دارالعلوم دیوبند کا علمی دینی رسالہ

ماہنامہ

زیر سرپرستی

مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

نگرانِ اعلیٰ حضرت الحاج مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند یوپی

دار العلوم دیوبند کا علمی و دینی

ماہنامہ دار العلوم

جلد نمبر ۶۷ | اکتوبر سنہ ۱۹۸۴ء مطابق محرم الحرام سنہ ۱۴۰۵ھ | شمارہ نمبر ۱

سالانہ زر اشتراک	
ہندوستان سے	۲۵/۰۰
سعودی عرب، کویت، ابوظہبی وغیرہ سے بذریعہ ایرمیل	۹۰/۰۰ روپے
جنوبی مشرقی افریقہ، برطانیہ وغیرہ سے بذریعہ ایرمیل	۱۰۵/۰۰ روپے
امریکہ، کناڈا وغیرہ سے بذریعہ ایرمیل	۱۱۶/۰۰ روپے
پاکستان سے بذریعہ ریل	۱۵/۰۰ روپے
فی پرچہ	۲/۵۰ روپے

طابع و ناشر

دار العلوم معرفت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب

مہتمم دار العلوم دیوبند

مطبوعہ

محبوب پریس دیوبند (یوپی)

ضروری گذارش

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینہ یا اس سے پہلے کسی مہینہ میں آپ کی مدت خریداری ختم ہوچکی ہے۔ بذریعہ سرخ نشان اس کی آپ کو اطلاع بھی دی جاچکی ہے۔ لہٰذا اب اگر آئندہ شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا کوئی خط یا چندہ نہ آیا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو وی، پی سے زر اشتراک ادا کرنے میں آسانی ہے اگلا شمارہ۔ ۳۱/ روپے کے مطالبہ میں وی، پی کردیا جائے گا۔ (مدیر)

فہرست مضامین

ہندوستانی اور پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

(۱) ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اولین فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ فرمائیں۔

(۲) پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ ۲۵/۰۰ روپے مولانا عبد الستار صاحب مقام کرم علی والا تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان (پاکستان) کو بھیج دیں اور انھیں لکھیں کہ وہ اس چندہ کو رسالہ دارالعلوم کے حساب میں جمع کرلیں۔

(۳) خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں، خط وکتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں

(مدیر)

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن قاسمی

۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغلیہ سلطنت جو اپنے تمام تر امتیازات وتشخصات کے باوجود ہندوستان کی سیاسی وحدت کی ضامن تھی یہاں پہنچ کر دم توڑ دیتی ہے۔ اور اس کے ملبہ پر ایک جدید حکومت کا قصر عمارت تعمیر ہوتا ہے، اس انقلاب کو چشم ظاہر بین نے اگرچہ ایک سیاسی کھیل سمجھا جسے سیاست واقتدار کے بازی گر زندگی کی فیلڈ میں کھیلتے رہتے ہیں

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ہوتا ہے شب وروز تماشا مرے آگے

لیکن ارباب بصیرت اور سیاسی عروج وزوال کے عوامل ومحرکات پر نگاہ رکھنے والے واضح طور پر سمجھ رہے تھے اور کھلی آنکھوں دیکھ رہے تھے کہ یہ محض سیاسی بازیگری اور اقتدار کا تبادلہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے عوامل نہایت دور رس اور ہمہ گیر ہیں یہ انقلاب زندگی کے پورے محور کو بدل کر رکھ دے گا۔ اس کی طوفانی موجیں معیشت ومعاشرت، تہذیب وتمدن، افکار ونظریات اور اعمال واخلاق کی پرانی قدروں کو ملیا میٹ کر دیں گی۔ سیاسی انقلاب کی اس ہمہ جہت شکست وریخت کو قرآن حکیم نے اپنے بلیغ اور معجزانہ اسلوب میں ملکۂ سبا بلقیس کی زبانی یوں واضح کیا ہے

قَالَتْ إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً

وہ بولی بادشاہ جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اسے خراب کر دیتے ہیں اور بنا دیتے ہیں اسکے سرداروں کو ذلیل

اب مسلمان ارباب فکر وعلم کے سامنے دو راستے تھے یا تو وہ حالات کے سامنے سرنگوں ہو کر اس سے سمجھوتہ کر لیتے اور اطمینان وسکون سے اسی ڈگر پر چل پڑتے جس پر اس وقت کے حالات انھیں لے جا رہے تھے چنانچہ ایک مصلحت پسند مفکر قوم کو اسی بات کی تلقین کرتا ہے۔

سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

اور یا تو "زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ ستیز" کے جرأت مندانہ فلسفہ پر عمل کرتے ہوئے حالات کو بدلنے کیلئے اس سے برسرِ پیکار ہو جاتے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہمارے اسلاف نے اسی دوسرے راستے کا انتخاب کیا حضرت شاہ عبدالعزیز محدث

دہلوی قدس سرہ کا فتویٰ "دار الحرب" حالات سے نبرد آزمائی کا ایک کھلا ہوا اعلان تھا۔ "دار الحرب" تو دیکھنے میں ایک مبہم سا فقرہ ہے لیکن جو لوگ اس کی اصطلاحی حقیقت اور ہندوستان کی دینی، علمی اور سیاسی بساط پر خاندان ولی اللّٰہی کے اثرات سے واقفیت رکھتے ہیں وہ اس کی اہمیت اور وسعت کو خوب سمجھتے ہیں۔ حضرت سید احمد شہید بریلوی قدس سرہ کی تحریک کی بنیاد درحقیقت حضرت شاہ عبد العزیز رحمہ کا یہی فتویٰ تھا۔ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور ان کے دونوں اصحاب حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور قطب ارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہم کو اسی فتویٰ نے مجبور کیا تھا کہ وہ تلوار لے کر شاملی کے میدان میں نکل پڑیں یہی وہ فتویٰ ہے جس کے مقتضیات کو بروئے کار لانے کے لئے دیوبند میں ایک مرکز قائم کیا گیا جسے آج دنیا "دار العلوم دیوبند" کے نام سے جانتی پہچانتی ہے۔ یہی فتویٰ ہے جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ ریشمی رومال کی تحریک مرتب فرمائیں اور اسے مؤثر بنانے کے لئے ضعف پیری اور کثرت امراض کے باوجود طول طویل سفر کریں اور مالٹا میں اسیری کی زندگی گذاریں یہی وہ فتویٰ ہے جو حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کو بے چین کرتا ہے کہ وہ مدرسہ وخانقاہ کے گوشۂ عافیت سے نکل کر خارزار سیاست کی بادیہ پیمائی کریں اور قید وبند کی بے پایاں صعوبتیں برداشت کریں۔

مقام فیض کوئی راہ میں جنچا ہی نہیں　　جو کوے یار سے نکلے تو سوے دار چلے

برٹش حکومت جو ملک عزیز پر تسلط قائم کرلینے کے بعد یہ خواب دیکھنے لگی تھی کہ یہاں کے باشندوں کے مذہب ومسلک کو تبدیل کرکے سب کو اپنے مزاج ومذاق کے مطابق بنالے چنانچہ لارڈ میکالے نے ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو تعلیمی کمیٹی کی صدارت کرتے ہوئے جو رپورٹ پیش کی تھی اس پر وہ صاف طور پر لکھتا ہے۔

ہمیں ایک ایسی جماعت چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خون ورنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے الفاظ اور سمجھ وفکر کے اعتبار سے انگریز ہو۔ (علماء حق۔ ج ۱ ص ۳۹)

زمانہ گواہ ہے کہ حضرات اکابر رحمہم اللہ نے اپنی پامردی، استقامت، جوش عمل اور جہد مسلسل سے نہ صرف یہ کہ اس ظالم حکومت کے خواب کو شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیا بلکہ ایک دن وہ بھی آیا کہ اپنی تمام تر قوت وشوکت کے باوجود اس جابر ومتکبر قوم کو بے نیل ومرام یہاں سے جانا پڑ گیا۔ اور اس طرح سے ایسے عظیم فتنہ سے جس میں ملت اسلامیہ گھر گئی تھی اور یہی خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اس سیلاب بلاخیز میں وہ اپنے امتیازات وتشخصات کو محفوظ نہ رکھ سکے گی نجات ملی (شکر اللہ سعیھم وجزاھم عنی وعن سائر المسلمین جزاءً حسناً)

آج کل کے حالات بتارہے ہیں کہ اسلام مخالف طاقتیں ایک بار پھر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی کے درپے ہیں۔

آگ ہے اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے

اسلام دشمن طاقتوں کو ملک عزیز میں مسلمانوں کا وجود کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے اور اس کانٹے کو نکالنے کیلئے وہ پوری قوت سے میدان میں آگئی ہیں۔ مسلمانوں کو اقتصادی، سیاسی، علمی اور دینی اعتبار سے بے جان کرکے انھیں ہضم کرنے کی فکر میں ہیں اسی لئے مسلمانوں کے اقتصادی مرکز کو تاک تاک کر نشانہ بنایا جارہا ہے اور دیکھتے دیکھتے لاکھوں اور کروڑوں کی املاک کو خاکستر کے ڈھیر میں بدل دیا جاتا ہے اور یہ عمل ایسے مرتب اور منظم طریقے پر انجام دیا جاتا ہے کہ ایک جگہ کے مسلمان ابھی سنبھلنے نہیں پاتے کہ دوسری جگہ خاک وخون کا کھیل شروع ہوجاتا ہے جمشید پور، بھیونڈی اور بمبئی کے بعد حیدرآباد اور پھر اس کے بعد مئوناتھ بھنجن میں ابھی چند مہینوں کے اندر جو کچھ ہوا ہے وہ کھلا ہوا ثبوت ہے کہ یہ سب ایک مرتب اسکیم اور طے شدہ منصوبے کے تحت ہورہا ہے۔ اسی کے ساتھ اب تو مسلمانوں کی مشہور اور قدیم مساجد پر بھی نگاہیں اٹھنے لگی ہیں اور باقاعدہ تنظیم کے تحت یہ کوشش کی جارہی ہے کہ ان مسجدوں کی قدیم اور تاریخی دینی ومذہبی حیثیت کو ختم کرکے انھیں اپنے قبضہ میں لے لیا جائے۔ مسلم اوقاف کا جو حشر ہورہا ہے وہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے مسلم پرسنلا خطرے کی زد سے محفوظ نہیں ہے۔ تعلیمی اور سیاسی اداروں سے مسلمانوں کو جس طرح بے دخل رکھا جارہا ہے وہ سب پر عیاں ہے یہ تمام کارروائیاں ایک عظیم طوفان کا پتہ دے رہی ہیں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو تمہارا تذکرہ تک بھی نہ ہوگا داستانوں میں

ان حالات میں ہمارے سامنے بھی دو ہی راستے ہیں ایک یہ کہ ہم حالات کے سامنے سر تسلیم خم کریں اور ہوائے زمانہ جس سمت لے جانا چاہتی ہے بغیر کسی مزاحمت کے ہم اسی رخ پر چل پڑیں۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ اپنے دین اپنے تہذیب وتمدن اور اپنی جان ومال کی حفاظت اور بقاء کے لئے اپنے اکابر واسلاف کے اسوہ کے مطابق استقامت وپامردی اور ہمت وجرأت کے ساتھ ہر مخالف قوت کا مقابلہ کریں۔

بطور خاص حضرات علماء کرام کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ ملت کی کشتی کو کس سمت لے جائیں گے کیونکہ خود رائی وخودپسندی کی عمومی فضا کے باوجود آج بھی بڑی حد تک ملت کی زمام قیادت علماء ہی کے ہاتھ میں ہے اور انھیں کے سامنے اپنے اکابر کے جہد وعمل کی مکمل تاریخ بھی ہے۔ اس لئے شدید ضرورت ہے کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور وقت کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ایثار وقربانی اور استقامت وپامردی کی تاریخ کو پھر سے زندہ کریں یہی اسلاف کا راستہ ہے اور یہی اور صرف یہی حیات ونجات کا راستہ ہے۔

یہ مصرعہ کاش نقش ہر در ودیوار ہوجائے جسے جینا ہو مرنے کے لئے تیار ہو

تقلید اور اجتہاد قسط ۳

از حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

شرائط اجتہاد

اجتہاد۔ جہد بمعنی کوشش سے مشتق ہے اصطلاح شریعت میں احکام شرعیہ کو ادلۂ تفصیلیہ سے معلوم کرنے کے لئے کوشش خرچ کر دینے کا نام اجتہاد ہے۔

مجتہد کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ علوم عربیت میں حاذق اور ماہر ہو کیونکہ قرآن اور حدیث عربی ہے بغیر عربی زبان جانے ہوئے نفس مطلب بھی نہیں سمجھ سکتا اجتہاد تو درکنار اور علوم عربیت میں لغت اور صرف اور نحو اور بلاغت یہ تمام علوم داخل ہیں۔ اعراب کے بدل جانے سے اور تعریف و تنکیر کے فرق سے معنی میں زمین و آسمان کا فرق ہو جاتا ہے اس لئے اجتہاد کے لئے ان علوم میں حاذق اور ماہر ہونا نہایت درجہ ضروری ہے۔

دوم یہ کہ کتاب و سنت اور اقوال صحابہ و تابعین پر پورا مطلع ہو تاکہ مختلف فیہ مسائل صحابہ و تابعین کے دائرہ کے باہر نہ جائے

سوم یہ کہ منجانب اللہ اس کو نور فہم اور فراست سے خاص حصہ ملا ہو۔ ذکاوت اور ذہانت میں ممتاز ہو کہ بڑے بڑے اذکیاء اور عقلاء کی گردن تسلیم اس کے خداداد فہم کے سامنے خم ہو۔ اجتہاد کے لئے معمولی فہم کافی نہیں۔ اجتہاد کے لئے ایسا غیر معمولی فہم چاہیے کہ جو لوگوں میں ضرب المثل بن گیا ہو۔ معمولی فہم تو ہر عالم میں ہوتا ہے مجتہد کی کیا خصوصیت،

چہارم یہ کہ ورع اور تقویٰ کا مجسمہ ہو اس کا چہرہ اور اس کی پیشانی اس کے تقویٰ اور پرہیزگاری پر شہادت دیتی ہو۔ حق پرست ہو۔ ہوا پرست نہ ہو زبان قال نہیں بلکہ زبان حال یہ شعر پڑھتی ہو

اَنَا عَبْدُ الْحَقِّ لَا عَبْدُ الْهَوٰی ‏ ‏ لَعَنَ اللّٰهُ الْهَوٰی فِیْمَا لَعَنْ

میں بندہ حق کا ہوں ہوائے نفس کا بندہ نہیں ہوائے نفسانی پر اللہ کی لعنت ہو۔

پنجم یہ کہ طرقِ استنباط اور اجتہاد سے بخوبی واقف ہو۔

تقلید تقلید کی حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اجتہاد کے درجہ کو نہ پہونچا ہو اس کا کسی عالم اور مجتہد کے علم اور فہم اور اس کے ورع اور تقوی کے اعتماد پر بلا دلیل معلوم کئے ہوئے اس کے قول اور فتوی پر عمل کرنے کا نام تقلید ہے۔

جس شخص کو حق تعالی نے قوت اجتہادیہ عطا فرمائی ہو اس کو تقلید جائز نہیں اس کو اپنے اجتہاد پر عمل کرنا واجب ہے اور جو شخص اجتہاد کے درجہ کو نہ پہونچا اس کے لئے اجتہاد جائز نہیں اس پر تقلید واجب ہے
ع چوں تو یوسف نیستی یعقوب باش۔

علم طب اور علم ریاضی میں ہر شخص اپنے اعلم اور افضل کے اتباع کو عین عقل اور دانائی سمجھتا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ دین میں اپنے سے اعلم اور اتقی کے اتباع کو ناجائز اور شرک سمجھا جائے تقلید ایک امر فطری ہے جو شخص اپنے سے اعلم اور افضل کے اتباع کو موجب عار سمجھے وہ ہمیشہ کمال سے عاری اور محروم رہتا ہے کوئی کمال بدون تقلید کے حاصل نہیں ہو سکتا معمولی صنعت اور حرفت میں بھی بغیر تقلید کے کام نہیں چلتا۔ افسوس کہ جو حضرات ائمہ مجتہدین با مرتبہ کے مصداق ہوں ان کی تقلید اور اتباع کو شرک کہا جائے اور اپنے فہم ناقص اور ہوائے نفس کے اتباع کو عین توحید سمجھا جائے ع بریں عقل و دانش بباید گریست۔

جس طرح غیر طبیب کو طبیب کا اتباع لازمی ہے۔ اسی طرح غیر مجتہد کو مجتہد کا اتباع لازم ہے۔ جو شخص طبیب نہ ہو اس کو جائز نہیں کہ وہ محض اردو تراجم دیکھ کر اپنا یا کسی مریض کا علاج کرے اور جو شخص ایسا کرے گا وہ مجرم قرار پائے گا۔ جو شخص اردو تراجم دیکھ کر علاج کرنے کے لئے تیار ہو جائے وہ تو نادان ہے۔ لیکن جو ایسے نادان سے معالجہ کرانے کے لئے تیار ہو جائے وہ اس سے بڑھ کر نادان ہے کہ اپنی صحت کو خطرہ میں ڈال رہا ہے۔ اللہ تعالی دونوں کو ہدایت دے اور ایسے معالج اور مُعالَج دونوں پر رحم فرمائے۔ آمین۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ بعض حضرات کو یہ شبہ ہو گیا کہ مجتہد کی تقلید اور اتباع صرف عوام پر لازم ہے علماء اس وجوب اور لزوم سے مستثنی ہیں یہ صحیح نہیں کوئی عالم خواہ کیسا ہی متبحر فی العلم کیوں نہ ہو جب اس میں قوت اجتہادیہ نہ ہو اور خود کتاب و سنت سے مسائل کا استنباط نہ کر سکے تو وہ مجتہد کے اعتبار سے عامی ہے اس پر مجتہد کی تقلید واجب ہے۔ مجتہد وہ ہے کہ جو اپنی قوت اجتہادیہ سے مسائل کا کتاب و سنت سے استخراج اور استنباط کر سکے اور دوسرے کے مستنبط مسائل اور دلائل میں تطبیق دے لینے سے مجتہد نہیں بن جاتا ہی دلائل پہلے بھی موجود تھے مگر یہ عالم ان مسائل کو ان دلائل سے مجتہد کے استنباط کے بعد سمجھا۔ شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے عقد الجید میں امام نووی سے نقل کیا ہے کہ شروط اجتہاد پانچ ہیں۔ اور جس میں اجتہاد کی ایک شرط بھی مفقود ہو جائے اس کو

تقلید سے چارہ نہیں۔ آہ اب ہم وجوب تقلید کے دلائل ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

آیت اولیٰ | قال تعالیٰ فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ — اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت کر لو۔

اہل الذکر سے عموم اور استغراق یعنی اہل الذکر کے تمام افراد مراد نہیں۔ اس لئے کہ تمام افراد سے دریافت کرنا ناممکن ہے۔

دوم یہ کہ اہل الذکر میں اختلاف فہم کی وجہ سے اختلاف ہونا لازم ہے پس اگر سب کا اتباع کیا جائے تو اجتماع نقیضین لازم آئے لہذا اہل الذکر اس جنس کے حکم میں قرار دینا لازم ہوگا کہ جو واحد اور متعدد سب کو شامل ہو یعنی وہ مسئول خواہ واحد ہو اور خواہ متعدد ہو پہلی صورت کا نام تقلید شخصی ہے اور دوسری صورت کا نام تقلید غیر شخصی ہے یہ آیت اگرچہ اہل کتاب کے بارہ میں نازل ہوئی مگر باتفاق علماء اعتبار عموم معنیٰ کا ہے نہ خصوصی مبنیٰ کا اس لئے کہ علت سوال کی دونوں جگہ مشترک ہے جس طرح مشرکین کو عدم علم کی وجہ سے علماء اہل کتاب سے دریافت کرنے کا حکم ہوا اسی طرح غیر عالم مسلمان کو امور دینیہ میں عالم کی طرف رجوع کرنا ضروری اور واجب ہوا اور جس طرح مشرکین کو تین چار علماء اہل کتاب سے دریافت کرنا ضروری نہیں ایک یہودی یا ایک نصرانی عالم سے بھی دریافت کر کے تشفی کر سکتے ہیں اسی طرح اہل اسلام پر ضروری نہیں کہ وہ متعدد علماء ہی سے مسائل دریافت کیا کریں۔ ایک ہی عالم سے اگر مسائل دریافت کیا کریں تو اس آیت کے عامل سمجھے جائیں گے اس آیت سے مطلق تقلید کی فرضیت معلوم ہوتی ہے لہذا مطلق کے تمام افراد فرضیت میں مساوی اور برابر کے ہوں گے اور اکثر اہل حدیث مطلق کی فرضیت کے قائل بھی ہیں اور ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ مطلق تقلید کے دو فرد ہیں ایک شخصی اور ایک غیر شخصی۔ لہذا جب مطلق تقلید فرض ہوئی تو اس کا ہر فرد علیٰ سبیل البدلیۃ فرض کا مصداق ہوگا مامور بہ کے تمام افراد مامور بہ ہونے چاہئیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مامور بہ کے بعض افراد تو فرض اور واجب ہوں اور بعض افراد شرک اور حرام ہوں اس لئے کہ حرام اور منہی عنہ کا مامور بہ کے تحت میں مندرج ہونا عقلاً اور نقلاً محال ہے کیونکہ تقسیم الشئی کا قسیماً منہ ہونا لازم آتا ہے جو مستلزم ہے اجتماع نقیضین کو۔

خلاصۂ کلام | یہ کہ باتفاق علماء اہل الذکر سے اس آیت میں اہل علم مراد ہیں جس کا بہترین مصداق فقہاء مستنبطین اور ائمہ مجتہدین ہیں یہی وجہ ہے کہ اکابر محدثین ومفسرین ہمیشہ ائمہ اربعہ ہی کی طرف رجوع کرتے رہے

آیت دوم | قال تعالیٰ یا ایہا الذین — اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی

أمنوا أطيعوا الله وأطيعوا الرسول وأولي الأمر منكم اطاعت کرو اور اولی الامر کی اطاعت کرو ۔

اولی الامر کی تفسیر میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ حکام مراد ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ علماء اور فقہاء مراد ہیں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور جابر بن عبد اللہ اور حسن بصری اور ابو العالیہ اور عطاء بن ابی رباح ضحاک اور مجاہد سے مروی ہے کہ اولو الامر سے علماء مراد ہیں اور ایک روایت امام احمد بن حنبل سے بھی یہی ہے کہ اولوا الامر سے علماء مراد ہیں کذا فی اعلام الموقعین ص۸ ج ۱ قاضی ابو بکر ابن العربی احکام القرآن ص۱۸۵ ج ۱

قوله تعالى وأولى الأمر منكم فيها قولان
الاول قال الميمون بن مهران هم اصحاب السرايا
وروى في ذلك حديثا وهو اختيار البخاري
وروى عن ابن عباس انها نزلت في
عبد الله بن حذافة اذ بعثه
النبي صلى الله عليه وسلم في سرية
الثاني. قال جابر هم العلماء وبه قال
اكثر التابعين واختاره مالك قال مطرف
وابن مسلمة سمعنا مالكا يقول هم
العلماء وقال خالد بن نزار وقفت على
مالك فقلت يا ابا عبد الله ما ترى في
قوله تعالى واولى الامر منكم قال وكان
محتبيا فحل حبوته وكان عنده اصحاب
الحديث ففتح عينيه في وجهي وعلمت ما
اراد وانما عنى اهل العلم واختاره
الطبري واحتج بقوله صلى الله عليه وسلم
من اطاع امري فقد اطاعني الحديث
والصحيح عندي انهم الامراء و
العلماء جميعا اما الامراء فلان اصل
الامر والحكم اليهم واما العلماء

اولی الامر کے بارے میں دو قول ہیں اول یہ کہ اس سے
حکام اور امراء سریہ مراد ہیں اور ایک حدیث بھی آئی
ہے۔ اور اسی قول کو امام بخاری نے اختیار فرمایا
اور ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب آں حضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے عبد اللہ بن حذافہ کو امیر لشکر بنا کر بھیجا
اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ دوسرا قول یہ
ہے کہ اولی الامر سے علماء مراد ہیں اور اکثر
تابعین اسی کے قائل ہیں اور امام مالک
نے اسی کو اختیار فرمایا مطرف اور ابن مسلمہ
کہتے ہیں کہ ہم نے امام مالک کو کہتے سنا کہ علماء
مراد ہیں خالد بن نزار کہتے ہیں کہ میں نے امام
مالکؒ سے اولی الامر کے متعلق دریافت کیا۔
آپ گوٹ لگائے ہوئے بیٹھے ہوئے تھے کھل کر
بیٹھ گئے اور آپ کی مجلس میں اصحاب حدیث
یعنی علماء موجود تھے امام مالکؒ نے میری طرف
نظر اٹھا کر دیکھا میں سمجھ گیا کہ اہل علم مراد ہیں اور اسی
کو امام طبری نے اختیار فرمایا اور اس حدیث سے
استدلال کیا کہ جس نے میرے حکم کو مانا اس نے میری
اطاعت کی۔ اور صحیح اور راجح یہ ہے کہ اولی الامر سے امراء
اور علماء دونوں ہی مراد ہیں امراء تو اس لئے کہ وہ حکم دیتے ہیں

فلان سوالهم واجب متعین علی الخلق وجوابهم لازم وامتثال فتواهم واجب وقد قدمنا ان کل هؤلاء حاکم قد سماهم الله تعالی بذلک فقال یحکم بها النبیون الذین اسلموا للذین هادوا والربانیون والاحبار. فاخبر تعالی ان النبی صلی الله علیه وسلم حاکم والربانی حاکم والحبر حاکم والامر کله یرجع الی العلماء لان الامر قد افضی الی الجهال وتعین علیهم سؤال العلماء انتهی۔

اور علماء اس لئے کہ مخلوق پر ان سے دریافت کرنا ضروری اور فرض ہے اور ان کے فتوے پر عمل کرنا واجب اور ضروری ہے اور علماء کو بھی اللہ تعالیٰ نے حاکم فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ انبیاء اللہ اور اہل اللہ اور علماء یہودیوں کو توریت کے مطابق حکم دیا کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ بتلا دیا کہ نبی بھی حاکم ہوتا ہے اور اللہ والا یعنی ولی وہ بھی حاکم ہوتا ہے اور عالم بھی حاکم ہوتا ہے غرض یہ کہ معاملہ علماء ہی کی طرف لوٹتا ہے اس لئے حکام جاہل ان پر واجب ہے کہ علماء سے پوچھ کر فیصلہ کریں۔ انتہی۔

اور امام ابوبکر رازی اور حافظ ابن کثیر نے بھی اختیار کیا کہ اولی الامر عام ہے امراء اور علماء دونوں کو شامل ہے امور دنیاویہ میں امراء کی اطاعت لازم ہے۔ اور امور دینیہ میں علماء کی اطاعت فرض ہے۔ ظاہر شریعت میں علماء کی شریعت کی اور باطن شریعت میں مشائخ طریقت کی اتباع ضروری ہے اور اور اپنے عمل کو کسی کے فتوے کے تابع کر دینے ہی کا نام تقلید ہے۔ اور اگر بالفرض اولی الامر سے خاص حکام ہی مراد ہوں تب بھی آیت سے تقلید کا وجوب ثابت ہوگا اس لئے کہ عوام حکام کے تابع ہیں اور حکام علماء کے تابع ہیں اور تابع کا تابع بھی تابع ہوتا ہے۔ یا یوں کہو کہ علماء حکام کے متبوع ہیں اور حکام عوام کے متبوع ہیں اور متبوع کا متبوع بھی متبوع ہوتا ہے فافهم ذلک واستقم۔

آیت سوم | قال تعالی ولو ردوه الی الرسول والی اولی الامر منهم لعلمه الذین یستنبطونه منهم۔

اگر یہ لوگ اس امر کو رسول کے اور اولی الامر کے حوالہ کرتے تو جو لوگ اہل فقہ اور اہل استنباط ہیں وہ سمجھ کر ان کو بتلا دیتے کہ کون سی خبر قابل ذکر ہے اور کون سی ناقابل ذکر۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جو لوگ استنباط کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں ان پر اہل فقہ اور اہل استنباط کی تقلید ضروری ہے تفصیل کے لئے امام رازی کی تفسیر اور احکام القرآن للجصاص کی طرف مراجعت فرمائیں۔

آیت چہارم | قال تعالی فلولا نفر من

کیوں نہ نکلے ہر فرقہ میں سے ایک جماعت تاکہ

كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ۔

تفقہ فی الدین کو حاصل کرے اور جب واپس آئے تو اپنی قوم کو ہشیار بیدار کرے تاکہ وہ دین کی باتوں کو سن کر اللہ کی نافرمانی سے بچیں۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ ان لوگوں پر دین سیکھنے کے بعد اپنی قوم کو وعظ و انذار ضروری ہے اور قوم پر ان کا اقتدا اور اتباع ضروری ہے اور بسا اوقات یہ علم دین سیکھ کر واپس ہونے والا ایک ہی شخص ہوتا ہے سو ظاہر ہے کہ ایک شخص کا اتباع تقلید شخصی ہی ہوگا۔

آیت پنجم قَالَ تَعَالَىٰ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ۔

اور ہم نے ان میں سے پیشوا بنائے جو لوگوں کو ہماری راہ پر چلاتے تھے جب انھوں نے صبر کیا اور ہماری آیتوں پر پورا یقین رکھتے تھے۔

اور حدیث میں ہے انما جعل الامام لیوتم بہ امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا و اتباع کیجائے

احادیث اب ہم چند احادیث درپارۂ تقلید ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

حدیث اول عن حذیفۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی لا ادری مابقائی فیکم فاقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر رواہ احمد و الترمذی و ابن ماجہ بلفظ اقتدوا باللذین من بعدی ابی بکر و عمر

حذیفہؓ سے روای ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں کہ میں کب تک تم لوگوں میں زندہ رہوں گا پس میرے بعد ان دو شخصوں کی اقتداء کرنا ایک ابوبکر دوسرے عمر رضی اللہ عنہما۔

من بعدی کا مطلب یہ ہے کہ میرے بعد یہ دونوں خلیفہ ہوں گے ابوبکر کے زمانہ خلافت میں ابوبکر کا اتباع کرنا اور عمر کی زمانہ خلافت میں عمر کا اتباع کرنا اور یہ نہیں فرمایا کہ ان سے احکام اور مسائل کے دلائل بھی دریافت کرنا اور بلا دلیل دریافت کئے کسی فتوے پر عمل کرنا یہی تقلید شخصی ہے۔

حدیث دوم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبلؓ کو تعلیم احکام کے لئے یمن روانہ فرمایا (مفصل حدیث گذرچکی) جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اہل یمن پر ہر مسئلہ میں معاذ بن جبل کا اتباع واجب ہے اور اہل یمن کو یہ حکم نہیں دیا کہ تم معاذ سے دلیل بھی پوچھنا خصوصًا ان مسائل میں جو اپنی رائے سے بتلائیں اور یہی تقلید شخصی ہے۔

حدیث سوم ان العلماء ورثۃ الانبیاء (رواہ احمد و ابوداؤد و الترمذی) علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

پس جس طرح نبی کا اتباع فرض اور لازم ہے اسی طرح اس نبی کے وارث کا اتباع بھی لازم ہے انبیاء کی میراث شریعت کا علم ہے علماء کا اتباع اور اقتداء اس لئے فرض ہے کہ وہ علم شریعت کے وارث ہیں اور شریعت کا اتباع فرض ہے جو شخص کسی صحیح وارث اور صحیح عالم دین کی تقلید کرے گا وہ نبی اور رسول ہی کا متبع سمجھا جائے گا جیسے رسول کا اتباع کرنے والا اللہ ہی کا مطیع اور فرماں بردار سمجھا جاتا ہے کما قال تعالیٰ مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ،

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

عہد صحابہ و تابعین میں تقلید شخصی

کتاب و سنت کی نصوص سے یہ امر بخوبی ثابت ہو گیا کہ مطلق تقلید فرض ہے جس کے دو فرد ہیں ایک شخصی اور ایک غیر شخصی اور کتاب و سنت میں کہیں یہ حکم نہیں آیا کہ عالم سے بغیر دلیل معلوم کئے اس کے فتوے پر عمل نہ کرنا چنانچہ صحابہ و تابعین کے زمانہ میں اسی طرح عمل رہا کہ سائل کے جواب میں عالم نے جو حکم دیا دلیل سے یا بلا دلیل کے سائل نے اس پر عمل کیا اور عدم دلیل کی صورت میں عالم سے دلیل کا مطالبہ نہیں کیا۔ جو صحابی یا تابعی کسی شہر میں رہتا لوگ اسی سے فتویٰ پوچھ کر عمل کرتے تھے اور فتوے کا ماخذ نہیں دریافت کرتے تھے معلوم ہوا کہ مستفتی کو بلا ماخذ معلوم کئے ہوئے کسی مستند عالم کے فتویٰ پر عمل کرنا بالاجماع جائز ہے۔

قال ابن الحاجب لم تزل العلماء يستفتون ويتبعون من غير ابداء المستند وشاع وذاع ولم ينكر عليهم فكان اجماعا آه مع اهل الزيغ والالحاد صفحہ ۵۳

ابن حاجب کہتے ہیں کہ ہمیشہ سے طریق یہ رہا ہے کہ علما سے فتوی دریافت کیا جاتا اور وہ فتوی دیتے اور لوگ بغیر دلیل معلوم کئے ان کا اتباع کرتے اور یہ امر شائع اور ذائع رہا اور کسی نے اس کا انکار نہیں کیا۔ پس تمام علماء کا اجماع ہو گیا کہ تقلید شخصی بالکل صحیح اور درست ہے

عہد صحابہ میں عبد اللہ بن عباس مکہ میں اور زید بن ثابت مدینہ میں اور عبد اللہ بن مسعود کوفہ میں فتوی دیتے تھے اور مسائل خلافیہ میں اہل مکہ عبد اللہ بن عباس کے قول کو اور اہل مدینہ زید بن ثابت کے قول کو ترجیح دیتے تھے اور انھیں کے فتوے پر عمل کرتے تھے اور محل خلاف میں ایک کو اعلم اور افضل سمجھ کر اس کے قول پر عمل کرنا اسی کا نام تقلید شخصی ہے بخاری اور ترمذی اور ابوداؤد میں ہے کہ ابو موسی اشعریؓ سے ایک مسئلہ دریافت کیا گیا پھر وہی مسئلہ عبد اللہ بن مسعود سے دریافت کیا گیا عبد اللہ بن مسعود نے ابو موسیٰ اشعری کے خلاف فتوی دیا جب ابو موسیٰ اشعری کو اس کا علم ہوا تو سمجھ گئے کہ

صحیح فتوی عبداللہ بن مسعود کا ہے تو یہ فرمایا۔

لاتسئلونی مادام ھذا الحبر فیکم جب تک یہ تبحر عالم یعنی عبداللہ بن مسعودؓ تم میں موجود ہے مجھ سے مت دریافت کرو یعنی ہر مسئلہ انہی سے دریافت کیا کرو اور جو فتوی دیں اس پر عمل کرو اور یہی تقلید شخصی ہے حافظ عراقی فرماتے ہیں۔

وَهُوَ وَزَیْدٌ وَابن عباس لھم فی الفقہ اتباع یرون قولھم

یعنی عبداللہ بن مسعود اور زید بن ثابت اور عبداللہ ابن عباسؓ کے فقہ میں کچھ لوگ متبع اور مقلد ہیں جو انھیں کے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔

اور پھر تابعین کے دور میں فقہاء سبعہ کے فتووں پر عمل ہوتا تھا اور پھر تبع تابعین کے دور میں ائمہ اربعہ پیدا ہوئے اور امت نے ان کے فتووں پر عمل کیا اور ان کے تقلید اور اتباع کو اپنے لئے ذریعہ ہدایت سمجھا اور اسی پر امت کا اجماع ہوگیا۔

تقلید ائمہ اربعہ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں اگرچہ تقلید شخصی بھی بلا نکیر کے جاری تھی لیکن کسی خاص شخص کو تقلید کا التزام اور اہتمام نہ تھا جس کے علم اور تقوی پر اطمینان ہوا اس سے دین کا مسئلہ دریافت کر کے عمل کر لیا دو صدی تک اسی طرح عمل جاری رہا۔ تیسری صدی آئی اور بہت سے فقہاء اور مجتہدین پیدا ہوئے اور لوگوں نے ان کا اتباع کیا ۲۰۲ھ میں داؤد ظاہری ظاہر ہوئے جنھوں نے سب سے پہلے قیاس کا انکار کیا کچھ لوگ ان کے بھی متبع ہوئے اور اسی تیسری میں مذاہب اربعہ کا شیوع اور ظہور ہوا اور امت کے علماء اور صلحاء نے ان مذاہب اربعہ کو استحسان اور قبول کی نظروں سے دیکھا۔ اسی تیسری صدی میں اوزاعی اور اسحاق بن راہویہ اور سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ اور لیث بن سعد وغیرہم کا مذہب بھی ظاہر ہوا مگر اس تیسری صدی کے ختم پر یہ مذاہب بھی ختم ہو گئے اور دنیا میں صرف امام ابوحنیفہ اور امام مالک اور امام شافعی اور امام احمد کا مذہب اور ان کے متبعین باقی رہ گئے۔

چوتھی صدی کے شروع میں علماء ربانیین نے دیکھا کہ خیر القرون کا زمانہ تو گذر گیا کہ جس سے چاہیں مسئلہ پوچھ کر عمل کریں۔ علم اور تقویٰ میں غیر معمولی انحطاط ہوگیا دیانت کے بجائے نفسانیت کا غلبہ ہوگیا اس لئے علماء نے مناسب نہ سمجھا کہ عوام کو ہر شخص کی تقلید اور اتباع کی اجازت دے دی جائے اور ائمہ اربعہ کا علم اور تقوی اور فہم اور فراست اور استنباط و اجتہاد امت میں مسلم ہو چکا تھا اس لئے یہی اسلم سمجھا کہ ائمہ اربعہ میں سے کسی معین امام کی تقلید کا التزام کیا جائے تاکہ لوگ اپنی خود غرضیوں اور نفسانیوں کی وجہ سے دین کو کھیل اور تماشہ نہ بنالیں اور خدانخواستہ کہیں اس آیت کا مصداق نہ بن جائیں۔

اتَّخَذُوْا دِیْنَھُمْ لَھْوًا وَّلَعِبًا اور ان علماء ربانیین نے علی رؤس الاشہاد یہ اعلان کر دیا کہ ہم اجتہاد
سے عاجز ہیں ہم میں نہ ابوحنیفہ اور مالک جیسا علم اور فہم ہے اور نہ ان جیسا ورع اور تقوی ہے اور
نہ ان جیسی قوت اجتہاد اور ملکہ استنباط ہے۔ اور مسلمانوں میں اپنی تقلید کا اعلان کر دیا کہ ہم فلاں امام
کے مقلد ہیں اور عامہ مسلمین کو بھی اسی کا حکم دیا کہ ائمہ اربعہ میں سے کسی امام کی تقلید اختیار کریں چنانچہ
اکابر محدثین کو آپ دیکھیں گے کہ کوئی بھی ایسا نہیں ملے گا کہ جو ائمہ اربعہ میں سے کسی کا مقلد نہ ہو اور شاذ و
نادر کا اعتبار نہیں صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں کسی امام معین کی تقلید کا التزام اس لئے نہ تھا کہ قلوب
نفسانیت سے پاک تھے اب زمانہ ہے فتنہ اور فساد کا اور غلبہ ہے ہوی اور ہوس کا اب اگر تقلید غیر شخصی
کی اجازت دے دی جائے تو جس مجتہد کا فتویٰ اپنی خواہش اور غرض کے مطابق ہوگا اس کو اختیار
کریں گے آج ان کو جس چیز کی جواز کی ضرورت ہے اس کے جواز حاصل کرنے کے لئے اس عالم سے
فتویٰ دریافت کریں گے کہ جس کے مذہب میں یہ چیز جائز ہے اور جب کل کو اسی چیز کی ممانعت کی ضرورت
ہوگی تو اس عالم سے فتویٰ دریافت کریں گے جس کے مذہب میں یہ شئی ممنوع ہے اور اس طرح
یُحِلُّوْنَہٗ عَامًا وَّیُحَرِّمُوْنَہٗ عَامًا کے مصداق بنیں گے ضرورت کی وجہ سے ایک سال اس کو حلال
کرتے ہیں اور دوسرے سال اس کو حرام کرتے ہیں۔

ائمہ اربعہ کی تقلید پر امت کا اجماع

سلسلہ تقلید کا ائمہ اربعہ پر ختم ہو جانا کوئی امر عقلی نہیں اور نہ کوئی امر کسبی ہے کہ جس کو
کسی سعی اور جدوجہد کا نتیجہ کہا جائے بلکہ محض فضل خداوندی اور مشیت ربانی ہے اسی نے اپنی قدرت
اور حکمت سے فقہاء اور مجتہدین کو پیدا کیا اور اسی کی مشیت سے ان کے مذاہب پھیلے اور لوگوں نے
ان کی تقلید کی پھر اسی کی مشیت اور حکمت اس کو مقتضی ہوئی کہ ائمہ اربعہ کو اپنے اجتباء اور قبول
سے سرفراز فرمائے اور تمام امت انہی کی رہنمائی سے خدا تک پہنچے چنانچہ رفتہ رفتہ تمام مذاہب
دنیا سے معدوم ہو گئے اور صرف ائمہ اربعہ کے مذاہب باقی رہ گئے حق جل وعلا نے تکوینی طور پر
محدثین اور مفسرین اور اولیاء اور عارفین کے قلوب میں یہ القاء فرمایا کہ تم ہمارے ان چار مقبول
بندوں میں سے کسی کا اتباع کرو یہ القاء ہوتا تھا کہ امت کے عوام اور خواص کے قلوب سمٹ کر ائمہ اربعہ
پر جمع ہو گئے اور دن بدن ان کا شیوع اور قبول ہوتا رہا یہاں تک کہ ان کے اصول و فروع منضبط ہو گئے
اور روئے زمین کے تمام اہل سنت والجماعت انہی ائمہ اربعہ کی تقلید کے دائرے میں منحصر ہو گئے اور
اہل علم نے یہ اعلان کر دیا کہ جو شخص ائمہ اربعہ کی تقلید سے خروج کرے وہ اہل بدعت سے ہے اہل سنت سے نہیں۔

لہذا یہ سوال کرنا کہ تقلید انہی چار میں کیوں منحصر ہوئی ایسا ہی سوال ہے کہ خلافت راشدہ خلفائے اربعہ ہی میں کیوں منحصر ہوئی اور ملائکہ مقربین چار ہی میں کیوں منحصر ہیں جواب یہ ہے کہ محض فضل ربانی اور قبول یزدانی ہے اس میں کسی توجیہ اور دلیل کی گنجائش نہیں ماشاء اللہ کان ومالم یشأ لم یکن

حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ عقد الجید میں فرماتے ہیں کہ جب دنیا سے تمام مذاہب حقہ مندرس ہوگئے اور ان چار مذاہب کے سوا کوئی مذہب حق باقی نہ رہا لہذا انہی مذاہب اربعہ کا اتباع سواد اعظم کا اتباع ہوگا اور مذاہب اربعہ سے خروج سواد اعظم سے خروج ہوگا انتھی! یہی وجہ ہے کہ چوتھی صدی کے جو حفاظ اور ائمہ حدیث ہوئے وہ اکثر وبیشتر ائمہ اربعہ میں سے کسی نہ کسی کے ضرور متبع ہوئے والنادر کالمعدوم حضرات اہل حدیث کی طرح حضرات شیعہ بھی مذاہب اربعہ کو بدعت کہتے ہیں حافظ ابن تیمیہؒ نے منہاج السنہ جلد دوم صفحہ ۹۹ تا صفحہ ۹۲ میں اس اعتراض کے جواب میں مفصل کلام فرمایا ہے حضرات اہل علم اس کی طرف مراجعت فرمائیں۔

اجتہاد امر وہبی ہے اور تقلید امر کسبی

اجتہاد کی ہر شرط اگرچہ من وجہ وہبی ہے مگر فہم و فراست اور ملکۂ استنباط کہ جس کے ذریعہ سے کتاب وسنت کے حقائق اور معارف اور دقائق و لطائف کا انکشاف ہوتا ہے وہ محض عطیہ ہے وہ کسی مجاہدہ اور ریاضت اور کسب اور محنت سے حاصل نہیں ہوسکتا البتہ تقلید امر کسبی اور فعل اختیاری ہے

اجتہاد ختم ہوگیا اور تقلید قیامت تک کے لئے باقی رہ گئی

گذشتہ اوراق میں یہ امر بخوبی واضح ہوچکا ہے کہ دین کا دار و مدار دو چیزوں پر ہے ایک نقل صحیح اور ایک فہم صحیح حضرات محدثین نے پہلی خدمت اور حضرات مجتہدین نے دوسری خدمت انجام دی

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تقریباً سو سال تک سلسلہ اس طرح جاری رہا کہ صحابۂ کرام حدیثیں بیان کرتے اور لوگ ان کو اپنے دلوں کی تختیوں پر کندہ کرلیتے اور جو فتوی دیتے دل وجان سے اس کا اتباع کرتے صحابہ کا قرن قریب الختم تھا کہ اللہ تعالی نے علماء امت کے دلوں میں تدوین حدیث کا خیال القاء فرمایا یکایک حضرات محدثین کا گروہ الفاظ حدیث کے جمع اور تدوین کی طرف اور حضرات فقہا اور ائمہ مجتہدین کا گروہ استنباط احکام اور تدوین فقہ کی طرف متوجہ ہوا۔

دوسری صدی کے شروع میں ان دونوں سلسلوں کا آغاز ہوا۔ من جانب اللہ ایک گروہ الفاظ شریعت کی حفاظت میں مشغول ہوا اور دوسرا گروہ شریعت کے اغراض اور مقاصد اصول اور کلیات کے استنباط کی طرف متوجہ ہوا

مدینہ منورہ میں امام مالک مؤطا کی تالیف میں مشغول ہوئے اور کوفہ میں امام ابوحنیفہ استنباط اور استخراج مسائل میں مشغول ہوئے اور جس طرح مؤطا امام مالکؒ تمام کتب حدیث کے لئے سنگ بنیاد بنا اسی طرح فقہ ابوحنیفہ تمام فقہاء کے لئے مشعل راہ بنا۔ اور چونکہ تکوینی طور پر ان دونوں سلسلوں سے شریعت حقہ کی الفاظ اور معنی کی ہدایۃً اور درایۃً حفاظت مقصود تھی اس لئے من جانب اللہ اسی دوسری صدی کے شروع میں اصمعی اور خلیل بن احمد اور سیبویہ اور کسائی پیدا ہوئے تاکہ علوم عربیت۔ لغت اور اشتقاق اور نحو وغیرہ مدون ہو کہ جن کے بغیر کتاب وسنت کا سمجھنا ممکن ہے محدثین نے متونِ حدیث اور اسانید اور اسماء رجال اور جرح وتعدیل میں کتابیں اور جوامع اور سنن اور مسانید اور معاجم کے ڈھیر لگا دیئے۔ فقہاء نے اصول اور کلیات کا استنباط کیا اور شریعت کے مقاصد اور مصالح کو واضح کیا دفتر کے مسائل فقہیہ تیار ہو گئے۔

تیسری صدی کے ختم تک حدیث اور فقہ کی تدوین حد کمال کو پہونچ گئی اور مشیت خداوندی کا جو منشا تھا وہ پورا ہو گیا اور دین کی ضرورت تکمل ہو گئی نہ اب احمد بن حنبل اور بخاری جیسے حافظ کی ضرورت رہی اور نہ ابوحنیفہ اور مالک جیسے فہم وفراست کی ضرورت رہی تکوینی طور پر دن بدن حافظہ اور فہم میں انحطاط شروع ہو گیا۔

منتہائے کمال نقصان است گل بریزد بوقت سیرائے

بمقتضائے عقل اور نقل راستے دو ہی ہیں ایک اجتہاد اور دوسرا تقلید۔ اجتہاد ختم ہو گیا اور تقلید قیامت تک کے لئے باقی رہ گئی جس طرح نئی حدیث اور نئی جرح وتعدیل کی ضرورت نہیں اسی طرح اب کسی نئے فقہ کی ضرورت نہیں ہم نے کوئی اجتہاد اور استنباط کا دروازہ بند کیا؟ ہم کون ہیں اور کیا ہیں اور ہمارے اختیار میں کیا ہے ہمارا اگر کچھ اختیار چلتا تو بخاری اور مسلم جیسا حافظہ ختم ہونے دیتے اور نہ ابوحنیفہ اور مالک جیسے اجتہاد اور استنباط کا دروازہ بند ہونے دیتے یہ سب کچھ من جانب اللہ ہے اسی کی مشیت نے بخاری اور مسلم جیسے حافظہ کو ختم کیا اور اسی کے ارادے نے ابوحنیفہ اور مالک جیسے فقہ اور استنباط کو دنیا سے اٹھا لیا سب مطمئن رہیں کہ اب نہ وہ حافظہ لوٹ کر آئے گا اور نہ وہ فہم وفراست واپس آئے گی۔ اب تو قیامت تک تقلید ہی کرنی ہوگی اہل حدیث یہ کہتے ہیں کہ اجتہاد کوئی نبوت نہیں جو ختم ہو گئی ہو ہم بھی اجتہاد کر سکتے ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ قوت اجتہادیہ نبوت نہیں۔ لیکن قوت حافظہ بھی نبوت نہیں مگر ختم ہو گئی۔ اسی طرح قوت اجتہادیہ بھی اگرچہ نبوت نہیں مگر ختم ہو گئی۔ الغرض جب یہ ثابت ہو گیا کہ اب نہ وہ فہم ہے۔

اور نہ وہ حافظہ ہے اور نہ وہ ورع اور تقویٰ ہے تو پھر اس ماننے میں کیا تامل ہے کہ اجتہاد ختم ہوگیا

طریقۂ امتحان طریقۂ امتحان یہ ہے کہ علماء اہل حدیث میں سے چوٹی کے چار پانچ عالم منتخب کرلئے جائیں اور سو سو مسائل کی فہرست انکے سامنے پیش کردیجائے کہ ان مسائل کا جواب کتاب وسنت سے مدلل ومفصل تحریر فرمادیں مگر شرط یہ ہے کہ بغیر فقہ کی کتابوں کے دیکھے ان مسائل کا جواب لکھیں پھر جب جواب مکمل ہوجائے تو کتب فقہ سے اس کا مقابلہ کیا جائے اور ان کے استدلالات کا فقہاء کے استدلالات سے موازنہ کیا جائے انشاء اللہ تعالیٰ فقہاء کے سامنے لغو اور مہمل ثابت ہونگے اور یہ بھی انشاء اللہ تیمناً اور تبرکاً کہہ رہا ہوں نہ کہ شکاً اور تعلیقاً۔ جس وقت اہل حدیث کے جوابات کا عبارات فقہاء سے مقابلہ ہوگا تو اہل فہم اس وقت یہ شعر پڑھیں گے۔

ناز را روئے بباید ہمچو ورد ورنہ داری گرد بدخوئی مگرد

آج کل کے علماء کا جو حال ہے وہ ظاہر ہے لہٰذا اگر ہر ایک کو اجتہاد کی اجازت دے دی جائے تو ہر شخص کا ایک نیا مذہب اور نیا دین ہوگا اور اصل دین ندارد ہوجائے گا۔ احتیاط کا مقتضیٰ یہی ہے کہ مجتہدین سلف ہی کا اتباع کیا جائے اس لئے کہ ان کا علم اور فہم اور تقویٰ اور دیانت امت میں مسلم ہوچکی ہے بالفرض اگر ان حضرات کا فہم وفراست مسلم بھی نہ ہو تو کیا معاذ اللہ ابوحنیفہ اور مالک۔ آج کل کے اہلحدیث سے بھی گئے گذرے ہوئے تھے۔ استغفر اللہ ولاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ الغرض جب اجتہاد اور استنباط کی قوت نہ ہو تو تقلید لابد ہے۔ الفاظ میں بخاری اور مسلم کی تقلید کی جاتی ہے اور معانی میں ابوحنیفہ اور مالک کی تقلید کی جاتی ہے حالانکہ قرآن اور حدیث میں نہ بخاری اور مسلم کے نام کی تصریح ہے اور نہ ابوحنیفہ اور مالک کے نام کی پھر کیا وجہ ہے کہ فقہاء کی تقلید تو شرک ہوجائے اور محدثین کی تقلید عین توحید کہلائے مقلدین اور غیر مقلدین میں فرق یہ ہے کہ غیر مقلدین نے صرف الفاظ میں سلف کی تقلید کی اور معانی میں مجتہد اور مختار بن گئے کہ معنی جو چاہیں اپنی طرف سے لگائیں چاہے اصول شریعت اور قواعد ملت کے موافق ہوں یا خلاف۔ اور مقلدین معانی میں بھی سلف صالحین کے مقلد ہیں لفظاً اور معنیً دونوں ہی میں سلف کا اتباع ضروری سمجھتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ اَحْسَنَ الْکَلَامِ کَلَامُ اللّٰہِ

جامعیت قرآن حکیم اور تکمیل دین کا مفہوم

ازجناب مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ — آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کردیا
وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ — اور میں نے تم پر اپنا پورا پورا انعام کردیا اور میں نے اسلام
وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (مائدہ) — کو تمہارے دین بننے کے لئے پسند کرلیا۔

آیت مذکورہ فی الحقیقت دریائے معانی کے چند قطروں میں سے ایک قطرہ ہے یہ ایسا کلام ہے کہ اس کو نہایت کھلا اور آسان بھی کہہ سکتے ہیں اور نہایت چھپا اور مشکل بھی۔ اگر ایک طرف معانی اور حکمتوں کا بے پایاں سمندر ہے تو دوسری طرف اس کی سادگی کا یہ عالم ہے کہ عرب کے ان پڑھ بدو تک اس کو سن کر سیدھا سادا مطلب سمجھ جاتے تھے۔ خواص صحابہ جو اعلیٰ فہم و فراست کے مالک تھے اور اسلام کے زندہ نمونہ کو دن رات دیکھتے رہتے تھے ان کو ایک ایک سورۃ کے مطالب پر برسوں غور کرنے کے بعد اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ وہ اس بحر ناپیدا کنار کے احاطہ سے عاجز ہیں سطح سے دیکھئے تو ایک نظر میں سب دیکھ سکتے ہیں مگر تفصیل کے ساتھ اس کی گہرائیوں کو ناپنا چاہو تو جس قدر گہرائی میں جاؤ گے اس سے آگے اور گہرائیاں ملتی چلی جائینگی

غرض اس وقت مسلمان ہی وہ خوش قسمت لوگ ہیں جن کے پاس اللہ کا کلام بالکل محفوظ از تحریفات سے پاک، ٹھیک ٹھیک انہی الفاظ میں موجود ہے جن الفاظ میں وہ اللہ کے رسول برحق پر اترا تھا اور دنیا میں اس وقت مسلمان ہی وہ بدقسمت لوگ ہیں جو اپنے پاس اللہ کا کلام رکھتے ہیں اور پھر بھی اس کی برکتوں اور بے حد و حساب نعمتوں سے محروم ہیں۔ قرآن ان کے پاس اس لئے بھیجا گیا تھا کہ اس کو پڑھیں، سمجھیں، اس کے مطابق عمل کریں اور اس کو لے کر خدا کی زمین پر خدائی قانون کی حکومت قائم کردیں۔ تاریخ گواہ ہے

کہ جب انھوں نے اس کی ہدایت کے مطابق عمل کیا تو اس نے ان کو دنیا کا امام اور پیشوا بنا کر بھی دکھا دیا۔ قرآن حکیم خیر کا سرچشمہ ہے۔ جتنی اور جیسی خیر تم اس سے مانگو گے یہ تمہیں دے گا تم اس سے محض جن بھوت بھگانا اور کھانسی بخار کا علاج اور مقدمہ کی کامیابی اور نوکری کا حصول اور ایسی ہی چھوٹی چھوٹی ذلیل بے حقیقت چیزیں مانگتے ہو تو یہی تمہیں ملیں گی اگر دنیا کی بادشاہی اور روئے زمین کی حکومت مانگو گے تو وہ بھی ملے گی اور اگر عرش الٰہی کے قریب پہونچنا چاہو گے تو یہ تمہیں وہاں بھی پہونچائے گا یہ تمہارے اپنے ظرف کی بات ہے کہ سمندر سے پانی کی دو بوندیں مانگتے ہو ورنہ سمندر تو دریا بخشنے کے لئے بھی تیار ہے اجتماعی ترقی کے علاوہ قرآن نے ذاتی اور انفرادی سربلندی بھی بخشی ہے عامر بن واثلہ ابی الطفیل سے روایت ہے کہ نافع بن عبدالحارث عمر بن الخطاب سے عسفان کے مقام پر ملے حضرت عمر نے ان کو مکہ کا امیر مقرر کیا تھا۔ پوچھا کہ اہل مکہ پر اپنی جگہ امارت پر کس کو چھوڑ کر آئے ہو نافع نے جواب دیا کہ ابن ابزی کو۔ خلیفہ دوم نے فرمایا کہ یہ ابن ابزی کون ہیں؟ نافع نے جواب دیا کہ ہمارے آزاد کردہ غلاموں میں سے ایک غلام ہیں حضرت عمرؓ نے فرمایا کیا تم اہل مکہ پر غلام کو امیر و حاکم کر آئے ہو؟ نافع نے جواب دیا کہ ہاں اس لئے کہ وہ کتاب اللہ کا قاری اور فرائض و علوم قرآنی کا عالم ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا ٹھیک ہے آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے "ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواما و یضع بہ آخرین"

چنانچہ استیعاب میں علامہ ابن عبدالبر کو عبدالرحمٰن ابن ابزی کے بارے میں یہ فقرہ لکھنا پڑا۔ و قال فیہ عمر بن الخطاب عبد الرحمٰن بن ابزی ممن رفعہ اللہ بالقرآن" حضرت عمر کا ارشاد ہے کہ عبدالرحمٰن بن ابزی ان لوگوں میں ہیں جن کو قرآن نے بلند مرتبہ پر پہونچایا۔ خوب سمجھ لیجئے کہ اللہ کا کلام انسان کے پاس اس لئے نہیں آتا کہ وہ بدبختی نکبت اور مصیبت میں مبتلا ہو۔ طٰہٰ ۰ مَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ۔ ترجمہ یہ ہے کہ اس واسطے نہیں اتارا ہم نے تجھ پر قرآن کہ تو محنت میں پڑے۔ فی الحقیقت قرآن محنت اور شقاء نہیں ہے رحمت اور نور ہے۔ سعادت اور نیک بختی کا سرچشمہ ہے شقاوت اور بدبختی کا ذریعہ نہیں ہے پس جو قوم خدا کی کتاب رکھتی ہو اور پھر بھی ذلیل و خوار ہو، محکوم و مغلوب ہو تو سمجھ لیجئے کہ وہ ضرور کتاب الٰہی پر ظلم کر رہی ہے نجات کی صورت صرف یہ ہے کہ اس کی کتاب کے ساتھ ظلم کرنا چھوڑ دیا جائے اور اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی جائے، مگر ہو کیا رہا ہے؟ ہو یہ رہا ہے کہ آج ہر جماعت انبیاء کے راستہ کو چھوڑ کر گمراہ قوموں کی راہوں کو اختیار کر چکی ہے۔ وضع و قطع، تراش و خراش، صورت و سیرت، تعلیم و تربیت، تہذیب و تمدن اخلاق و عادات رفتار و گفتار، تجارت و اقتصادی معاملات اور حکومت و سلطنت غرض زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا رخ قرآن اور

صاحب قرآن سے بالکل ہٹا ہوا ہے یہ زبان سے تو کہتے ہیں کہ منہ میرا کعبہ شریف کی طرف لیکن رفتار کی سمت لندن، پیرس، ماسکو، برلن اور نیویارک ہے " قاعدہ ہے جب کسی قوم کو اپنے نظام زندگی سے بے خبری اور علم سے بے بہرگی ہو جاتی ہے اور اپنے یقینیات و ایمانیات مشکوک ہو جاتے ہیں اور دوسری قوم کے رسم ورواج اور ظنیات دل میں گھر جاتے ہیں تو اس قوم کا ہیولی تبدیل ہو کر اوپر سے بظاہر وہی قوم معلوم ہوتی ہے لیکن اندر سے وہ دوسری قوم بن جاتی ہے بعینہٖ یہی حال مسلمانوں کا ہے آج گمراہ قوموں اور فرقوں کی ایجاد واختراع، دولت وطاقت حکومت وسلطنت کی ظاہری چمک دمک نے ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ ان کی عریانی و بے پردگی، ان کی نفس پرستی و ہوس ناکی وخود پسندی ان کے تکبر واستکبار، ان کے کفر وعصیاں کی ہر تصویر کر ہمارے دل کو پسند، ہمارے بچے جوان بوڑھے عورت اور مرد ہر ایک اسی کوشش میں ہے کہ ان گمراہ قوموں کے اس مشترک پیدا کردہ تہذیب وتمدن، طور وطریق، شکل ولباس، تعلیم وتربیت کی راہوں کی اقتدا کی تیز سے تیز دوڑ میں دوسروں سے آگے بڑھ جائے انا للہ الخ۔

خلاصہ یہ کہ دین کو مکمل کر دینے سے مراد ایک مستقل نظام فکر وعمل اور ایک مکمل نظام تہذیب وتمدن بنا دینا ہے جس میں زندگی کے جملہ مسائل کا جواب اصولاً یا تفصیلاً موجود ہو اور ہدایت ورہنمائی حاصل کرنے کے لئے کسی حال میں اس سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

مذکورہ بالا آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الخ ۱۰ھ ہجری میں "حجۃ الوداع" کے موقع پر عرفہ کے روز جمعہ کے دن عصر کے وقت نازل ہوئی جبکہ میدان عرفات میں نبی کریم صلعم کے اونٹنی کے گرد چالیس ہزار سے زاید قدوسیوں، اتقیا وابرار رضی اللہ عنہم کا مجمع کثیر تھا۔ اس کے بعد صرف اکیاسی روز حضور پرنور اس دنیا میں جلوہ افروز رہے۔

قرآن مجید شریعت کی پابندی پر زور دیتا ہے اور اتباع "ھوی" یعنی بدعات کی مذمت کرتا ہے

قرآن حکیم اتباع شریعت پر زور دیتا اور اتباع خواہشات وبدعات کی مذمت کرتا ہے اور دونوں کو ایک دوسرے کا مخالف قرار دیتا ہے راہِ ہدایت پکارتی ہے کہ اس راہ پر چلو راستہ یہ ہے مگر محدثات وبدعات اور خواہشات مچلنے لگتی ہیں، اور طرح طرح کی رکاوٹیں سامنے آتی ہیں

"ھدیٰ" ایک آسمانی آئین ہے اس کے اتباع اور پیروی کرنے اور مان لینے میں محکومیت کا داغ لگتا ہے اور "ھویٰ" اپنے ہی نفس کے جذبات ہیں اس کے مان لینے میں حاکمیت کا مزہ آتا ہے خواہشات اور اَھوٰی کا محرک چونکہ خود نفس انسانی ہے اس لئے وہ جسم انسانی میں جان کی طرح سرایت کئے ہوئے ہوتی ہے اس لئے ان کا خلاف اتنا ہی مشکل ہوتا ہے جتنا کہ جسم کو جان کا۔ اور جب کبھی ان پر قرآن و حدیث کا ملمع چڑھ جاتا ہے تو اب وہ "ھویٰ" یعنی بدعات و خواہشات ٹھیک "ھدیٰ" یعنی شریعت کی صورت نظر آنے لگتی ہے اور اس حد پر پہونچ کر انسان اپنے اندر اتنا سکون محسوس کرتا ہے کہ حق کی تلاش کا لفظ بھی سننا گوارہ نہیں کرتا اس لئے یہاں اب توبہ کی بھی امید نہیں رہتی۔ توبہ کی توفیق اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ قلب کا گوشہ ھویٰ یعنی بدعات و خواہشات مذمومہ سے خالی ہو۔ آیت ذیل میں اس کی جانب اشارہ ہے۔

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰہُ وَاَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمْعِہٖ وَقَلْبِہٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِہٖ غِشٰوَۃً فَمَنْ یَّھْدِیْہِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰہِ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ۔ (جاثیہ)

بھلا تونے اس کو دیکھا جس نے اپنا معبود بنا لیا اپنی خواہش کو اور اس کو گمراہ کر دیا اللہ نے علم ہوتے ہوئے اور مہر لگادی اس کے کان اور دل پر اور پیدا کر دیا اس کی آنکھ پر پردہ تو اس کو کون راہ پر لائے اللہ کے سوائے سو کیا تم سوچتے نہیں۔

سورہ جاثیہ کی اس آیت کو اوپر سے پڑھئے تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ اختلافات اور فرقہ وارانہ کشمکش کی موجودگی میں امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ بھی چاہئے کہ شریعت کے راستہ پر برابر مستقیم رہے کبھی بھول کر بھی جاہلوں اور نادانوں کی خواہشات پر نہ چلے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ ایسے لوگوں کی استعداد خراب ہے اور وہ اس قابل ہیں کہ سیدھی راہ سے بھٹکے پھریں۔ اللہ بھی اس کو اس کی اختیار کردہ گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے۔ پھر نہ کان نصیحت سنتے ہیں نہ دل سچی بات کو سمجھتا ہے نہ آنکھ سے بصیرت کی روشنی نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ جس کو اس کی کرتوت کی بدولت ایسی حالت پر پہونچا دے کون سی طاقت ہے جو اس کے بعد اسے راہ پر لے آئے۔

جاہلوں کی سب سے بڑی حجت یہ ہوتی ہے کہ جو کام باپ دادا سے ہوتا آیا ہے اسکے خلاف کیسے کریں سورہ مائدہ میں بتلایا گیا کہ اگر تمہارے اسلاف بے عقلی یا بے راہی سے قعر ہلاکت میں جا گرے ہوں کیا پھر بھی تم انھیں کی راہ چلو گے ؟ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ باپ کا حال معلوم ہو کہ حق کا تابع اور صاحب علم تھا اس کی راہ پکڑے نہیں تو عبث ہے ہر کسی کی اندھی تقلید جائز نہیں۔ اس

میں جاہل صوفیہ وغیرہ کے اس طریق کا ابطال اور رد ہے۔ کہ جب ان کے سامنے شریعت پیش کی جاتی ہے تو وہ اپنے مشایخ کے طریق سے تمسک کرتے ہیں۔ انھیں غور کرنا چاہیئے کہ اصل دعوت کیا ہے۔ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ۔ اصل دیکھا دعوت الی اللہ ہے اور یہی ہے جو ہدایت کی سیدھی راہ ہے۔ اس کے بعد فرمایا اگر لوگ اس پر بھی نہ مانیں اور جھگڑا کریں تو پھر اللہ پر معاملہ چھوڑ دینا چاہئے۔ وہ قیامت کے دن ان تمام نزاعات کا آخری فیصلہ کر دے گا۔ اگر پیروان مذاہب صرف اتنی سی بات سمجھ لیں کہ وَإِن جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ۔ اگر تجھ سے جھگڑنے لگیں تو تو کہہ اللہ بہتر جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔ تو مذہبی نزاع و منافرت کے سارے جھگڑے ختم ہو جائیں گے

نکتہ ہا ہست بسے محرم اسرار کجا است   سخنہا است اہل بصارت کہ اشارت داند

خلاصۂ بحث قرآن مجید

(۱) قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب، تحریف اور تبدیل سے پاک، سارے عالم کے لئے ہدایت اور فلاح کی ذمہ دار ہے۔

(۲) قرآن مجید وہی ہے جو آں حضرت صلعم پر نازل ہوا تھا اور جس کی ترتیب آں حضرت صلعم نے اپنے زمانہ حیات میں فرما کر صحابہ کو یاد کرا دیا تھا۔

(۳) جو قرآن مجید آج تیس پاروں میں ہے اور جس کے یاد رکھنے والے حفاظ ہزاروں لاکھوں موجود ہیں یہی قیامت تک کے لئے مکمل دستور ہے۔ جو سنہ ۱۰ ہجری حجۃ الوداع کے موقع پر جمعہ کے روز ۴۰ ہزار قدوسیوں، اتقیا و ابرار کے مجمع میں مکمل کر دیا گیا۔

(۴) قرآن مجید ایک لاکھ کی تعداد میں مصر، عراق، شام اور یمن وغیرہ کے اندر خلیفہ دوم کی وفات کے بعد بھیجا گیا اور پھیلا ہوا تھا۔

(۵) قرآن مجید ۲۳ سال کی مدت میں حسب ضرورت آں حضرت صلعم پر اتارا گیا۔

(۶) قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اس کی تعلیم کی ہمہ گیری پر مخالفین نے بھی شہادت دی اور مقابلہ میں ساری دنیا کو منہ کی کھانی پڑی

(۷) قرآن حکیم کا اولیں ترجمہ سندھ کے اندر سندی زبان میں راجہ مہردگ نے کرایا۔ (عجائب الہند)

(۸) قرآن کا پڑھنا پڑھانا اور تلاوت کرنا بڑے ثواب اور اجر کا کام ہے۔

(۹) باعمل حافظ قرآن اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں میں ہیں اور ہر حرف پر دس نیکیوں

کے پانے کے امیدوار ہیں ۔

(۱۰) قرآن کا شروع کرنا اور ختم کرنا افضل ترین عبادت ہے ۔

(۱۱) قرآن کے ختم پر دعائیں قبول ہوتی ہیں ۔

(۱۲) جس نے قرآن حفظ کیا اور یاد رکھا اس کی شان بلند ہوجاتی ہے اور برکت سے گھر والے بھی محروم نہیں رہتے ۔

(۱۳) قرآن مجید پر عمل نہ کرنے والا خدا کا دشمن ہے ۔ اور قیامت میں آں حضرت صلعم خدا کے حضور میں ایسے شخص کے خلاف احتجاج فرمائیں گے ۔

(۱۴) قرآن مجید بھلا دینے والا اندھا اٹھے گا ۔

(۱۵) قرآن مجید میں شفاء روحانی کے ساتھ شفاء جسمانی بھی ہے ۔ قرآن مجید ہی تمام احکامات اور عقائد کا سرچشمہ ہے ۔

(۱۶) علم قرآن اور فہم قرآن اللہ تعالیٰ کا بڑا عطیہ ہے ۔

(۱۷) جو قرآن مجید کو اپنا امام، ہادی اور شافع نہ بنائے گا وہ نجات سے محروم ہوجائے گا ۔

(۱۸) قرآن مجید کی خدمت جس طرح مردوں نے کی ہے اسی طرح عورتوں نے بھی کی ہے مردوں کی تعداد زیادہ ہے اور عورتوں کی کم ۔

(۱۹) تمام صوفیاء کا اتفاق ہے کہ سب سے بہتر اور افضل سماع قرآن کریم کا سماع ہے ۔

(۲۰) قرآن مجید کی تلاوت سے آنکھوں کی روشنی بڑھتی ہے (التبیان) حضرت خواجہ اجمیری کا بھی یہی قول ہے

(۲۱) قرآن مجید کی حفاظت اور نگہبانی اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ رکھی ہے ۔

(۲۲) قرآن مجید میں جہاں کہیں لفظ ھوی آیا ہے اس سے مراد بدعات اور محدثات ہیں جو اپنے ہی نفس کے جذبات ہیں ۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے رسول اور نبی آخرالزماں ہیں

ہندومت کی قدیم کتاب پُران کی پیشین گوئی

بھارت کے ۹ پنڈتوں کا اعلان حق

رسول عربی کی آمد کی خبر ہماری مذہبی کتابوں میں دی گئی ہے

سرکار مدینہ ہی وہ "کلکی اوتار" ہیں کہ کروڑوں ہندو آج تک جن کے منتظر ہیں

ثروت جمال اصمعی

اہل علم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ تمام قدیم آسمانی کتابوں اور مذہبی روایتوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں تشریف آوری کی خوش خبری دی جاتی رہی ہے حضورؐ کی ذات وصفات، آپ کی جائے پیدائش، خاندان، والدین، آپ کی تحریک کے مختلف مراحل اور بالآخر اس کی بھرپور کامیابی تک کے بارے میں واضح اشارے تمام قدیم کتب سماوی میں موجود ہیں یہی وجہ ہے کہ مکہ سے ہجرت کے بعد جب مدینہ کے یہودیوں کو رسول اللہؐ نے اسلام کی دعوت دی تو وہ اپنی نجی محفلوں میں کہا کرتے تھے کہ خدا کی قسم یہ وہی نبی آخرالزماں ہے جس کی آمد کی خبر ہماری کتابوں میں دی گئی ہے لیکن جب تک جان میں جان ہے ہم اسے مانیں گے نہیں کیونکہ اسے بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسماعیل میں سے اٹھایا گیا ہے یہودی علما کی اسی ذہنیت اور ہٹ دھرمی کا پردہ چاک کرتے ہوئے قرآن میں نبی کریمؐ سے مخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ یہ لوگ تمھیں اسی طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو۔ حقیقتاً بائیبل میں حضور کی دنیا میں آمد اور مشن کے بارے میں بڑی واضح تفصیلات تھیں لیکن آج کہیں بھی اصل بائیبل موجود نہیں، اس میں بے شمار تحریفیں ہو چکی ہیں اور آج اس کے ماننے والے بھی اس کی صحت کا دعوی نہیں کرسکتے۔ اس کے باوجود بائیبل کے موجودہ نسخوں میں بھی حضورؐ کی آمد کے واضح اشارے موجود ہیں

خصوصاً انجیل برنا باس میں تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی "محمدؐ" متعدد مقامات پر موجود ہے اور آپ کی ذات کے بارے میں ایسی درست تفصیلات ہیں کہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ دراصل حضرت عیسیٰؑ کا تو مشن ہی یہ تھا کہ ایک طرف شریعتِ موسوی کی تصدیق کریں اور دوسری طرف نبی آخر الزماں کی آمد کی خوشخبری دنیا کے لوگوں تک پہنچائیں۔

ہندومت یہودیت اور عیسائیت سے بھی کہیں زیادہ قدیم ہے حتیٰ کہ اس بات کا بھی کوئی اندازہ نہیں کہ اس کی ابتدا کب اور کس طرح ہوئی تھی۔ اس مذہب کی ابتدائی شخصیات پراسرار اور اوہام کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کی تعلیمات بھی وقت کی دستبرد کا شکار ہوگئی ہیں اور وہ کتابیں بھی جو ان شخصیتوں سے منسوب ہیں بہت سوں کی طبع آزمائی کا نشانہ بنی ہیں چنانچہ کوئی بھی صاحب علم ان کے مستند ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ اس کے باوجود ہزاروں سال پرانی ان کتابوں میں آج بھی، نبی آخر الزماں محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسی صاف اور صریح پیشین گوئیاں موجود ہیں جو کسی اور شخصیت پر چسپاں ہو ہی نہیں سکتیں۔

بھارت کے "ممتاز پنڈتوں" نے، حال ہی میں منظر عام پر آنے والی ایک کتاب "کلکی اوتار اور محمدؐ" میں اس حقیقت کا نہایت جرأت کے ساتھ برملا اعلان کیا ہے۔ کتاب کے مصنف پنڈت وید پرشاد اپادھیا (ایم اے) ہیں۔ آپ الہ آباد کی پریاگ یونیورسٹی میں سنسکرت کے ریسرچ اسکالر ہیں ان کی تحقیق پر آٹھ دوسرے ممتاز پنڈتوں نے نظر ثانی کی ہے اور پر زور تائیدی نوٹ لکھے ہیں واضح رہے کہ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق عالم انسانیت کے نجات دہندہ کی حیثیت سے کلکی اوتار دنیا میں آئیں گے، وہ تمام انسانوں کے لئے خدا کی طرف سے رہنما بنا کر بھیجے جائیں گے اور پوری دنیا میں ان کی وجہ سے عدل وانصاف کا دور دورہ ہوگا۔

ہندومت کے ان نو ممتاز علماء کا دعویٰ ہے کہ جو لوگ ابھی تک کلکی اوتار کی راہ دیکھ رہے ہیں وہ ایک ایسے انتظار کی زحمت میں مبتلا ہیں جو کبھی ختم نہ ہوگا۔ کیونکہ کلکی اوتار تو آج سے ۱۴ سو سال پہلے سرزمین عرب پر نمودار ہو کر اور بحسن وخوبی اپنا کام انجام دے کر دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں ان علماء کا دعویٰ ہے کہ کلکی اوتار اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم مختلف شخصیتیں نہیں، ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں اپنے اس دعوے کے ثبوت میں پنڈت وید پرشاد اور ان کے ساتھیوں نے ہندومت کی معتبر کتاب "پُران" کے بہت سے حوالے نقل کئے ہیں جن میں سے چند یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

کلکی اوتار عرب کی سرزمین پر عبداللہ اور آمنہ کے گھر میں پیدا ہونگے

۱۔ پُران میں کہا گیا ہے کہ کلکی اوتار خدا کے آخری پیغمبر ہوں گے جو تمام انسانی دنیا کی رہنمائی کیلئے بھیجے جائیں گے۔ فاضل مصنف اوران کے ساتھی کہتے ہیں کہ یہ بات صرف اور صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی صادق آتی ہے اور اسے مزید تقویت یوں ملتی ہے کہ پُران میں کلکی اوتار کی پیدائش کی جگہ، تاریخ اور وقت اوران کے والدین کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا ہے وہ سب کچھ پوری طرح نبی اکرم پر منطبق ہوتا ہے واضح رہے کہ اوتار اور پیغمبر ہم معنی الفاظ ہیں۔

۲۔ پران کی پیش گوئی کے مطابق کلکی اوتار سَنْمَل دیپ کے علاقے میں پیدا ہوں گے۔ یہ لفظ ہندومت کی قدیم کتابوں میں سرزمین عرب کے لئے استعمال ہوتا تھا پران میں پوری دنیا کو سات خطوں یا دیپوں میں تقسیم کیا گیا ہے مثلاً جمبودیپ، شارک دیپ، سَنمل دیپ وغیرہ اس تقسیم کے مطابق جزیرہ نمائے عرب سَنمل دیپ میں واقع ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہیں پیدا ہوئے۔

۳۔ پُران میں کلکی اوتار کے باپ کا نام وشنو بھگت درج ہے وشنو کے معنی اللہ اور خدا کے ہیں اور بھگت غلام، عبد یا بندے کو کہتے ہیں اس طرح وشنو بھگت کے معنی ہوئے خدا کا بندہ جسے عربی میں "عبداللہ" کہیں گے اور ٹھیک یہی رسالت مآبؐ کے والد محترم کا نام ہے۔

۴۔ کلکی اوتار کی ماں کا نام پُران میں "سوماتی" بتایا گیا ہے جس کے معنی شانتی کی جگہ یا جائے امن ہیں جسے عربی میں "آمنہ" کہیں گے اور ٹھیک یہی رسول خدا کی والدہ محترمہ کا اسم گرامی ہے۔

۵۔ پُران کے مطابق کلکی اوتار کی گذر بسر کھجوروں اور اناروں پر ہوگی اور وہ اپنے ساتھیوں کو گناہوں اور برائیوں سے پاک کریں گے یہ باتیں بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پوری طرح چسپاں ہوتی ہیں۔

۶۔ ہندومت کی مقدس کتاب کے مطابق کلکی اوتار جس گھر میں پیدا ہوں گے وہ اس علاقے کی سب سے زیادہ محترم اور معزز شخصیت کا گھر ہوگا۔ یہ پیش گوئی بھی رسول عربی پر پوری طرح صادق آتی ہے آپ مکہ معظمہ میں اپنے دادا حضرت عبدالمطلب کے گھر میں پیدا ہوئے جو خانہ کعبہ کے متولی ہونے کی حیثیت سے عالم عرب کی معزز ترین شخصیت تھے۔

پرسورام انھیں غار میں تعلیم دے گا

۷۔ کلکی اوتار کے بارے میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں غار میں تعلیم دیگا اور حضرت محمدؐ نے غار حرا میں بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ سے حقیقت کا علم حاصل کیا۔

۸۔ شیوا کی جانب سے کلکی اوتار کو ایک برق رفتار گھوڑا دیا جائے گا" اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے سفر معراج کے موقع پر "براق" کی شکل میں سواری مہیا کی۔

۹۔ کلکی اوتار اپنے ممتاز ترین چار پیرودں کی مدد سے شیطان کو شکست دیں گے" اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چار خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے تعاون سے سرزمین عرب سے شرک و بت پرستی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کرکے شیطان کو شکستِ فاش دے دی۔

۱۰۔ "کلکی کو فرشتوں کے ذریعے امداد مہیا کی ہو گی" اور جنگِ بدر میں واضح طور پر اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ اور ان کے ساتھیوں کی مدد کے لئے فرشتوں کے لشکر بھیجے جس کا ثبوت قرآن کی آیات سے ملتا ہے۔

۱۱۔ "حسن و وجاہت میں کلکی اوتار بے مثال ہوں گے" پران کی یہ پیش گوئی بھی نبی اکرمؐ پر پوری طرح صادق آتی ہے سیرت طیبہ کی کتابوں میں سراپائے مبارک کی تفصیل اس کا بین ثبوت ہے۔

۱۲۔ "کلکی اوتار کا جسم نہایت معطر اور خوشبو دار ہوگا" اور حضورِ اکرمؐ کے سیرت نگار لکھتے ہیں کہ آپ کا جسم حتیٰ کہ پسینہ تک مشک بو تھا۔

۱۳۔ "کلکی اوتار مہینے کی ۱۲ر تاریخ کو پیدا ہوں گے" اور رسولؐ خدا ماہِ ربیع الاول کی ۱۲ر تاریخ کو دنیا میں تشریف لائے۔

۱۴۔ "کلکی اوتار عمدہ شہسوار اور شمشیر زن ہوں گے" یہ بات بھی حضور اکرمؐ پر صادق آتی ہے۔

نبی آخر الزماںؐ کے بارے میں پنڈت وید پرشاد کی کتاب میں درج کی جانے والی بہت سی پیشگوئیوں میں سے یہ صرف چند ہیں اور ان کی بنا پر پنڈت وید پرشاد اور ان کے ساتھی علماء اور محققین پورے شرحِ صدر کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ..... "پران" میں کلکی اوتار کے نام سے جس ہستی کا ذکر ہے وہ پیغمبر عربی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور نہیں اس لئے جو لوگ اب تک پران کی پیش گوئی کے مطابق کلکی اوتار کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں انھیں اپنا نقطۂ نظر تبدیل کر لینا چاہئے۔

پنڈت وید پرشاد کی کتاب "کلکی اوتار اور محمد صاحب" کے اس تعارف کے بعد ریڈیئنس دہلی میں شائع ہونے والے مضمون کے مصنف جناب قائم رضوی مزید لکھتے ہیں کہ ۱۹۶۵ء میں انھیں انارکلی لاہور سے شائع ہونے والی "کالانکی اوتار" نامی ایک کتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں "پران" کے حوالے سے کلکی اوتار کے بارے میں اسی قسم کی تفصیلات دی گئی تھیں۔ اس کتاب سے ایک چھوٹا سا اقتباس درج ذیل ہے۔

در جگت گرو (سرورِ عالم) وشنو بھگت اور سومانی کے گھر میں پیر کے دن بیساکھ کی ۱۲ار
تاریخ کو طلوعِ آفتاب کے دو گھنٹے بعد پیدا ہوں گے ان کی پیدائش سے پہلے ہی انکے باپ
کا انتقال ہو چکا ہوگا اور ان کی ماں ان کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد دنیا سے رخصت ہو جائیگی
جگت گرو سنگل دیپ (سرزمین عرب) کی خاتون سے شادی کریں گے شادی کی تقریب میں
ان کے ایک چچا اور تین چچا زاد بھائی موجود ہوں گے۔ پرسورام (خدا) انھیں ایک غار میں
تعلیم دے گا غار سے واپسی پر وہ لوگوں میں اس علم کی تبلیغ کریں گے جو خدا نے انھیں دیا
ہوگا اس تبلیغ کے نتیجے میں ان کے رشتہ دار ان سے سخت ناراض ہوں گے انھیں شدید تکلیفیں
اور اذیتیں دی جائیں گی جس کی بنا پر وہ پہاڑ کی شمالی جانب کو "پرواز" کر جائیں گے لیکن
کچھ عرصے بعد تلوار کے ساتھ واپس آئیں گے اور شہر میں فاتحانہ داخل ہونگے جگت گرو کے پاس
روشنی سے زیادہ تیز رفتار ایک گھوڑا ہوگا جس کے اوپر بیٹھ کر وہ زمین اور سات آسمانوں
کی سیر کریں گے۔

جگت گرو روشنی سے زیادہ تیز رفتار گھوڑے پر سات آسمانوں کی سیر کرینگے

"پران" کا یہ اقتباس، محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک ایسا درست خاکہ ہے جسے پڑھنے کے بعد
یہ کہا ہی نہیں جا سکتا کہ ہزاروں سال پرانی اس کتاب کی یہ پیش گوئیاں نبی اکرمؐ کے سوا کسی اور شخصیت کے لئے
ہو سکتی ہیں "وشنو بھگت" دراصل عبداللہ کا اور "سومانی" "آمنہ" کا سنسکرت ترجمہ ہے۔ سنگل دیپ یعنی سرزمین
عرب کی خاتون سے مراد ام المومنین حضرت بی بی خدیجہؓ ہیں جن سے شادی کے موقع پر پران کی پیش گوئی کے مطابق
حضورؐ کے ایک چچا حضرت ابو طالب اور تین عم زاد حضرت عقیل، حضرت جعفر اور حضرت علیؓ موجود تھے مذکورہ غار
واضح طور پر حرا تھا یہ وہ غار ہے جہاں رسول خدا پر نزول وحی کا آغاز ہوا اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے نبی
امی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا انتظام فرمایا۔ پہاڑ کی شمالی جانب پرواز واضح طور پر ہجرت مدینہ کا اشارہ ہے
پھر تلوار کے ساتھ واپسی اور فاتحانہ شہر میں داخلہ فتح مکہ کی پیش گوئی ہے۔ روشنی سے زیادہ تیز رفتار گھوڑے
اور اس پر بیٹھ کر سات آسمانوں کی سیر، براق اور سفر معراج کی کھلی ہوئی پیش گوئی ہے۔ درج بالا اقتباس
میں حضورؐ کی پیدائش مہینے کی ۱۲ر تاریخ کو پیر کے دن طلوع آفتاب کے دو گھنٹے بعد بتائی گئی ہے جبکہ حضورؐ
طلوع آفتاب سے دو گھنٹے قبل دنیا میں تشریف لائے پیش گوئی اور واقعہ میں یہ اختلاف عرب اور ہندوستان
کے طلوع آفتاب کے اوقات میں فرق کی وجہ سے ہے۔ مشرق میں ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں سورج

پہلے طلوع ہوتا ہے اور عرب میں بعد میں چنانچہ مکہ کے وقت کے مطابق نبی اکرمؐ اگرچہ سورج نکلنے سے دو گھنٹے پہلے دنیا میں تشریف لائے لیکن ہندوستان کے بعض علاقوں میں اس وقت سورج کو طلوع ہوئے دو گھنٹے گذر چکے تھے۔

ہندو مت کے مستند عالموں اور محققوں کی طرف سے نبی اکرمؐ کی حقانیت و صداقت کا یہ اعتراف اور خود ہندو مت کی مذہبی کتابوں سے اس کے ناقابلِ تردید ثبوت و شواہد کی فراہمی اس حقیقت کا ایک بین اظہار ہے۔ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالم انسانیت کے قائد و راہبر ہیں اور ان ہی کی پیروی انسانیت کو ترقی و فلاح اور نجات و کامرانی کی حقیقی منزل تک پہنچا سکتی ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو پہلے ہی محمد عربیؐ کے امتی ہونے کی سعادت سے بہرہ مند ہیں بشرطیکہ وہ اپنی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھالیں جس کی تعلیم رسول خدا نے دی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر شاید اُن سے بڑھ کر بدنصیب بھی کوئی نہ ہو کہ جب وہ میدان حشر میں شفاعت کی امید لئے رحمت عالم کے پاس پہنچیں تو ان کی بے ایمانیوں اور سیاہ کاریوں کے سبب حضورؐ انہیں پہچاننے اور اپنا امتی تسلیم کرنے سے انکار کر دیں اور پھر ہمیشہ کا عذاب ان کا مقدر بنے۔

حضورؐ کی صداقت کا یہ اعتراف ہم مسلمانوں کے لئے ایک اور پہلو سے بھی نہایت اہم اور توجہ طلب ہے ایک مسلمان پر صرف اپنی ہی اصلاح کی ذمہ داری نہیں اس کے عقیدے کا تقاضا ہے کہ وہ دنیا کے تمام انسانوں کو حسب استطاعت نجات و فلاح کی راہ کی دعوت دے غیر مسلموں کی اپنی مذہبی کتابوں میں پیغمبر اسلام کے بارے میں ایسی پیش گوئیاں انھیں اسلام کی طرف راغب کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں لہٰذا ان انکشافات سے کام لے کر ان لوگوں کو بھی محمد عربی کی رسالت و قیادت قبول کرنے پر آمادہ کرنے کا کام کیا جانا چاہئے اور اس مقصد کے لئے مزید تحقیق جستجو بھی جاری رہنی چاہئے۔

(بقیہ صـ۳۶) بدایونی نے لکھا ہے کہ موصوف نے چالیس مرتبہ سے زیادہ۔ اس کتاب کو اول سے آخر تک پڑھایا تھا۔ بدایونی صـ۳۲۴

صحبت باقی | معقولاتی کتابوں کے اضافہ کا یہ پہلا دور تھا ــــ اس کے بعد لودیوں کی حکومت ختم ہو جاتی ہے ــــ بابر مغل حکومت کرتے ہیں ــــ (داستان شوق ابھی ناتمام ہے)

ربط کے لئے ماہ اگست کا شمارہ دیکھا جائے

درس نظامی اور ہمارے اسلاف

دوسری قسط

از مولانا عبدالستار صاحب قاسمی نائب مدیر شعبۂ عربی مرکز دعوت اسلام جمعیۃ علماء ہند دیوبند

عظیم المرتبت ہندوستان میں "نصاب تعلیم" کن کن مراحل سے گذرا، اگر اسے سردست جانے بھی دیں اور صرف مادر علمی دارالعلوم دیوبند ہی کے نصاب تعلیم کا اگر تاریخی جائزہ لیں تو معلوم ہوگا — کہ — ہمارے اسلاف ہم سے زیادہ حقیقت پسند اور زمانہ شناس تھے اور انھوں نے شروع ہی سے اس میں اصلاح و تبدیلی کی ضرورت شدت محسوس کی۔ غالباً نصاب میں سب سے پہلا تغیر سنہ ۱۲۸۵ھ میں ہوا۔ اس کے بعد سنہ [illegible] میں پھر سنہ ۱۲۹۰ھ اور پھر سنہ ۱۳۰۱ھ میں تغیرات ہوتے رہے اس کے بعد بھی اس میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے

دارالعلوم — یا — اسلام کا ایک قلعہ

اور جب دارالعلوم کے قیام کا اولین مقصد اس کے بانیین کے نزدیک — اسلام کا ایک قلعہ، اس کے داعیوں اور مجاہدوں کی تربیت کی ایک چھاؤنی اور سلطنت مغلیہ کے گل ہونے والے چراغ کا بدل بلکہ نعم البدل ہو، تو پھر محض چند غیر اساسی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے پر اصرار "هباءً منثوراً"، اور ایک "سوال بے معنی" بن کر رہ جاتا ہے

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی زید مجدہم نے ایک موقعہ پر فرمایا تھا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند کے حق میں ازالۂ حیثیت عرفی کا جرم ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ دارالعلوم چند مخصوص کتابوں کے پڑھنے پڑھانے اور درس و تدریس کے ایک مرکز کی حیثیت سے

قائم ہوا تھا، اس سے بڑھ کر اس کے بانیوں کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوسکتی .. ایسا کہنے والوں کو ان بزرگوں کی روحوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا، جس وقت یہ کہا جاتا تھا کہ یہ محض ایک مدرسہ ہے تو حضرت شیخ الہندؒ تڑپ اٹھتے تھے، ان کے نزدیک یہ اسلام کا ایک قلعہ، اس کے داعیوں اور مجاہدوں کی تربیت کی ایک چھاؤنی .. اور سلطنت مغلیہ کے گل ہونے والے چراغ کا بدل بلکہ نعم البدل تھا۔

(عصر جدید کا چیلنج اور اس کا جواب ص ۱۶)

طرۂ امتیاز

دارالعلوم کا سب سے بڑا طرۂ امتیاز موصوف ہی کے الفاظ میں یہ ہے :

جس امتیاز پر آپ کے دارالعلوم کی بنیاد پڑی اور جو اس کا حقیقی سنگ بنیاد ہے وہ دین کی محبت اور اسلام کی حفاظت کا جذبہ تھا ـــــ یہی ہے اس دارالعلوم کا سب سے بڑا طرۂ امتیاز

(ایضاً ص ۱۲)

اسلام کی حفاظت کا ہی وہ جذبہ صادق تھا، جو ہمارے اسلاف کو ہر وقت بے کل بنائے رکھتا ہے .. ان کے سامنے محض چند درسی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے کا مسئلہ کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا .. ان کی دھن اور شبانہ روز تگ و دو اور جانفشانی کا مقصود تھا تو یہی کہ کس طرح اسلام کے جاں نثار سپاہی، اس چھاؤنی میں تیار ہوں۔

اب ناگزیر تھا کہ ان سپاہیوں کے "تربیتی کورس" میں وقتاً فوقتاً، دور حاضر کی ضرورتوں کے موافق تراش خراش اور اصلاح و ترمیم کا پروگرام جاری ہو .. چنانچہ ان باصفا بزرگوں نے ہمیشہ اس ضرورت کا شدت سے احساس کیا .. اس لئے کہ ان کا ہاتھ اور ان کی انگلیاں زمانہ کی اور ملت کی نبض پر رہتی تھیں۔

نصاب میں تبدیلی کا فیصلہ

ملاحظہ ہو آج سے تقریباً بیالیس سال پہلے، ہمارے اسلاف کی ایک بڑی تعداد، جس نے اس درس نظامی کو پڑھ کر علمی رسوخ و کمال حاصل کیا تھا، نہایت غور و فکر اور سنجیدگی کے ساتھ، دوسرے ہزاروں علماء و فضلاء کی مکمل تائید کے ساتھ یہ فیصلہ کرتی ہے کہ: " یہ اجلاس مدارس عربیہ دینیہ کے مروجہ نصاب میں دور حاضر کی ضرورتوں کے موافق اصلاح و تبدیلی کی ضرورت شدت سے محسوس کرتا ہے اور مدارس عربیہ کے ذمہ دار حضرات اور تعلیمی جماعتوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ ماہرین تعلیم کی ایک کمیٹی اس پر غور کرنے کے لئے باہمی مشورہ اور تعاون سے مقرر کر کے ایک ایسا نصاب تعلیم مرتب کرائیں جو دینی علوم کی تکمیل کے ساتھ، ضروریات عصریہ میں بھی مہارت پیدا

کرنے کا کفیل ہو۔" (منظور شدہ تجویز اجلاس جمعیتہ علماء ہند لاہور سال ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۹۴۲ء)

اک تلخ حقیقت

اور یہ ایک حقیقت ہے کہ:

"مدارس عربیہ دینیہ میں اس وقت جو نصاب تعلیم رائج ہے، حدیث و فقہ کی چند کتابوں کو مستثنیٰ کرنے کے بعد، زیادہ تر ساتویں صدی ہجری اور اس کے بعد کے قرون کی یادگار ہے۔ جہاں سے صحیح معنوں میں علمی انحطاط کا دور شروع ہو چکا تھا۔ قدماء امت کی وہ تالیفات جن میں علم کی روح موجود تھی، عبارت سلیس و شگفتہ، مسائل و قواعد واضح، جن میں نہ عبارتی تعقیدات تھیں نہ دور از کار ابہامات، جن کے پڑھنے سے صحیح معنی میں دل و دماغ متاثر ہو سکتے تھے نہ وقت ضائع ہوتا تھا، نہ دماغ پر بوجھ کا خطرہ ہوتا تھا، ان کی جگہ ایسی کتابیں تصنیف ہوئیں، جن میں زیادہ کمال اختصار نویسی کو سمجھا گیا، زیادہ زور لفظی بحثوں میں دیا گیا، لفظی موشگافیاں شروع ہوئیں۔ یوں اگر کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ کاغذ تو کم خرچ کیا گیا لیکن وقت اور دماغ کو اس کے او بر زیادہ صرف کیا گیا، بڑا کمال یہی سمجھا گیا کہ عبارت ایسی دقیق اور غامض ہو جس کے لئے شرح و حاشیہ کی ضرورت ہو، کئی کئی توجیہات کے بغیر حل نہ ہو، آخر یہ علمی عیاشی نہیں تو اور کیا ہے، میرے ناقص خیال میں یہ علم کا سب سے بڑا فتنہ تھا جس سے علوم اور اسلامی معارف کو بڑا نقصان پہنچا۔ (مدارس عربیہ کا نظام و نصاب تعلیم از حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری)

نصاب تعلیم اور تاریخ کے تھپیڑے

آئیے ہم قدرے تفصیل کے ساتھ بتائیں کہ ہندوستان میں نصاب تعلیم کن کن مراحل سے گذرا، مختلف ادوار میں اس میں کیا کیا تغیرات ہوتے رہے اور وہ انقلابات زمانہ کی کن کن بھٹیوں سے گذر کر ہمارے پاس پہونچا ہے۔۔ اس سلسلہ میں ہمارا اتمام تر ماخذ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رح کی مایہ ناز کتاب "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" جلد اول ہے۔۔ کہیں کہیں اختصار کے پیش نظر مولانا کے کئی کئی صفحے کی عبارت کو چند سطروں میں سمیٹنے کی کوشش بھی کی ہے ۔ اس التزام کے ساتھ کہ نفس مضمون میں کوئی کتر بیونت یا "فتربو" نہ ہونے پائے۔

ہندوستان میں نصاب کی بسم اللہ

اب سنئے مولانا رقم طراز ہیں:

جس زمانہ میں ہم اس ملک میں آئے ہیں، اس وقت جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے، مسلمانوں نے اس ملک میں پہونچ کر تعلیم کا جو طریقہ اختیار کیا اس میں بچوں کو سب دستور پہلے قرآن ناظرہ پڑھا لیا جاتا تھا، قرآن پڑھانے والے معلموں کو عموماً "مقری" کہتے تھے جو باضابطہ فن قرأت سے واقف ہوتے تھے۔۔

قرآن کے بعد ظاہر ہے کہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق فارسی کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں فارسی اور فارسی کتابوں کا مذاق مسلمانوں پر کتنا غالب تھا، اس تاریخی لطیفہ سے اس کا پتہ چل سکتا ہے:

اک دلچسپ تماشہ طباطبائی صاحب سیرالمتاخرین نے بنگالہ کے بازیگروں کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ دلی میں آکر جو تماشے ان بازیگروں نے دکھائے ان میں ایک دلچسپ تماشہ یہ بھی تھا:

"کلیات سعدی شیرازی آوردند بکیسہ گذاشتہ، چو برآوردند دیوان حافظ برآمد، آں راچوں بکیسہ بردند دیوان سلمان ساوجی برآمد بازچوں کیسہ نمودند دیوان انوری ہم چناں چندمرتبہ کتاب را درکیسہ کردند و ہرمرتبہ کتاب دیگر برآوردند سیرالمتاخرین ص۲۴۵ جلد اول

کلیات سعدی شیرازی لاتے اور اسے تھیلے میں ڈالتے، پھر جب نکالتے دیوان حافظ نکلتا، پھر تھیلے میں ڈالتے اور نکالتے تو دیوان سلمان ساوجی نکلتا، پھر تھیلے میں ڈالتے تو دیوان انوری۔۔ ایسے ہی چندمرتبہ کتاب تھیلے میں ڈالتے اور نکالتے اور ہرمرتبہ ایک دوسری کتاب نکلتی۔ ۔

نظام تعلیم و تربیت خلاصہ ص۱۸۳ تا ۱۸۶

سوچا جاسکتا ہے جس دور میں بازیگر بھی بازیگری میں سعدی وحافظ، سلمان ساوجی، اور انوری کے دواوین وکلیات ہی دکھایا کرتے تھے اس وقت عام پبلک پر فارسی کی ان کتابوں کا کیا اثر ہوگا

نصاب کے اجزاء بہرحال تعلیم کی ایک منزل تو فارسی ہی کی کتابوں پر ختم ہوجاتی تھی، اور اگرچہ صرف اسی تعلیم کا اثر بھی بہتوں پر یہ پڑتا تھا کہ وہ تھوڑی بہت عربی ضرور سیکھ لیتے تھے لیکن پھر بھی وہ دانشمند، یا مولوی یا ملا تا ملانا، وغیرہ الفاظ کے مستحق نہیں قرار پاتے تھے اس کے بعد دوسری منزل شروع ہوتی تھی یعنی باضابطہ عربی زبان میں عربی اور اسلامی علوم کے سیکھنے کا مرحلہ پیش آتا تھا۔

گویا یہ ایک درجہ ـــــ "علم ضروری کا تھا، جس کو ختم کئے بغیر کوئی مولوی جسے اس زمانہ میں "دانشمند" کہتے تھے ـــــ کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا تھا۔

درجہ "دانشمندی" میں مندرجہ ذیل کتابوں کا پڑھا دینا کافی سمجھا جاتا تھا۔

علم صرف میں میزان الصرف
علم نحو میں کافیہ ومفصل
اور فقہ میں قدوری اور مجمع البحرین[1]

[1] مجمع البحرین بڑی مشہور کتاب کی تمام مقام تھی، یہ ابن الساعاتی کی مشہور کتاب ہے۔ ۱۲ منہ

غور کیا جاسکتا ہے کہ اس درجہ تک ہمارے نصاب میں، اس زمانہ کی حد تک نہ منطق کی کوئی کتاب تھی اور نہ فلسفہ کی ـــــــــ ہاں اس کے بعد "فضل" (فاضل) کا درجہ شروع ہوتا تھا، کبھی کبھی ملا عبد القادر وغیرہ اس درجہ کی کتابوں کو کتب منتہیانہ بھی کہتے ہیں۔

عالم فاضل کا کورس

درجہ فضل (فاضل) کی کتابیں بھی ملاحظہ ہوں:

فقہ میں ہدایہ [۱]

اصول فقہ میں حسامی اور اس کی شرح غایۃ التحقیق، اصول بزدوی، المنار اور اس کی شرح

تفسیر میں اس درجہ کی لازمی کتاب صرف کشاف [۲]

حدیث میں مشارق الانوار . . اور مصابیح

فن معانی و بیان میں سکاکی کی مفتاح العلوم اور کچھ دوسری کتابیں جن کی تفصیل کا پتہ نہیں چلتا [۳]

فن ادب میں صرف مقامات حریری (ایضاً۔ خلاصہ ص۱۸۳ تا ۱۹۷)

حضرت مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مطالعہ کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"بہرحال اس زمانہ کے "ضروری" اور نصاب فضل (فاضل) دونوں کے متعلق جہاں تک میری جستجو کا تعلق ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر و حدیث، فقہ، اصول فقہ کی دینیات میں، اور نحو و صرف، ب معانی، بیان وغیرہ کی عربیت کے سلسلہ میں تعلیم ہوتی تھی، معقولات کا ان صدیوں میں یعنی ساتویں اور آٹھویں صدی میں پتہ بھی نہیں چلتا، انتہا یہ کہ منطق و فلسفہ، ریاضی وغیرہ تو دور کی چیزیں ہیں، علم کلام تک کی کتابوں کا ذکر عام علماء کے تدریسی نظام میں نہیں ملتا۔

---

[۱] ممکن ہے کہ ہدایہ کے ساتھ بعض دوسرے متون بھی پڑھائے جاتے ہوں ۱۲ منہ

[۲] بعض علماء کے تذکروں میں مدارک کا بھی ذکر ملتا ہے . . یوں تفسیر کی دوسری کتابیں، مثلاً "ایجاز" "عمدہ" تفسیر نیشاپوری، تفسیر عرائس البیان، تفسیر ناصری، تفسیر زاہدی یہ سب کتابیں بکثرت علماء کے زیر نظر تھیں ۱۲ منہ

[۳] نحو و صرف کے سوا، علوم آلیہ میں معانی و بیان، بدیع، عروض و قوافی کی کتابوں کے ساتھ ادب کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، عام طور پر ان کو علوم عربیت "یا" لغت "ہی کہتے تھے، افسوس ہے کہ ان علوم کی کتابیں جو اس عہد میں زیر درس تھیں تفصیل سے ان کا پتہ نہیں چلتا، البتہ مولانا معین الدین عمرانی کے ذکر میں یہ مضمون موجود ہے کہ انھوں نے سکاکی کی مفتاح العلوم پر شرح لکھی تھی، بظاہر قیاس یہی ہوتا ہے کہ یہی کتاب معانی، بیان و بدیع میں پڑھائی جاتی ہوگی۔ تفتازانی کی دونوں کتابیں، مختصر و مطول بعد کو ہندوستان پہونچیں، اسی طرح ادب میں صرف ان مقامات حریری کا پتہ چلتا ہے ۱۲ منہ

نصاب کروٹ بدلتا ہے

البتہ آٹھویں صدی جب ختم ہو رہی تھی اور دلی میں لودیوں کے آہنی پنجوں نے پھر ایک مرکزی حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی، تو اس خاندان کے دوسرے بادشاہ سلطان سکندر لودی کے عہد میں جو ایک خاص تعلیمی انقلاب ہوا، اس کے بارے میں کتابوں کا کہنا یہ ہے کہ:

"قبل ازیں بغیر از شرح شمسیہ و شرح صحائف از منطق و کلام در ہند شائع نبود (بدایونی ص ۳۲۴)"

ہندوستان میں۔ اس عہد سے قبل منطق و کلام کے موضوع پر سوائے شرح شمسیہ اور شرح صحائف کے کوئی دوسری کتاب مروج نہ تھی۔

سکندر لودی ۸۹۴ھ میں تخت نشین ہوا، یعنی نویں صدی گویا گذر رہی تھی، اس وقت تک یہاں کے نصاب میں منطق اور کلام دونوں علوم کا سرمایہ لے دیکر "شرح شمسیہ" اور "شرح صحائف" پر ختم ہو جاتا تھا شرح شمسیہ (قطبی) کو خیر سب جانتے ہی ہیں، لیکن یہ شرح صحائف کوئی اتنی ہی معمولی کتاب ہے کہ حاشی کبری زادہ نے اس شرح کا ذکر ہی نہیں کیا ہے، صحائف کے متن کے متعلق لکھا ہے "الصحائف لِلسَّمَرْقَنْدِيُ لَمْ اَقِفْ عَلٰى تَرْجَمَتِہٖ" (ص ۲۹) [1] "صحائف" سمرقندی کی کتاب ہے میں سمرقندی کے حالات سے مطلع نہ ہوسکا (نظام تعلیم و تربیت خلاصہ ص ۱۹۶ و ۱۹۸)

معقولات کی چاشنی

آگے چل کر مولانا پورے جزم کے ساتھ فرماتے ہیں:

بہرحال، نصاب کی حد تک تو میرا دعوی ہے کہ نہ صرف "ضروری" بلکہ "فضل" "فاضل" کے درجوں میں بھی ــ اس وقت تک ــ معقولات کا عنصر صرف قطبی اور شرح صحائف تک محدود تھا۔ یعنی لازمی طور پر اس نصاب کے ختم کرنے والوں کو معقولات کی جن کتابوں کا پڑھنا ضروری تھا وہ صرف یہ تھیں، لیکن جو لوگ خاص فن یا شعبۂ زندگی میں ترقی کرنا چاہتے تھے، ان کے لئے راستہ بند نہ تھا (ایضاً ص)

اس طرح سکندر لودی کی تخت نشینی (۸۹۴ھ) تک، تقریباً دو سو سال تک منطق و کلام کی مقدار ہمارے نصاب میں یہی قطبی و شرح صحائف کی حد تک تھی (ص ۲۴۶) سکندر کے زمانہ میں کن کن پہلوؤں سے کیا کیا نئی نئی باتیں پیدا ہوئیں، کن کن چیزوں میں کیا کیا۔ انقلابات ہوئے، اس وقت ان کی تفصیل میرے سامنے نہیں ہے، بلکہ "تعلیمی نصاب" میں جو انقلاب پیدا ہوا صرف اسی کو ظاہر کرنا ہے

انقلاب ... اور اس کے ہیرو

واقعہ یہ ہے کہ دلی میں ارباب علم و فضل کا عہد سکندری میں

---

[1] کتاب میں اس موقعہ پر "لم اقفہ" کا لفظ لکھا ہوا ہے.. جو یقیناً حضرت کاتب کا کرشمہ معلوم ہوتا ہے (عبدالستار اسلام)

غیر معمولی مجمع اکٹھا ہوگیا تھا، اُن ہی میں دو بھائی شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ بھی تھے، دراصل یہ دونوں حضرات ملتان کے علاقہ "تلبن" نامی کسی قصبے کے رہنے والے تھے، جو شاید اب کوئی غیر معروف گاؤں ہے، ان دونوں حضرات کو فن تدریسی میں کمال حاصل تھا، شیخ عبداللہ کو تو سکندر نے دلی ہی میں رکھ لیا اور مولانا عزیز اللہ، سنبھل (مراد آباد) روانہ کر دیئے گئے جو اس زمانہ میں اس علاقہ کا مرکزی شہر تھا۔ (ص ۲۴۸ ۱ھ)

اور (واقعات کے تتبع سے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عہد سکندری کے اد دونوں بزرگوں پر اس زمانہ کے درس و تدریس کا سلسلہ ختم ہوتا تھا۔ (ص ۲۵۰)

اب سنئے، بالاتفاق ہمارے تعلیمی مورخین کا یہ بیان ہے کہ:

"ایں ہر دو عزیز (شیخ عبداللہ و عزیز اللہ) ہنگام خرابی ملتان در ہندوستان آمدہ، علم معقول را دریں دیار رواج دادند" بدایونی ص ۳۲۳

"یہ دونوں عزیز (عبداللہ و عزیز اللہ) ملتان کی ویرانی کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور علم معقول کو یہاں رواج دیا۔

تصدیق مزید مولانا غلام علی آزاد نے بھی اس کی تصدیق کی ہے فرماتے ہیں:

از خرابی ملتان او و شیخ عزیز اللہ تلبنی رخت بدار الخلافہ دہلی کشیدند و علم معقول را دریں دیار مروج ساختند۔ مآثر ص ۱۹۱

ورنہ اس سے پہلے ان ہی مؤرخین کی یہ اتفاقی شہادت آپ کے سامنے آچکی ہے کہ:

قبل ازیں بغیر از شرح شمسیہ (یعنی قطبی) و شرح صحائف از علم منطق و کلام در ہند شائع نبود (بدایونی ص ۳۲۴، مآثر ص ۱۹۱)

جس کے یہی معنی ہوئے کہ علم معقول کی کتابوں کی زیادتی کا دور دورہ اسی زمانہ کے بعد شروع ہوا۔ (نظام تعلیم و تربیت ص ۲۵۲)

خیال ہے کہ شرح مطالع، شرح حکمت العین اور شرح مواقف جیسی کتابیں اس وقت یہاں کے نصاب میں شریک ہوئی ہوں گی (ایضاً ص ۲۵۴)

مولانا نے لکھا ہے کہ علامہ تفتازانی کی کتابیں بھی اسی زمانہ میں شریک درس ہوئی ہوں تو کچھ تعجب نہیں تفتازانی کی کتاب "مطول" کا نام سب سے پہلے مجھے شیخ عزیز اللہ کے شاگرد رشید میاں حاتم سنبھلی کے تذکرہ میں ملا (باقی ص ۲۹ پر)

۱ھ شاہ عزیز اللہ کا مزار آج بھی سنبھل کے محلہ کٹرہ میاں سرائے میں موجود ہے اور عوام میں شاہ عزیز اللہ بزرگ کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ واللہ اعلم عند اللہ (عبدالستار، سلام)

عربی ادب اور قرآن مجید

ڈاکٹر محمد یوسف خاں شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ادب علوم و فنون کی روح ہماری زندگیوں کا ماحصل ہے ہمارے جذبات اور افکار و احساسات کا خلاصہ اور انسانی عقول اور قلوب و اجسام پر حکمرانی کرنے کا ایک مؤثر طریقہ ہے۔ ادب ایک مؤثر قوت ہے جو اخلاق و عادات کو اپنے مطابق ڈھال لیتی ہے ادب ایک موسیقی ہے جو اپنے ساز کی تاثیر سے قوموں کو مست خرام اور مائل بعمل رکھتی ہے۔ ادب ایک صیقل ہے جس کے ذریعہ قوموں کے دلوں اور ان کے اخلاق کو مانجھا جاتا ہے۔

ادب بہترین الفاظ اور شگفتہ اسلوب میں مافی الضمیر کے اظہار کا نام ہے۔ تاکہ اس کے واسطے معانی براہ راست سامع یا قارئین کے دل میں ڈال دیئے جائیں۔ ادب کی اسی اثر آفرینی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ "ان من البیان لسحرا وان من الشعر لحکمۃ"

ادب اپنے زمانہ کی پوری تصویر اور صحیح تاریخ ہوتا ہے آپ کسی دور کا ادب پڑھ کر اس عہد کے لوگوں کے اعتقاد، علمی سطح اور عملی قوتوں کا پورا پورا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ادب کی دو قسمیں

ادب میں انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ انسانوں کے جذبات و احساسات، میلانات و عواطف بدلتے رہتے ہیں جو اپنے ساتھ نئے نئے تقاضے پیدا کرتے ہیں۔ ان جذبات و احساسات کے تحت پیدا ہونے والے مختلف تقاضوں کی مؤثر تفسیر ادب کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ انسانوں کے جذبات و میلانات کبھی بلند ہوتے ہیں اور کبھی پست، انسانیت کے احساسات و مقتضیات کبھی عالیہ ہوتے ہیں اور کبھی سافلہ لہٰذا ادب کے

بھی دو حصے ہو جاتے ہیں۔ جو ادب مقتضیات عالیہ کی ترجمانی کرتا ہے وہ ادب عالی ہے۔ اور جو احتیاجات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ادب سافل کہلائے گا۔ تو ادب کامل وہی ہوگا جو تمام مقتضیات انسانی کو پورا کر رہا ہو۔ ادب کی اس تعریف کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم کسی زبان کے ادب کا مطالعہ کریں گے تو ہمیں اس کی شاعری اور نثر میں متنوع مضامین۔ اختلاف آرا۔ و افکار، احساسات و جذبات دیکھنے پر تناقض و تضاد نظر آئے گا۔

عربی ادب پر خدا کی عنایت خصوصی

عربی زبان اور اس کے ادب کا مطالعہ کرنے سے یہ بات کھل کر واضح ہو جاتی ہے کہ اس زبان و ادب پر اللہ کی خاص عنایت رہی ہے۔ خدا جب کسی انسان کو نبوت دیتا ہے تو اس کی ایک خاص انداز اور مخصوص ماحول میں نشو و نما کرتا ہے۔ اسی طرح جب اس نے عربی زبان کو اپنے آخری پیغام ہدایت کے لئے چنا۔ تو اس کو ابتدا ہی سے ایک الگ انداز سے اپنی نگرانی و حفاظت میں پروان چڑھایا۔ اور جب اس زبان کا ادب اس معیار و مقام پر پہونچ گیا کہ کلام خداوندی کا متحمل ہو سکے تو اس میں قرآن مجید نازل کیا۔ جو ادب عربی کا اعلیٰ و مکمل نمونہ ہے۔

قرآن مجید عربی ادب کی بلند ترین مثالی کتاب

قرآن مجید نے ادب میں حریت، فکر و وسعت نظر، پاکیزگی تخیل، بلند معانی پیدا کئے۔ ادب عربی قرآن پاک کے نزول سے قبل لفظی حسن و شوکت کے ساتھ بیشتر جذبات سافلہ کی ترجمانی میں لگا ہوا تھا۔ قرآن پاک نے آکر ادب عربی کو لفظی و معنوی حسن کے ساتھ جذبات عالیہ کی ترجمانی کے آداب سکھائے۔ اور یہ قرآن مجید ہی کی تعلیم کا فیضان ہے کہ آج عربی ادب تمام دنیا کے علوم و افکار سے بھرا پڑا ہے۔ میری نظر میں عربی ادب و زبان کا محور قرآن مجید ہے۔ زمانہ جاہلیت میں یہ زبان قرآن مجید کو اپنے اندر لینے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ مگر قرآن مجید کے نزول کے بعد یہ اسی کی خادم بن گئی۔

اسی طرح صرف، نحو، معانی، بیان، لغت و تفسیر، حدیث و فقہ، علم کلام، سب ہی قرآن مجید کے معانی و مطالب حل کرنے کے لئے وجود میں آئے۔ حتیٰ کہ جب عربوں نے تاریخ و جغرافیہ و دیگر علوم کو اپنائے۔ تو وہ بھی قرآن مجید کے احکام و ہدایات کو سمجھنے اور ان پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی ایک کوشش تھی تاریخ ادب عربی کا مطالعہ کرنے والا دیکھے گا کہ زبان عرب جس نازک ترین مرحلوں سے جان بچا کر نکل آئی۔ یہ محض قرآن مجید کی قوت کا نتیجہ تھا۔ ورنہ دنیا کی بیشتر زبانیں ذرا سے

صدمہ کو نہ برداشت کر کے ختم ہوگئیں۔ اور اب ان کو کوئی نہیں جانتا ہے۔ عربی زبان وادب پر یہ قرآن مجید کا عظیم احسان ہے کہ اس نے اسے آفاقیت اور حیات جاویدسے ہم دوش کر دیا۔

قرآن مجید نے الفاظ ومعانی کے ذریعہ اثر آفرینی کے سلسلہ میں حقائق پسندی نفع بخشی اور افادی ہمہ گیری کو ملحوظ رکھنے کا درس دیا۔ اور حقیقت پسند ادب کا نمونہ پیش کرتے ہوئے اس قدیم مقولہ کی تردید کردی کہ " ان اعذب الشعر اکذبہ " قرآن مجید نے ادب کو پاکیزہ وبلند اقتدار سے روشناس کرایا۔ اور ادب کا مقصود تزکیہ نفوس متعین کیا اس نے بتایا کہ انسانوں کو دیگر حیوانات سے جو صفت ممتاز کرتی ہے۔ وہ ادبی تخلیق کی طاقت ہے۔ قرآن مجید نے ادب کے لئے جو نام مقرر کیا وہ " البیان " ہے سورہ رحمٰن میں جہاں اس نے عَلَّمَهُ الْبَیَان۔ کہا ہے تو اس سے مراد ادب ہی ہے۔

قرآن مجید نے ادب کا رخ عدل وانصاف، خدمتِ انسانیت، تائیدِ حق وصداقت نفاست پسندی، عفت وحیا اور رضا پرستی کی طرف پھیر دیا۔ اس نے ہر موضوع کو بیان کرنے کے لئے مناسب اور پر وقار اسالیب بخشے۔ غور وفکر اور دلائل وبراہین سے کام لینے کی دعوت دی۔

قرآن مجید نے بتایا کہ ادب کا فریضہ یہ ہے کہ وہ طیبات کو معاشرہ میں مقبول بنائے۔ اور خبائث کیلئے معاشرہ کی فضا ناسازگار بنائے۔ قرآن مجید نے ادب کو یاس وقنوط کے مہلک جراثیم سے نجات دلاکر اسے جہاد مسلسل اور حیات آفریں، ربانیت کا داعی بنایا۔ تنقید کے لئے بلند اصول دیئے اور احسن اختیار کرنے میں کسی قسم کا تعصب نہ کرنے کے لئے تلقین کی۔ اس نے مدح وہجو کے لئے نئے پیمانے مقرر کئے اور اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ کا بلند ترین معیار عطا فرمایا۔

قرآن مجید نے عربی زبان وادب کو اس درجہ بلندی عطا کی کہ اس کے بعد جس زبان میں بھی کسی شکل سے عربی ادب پہونچا اس زبان کو بھی فکری ومعنوی بلندیوں سے ہمکنار کر دیا۔ آج دنیا کے ادب میں وحدتِ عالم، وحدتِ انسانیت، آزادی اور اخلاقِ فاضلہ کی جو حوصلہ افزائی ہو رہی ہے وہ اسی قرآنی ادب کا نتیجہ ہے اور اگر آج انسانیت اپنی آنکھوں سے تعصبات کی عینکیں اتارنے کی کوشش کر رہی ہے تو یہ سب اسی قرآنی ادب کے فیض کا ثمرہ ہے۔

تاریخِ ادبِ عربی کا سرسری مطالعہ کرنے والا بھی ادب میں قرآنی انقلاب کی تاثیر کو بڑی شدت وقوت سے محسوس کرے گا۔

رسول خدا کی وفات

اور

کفن دفن کے متعلق ایک عیسائی مؤرخ کی تحقیق

مولانا حبیب الرحمٰن خیرآبادی مفتی دارالعلوم دیوبند

مسٹر گوڈے ایک عیسائی مورخ کئی سال بدوؤں کی صحرائی خیموں میں رہے اور وہاں انھوں نے ان کے عادات وخصائل اور قرآن ورسول ؐ سے ان کی دل بستگی کا مشاہدہ کیا اور ایک کتاب بنام . The Messenger (پیغمبر) تقریباً چارسو صفحات پر مشتمل لکھی اور شائع کی ۔ اس میں اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات رحلت نہایت جامع الفاظ میں زیبِ قرطاس کئے ہیں جن کا پڑھنا شیعہ وسنی دونوں کے لئے مفید ہوگا۔

حجرۂ میمونہ سے حجرۂ صدیقہ رضہ میں

لکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام اپنی بیویوں کے پاس باری باری اقامت گزیں ہوتے تھے۔ ابتداء علالت میں آپؐ حضرت میمونہ رضہ کے حجرے میں تھے ۔ یہ بیوی حضرت عباس عمّ رسول ؐ کی سالی تھیں یہاں آپ کی عیادت تسلی بخش نہ ہوئی ، حضرت عباس رضہ کی خواہش تھی کہ آپ کی زندگی کی آخری گھڑیاں یہیں کٹیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ آپؐ کا اپنے خلیفہ کے بارے میں کیا ارادہ ہے کیونکہ آج تک

لے یہ مؤرخ کے مذہبی تعصب کی کارفرمائی ہے ورنہ تمام ازواج مطہرات حضور علیہ السلام پر جان چھڑکتی تھیں اس لئے محبوب کی دیکھ ریکھ میں کمی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔

آپؐ نے اپنے ارادے کا اظہار نہیں فرمایا تھا۔ آپؐ اپنے چچا (حضرت) عباسؓ اور (حضرت) علیؓ کے سہارے چل کر (حضرت) عائشہؓ کے حجرے میں پہنچ گئے۔
(حضرت) عائشہؓ کی عمر اس وقت بیس برس کی تھی۔ انھوں نے تاحال کسی قریب المرگ مریض کی تیمار داری نہیں کی تھی مگر اس موقع پر انھوں نے نہایت تن دہی اور چابک دستی سے کام لیا اور تادم واپسیں اپنے شوہرؐ کی بڑی خدمت کی۔ اس ہمدردانہ تیمار داری سے آپؐ کچھ صحت مند ہو گئے۔ طاقت بحال ہونے لگی اور پریشانی خیالات کم ہوئی، اسی اثناء میں آپ نے فرمایا کہ مالکِ اعلیٰ نے بندے کو اختیار دیا ہے کہ خواہ وہ دنیا میں رہنا پسند کرے یا مالک کے پاس پہنچنے کو۔ لیکن بندے نے اسی کی طرف لوٹ جانا اختیار کیا ہے اس فقرے کی گہرائیوں تک (حضرت) ابوبکرؓ کے سوا حاضرینِ مسجد میں سے کوئی نہ پہنچا۔

حضرت صدیقِ اکبرؓ کی محبت

پیش آنے والے فراق کے خیال سے (حضرت) ابوبکرؓ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضورؐ نے دیکھ کر فرمایا۔ لوگو تم سب میں میرے ساتھ محبت و ایثار میں بڑھے ہوئے ابوبکرؓ ہی ہیں۔ اگر میں کسی کو اپنا خلیل چنتا تو ابوبکر کو چنتا مگر اسلام نے ہم سب کو اخوت کے رشتے میں مربوط کر دیا ہے اس کے بعد انصار سے نیک سلوک کرنے اور دیگر نصائح فرمانے کے بعد آپؐ مسجد سے (حضرت) عائشہؓ کے حجرہ میں تشریف لے آئے۔ مسجد تک جانے اور واپس آنے سے آپؐ بہت مضمحل ہو گئے اور مسجد جا کر نماز پڑھانے کی ہمت نہ رہی۔ لہٰذا آپؐ نے (حضرت) ابوبکرؓ کو حکم دیا کہ مسجد جا کر امامت کا فرض انجام دیں۔

حضرت صدیقِ اکبرؓ کو امامت سپرد

آپؐ نے اپنی موجودگی میں کسی اور کو کبھی امام نہیں بنایا تھا، اور یہ پہلا موقع تھا کہ ایسا حکم دیا۔ (حضرت) عمرؓ، (حضرت) عثمانؓ اور (حضرت) علیؓ بھی موجود تھے آپؐ ان میں سے کسی کو چاہتے تو یہ فرض ادا کرنے کو کہہ دیتے مگر اپنے نہایت قابلِ اعتبار دوست کو منتخب کرنا۔ اور ان کی بیٹی (حضرت) عائشہؓ کو اور ان کے حجرے کو تیمار داری کے لئے چن لینا صرف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے مراد یہی تھی کہ آپ کا خلیفہ وہی ہو جس نے شروع اسلام میں تکلیف اور راحت کے موقعوں پر ساتھ دیا ہو۔
بعض اوقات آپؐ پر غشی سی طاری ہو جاتی مگر آپ کا دل گرد و پیش کے حالات سے باخبر رہتا

پھر ایک بار آپ نے ہمت کی اور غسل کر کے اور صرف کپڑے پہن کر مسجد تشریف لے گئے۔ اس وقت (حضرت) ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے۔ آپؐ کے آنے کی آہٹ پاکر سب نمازیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی (حضرت) ابوبکرؓ آپؐ کی تشریف لانے کی اطلاع پاکر پیچھے ہٹے مگر آپؐ نے اشارہ کیا کہ اپنے کام میں مشغول رہو۔ نماز ختم ہو چکی تو آپ منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ

حضورؐ کا آخری خطبہ

مجھے معلوم ہوا ہے کہ میری وفات کی خبر سے تم خوفزدہ ہو مگر خیال کرو کہ کبھی کوئی پیغمبر ہمیشہ زندہ بھی رہا ہے؟ یہ چیز اللہ کی تقدیر کے مطابق ہوتی ہے اور کسی کو مقررہ وقت سے پہلے یا بعد موت نہیں آسکتی ہے۔ مجھے اپنے مرسل کی طرف لوٹ جانا ہے اور میرا آخری حکم یہ ہے کہ تم باہم متحد رہو۔ ایک دوسرے سے محبت رکھو، ایک دوسرے کی عزت کرو۔ مدد کرو اور عقیدے خالص رکھو۔ اور نیک کام کرنا اپنا شعار بنالو انہی باتوں سے تم فلاح پاؤ گے۔ نہیں تو بربادی کی طرف دھکیل دیے جاؤ گے۔ یہی فرنگی مؤرخ (گوڈے) بیان کرتا ہے کہ (حضرت) ابوبکرؓ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صحت بحال دیکھ کر اپنے موسم گرما کے مسکن (سنح) کی طرف چلے گئے، جوں ہی وہاں آپ کی وفات کی خبر پہنچی تو فوراً اخچر پر

حضرت صدیقؓ جنازۂ رسولؐ پر

سوار ہو کر موقع پر پہنچے۔ دیکھا کہ لوگ وفاتِ رسولؐ کے متعلق مختلف خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ آپ پر سکتے کی حالت ہے، کوئی کہتا ہے کہ لگے جہاں تشریف لے گئے ہیں اور جلد لوٹ آئیں گے فرط غم نے انھیں بکرا دیا تھا، انہی میں (حضرت) عمرؓ بھی شامل تھے۔ (حضرت) ابوبکرؓ ان کو کچھ کہے بغیر اندر چلے گئے، دیکھا کہ ان کی صاحب زادی (حضرت) عائشہؓ صدیقہ پیغمبر کے پاس بیٹھی ہیں۔ انھوں نے منہ سے کپڑا اٹھاتے ہوئے کہا حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) جس طرح زندگی میں زیبا رخ تھے ویسے ہی فوت ہونے پر بھی ہیں۔ حضورؐ کے بالوں کو چھوا جو سر سے پچھلی طرف بکھرے ہوئے تھے۔ اور کہا آپ فوت ہو گئے ہیں! فوت ہو گئے ہیں! آہ مرے مربی! میرے مصطفےٰ!! ماں باپ سے زیادہ پیارے!!! آپ نے موت کی تلخی کا مزا چکھ لیا ہے!!! (حضرت) ابوبکرؓ نے ایک دفعہ پھر پیغمبرؐ کی پیشانی کو بوسہ دیا! اور چادر کا سرا منہ پر ڈال کر آہستگی سے باہر صحن خانہ میں آئے جہاں ازواجِ رسول رو رہی تھیں پھر بیرونِ دیوار لوگوں کی حالت کو دیکھا اور سنا کہ (حضرت) عمرؓ کہہ رہے ہیں کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) سکتے میں ہیں۔ (حضرت) ابوبکرؓ نے انھیں چپ کرنے کی کوشش کی مگر ان کی طبیعت قابو میں نہیں تھی۔

حضرت ابوبکرؓ کی استقامت وحکمت

(حضرت) ابوبکرؓ نے ایک گھڑی سوچا۔ ایسی حالت سے وہ کبھی دوچار نہیں ہوئے تھے آخر آپ نے اپنے ہاتھ بلند کئے اور کچھ بولنا شروع کیا لوگوں نے مانوس آواز سن کر ادھر کا رخ کیا اور چپ ہو گئے۔ (حضرت) ابوبکرؓ نے انھیں بلند آواز سے مخاطب کیا اور صاف فرمایا کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو نہیں بتایا تھا کہ تم بھی واپس جاؤگے اور لوگ بھی۔ اور پھر احد کی جنگ کے بعد کہا کہ محمدؐ صرف خدا کے رسول ہیں دوسرے رسول ان سے پہلے فوت ہو گئے ہیں! کیا اگر یہ (محمدؐ) فوت ہو جائیں یا قتل تو کیا تم اپنی ایڑیوں پر پھر جاؤگے اور ان کی تعلیم پر عمل کرنا ترک کر دوگے پھر (حضرت) ابوبکرؓ نے اپنی آواز مدھم کر دی۔ پھر پرزور الفاظ میں کہا "اب انھیں بتادو جو محمدؐ کی پرستش کرتا تھا کہ وہ فوت ہو گئے ہیں۔ اور جو اللہ کی پرستش کرتا تھا وہ جان لے کہ وہ زندہ ہے اور کبھی نہیں مرے گا"

ان الفاظ سے سکوت کا عالم طاری ہو گیا۔ کیونکہ (حضرت) ابوبکرؓ کا کلام باسند تھا۔ انھوں نے قرآن پیش کیا تھا جو وہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سن چکے تھے لوگوں کو (حضرت) ابوبکر کے خلوص کا یقین تھا۔ جو ان کے ہادی کے بہت بڑے دوست تھے۔ کچھ آنکھیں (حضرت) عمرؓ کی طرف اٹھیں کہ شاید وہ کچھ اختلافی بات کریں۔ مگر وہ سر جھکائے ساکت کھڑے رہے مجمع غمزدہ دل کے ساتھ منتشر ہو گیا صرف ابوبکرؓ و عمرؓ وہاں رہ گئے۔ وہ بھی فرط غم سے بات نہیں کر سکتے تھے۔ (حضرت) ابوبکرؓ نے باوجود شدت الم اپنے حواس ٹھکانے رکھے۔ انھیں فکر تھی کہ اسلام پر برا وقت آپڑا ہے۔ رسول اللہ کی رحلت کا صدمہ بہت سخت ہے۔ مگر اس کا نتیجہ اور بھی سخت ہو گا اگر فوراً کوئی لیڈر مقرر نہ کیا گیا تو رقیب اٹھ کھڑے ہوں گے اور (حضرت) ابوبکر کا یہ اندیشہ بجا تھا۔

انصار کی سوچ بچار

(حضرت) ابوبکر کی تقریر کے بعد اہل مدینہ ایک جگہ جمع ہوئے اور فیصلہ کیا کہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) واقعی فوت ہو گئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم مہاجرین مکہ کے ماتحت رہیں۔ اس لئے اب موقع ہے کہ ہم آزاد اور خود مختار ہو جائیں حضرت ابوبکرؓ ان کا میلان خاطر بھانپ گئے لہذا (حضرت) عمرؓ کو ساتھ لے کر مدنیوں کے مجمع میں پہونچے

۱؎ یہ بھی مورخ کی حاشیہ آرائی ہے جس کی تاریخ وسیرے شہادت پیش نہیں کی جا سکتی۔ ۲؎ بھانپ نہیں گئے بلکہ ایک صاحب نے سقیفہ بنی ساعدہ میں جو صورت حال رونما تھی اس کی اطلاع دی تھی چونکہ یہ صورت حال نہایت نازک تھی اس لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت عمرؓ کو لے کر وہاں تشریف لے گئے۔

ان دونوں نے جاکر معلوم کر لیا کہ سعد بن عبادہ کو انھوں نے اپنا سردار نامزد کردیا ہے[1]، (حضرت) ابوبکرؓ نے ویسی ہمت سے کام لیا جیسا کہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لیا کرتے تھے۔

انصار کو مشورہ

(حضرت) ابوبکرؓ نے کہا کہ مجھے اہل مدینہ کا بڑا لحاظ ہے، مگر اہل عرب ان کی سرداری کو کبھی منظور نہیں کریں گے صرف (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قوم قریش ہی عربوں کو ایک مرکز پر جمع کر سکتی ہے۔ اگر تم لوگ چاہتے ہو کہ اسلام زندہ رہے تو تمہیں میری بات مان لینی چاہیئے، (حضرت) ابوبکرؓ نے انھیں یہ بات ذہن نشین کرنے کا وقفہ دیا اور پھر فرمایا کہ میں یہ بات خود غرضی کے لئے نہیں کہتا۔ تم جسے چاہو قریش میں سے رہنما چن لو۔

انتخاب صدیق اکبرؓ

(حضرت) ابوبکرؓ نے بات ٹھیک کہی اور معاملہ اہل مدینہ پر چھوڑ دیا۔ لہذا انھوں نے متفقہ طور پر (حضرت) ابوبکرؓ کو خلیفہ رسول اور رہنمائے اسلام منتخب کر لیا، عمرؓ نے بھی اس انتخاب کی تائید کی اور دوسرے دن مسجد میں عام پبلک نے بیعت کر کے (حضرت) ابوبکرؓ کو خلیفہ تسلیم کر لیا۔ لوگو! تمہارا یقین قرآن پر استوار ہونا چاہیے، مزید فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے امور ان کے سپرد کئے ہیں۔ جو رسول اللہ صلعم کے رفیق ہیں اور سچے رفیق " دو میں دوسرے" (ثانی اثنین) جبکہ وہ غار میں اکیلے تھے، اٹھو اور صدق دل سے ان کی بیعت کرو" اتفاق رائے سے لوگ (حضرت) ابوبکرؓ کی طرف بیعت کے لئے امڈ پڑے اور فرداً فرداً سب نے اسلام کے خلیفہ اول کی بیعت کر لی اور اطاعت کا حلف اٹھایا، یہ فیصلہ بیان کرکے سڑگوڈے نے حضرت ابوبکرؓ کا وہ خطبہ بیان کیا ہے۔

بے نظیر خطبۂ صدیق اکبرؓ

جو دنیا میں ایک حکمراں کا بے نظیر خطبہ ہے جس میں آپؓ نے اپنی کوئی بڑائی ظاہر نہیں کی اور کمزوروں کا زبردستوں سے حق دلانے کے عزم کا اظہار کیا اور فرمایا کہ تم پر میری اطاعت جبھی تک فرض ہے جب تک میں خدا اور رسول کے احکام کی پیروی کرتا رہوں ورنہ نہیں۔ پھر کہا کہ اٹھو نماز کے لئے خدا تم پر رحم کرے۔

ادھر یہ واقعات ہوئے ادھر رسول خدا کی تجہیز و تکفین ہو چکی اور جنازہ (حضرت) عائشہؓ کے حجرہ میں رکھا رہا اور لوگوں کو اجازت دی گئی کہ وہ گروہ در گروہ اپنے پیارے پیغمبر کی زیارت

---

[1] بلکہ صحیح یہ ہے کہ حضرت سعدؓ کی نامزدگی کی بات چل رہی تھی۔

کرتے جائیں۔ یہ سلسلہ دو دن بھر جاری رہا پہلے مردوں نے زیارت کی۔ پھر عورتوں نے ان کے بعد بچوں اور غلاموں نے۔

اتفاق بر ارشاد حضرت صدیق رضؓ جب دفن کرنے کا وقت آیا تو کسی کی رائے تھی کہ زیر منبر مسجد میں تدفین ہو جہاں آپ خطبہ دیا کرتے تھے کسی کی تجویز تھی کہ یہ عمل زیر محراب کیا جائے جہاں آپ امامت فرمایا کرتے تھے۔ بعض نے کہا کہ آپ اپنے عزیزوں کی قبور پر جایا کرتے تھے اس لئے وہیں دفن کئے جائیں۔ مگر (حضرت) ابوبکرؓ نے اس معمہ کو یہ کہہ کر حل کیا کہ (حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ پیغمبر وہاں دفن ہوتے ہیں جہاں وہ فوت ہوں اس کی کسی نے مخالفت نہیں کی۔ چنانچہ اسی پر عمل ہوا۔ اور آپؐ کو حجرۂ عائشہؓ میں تیار کردہ قبر میں (حضرت) علیؓ (حضرت) اسامہؓ اور (حضرت) الفضلؓ (ابن عباسؓ) نے اتارا مسٹر موصوف لکھتے ہیں یہ کام ۹ رجون ۶۳۲ء بروز شنبہ مطابق ۱۱ھ کو ہوا۔ آج تک اسی جگہ آپ کا مزار قائم ہے مگر پبلک اسے دیکھ نہیں سکتی۔ پہلے جہاں معمولی سے حجرے بنے تھے اب وہاں عظیم الشان مسجد موجود ہے اور خاص مزار پر ایک عالی شان گنبد ہے یہاں تمام دنیا سے مرد اور عورت عبادت اور زیارت کے لئے آتے ہیں"۔

قولِ فیصل یہ ہے حضورؐ کی وفات، تجہیز و تکفین اور تدفین کے متعلق ایک غیر جانبدار مؤرخ کا بیان۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ (حضرت) ابوبکرؓ و (حضرت) عمرؓ جو حضورؐ کے جنازے کے پاس غمزدہ بیٹھے تھے ان کو مجمع انصار میں تشریف لے جانا کیوں ضروری ہوا اس لئے کہ مسلمانوں کو انتشار سے بچایا جائے اور اسلام کی عظمت برقرار رکھی جائے (حضرت) ابوبکرؓ کے تمام کام مخلصانہ اور بے غرضانہ تھے، اس لئے وہ ہر مہم میں کامیاب ہوئے۔ اسلام کو مٹانے کے لئے جتنے فتنے اٹھے وہ رسول خدا کے اس حقیقی معنوں میں خلیفۂ بلا فصل کی ہمت سے مٹ گئے۔ کیا ہی برمحل کہا ہے، علامہ اقبال مرحوم نے ؎

آں امنّ النّاس بر مولائے ما — آں کلیم اول سینائے ما

ہمت او کشت ملت را چو ابر — ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر

یعنی (حضرت) ابوبکرؓ ہمارے مولا (محمد رسول اللہ صلعم) کے سب سے بڑے محسن ہیں اور حضورؐ کے خلیفہ بلا فصل ہیں، آپؓ کی ہمت سے اسلام کی کھیتی اسی طرح سرسبز ہوئی جس طرح بارش سے زراعت تر و تازہ ہوتی ہے ابوبکرؓ نبی رسول اللہ صلعم کے بعد دوسرے مسلمان ہیں۔ غار میں ساتھ۔ غزوۂ بدر میں بھی ساتھ اور قبر میں بھی ساتھ۔ یہ مرتبہ حضرت ابوبکرؓ کے سوا کسی کو نہیں ملا۔

حضرت جعفر صادق کا روایت کردہ آخری خطبۂ رسول حیات القلوب قلمی صفحہ ۱۰۰

میں بسند معتبر حضرت صادق سے روایت ہے کہ جبرئیل امین اللہ تعالیٰ سے رسول ﷺ کی خبر رحلت لے کر اس وقت آئے جبکہ آپ کو کسی قسم کی تکلیف و درد نہ تھا۔ آپ نے مہاجرین و انصار کو ہتھیار لگا کر آنے کا حکم دیا جب سب حاضر ہو گئے تو حضورؐ منبر پر آئے اور اپنی وفات کی خبر سنائی اور فرمایا کہ جو شخص میرے بعد والی امر ہو میں اسے خدا کی یاد دلاتا ہوں کہ میری امت پر رحم کرے اور مسلمانوں کی جماعت اور اس کے بوڑھوں کی عزت کرے اور ضعیفوں پر رحیم ہو۔ مسلمان عالموں کی تعظیم کرے، انھیں کوئی ضرر نہ پہنچائے جو ان کی ذلت کا باعث ہو۔ انھیں فقیر نہ بنا دے تاکہ محتاجی ان کے کفر کا باعث نہ ہو، اپنا دروازہ ان پر بند نہ کرے تاکہ زبردست زیردستوں پر مسلط نہ ہو جائیں، اور انھیں کافروں کی سرحد پر بہت عرصہ نہ روکے رکھے تاکہ میری امت (کے قطع نسل) کا باعث نہ ہو، پھر فرمایا کہ میں نے رسالت کی تبلیغ اور تمہاری خیر خواہی کر دی پس سب گواہ رہو، حضرت صادق نے فرمایا کہ یہ آخری سخن تھا جو آں حضرت نے منبر پر فرمایا۔"

قارئین غور کریں کہ اس ارشاد نبوی میں حضرت علیؓ کے اسم مبارک کا کہیں ذکر نہیں بلکہ فرمایا کہ میرے بعد جو والی امر ہو۔ سوچیں کہ والی امر کون ہوا؟ ابوبکر صدیقؓ یار غارؓ، انہی نے حسب ارشاد نبوی تمام کام سرانجام دیئے، اور پورا عمل کیا۔ کافروں سے جہاد کرتے تو مجاہدین کو زیادہ عرصہ سرحدوں پر روک نہ رکھنے کی تعمیل کرتے، آپ کو معلوم تھا کہ میرے بعد یہ کام حضرت ابوبکرؓ ہی سرانجام دے سکیں گے، لہٰذا خطاب انہی کی طرف تھا اور تاریخ بتاتی ہے کہ انھوں نے کس اخلاص اور کوشش سے ارشاد نبوی کو عملی جامہ پہنایا۔

بقیہ صفحہ ۴۸

علماء امت نے حضرات صحابہ کے حالات اور مناقب و فضائل میں بیشمار کتابیں لکھی ہیں زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ فاضل مؤلف نے اس کتاب میں صحابۂ کرام کی عظمت شان اور علو مرتبہ کو قرآن و حدیث کے علاوہ کتب سماویہ سابقہ توریت و انجیل کی آیتوں سے بھی واضح کیا ہے۔ اسی کے ساتھ عشق رسول اور علمی و دینی شعبوں میں ان کی جلیل القدر و محیر العقول خدمات کو مستند روایتوں سے بیان کیا ہے اسی سلسلہ میں ان سے جاری روحانی فیوض اور ان کے کشف و کرامات پر بھی روشنی ڈالی ہے لیکن اس سلسلے کی بعض روایتیں پایۂ اعتبار سے گری ہوئی ہوتی ہیں اگر انھیں کتاب میں شامل نہ کیا جاتا تو بہتر تھا آخر میں صحابۂ کرام سے متعلق صحیح اور معتدل موقف کے عنوان سے ایک بڑی اچھی بحث کی ہے جسے حاصل کتاب کہا جا سکتا ہے۔ زبان و بیان اور بعض تصنیفی خامیوں کے باوجود لائق استفادہ ہے بالخصوص عوام اور متوسط طبقہ کے حق میں بہت مفید ہے۔

تعارف و تبصرہ

نام کتاب	تبلیغی نصاب، ایک مطالعہ کا جواب
مولف	مولانا قاری عبدالکریم صاحب خطیب جامع مسجد انعام دار پورہ اکولہ
صفحات	دو سو آٹھ (۲۰۸)
ناشر	انجمن حامیانِ اہلِ سنت والجماعت
قیمت	چودہ روپے ۱۴/-
ملنے کا پتہ	خلیل بکڈپو جامع مسجد انعام دار پورہ اکولہ مہاراشٹر

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی قدس سرہٗ کی ذات و خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے عصر حاضر میں آپ کے علمی و روحانی فیوض و برکات سے عالم اسلام کو جس قدر نفع پہنچا ہے اس کی نظیر مشکل ہی سے ملے گی۔ آپ نے اپنی پوری زندگی حدیث رسول کی اشاعت اور بندگان خدا کی اصلاح و تربیت کے لئے وقف کر دی تھی۔ چنانچہ ہزاروں کی تعداد میں تلامذہ و مریدین کے ساتھ سو سے زائد تصانیف آپ کے دینی شغف کا بین ثبوت ہیں۔ پھر ان تصانیف میں اکثر حدیث رسول ہی سے متعلق ہیں۔

حضرت شیخ قدس سرہ نے حدیث رسول کی عمومی اشاعت کی غرض سے جہاں اہل علم کے استفادہ کیلئے عربی میں بخاری، ترمذی، ابو داؤد، موطا امام مالک وغیرہ کی شروحات یا ان کی شرحوں پر حواشی تحریر کئے ہیں وہیں عوام کے لئے ہلکی پھلکی زبان میں فضائل نماز، فضائل ذکر، فضائل قرآن، فضائل تبلیغ، فضائل صدقات فضائل درود وغیرہ کے عنوان سے اردو میں متعدد رسائل بھی مرتب کئے ہیں جن میں زیادہ تر قرآن حکیم کی آیات کی تفسیر یا احادیث نبوی کی تشریحات ہی ہیں البتہ ترغیب و تشویق کے طور پر اولیاء و اکابر کے واقعات بھی درج کر دیئے ہیں۔ یہ الگ الگ رسالے اب "تبلیغی نصاب" کے نام سے یکجا بھی چھپنے لگے ہیں۔ ان رسائل کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ ان کے ترجمے دنیا کی بیشتر زبانوں میں ہو گئے ہیں اور سالانہ لاکھوں کی تعداد میں ان کی اشاعت ہوتی ہے اور دور حاضر کے تقریباً سبھی علماء و صلحاء ان کی افادیت کو تسلیم کرتے ہیں۔

چونکہ ان رسائل کے مطالعہ سے اخلاص و للہیت اور عبادت و ریاضت کا خالص دینی مزاج بنتا ہے جس سے جماعت اسلامی کے خود ساختہ نظریہ "اقامت دین" اور "اصلاح قدیم" "حکومت الٰہیہ" پر براہ راست زد پڑتی ہے اس لئے اس جماعت کے ایک پرجوش داعی نے "تبلیغی نصاب ایک مطالعہ" کے نام سے ایک تنقیدی کتابچہ مرتب

کر کے شائع کیا ہے جسے جماعت اسلامی ہزاروں کی تعداد میں خرید کر مفت تقسیم کر رہی ہے۔

کتابچہ مذکورہ کے مرتب علوم دینیہ بالخصوص فن حدیث سے واجبی حد تک بھی واقفیت نہیں رکھتے جس کا ثبوت خود یہی کتابچہ ہے جس میں انھوں نے بہت سی مستند احادیث رسول کا اپنی لاعلمی کی وجہ سے انکار کر دیا ہے البتہ ادعاء ہمہ دانی میں وہ اپنے لیے سے بڑے امیر سے بھی دو چار قدم آگے ہی ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی اس تحریر میں بار بار حضرت شیخ کے تلامذہ و خلفاء کو دعوت مبارزت دیتے ہیں کہ وہ میدان میں آئیں اور ان کے اعتراضات کا جواب دیں لیکن پورے کتابچہ میں علمی سنجیدگی اور وقار کے مقابلہ میں سوقیانہ طرز نگارش کو اپنایا گیا ہے اور علم و تحقیق کے بجائے اتہام و افتراء سے داد تحقیق حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لئے حضرت شیخ قدس سرہ کے تلامذہ نے اسے در خور اعتنا نہیں سمجھا ورنہ بفضلہ تعالیٰ ان کے تلامذہ و خلفاء میں ایک خاصی تعداد ایسے علماء و فضلاء کی موجود ہے جو اہم سے اہم ترین علمی مسائل پر فاضلانہ بحث کر سکتے ہیں۔ پھر بھی ضرورت تھی کہ اس کتابچے کا علم و تحقیق کی کسوٹی پر رکھ کر اس کے مفتریات کو واضح کر دیا جائے تاکہ عوام کسی مغالطہ اور فریب میں مبتلا نہ ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ایک نوجوان فاضل مولانا قاری عبدالکریم مقاتی کو اس ضرورت کا احساس بخشا اور اس کتابچے کے فریب کو طشت از بام کرنے کی توفیق مرحمت فرمائی۔

مولانا موصوف نے پورے حزم و احتیاط کے ساتھ نہایت سنجیدہ اور متین انداز میں پورے کتابچے کا جائزہ لیا ہے اور تقریباً باسٹھ عنوانات کے ذیل میں کتابچے میں مذکور تمام اعتراضات کا علمی و تحقیقی انداز میں اطمینان بخش مسکت جواب دیا ہے اور اس بات کا خاص طور پر التزام کیا ہے کہ کوئی بات بغیر حوالے کے نہ کہی جائے۔ موصوف کی کوشش ہر اعتبار سے کامیاب ہے اور ان کے روشن مستقبل کی نشان دہی کر رہی ہے۔

نام کتاب	اصحابی کالنجوم
مؤلف	مولانا ابوالنعمان بشیر الحق قریشی ادھونی
طابع و ناشر	دارالمعارف ۲۵۴ ہاؤسنگ بیٹ ادھونی اندھرا پردیش
صفحات	چھیانوے (۹۶)
قیمت	درج نہیں۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب کا موضوع حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم کے فضائل و مناقب کا بیان ہے۔ اسلام میں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد جماعتِ صحابہ ہی کا درجہ ہے۔ اہل سنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ جس خوش بخت کو بحالتِ ایمان زندگی میں ایک بار بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہو گیا اس کے مقام و مرتبہ کو بڑے سے بڑا مجتہد وقت، ولی زمانہ بھی نہیں پہنچ سکتا۔ (باقی صفحہ ۴۶ پر)

نگرانِ اعلیٰ حضرت الحاج مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند یوپی

دارالعلوم دیوبند کا علمی و دینی

ماہنامہ دارالعلوم

جلد نمبر ۶۷ | نومبر سنہ ۱۹۸۴ء مطابق صفر المظفر سنہ ۱۴۰۵ھ | شمارہ نمبر ۲

سالانہ زرِ اشتراک

ہندوستان سے	۲۵/۰۰
سعودی عرب، کویت، ابوظہبی وغیرہ سے	
بذریعہ ایرمیل	۹۰/۰۰ روپے
جنوبی مشرقی افریقہ، برطانیہ وغیرہ سے	
بذریعہ ایرمیل	۱۰۵/۰۰ روپے
امریکہ، کناڈا وغیرہ سے بذریعہ ایرمیل	۱۱۶/۰۰ روپے
پاکستان سے بذریعہ رجسٹری	۴۵/۰۰ روپے
فی پرچہ	۲/۵۰ روپے

طابع و ناشر

دارالعلوم معرفت مولانا مرغوب الرحمن صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مطبوعہ

محبوب پریس دیوبند (یوپی)

ضروری گذارش

◯ اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینہ یا اس سے پہلے کسی مہینہ میں آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ بذریعہ سرخ نشان اس کی آپ کو اطلاع بھی دی جا چکی ہے لہذا اب اگر آئندہ شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا کوئی خط یا چندہ نہ آیا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو دی، پی ہی سے زرِ اشتراک ادا کرنے میں آسانی ہے اگلا شمارہ ۳۱/۰۰ روپے کے مطالبہ میں وی پی کر دیا جائے گا۔ (مدیر)

فہرست مضامین

ہندوستانی اور پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

(۱) ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ فرمائیں۔

(۲) پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ ۴۵/.. روپے مولانا عبدالستار صاحب مقام کرم علی والا تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان (پاکستان) کو بھیج دیں اور انھیں لکھیں کہ وہ اس چندہ کو رسالہ دارالعلوم کے حساب میں جمع کریں۔

(۳) خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں، خط وکتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

(مدیر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

حبیب الرحمن قاسمی

اسلامی تاریخ میں ربیع الاول وہ مبارک ترین مہینہ ہے جس میں دعائے خلیل اور نوید مسیحا کا ظہور ہوا یعنی محسن انسانیت پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو خالق کائنات نے رحمت مجسم بنا کر اس خاکدان عالم میں بھیجا۔ آپ کی بعثت کے وقت دنیا کا کیا حال تھا ان مختصر صفحات میں اس کا اجمال بھی پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ دین و مذہب، تہذیب و تمدن، معاشرت و معیشت، اور اخلاق و کردار غرضیکہ زندگی کے تمام شعبوں میں جہالت و ضلالت کا دور دورہ تھا اور انسانیت کی گاڑی اپنی پٹری کو یکسر چھوڑ چکی تھی اور قریب تھا کہ وہ ظلمت و تاریکی کے ایسے مہیب اور خطرناک غار میں گر جائے جس سے پھر ابھرنا ممکن نہ ہو۔ "كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ" سے قرآن اسی عالمگیر ابدی تباہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

عین اس تباہی و بربادی کے عالم میں آپؐ نے گرتی ہوئی انسانیت کا ہاتھ پکڑا اور اپنی روشن تعلیمات اور تابناک اخلاق کے ذریعہ دنیا سے نہ صرف کفر و شرک اور ظلم و جہل کی تاریکیوں کو دور کر دیا بلکہ لہو و لعب بدعات و رسومات اور بے سروپا خرافات سے مسخ شدہ انسانیت کو اخلاق و شرافت، وقار و تمکنت اور سنت و شریعت کے خوشنما و دیدہ زیب زیور سے آراستہ و پیراستہ کر دیا۔ اور آج دنیا میں جہاں کہیں بھی شرافت و مروت، عدل و انصاف، علم و حکمت، عبادت و اطاعت اور ایمان و ایقان کی روشنی نظر آتی ہے وہ درحقیقت علیہ اسی آفتاب رسالت اور محسن انسانیت کا۔

اس رحمت مجسم اور محسن اعظم کا حق تو یہ تھا کہ ہمارے قلوب ہمہ وقت اس کی عظمت و احترام سے معمور ہوتے اور ہمارے دلوں کی ہر دھڑکن اس کی تعظیم و توقیر کی ترجمان ہوتی، ہمارا ہر عمل اس کے اسوۂ حسنہ کا نمونہ ہوا اور ہماری ہر حرکت و سکون اس کی سنت مطہرہ کے تابع ہوتی گویا ہماری مکمل زندگی سیرت رسول کی تذکار اور اخلاق نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جیتی جاگتی تصویر ہونی چاہیے تھی۔ نہ یہ کہ دیگر اہل ادیان و مذاہب کی دیکھا دیکھی ہم بھی اس نبی برحق اور محسن اعظم کی یاد و تذکرہ کے لئے چند دن مخصوص کر لیں اور پھر پورے سال بھولے سے بھی اس کی سیرت و اخلاق کا ذکر تک زبان پر نہ لائیں۔ لاریب کہ آپ کا تذکرہ، آپ کی یاد، اور آپ کے فکر میں حیات کے جتنے لمحے بھی گذر جائیں وہ ہمارے لئے سرمایۂ سعادت اور ذریعہ نجات آخرت ہیں۔

لیکن افسوس وصد افسوس! کہ آج رسول عربی فداہ روحی، ابی وامی کے نام لیوا، اور اس کے عشق ومحبت
کے دعویدار "ماہ ربیع الاول" میں "عید میلاد النبی" کے دلنشیں نام پر جو رقتی اور بے روح محفلیں منعقد کرتے ہیں
اس کے تصور ہی سے روح کانپ اٹھتی ہے اور کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ آہ! ملت اسلامیہ کی یہ کیسی بدبختی و بدنصیبی
ہے کہ محسن اعظم کے مقدس نام اور سیرت پاک کے بابرکت عنوان پر اس ہڑبونگ، غل غپاڑہ، شور و شغب اور
طوفان بے تمیزی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ کچھ دیر کیلئے شیطان کی پیشانی بھی احساس ندامت سے عرق آلود ہو جاتی
ہے دل کی دنیا تاریک تر ہوتی جارہی ہے مگر اس کی فکر سے بے پرواہ بازاروں اور گلی کوچوں کو برقی قمقموں
سے منور کیا جاتا ہے۔ دل کی بستی ویران اور اجاڑ ہو رہی ہے مگر اس کے غم سے غافل راستوں اور چوراہوں
کو حسین و خوش منظر جھنڈیوں سے سجایا جاتا ہے۔ چھ چھ آٹھ آٹھ گھنٹے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر
جلسوں اور جلوسوں میں گذار دیا جاتا ہے۔ مگر آں حضرت ﷺ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور اسلام کے رکن اولیں
نماز کے تصور تک کو ذہن و دماغ کے دریچے تک آنے نہیں دیا جاتا۔

سیرت کے ان جلسوں اور جلوسوں میں فکر ننگ و ناموس سے بے نیاز ہو کر مردوں اور عورتوں کا
جس طرح اجتماع اور اختلاط ہوتا ہے عہد جاہلیت کا جشن نوروز بھی اس کے آگے ماند پڑ جاتا ہے۔ قوم وملت
کا اس قدر سرمایہ ان سطحی اور غیر شرعی مجلسوں کی آرائش و زیبائش میں ہر سال صرف ہوتا ہے کہ اگر اس کا
عشر عشیر بھی بیواؤں کی نگہداشت اور بے سہارا بچیوں کے نکاح پر خرچ کر دیا جائے تو ملت کی ہزاروں
ماؤں اور بہنوں کو اطمینان و سکون اور عزت و آبرو کی زندگی میسر ہو جائے

محسن کائنات کی محبت کے مدعیو! خدارا غور و فکر اور عقل و ہوش سے کام لو۔ وہ دعوی
محبت یکسر فریب اور نرا دھوکہ ہے جو اطاعت و تسلیم، جاں سپاری و خود سپردگی کی عاشقانہ اداؤں
سے خالی ہو۔ عرب کا ایک شاعر کہتا ہے۔

تعصی الالٰہ وانت تظہر حبہ — ہذا محال وفی القیاس بدیع
لو کان حبک صادقا لاطعتہ — لان المحب لمن یحب یطیع

تم زبان سے اللہ کی محبت کا اظہار کرتے ہو اور عمل سے اس کی نافرمانی اور مخالفت۔ محبت اور مخالفت کا یکجا
ہونا از روئے عقل کے نہایت عجیب بلکہ محال ہے۔ اگر تمہاری محبت سچی ہوتی تو تم یقینی طور پر اس کی
اطاعت کرتے۔ کیونکہ محب و عاشق اپنے محبوب کا اطاعت گذار اور فرماں بردار ہوتا ہے۔

تم زبان سے عشق رسول کا دم بھرتے ہو مگر تمہارے طور طریقے، اخلاق و اعمال اور عادات و خصائل
تعلیمات رسول اللہ ہدایات محبوب کے سراسر خلاف ہیں۔ ہادیٔ اعظم اور محسن انسانیت نے بالکل آخری وقت

میں جبکہ تم ڈوب رہی تھی اور نزع کا عالم طاری تھا۔ تمہیں نماز کی وصیت فرمائی تھی، غیر محرم عورتوں سے اختلاط تو بڑی دور کی بات ہے ان کی جانب نظر اٹھانے کو بھی آپ نے دین و ایمان کی ہلاکت اور تباہی قرار دیا تھا۔ بیجا اسراف اور فضول خرچی سے تمہیں باز رہنے کی مؤکد ہدایت فرمائی تھی لیکن آج انھیں کے نام پر ان جلسوں اور جلوسوں میں تم وہ سب کچھ کرتے ہو جس سے تمہارے محسن نے تمھیں روکا تھا۔ خدارا ہوش میں آؤ اور دیکھو دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی تم ہو کہ ان مصنوعی اجتماعات اور غیر شرعی رسومات میں اپنی طاقت اپنی دولت، اور اپنے وقت کو برباد کر رہے ہو اور اس طرح اپنی دنیا کو تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی بھی خرید رہے ہو سے

ترسم کہ بہ کعبہ نہ رسی اے اعرابی کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستانست

ایک عظیم حادثہ | ۳۱ راکتوبر کو وزیر اعظیم مسز اندرا گاندھی کے اچانک رخصت ہو جانے سے ملک کی سیاست میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اسے آسانی سے پر کرنا ممکن نہیں ہے وہ جس انفرادی صلاحیت اور کرشمہ ساز شخصیت کی مالک تھیں اس کی مثال ہندوستان کیا ایشیا، یورپ اور امریکہ کے متمدن اور ترقی یافتہ ممالک کے سربراہوں اور لیڈروں میں بھی ملنی مشکل ہے انھوں نے ملک کو مضبوط و مستحکم بنانے اور اسے معاشی اور صنعتی ترقی کی راہ پر لگانے میں جو نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے تاریخ اسے کبھی بھلا نہیں سکتی۔ انھوں نے ملکی سیاست کو ایک نیا رخ اور موڑ دیا تھا اور اسی رخ پر ملک کو لے جانے کی جد و جہد میں مصروف تھیں۔ انھوں نے تقریباً پندرہ سال تک وزیر اعظم کی حیثیت سے اس ملک کی قیادت کا فریضہ انجام دیا اس مدت میں ان کے لئے ہوئے بعض فیصلوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی انھوں نے ملک اور قوم کی جو گرانقدر خدمت انجام دی ہیں مستقبل کا مورخ اسے کبھی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ان وجوہ سے ملک کا ایسے عظیم لیڈر سے محروم ہو جانا یقیناً ایک عظیم اور نہایت اندوہناک حادثہ ہے پھر اس حادثہ کی اندوہناکی اس تصور سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ حادثہ ایک بہیمانہ قتل کی صورت میں رونما ہوا ہے جس سے ملک میں بڑھتے ہوئے تشدد کے رجحان کا پتہ چلتا ہے کہ اب یہاں مسائل کو گفت و شنید کے بجائے بندوق کی نال سے حل کیا جائے گا۔ یہ رجحان اگرچہ کوئی نیا نہیں بلکہ فسادات کے نام پر آج تک کے سارے فرقہ وارانہ فسادات کی بنیاد اسی دہشت گردی اور طاقت کے ذریعہ مسائل حل کرنے کے رجحان پر ہے لیکن اب اس رجحان کی انتہائی بھیانک اور ہر اعتبار سے قابل مذمت و نفرت شکل وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے بہیمانہ قتل کی صورت میں رونما ہوئی ہے جس سے ملک کے بچہ بچہ کا کانپ جانا ایک فطری امر ہے۔ ہم ملک کے موجودہ قائدین بالخصوص اپنے نوجوان وزیر اعظم جناب مسٹر راجیو گاندھی سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ تشدد کے اس رجحان کو اس ملک میں جو عدم تشدد کا علمبردار ہے کبھی پنپنے نہ دیں گے تاکہ نسلی طاقتوں کو دوبارہ اس قسم کی دلگداز تاریخ دہرانے کی ہمت و جسارت نہ ہو

اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام پر ایک اصولی نظر

شیخ التفسیر حضرت علامہ شمس الحق افغانی رحمہ اللہ

اشتراکیت اور سرمایہ داری ایسے دو نظام ہیں جو مادی تہذیب کے فرزند ناخلف ہیں۔ تاریخی تسلسل کے لحاظ سے چونکہ سرمایہ داری پہلے وجود میں آئی، اور اشتراکیت اس کے بعد۔ لہذا سرمایہ داری مادرِ تہذیب مادی کا بڑا بیٹا ہے اور اشتراکیت چھوٹا ناخلف ہم نے اس لئے کہا کہ یہ دونوں ایک ماں سے پیدا ہونے کے باوجود آپس میں برادرانہ سلوک نہیں رکھتے بلکہ آپس میں برسرپیکار ہیں اور ان کی باہمی جنگ کا سلسلہ اس طرح جاری ہے جس کے ختم ہونے کی امید نہیں اور یہ دونوں فرزند اپنی مادرِ مشفقہ یعنی مادی تہذیب کے حق میں بھی ناخلف ہیں کہ مادی تہذیب جو کچھ مادی راحت و آسائش کا سامان مہیا کرتی ہے اور طویل محنت اور مسلسل جد و جہد سے جو کچھ تعمیر کرتی ہے، یہ دونوں فرزند یا ان کی اولاد اور پیروکار عالمگیر جنگ برپا کرکے اس کو بھسم کر دیتے ہیں اور ماں بیٹوں میں تعمیر و تخریب کی جنگ جاری ہے لیکن تاہنوز ماں اور بیٹوں کی اس جنگ میں قسمی فیصلہ نہ ہو سکا۔ تاہنوز نہ بیٹے پوری طرح تباہ ہوئے، اور نہ ماں کا خاتمہ ہوا۔

شاید مستقبل قریب میں مادرِ تہذیبِ مادی کی اولاد نے جس فیصلہ کن جنگ کے لئے تیاری کی ہے اور ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور میزائل نظام سے لیس ہوگئی ہے۔ اس سے آخری فیصلہ ہوگا۔ اور ہمارا اندازہ یہ ہے کہ اس آخری جنگ میں نہ کوئی فاتح ہوگا نہ مفتوح۔ بلکہ فریقین جنگ دونوں کے دونوں فنا ہو جائیں گے۔ اور مادرِ تہذیب اپنی ناخلف اولاد سمیت فنا ہو کر رہے گی یہ پیشگوئی اگرچہ قبل از وقت ہے لیکن وقت بتا دے گا کہ جو کچھ ہم نے کہا تھا وہی صحیح نکلا اقبال مرحوم کا بھی یہی اندازہ ہے ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اب تہذیب جدید کی حالتِ نزع اور جان کنی کا وقت ہے لیکن اس قریب الموت تہذیب پر عاشقوں کا اس قدر ہجوم ہے کہ عالم اسلام کا جدید عنصر اس بستر مرگ پر پڑی ہوئی تہذیب کے اپنانے کے لئے سخت بے چین ہے اور اس کے لئے اپنے تمام تاریخی ورثہ کو قربان کرنے کے لئے تیار ہے۔

میرا روئے سخن تہذیب جدید کے اپنانے کی طرف ہے نہ کہ ہنر جدید کے اپنانے کی طرف کہ وہ خود مسلمانوں کی بقاء کی ایک اہم ضرورت ہے اور اسلامی تعلیم کے زاویۂ نگاہ سے "سامانِ جہاد" میں شامل ہے جو فرض ہے لیکن تہذیب جدید اور ہنر جدید کا فرق ایسا ہے، جس کو ہمارا عنصر جدید نہیں سمجھتا، اور اس کی وجہ سے تقریباً تمام عالم اسلام میں قدیم و جدید کی جنگ جاری ہے اور اسی نامعقول جنگ کا [illegible] یہ ہے کہ کوئی اسلامی حکومت مضبوط اور پائیدار نہیں۔

کاش کہ اربابِ کالج اور اربابِ مدارس ان دو مختصر لفظوں کا مطلب کسی وقت بھی سمجھ جائیں اور دونوں قومیں ان دونوں مقاصد کے لئے متفق ہو کر کام کریں۔

۱: ایک طرف تہذیبِ جدید کی ایک ایک برائی کے خلاف قدیم و جدید علوم کے ماہر متفقہ کام کریں۔

۲: دوسری طرف دونوں مل کر ہنر جدید کی تحصیل کے لئے جد و جہد کریں تاکہ مسلمانوں کی بدقسمتی کا خاتمہ ہو اور جذباتی و حیوانی زندگی سے الگ ہو کر، باہمی جنگ و جدال ختم کر کے دین و عقل کی روشنی میں ہر دو دائرہ کار میں متفقہ اقدام کریں۔ پہلا دائرہ مغربی تہذیب کے خلاف جنگ کا اور دوسرا دائرہ مغربی ہنر کی تحصیل کے لئے جد و جہد کا۔

اگر فریقین ایک دوسرے کی بات سمجھنے کی کوشش کریں تو فکری انتشار اور تضادِ عمل کا فوراً خاتمہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اربابِ اقتدار بھی اسلام کے تہذیبی ورثہ کے تحفظ پر زور دیتے ہیں۔ حال ہی میں مشرقی پاکستان کے گورنر نے مغربی تہذیب کی مضرت رسانی کا ذکر کرتے ہوئے اسلامی تہذیب و تمدن کے تحفظ پر زور دیا۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ اس انتشار کی بڑی ذمہ داری ان چند افراد پر ہے جو فتنۂ استشراق کے شکار ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں فکری و عملی وحدت پیدا نہ ہو۔ اور کسی وقت بھی وہ طاقت ور نہ بن سکیں تاکہ سامراجیوں کا وہ فکری مقصد حاصل ہو جس کے لئے وہ کروڑوں روپے خرچ کر رہے ہیں۔

مذکورہ مشورے پر عمل کرنے سے زبان و قلم کی جنگ ختم ہو جائے گی اور ایک ایسا مثالی مضبوط اسلامی معاشرہ وجود میں آئے گا جو مادی اسباب ترقی اور روحانی قوت دونوں کا جامع ہوگا۔

مغربی تہذیب کا اسلامی ممالک میں فاتحانہ داخلہ | یہ ایک بڑا اہم سوال ہے کہ مغربی

تہذیب کو اسلامی ممالک میں فاتحانہ کامیابی کیونکر حاصل ہوئی ؟ جس سے اسلام جیسے دین فطرت کا چودہ سو سالہ ورثہ درہم برہم ہوگیا اس کے لئے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اسلامی ثقافت اور تہذیب کو اپنی پوری تاریخ میں صرف تین معرکے پیش آئے جو بنیادی ہیں۔

۱۔ اسلام کی ایرانی اور رومی تہذیب سے ٹکر

پہلا معرکہ اسلام کی پہلی صدی ہجری میں دنیا کی دو عظیم الشان تہذیبوں ایرانی اور رومی سے ٹکر لینے کا معرکہ تھا، جس میں اسلامی تہذیب مشرق و مغرب کی دو عظیم قوتوں اور تہذیبوں سے نبرد آزما ہوئی، یعنی ایرانی تہذیب اور رومی تہذیب سے۔

جہاں تک مادی اسباب کا تعلق ہے، مذکورہ ہر دو قومیں ہر قسم کے سامان سے لیس تھیں لیکن ان کے افکار و نظریات اور تہذیبی زندگی میں جان نہ تھی۔ اسلام نے اپنے فرزندوں کو افکار، عقائد و اعمال کا وہ استحکام بخشا تھا جس کا جواب ان کی حریف قوتوں کے پاس نہ تھا۔

ثقافت دراصل عقائد و افکار اور سیرت و کردار کی پختگی کا نام ہے جس سے پیدا شدہ جوش عمل اور اولوالعزمی کے آگے کوئی قوم ٹھہر نہیں سکتی۔ نہ گانے بجانے، رقص و سرود اور عیاشیانہ زندگی کا، کہ جس سے اس مذکورہ بلند اوصاف انسانیت کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور زنانہ پن اور مشقت گریز جذبا ابھرتا ہے۔

اس ٹکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تہذیب نے ان دونوں تہذیبوں کو شکست دی اور ان کے مقبوضہ علاقوں کو فتح کر کے اسلامی تہذیب و ثقافت کے رنگ میں ان کو ایسا رنگ دیا کہ آج تک کسی نہ کسی صورت میں وہی اسلامی رنگ باقی ہے۔

۲۔ اسلامی تہذیب کی تاتاری تہذیب سے ٹکر

دوسرا معرکہ ہلاکو اور چنگیز کا حملہ تھا جس نے اسلامی ثقافت سے ٹکر لی۔ یہ دوسرا معرکہ ایسا تھا کہ اس وقت کے مسلمانوں میں اسلامی ثقافت کے عمیق اور گہرے اثرات باقی نہیں رہے تھے۔ ایک حد تک علوم تھے لیکن ایمانی قوت کمزور ہوچکی تھی۔ اسلامی اعمال فسق و فجور اور عیاشی و راحت پسندی کی وجہ سے برائے نام رہ گئے تھے۔ البتہ صرف اسلامی افکار و علوم ان میں باقی رہ گئے تھے جن پر ان کا یقین باقی تھا۔ اور بالمقابل ایسی قوم تھی جو تعلیمیافتہ نہ تھی۔ اور علوم و فنون سے خالی تھی کوئی فکری تہذیب نہ رکھتی تھی۔ لیکن جوش عمل اور اپنے نصب العین پر اس کو پختہ یقین تھا جو اس وقت کے مسلمانوں میں کمزور ہوچکا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ یہ وحشی اور غیر تعلیم یافتہ قوم مسلمانوں کی تعلیم یافتہ قوم پر غالب آگئی اللہ تعالیٰ نے

اسلامی حکومتوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی لیکن ایک مضبوط ثقافت کے لئے جن پختہ عقائد وافکار اور ان سے متعلقہ علوم کی ضرورت تھی وہ تاتاریوں میں نہ تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی تہذیب اور مسلمان قوم اگرچہ بظاہر مفتوح ہوئے لیکن بالآخر فاتح ہوئے۔

تاتاریوں کو جب ان فتوحات کی وجہ سے اسلامی تہذیب اور ثقافت سے روشناسی ہوئی تو اسلامی تہذیب کے اثر سے ان کے دل و دماغ میں تبدیلی رونما ہونی شروع ہوئی اور کعبہ کو دشمنوں میں سے پاسبان مل گئے تیمور اور اس کی اولاد اور عثمانی ترک اسی قوم کے مختلف خاندان ہیں۔ جنھوں نے دور دراز علاقوں میں اسلام کو پھیلایا اور اسلامی عظمت قائم کی۔

۳۔ مغربی تہذیب کی اسلامی تہذیب سے ٹکر

تیسرا معرکہ جو اسلام کو پیش آیا وہ مغربی تہذیب اور ثقافت کا مقابلہ ہے جو انیسویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر اب تک جاری ہے۔ یہ اسلامی تاریخ میں سب سے شدید تر مقابلہ ہے۔

مغربی تہذیب نام ہے افکار و تصورات کا جن کو پوری دنیا میں اہل مغرب پھیلا رہے ہیں اور زندگی کے بود و ماند کے ان طریقوں کا جو ان کی عملی زندگی میں موجود ہیں۔ یہ تہذیب عقلی معیار کے اعتبار سے چاہے جس قدر بھی ناموزوں ہو۔ لیکن اس کی پشت پر ایک عظیم سیاسی قوت ہے اور تعلیم کا ایک وسیع نظام ہے تصنیفات و تحریرات کے بے شمار ذخائر ہیں، تصاویر اور فلمی دنیا کا ایک ہمہ گیر جال ہے معاشی اور اقتصادی برتری ہے یہ ایسی چیزیں ہیں جو ظاہر بیں طبقہ کی نگاہ کو خیرہ کرنے والی ہیں، اور اس تہذیب کے علمبرداروں نے خود مسلمانوں کی نئی نسل میں ایک بڑی با اثر اور با اقتدار جماعت تیار کی ہے جو اسلامی تہذیب کو فنا کرنے میں خود اہل مغرب سے زیادہ سرگرم عمل ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلام کے نو آزاد ممالک میں مغربی افکار و تہذیب اور اسلامی تہذیب و افکار کے درمیان مسلسل جنگ جاری ہے اور کسی اسلامی ملک کو استحکام نصیب نہیں ہوتا۔ روز نئے نئے انقلاب پیدا ہوتے رہتے ہیں اور بظاہر اس جنگ کا خاتمہ نظر نہیں آتا۔ تاوقتیکہ فریقین جذبات چھوڑ کر متفقہ طور پر تدبر اور عمیق بصیرت سے کام لے کر اس کا صحیح حل تلاش نہ کریں۔ دونوں جانب افراط و تفریط ہے اور راہِ اعتدال گم ہے۔ لیکن تعلیم قدیم کے ارباب تحقیق میں صاحب اعتدال کثرت سے موجود ہیں لیکن جدید والوں میں بہت کم ہیں بلکہ نایاب ہیں۔

یہ بے راہ روی ملت اسلام کے لئے زہر قاتل ہے، استعماری قوتوں کے لئے مفید ہے۔ وہ سمجھے

ہیں کہ اس جنگ سے مسلمان کمزور ہو کر استعماری قوتوں کے زیر اثر آجائیں گے اور مسلمان کے پاس مادی قوت تو مقابلۃً کم ہے جو کچھ ہے ان کی دینی و روحانی قوت ہے اس جنگ سے وہ بھی کمزور ہو جائے گی اور مسلمان استعماری قوتوں کے لئے لقمۂ تر بن جائیں گے۔

قدیم وجدید کی کشمکش کا اصلی حل

اصلی حل کے لئے یہ ضروری ہے کہ دونوں طبقے اپنے ذہن میں کچھ تبدیلی پیدا کریں۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ تقلیدِ مغرب کے جذبے سے ہٹ کر عقل و بصیرت سے کام لے کر تنقیدِ مغرب کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرے۔ اور اصلی اسلام تحریف کو چھوڑ کر تحقیق کی راہ اختیار کرے اور اسلام کو دشمنانِ اسلام کی تحریروں سے حاصل کرنے کی بجائے اگر ممکن ہو تو خود اس انداز میں اسلام کو سمجھنے کی کوشش کرے کہ خود اسلام کیا کہتا ہے اور کیا مطالبہ کرتا ہے؟

اس طرح نہ ہو کہ پہلے خود مغربی افکار کے اثر سے اپنے ذہن میں ایک رائے ٹھیرائی جائے اور پھر اسلام کو توڑ مروڑ کر اس کے مطابق کرنے کی کوشش کی جائے اور اگر وہ مغربی فکر کی ٹھیرائی ہوئی رائے کے مطابق بننے کے لئے تیار نہ ہو تو پھر یا تو تاویل کے پردے میں اصلی اسلام سے انکار کی راہ اختیار کی جائے یا اسلام کے ابدی دین ہونے کی حیثیت سے انکار کر کے اس کو وقتی قانون قرار دینے کی سعی کی جائے اور اسلام کے چودہ سو سالہ کے عملی اور خارجی وجود کو جس کا تانا بانا ان ہستیوں کے علم و تقوی اور مجاہدانہ کارناموں سے بنا ہے کہ ان کا ایک ایک فرد اور اس کی عظمت چند مغرب پرستوں پر کیا بلکہ پورے اہل مغرب پر بھاری ہے اور ایسے کروڑوں عظیم ہستیوں کا سمجھا پایا ہوا اسلام جس کے نتیجہ میں اسلام نے مراکش سے انڈونیشیا اور دیوار چین تک کی ظلمتوں کو کافور کر کے اپنی روشنی پھیلائی غلط سمجھ لیا جائے اور اس کے مقابل میں چودہ سو سال کے بعد چند مغرب زدہ مسٹروں نے دشمنانِ اسلام سے تعلیم پا کر صحیح اسلام معلوم کر لیا جو قبل ازیں چودہ سو سال میں کہیں بھی موجود نہ تھا۔

قدیم تعلیم یافتہ طبقہ میں جو حقیقی علماء ہیں ان میں تبدیلی کی ضرورت نہیں البتہ یہ ضروری ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ بدگمانی چھوڑ کر ان سے اسلام کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ نہ اس لئے کہ حقیقی اسلام کا فہم ان کا ٹھیکہ ہے۔ کیونکہ اسلام میں برہمنیت اور پاپائیت کا وجود نہیں کہ یہ دونوں نسلی نظریے ہیں اور اسلام ان کا قائل نہیں بلکہ اس لئے کہ ہر فن کے لئے معیاری قابلیت کا وجود ضروری ہے جو قدیم طبقہ کے پاس ہے اور جدید کے پاس نہیں۔

لہذا دونوں طبقوں کے ممتاز حضرات بیٹھ کر اس امر کی تحقیق کریں کہ یورپ کے پاس جو کچھ ہے ان

میں سے اسباب ترقی کی کونسی چیزیں ہیں۔ اور جو چیزیں ترقی سے تعلق نہیں رکھتیں اور اسلامی روح کے لئے مضر ہیں وہ کون سی ہیں اور جو ترقی سے غیر متعلق ہیں لیکن مباح ہیں وہ کون سی ہیں؟ اس طرح تین قسم کی اشیاء کی فہرستیں تیار ہوں گی۔

۱۔ ترقی سے متعلق اشیاء

۲۔ ترقی سے غیر متعلق اشیاء ممنوعہ۔

۳۔ ترقی سے غیر متعلق اشیاء جو مباح ہیں۔

میں نے "ترقی اور اسلام" کے موضوع پر جو کتاب لکھی ہے اس کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ یورپ کے پاس اسباب ترقی میں سے ایک چیز بھی ایسی نہیں جس کا اسلام نے اور قرآن نے چودہ سو سال پہلے حکم نہ دیا ہو۔ اس لئے مغرب زدہ طبقے کا یہ کہنا کہ "اسلام ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ یا ہم مغربیت کو ترقی کیلئے اختیار کر رہے ہیں" ایسا غلط اور بے اصل دعویٰ ہے جیسے دو دونے پانچ،،

اس نئے ترقی کے نئے پرانے اسلام کی تحریف کی قطعاً ضرورت نہیں اور نہ یورپی اسلام بنانے کی حاجت ہے بلکہ اسی اصلی اسلام کو فروغ دینے کی ضرورت ہے تاکہ مادی اسباب کے ساتھ روحانی جوش عمل اور اولوالعزمی ملت میں پیدا ہو اور غیر مسلم ممالک سے درآمد کردہ نظریات سرمایہ داری سودخوری، صنفی آوارگی، اخلاق کش طرزِ معاشرت، اشتراکیت، خدا بیزاری اور روحانی اقدار کی تباہی سے ملت کو محفوظ کیا جائے اور بے راہ روی اور انتشار ان کی وحدت فکر و عمل کو پارہ پارہ نہ کردے۔

دوسری قسم کی چیزیں جو یورپ کے وہ اجزاء تہذیب ہیں جن کا تعلق ترقی سے نہیں بلکہ اسلام اور حقیقی ترقی کے لئے مضر ہیں ان کو اسلامی ممالک اپنی تہذیب میں سے خارج کرنے کے لئے جہاد کریں اور تیسری قسم جو ترقی سے اگرچہ متعلق نہیں لیکن اسلام میں مباح ہیں، ان کو اختیار کرنے کی اجازت ہے۔

اس مشترکہ تحقیق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم کو یورپ کی گنا ہگاری کو جو ترقی کے لئے مضر ہے، ترک کرنا پڑے گا اور ان کی صنعت کاری کو جو ترقی میں مؤثر ہے اپنانا ہوگا کہ اس کا حکم تو خود قرآن نے دیا ہے وَ أَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ ایسی اشیاء کی جن سے مسلمان طاقتور بن سکتے ہیں جیسے یورپ کے ٹیکنیکل علوم و فنون۔ ان کو حاصل کرنا مسلمانوں پر اپنی طاقت کی آخری حد تک فرض ہے۔

اگر اقبال مرحوم کے صرف اس کلام کو مدنظر رکھا جائے تو بھی قدیم و جدید کی جنگ ختم ہو سکتی ہے۔

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقص دخترانِ بے حجاب

نے ز سحر ساحراں لالہ رواست
نے ز عریاں ساق وے از قطع مواست
محکمی او را نہ از لا دینی است
نہ فروغش از خط لاطینی است
قوت افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

افسوس ہے کہ ہم نے جدید ایجادات کا نہ تو کوئی قابل ذکر سائنس داں پیدا کیا۔ نہ یورپ کی طرح اسلحہ ساز کارخانے بنائے، نہ کوئی مشہور فلسفی اور نہ کوئی ماہر پیدا کیا۔ ہماری ساری قوت تحریف دین اور قدیم وجدید کی جنگ پر صرف ہو رہی ہے اور یورپ کی صنعت و ہنر کی جگہ یورپ کی گناہگارانہ تہذیب کو جزو زندگی بنانے کی کوشش پر اور اسی کو معراج ترقی سمجھ رہے ہیں۔

بہرحال اگر بیرونی ممالک کی تعلیم اس شکل میں حاصل کی جائے کہ وہاں کے وہ علوم جن کو فی الواقع ترقی میں دخل ہے۔ ان میں مہارت پیدا کی جائے۔ لیکن ان کے الحادی اور تشکیکی فلسفہ حیات سے پرہیز کیا جائے تو قوم روحانی اور مادی دونوں قوتوں سے بہرور ہو گی۔

ہم اگر مادی علوم میں کتنی بھی کوشش کریں۔ پھر بھی یورپ کی نسبت ان علوم میں ہماری حیثیت ثانوی ہو گی۔ لیکن اگر ہمارا دینی اور روحانی جذبہ محفوظ رہے۔ بلکہ اس میں اضافہ کرنے کی کوشش کریں تو مادی پہلو کی جو ناگزیر کمی ہے اس کا تدارک ہمارے روحانی جذبہ کی قوت سے ہو جائے گا اور ہم اپنے اسلاف کی طرح اپنی کمتر درمادی قوت اور فائق روحانی اور اخلاقی قوت سے اپنے سے بڑی مادی قوت کو شکست دے سکیں گے۔

اس سوال پر کلام کرتے ہوئے کہ مسلمانوں کو حکومت و اقتدار کیوں نہیں بخشا جاتا؟

مولانا محمد الیاسؒ نے فرمایا — اللہ کے احکام اور اوامر و نواہی کی حفاظت و رعایت جب کہ تم اپنی ذات اور اپنی منزلی زندگی میں نہیں کر رہے ہو (جس پر تمہیں اختیار حاصل ہے اور کوئی مجبوری نہیں ہے) تو دنیا کا نظم و نسق کیسے تمہارے حوالے کر دیا جائے، ایمان والوں کو حکومت ارضی دینے سے تو منشاء الٰہی یہی ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی مرضیات اسکے احکام کو دنیا میں نافذ کریں تو تم جب اپنے حدود اختیار میں آج یہ نہیں کر رہے ہو تو دنیا کی حکومت تمہارے سپرد کر کے کل کے لئے تم سے اس کی امید کی جا سکتی ہے؟ (از ملفوظات مولانا محمد الیاسؒ)

فتنہ انکارِ حدیث کا ایک تفصیلی جائزہ

بعثت نبویؐ اور تعمیر انسانیت

مولانا محمد اسلم شیخوپوری مدرس جامعہ بنوریہ کراچی ۱۶

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پیشتر عالم انسانی موت کی ہچکیاں لے رہا تھا۔ ظلم و تشدد کا دور دورہ تھا۔ بدی اور گمراہی کا تسلط اور اخلاقی قدریں پامال ہو رہی تھیں اور انسان انسانیت کا لبادہ اتار کر بہیمیت اور درندگی کا روپ دھار چکا تھا۔ انسانی سسکیوں، ہچکیوں اور پستیوں پر خداوند عالم نے ترس کھایا اور اس نے دانائے سُبل ختم الرسل مولائے کل محمد رسول اللہ کو گم کردہ راہ انسانیت کی تربیت کے لئے نبی بنا کر بھیجا۔ اور قرآن حکیم کی صورت میں آپ کو ایک نسخہ کیمیا ایک سرچشمۂ حیات ایک دستور زندگی عطا کیا۔ مگر آپؐ نے محض خدا کا پیغام پہنچانے پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اس کلام بلاغت نظام کے مجملات کی اپنے مخاطبین کے سامنے تفصیل کی۔ اور اس کے مشکلات کی تیسیر اور مبہمات کی توضیح کی۔ اور ان کے عقائد و اعمال، اخلاق و معاملات کو گمراہی اور کج روی چونکہ ہمہ جہت اور ہمہ گیر تھی اس لئے آپ کی تعلیم و تربیت کا دائرہ کار بھی ہمہ جہت اور ہمہ گیر تھا۔ عقائد کی تصحیح کے لئے بے شک علمی دلائل، محکم براہین اور فطری نظائر ان کے سامنے پیش کئے گئے اور ان سے غور و تدبر کرنے کی اپیل کی گئی۔ اخلاق و معاملات کی درستگی کے لئے آپ کی زندگی اور سیرت کردار کو نمونہ اور مثال بنا کر ان کے سامنے پیش کیا گیا اور ان کو حکم دیا گیا کہ آپؐ ہی کی اتباع کریں۔ زندگی کی ہر جہت میں معاشرت کے ہر پہلو میں، معیشت کے ہر مسئلے میں اور معاملات کے ہر انداز میں اور یقیناً اتباع اور اطاعت کا حق ادا کیا ان نصیبہ وروں نے جو شرف صحابیت سے نوازے گئے اور جن کو سعادت میسر آئی آپ پر ایمان لانے اور آپ کی معیت و رفاقت کی۔ ان کی اطاعت ہمہ جہت تھی۔ ہمہ وقت تھی۔ ہمہ تن تھی۔ ان میں کا ہر ایک اپنی سب سے بڑی سعادت یہی سمجھتا تھا کہ سرور عالم کی اداؤں اور سیرت و کردار کی جھلک اس کی زندگی میں دکھائی دے اور اس کا ہر قدم آپ کے فرمودات اور ہدایات کی روشنی میں اٹھے۔ آں حضورؐ کے اولیں مخاطب چونکہ زبان شناس تھے اور ادا شناس بھی۔ اس لئے وہ اس اطاعت کا مفہوم خوب سمجھتے تھے۔ جس کا حکم ان کو بار بار دیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں آپ اور آپ کی احادیث کا مقام اور مرتبہ بھی ان سے مخفی نہ تھا وہ اپنے تنازعات میں آپ کو حکم ٹھہراتے تھے۔ صحابہ کی زندگی میں سے

ایک مثال بھی ایسی نہیں پیش کی جا سکتی کہ انھوں نے کبھی آپ کی حدیث کو چھوڑ کر اپنی ذاتی رائے اور قیاس اور اجتہاد پر عمل کیا ہو۔

انکارِ حدیث کی ابتداء اور اس کے اسباب

احادیث نبویہ کو امت میں یہی حیثیت حاصل رہی لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ خلافت میں مسلمانوں کی تلواریں آپس میں ٹکرائیں اور فتنہ و فساد پھیل گیا۔ تو ابن سبا یہودی کے منافق ساتھیوں نے اسلام کے خلاف سازش شروع کی۔ انھوں نے قرآن حکیم کو محرف بتایا اور صحابہ کرام کو دشنام طرازیوں کا نشانہ بنایا اور اہل بیتؓ کے سوا کسی بھی صحابی کی روایت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف خوارج نے تحکیم (ثالثی) کو قبول کر لینے کی وجہ سے صحابہؓ کو (نعوذ باللہ) کافر قرار دیا اور ان کا کہنا ہے کہ کافر کی روایت کیسے قبول کی جا سکتی ہے؟

اس میں شک نہیں کہ خوارج کے انتہا پسندانہ نظریات نے دین کو بے حد نقصان پہنچایا۔ مگر ان کے بارے میں معتبر تاریخی روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ یہ لوگ انتہائی راست باز غیرت مند اور بات کے سچے اور کھرے تھے۔ وقتی مصلحتیں، نفسانی خواہشیں اور ذاتی عداوتیں ان کو دروغ گوئی پر برانگیختہ نہیں کرتی تھیں۔ اس کے برعکس سبائی انتہائی درجہ کے عیار، منافق، دروغ گوئی اور کمینگی کے تمام صفات سے مالامال تھے۔ انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ یہ لوگ بجز چند کے تمام صحابہؓ کو خائن، فاسق، غاصب اور مرتد قرار دیتے ہیں۔ ایسے متعصب اور غالی افراد سے خیر کی توقع کیسے رکھی جا سکتی ہے۔ پھر جب غیر مسلم اقوام کثیر تعداد میں اسلام میں داخل ہونے لگیں۔ اور ہر عقیدہ اور ہر مذہب کے لوگوں نے ایمان قبول کر تو ان کی وجہ سے طرح طرح کے خیالات مسلمانوں میں پھیلنے لگے اور مختلف قسم کے عقلی اعتراضات اسلام پر کئے جانے لگے۔

مسلمانوں کا ایک گروہ ان خیالات اور فلسفوں سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس گروہ نے ان تمام مسائل کا انکار کر دیا جو ان کی محدود عقل میں نہ سماتے تھے یا ان میں حسب منشا تحریف اور تغیر و تبدل کر دیا۔ حشر و نشر، رویت باری تعالیٰ، پل صراط، میزان، جنت، جہنم جیسے مسلّم عقائد میں سے ہر ایک ان کے دست تحریف اور عقل فتنہ انگیز کا محض اس لئے نشانہ بنا کہ یہ مسائل ان کے غلط معتقدات اور فاسد خیالات کے خلاف تھے۔ یہ گروہ اسلامی تاریخ میں معتزلہ کے نام سے مشہور ہوا۔ مگر تمام برائیوں اور گمراہیوں کے باوصف یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ یہ لوگ اہل علم تھے۔ صاحب زبان تھے عربی ادب کے اسرار و رموز سے واقف تھے اور دین سے مکمل طور پر، بلکہ محض اپنے زمانہ کے فلاسفہ اور

پرستوں کے خلاف عقل (بلکہ مافوق العقل، مافوق العقل میں نے اس لئے کہا کیونکہ جو
مسائل اور عقائد انسان کی محدود عقل میں نہ سما سکیں انھیں ہم زیادہ سے زیادہ مافوق العقل ہی قرار
دے سکتے ہیں ان کو خلاف عقل کہنا کسی طرح بھی درست نہ ہوگا) مسائل کا انکار یا ان کی حسب تقاضائے
عقل تاویلیں کر دیتے تھے اسی لئے انھوں نے کبھی بھی احادیث کو نشانہ تضحیک نہیں بنایا اور نہ ہی جماعت
صحابہؓ اور تابعینؒ اور محدثین پر انھوں نے پھبتیاں کسیں ۔

انکار حدیث کی یہ تحریک کچھ زیادہ نہ چل سکی کیونکہ وہ مسلمان زندہ تھے جنھوں نے صحابہ کا مبارک
دور دیکھا تھا۔ اور جگہ جگہ علمی مراکز قائم تھے۔ مجالس علم عام تھیں۔ اور شہوانی خیالات اور اغراض پرستی
نے عقلوں کو زنگ آلود نہیں کیا تھا۔ علاوہ ازیں متعدد نامور اہل علم اس فتنہ کی سرکوبی کے لئے اٹھ کھڑے
ہوئے اور انھوں نے ان نام نہاد عقلیت پرستوں کے دام ہمرنگ زمین کا تار بکھیر کر رکھ دیا۔

متقدمین میں سے جن لوگوں نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے ان میں سے امام شافعیؒ امام
محمدؒ، امام غزالیؒ، ابن حزمؒ اور حافظ سیوطیؒ کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر اور باعث فخر ہیں۔ حقیقت
یہ ہے اس فتنہ کی پیشین گوئی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت پہلے فرمائی تھی۔

لا الفین احدکم متکئاً علی اریکتہ یاتیہ الامر من امری مما امرت بہ او نھیت عنہ فیقول لا ادری ما وجدنا فی کتاب اللہ اتبعناہ،

(ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

میں تم میں سے کسی کو اپنی مسندوں پر سہارا لگائے ہوئے (اس حالت میں) نہ پاؤں کہ جب میرا حکم اس کے پاس پہنچے جس میں کسی کام کے کرنے کو میں نے کہا ہو یا کسی کام سے روکا ہو (تو جھٹ) یہ کہے کہ میں نہیں جانتا کہ یہ کیا حکم ہے ہم تو جو قرآن میں پائیں گے فقط اس کی پیروی کریں گے۔

تیسری صدی تک اس فتنے کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ علماء کی انتھک کوششوں، محدثین کی شبانہ روز تحقیق
و جستجو اور منکرین حدیث کے خام نظریات اور غیر سنجیدہ دلائل نے اس فتنے کو اپنی موت آپ مرنے پر مجبور کر دیا۔
پھر صدیوں تک کامل سکوت اور اطمینان رہا۔ تاآنکہ تیرھویں صدی ہجری میں مستشرقین نے اسلامی عقائد
اور مآخذ اور مراجع کو اپنی تحقیق انیق کا تختہ مشق بنایا۔ اور سائنٹفک ریسرچ کے نام سے مختلف موضوعات
پر کافی تعداد میں کتابیں تصنیف کیں تو اس فتنے کو نئی زندگی مل گئی۔

یہ مستشرقین حقیقت میں مسلمانوں سے انتقام لینا چاہتے تھے۔ صلیبی جنگوں میں رسوا کن شکست اور پسپائی
اور مسلمانوں کے جذبہ جہاد، شوکت و عظمت اور قوت و ہیبت کی وجہ سے انتقام کی کوئی صورت انھیں نظر نہ آئی بجز
اس کے کہ اسلامی شخصیات کو مطعون کیا جائے۔ اور دینی عقائد کے بارے میں مسلمانوں کے یقین اور اعتماد کو

تنزل کیا جائے۔ اور وہ اپنی اس مذموم کوشش میں کسی حد تک کامیاب ہو گئے۔ مغلوب اور مفتوح مسلمان قوم کے بعض افراد اپنے حکمرانوں کے ہم نسب مصنفین کی تحقیقات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور مختلف اسلامی ممالک میں بعض تجدد پسند حضرات نے مستشرقین کی ہمنوائی کی۔ متحدہ ہندوستان میں تحریک استشراق کا خیر مقدم کرنے والے سر سید احمد خاں اور مولوی چراغ علی تھے۔ انھوں نے سرزمین ہند میں انکار حدیث کا بیج بویا اور ایسی کتابیں تصنیف کیں جن کے لفظ لفظ سے غلامانہ ذہنیت کی بو آتی تھی۔ پھر عبداللہ چکڑالوی نے اسے سہارا دیا۔ اس کے بعد مولوی احمد دین امرتسری نے اسے مزید ترقی دی۔ پھر اسلم جیراج پوری نے اس تحریک کا علم اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور جہاں تک جا سکتا تھا گیا اسکے بعد مرزا غلام احمد قادیانی اٹھا۔ احادیث تو کیا وہ حریمِ نبوت تک نقب زنی سے باز نہ آیا۔ بالآخر ان سب ضلالتوں، خرافات اور کج ادائیوں کا وارث چوہدری غلام احمد ٹھہرا۔ اسے کچھ زندگی بھی لمبی مل گئی، رخام حال ملبہ پہلے سے موجود تھا۔ جادو طراز علم، حالات موافق اور ذہن نارسا تھا یوں ضلالت وگمراہی کی پوری عمارت اس نے کھڑی کر دی۔ موجودہ دور میں انکار حدیث کے علمبرداروں میں سے ایک عمر احمد عثمانی بھی ہے۔ موجودہ دور میں احادیث کو ناقابل اعتبار ٹھہرانے کے لئے جدت طرازی سے کام لیا ہے۔

پرانے اور نئے منکرین حدیث میں بعض وجوہ میں مماثلت اور بعض وجوہ میں مغائرت ہے۔ ہمارا روئے سخن دورِ حاضر کے منکرین کی طرف ہے۔ اس لئے ہم قدرے تفصیل کے ساتھ ان اسباب پر روشنی ڈالیں گے۔ جنھوں نے ان کو انکار حدیث پر برانگیختہ کیا۔ اس کے بعد ہم ان کے مخصوص طریقۂ کار کا بھی جائزہ لیں گے۔

وجوہ و اسباب

دورِ حاضر میں انکار حدیث کے چند ایک اسباب یہ ہیں!

۱۔ جہالت وکم علمی۔ منکرین کا علمی مطالعہ بہت محدود اور معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کتب احادیث کو بالاستیعاب دیکھنے کی سعادت انکو کم ہی میسر آتی ہے اسماء الرجال، اسناد حدیث اور مصطلح الحدیث جیسے بلند پایہ علوم سے یہ قطعًا نابلد ہیں۔ حدیث پر ان کے اعتراضات اکثر و بیشتر بلکہ تمام تر کم علمی اور جہالت پر مبنی ہیں۔ آپ نے ان کا یہ مشہور اعتراض تو سنا ہوگا۔ جس کے ذریعے سے بھولے بھالے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے فرمایا کہ میں نے چھ لاکھ احادیث میں سے صرف نو ہزار کو صحیح احادیث کی حیثیت سے منتخب کیا۔ یہاں وہ ایک اشکال تو یہ پیش کرتے ہیں کہ اتنی زیادہ احادیث کہاں سے آگئیں۔ دوسرا یہ کہ اگر صرف نو ہزار احادیث صحیح ہیں تو باقی پانچ لاکھ اکانوے ہزار احادیث گویا ضعیف، ناقابل اعتبار، موضوع اور جھوٹے واقعات پر مبنی ہوں گی

یہاں منکرین نے تین جہالتوں کا ثبوت دیا ہے۔ ایک یہ کہ ان کو احادیث کی کمی بیشی کے اصول کا علم نہیں۔ دوسرے یہ کہ امام بخاریؒ کے اپنی کتاب میں صحیح احادیث کے انتخاب سے قطعًا یہ بات لازم نہیں آتی کہ بقیہ

احادیث ضعیف ہوں، ستم ظریفی یہ ہے کہ صحیح کی تعریف اور حقیقت ان کو قطعاً معلوم نہیں۔
آئندہ صفحات میں ہم انشاء اللہ ان کے اس اعتراض کا تفصیلی جائزہ پیش کریں گے۔

۲۔ منافقت:۔ رسول اکرمؐ کے خلاف ان کی غیظ و غضب سے لبریز تصانیف اور اکابر امت پر ان کی دشنام طرازیوں سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف کدورت اور بغض و عناد جاگزیں ہے اور ان کا دعویٰ ایمان سراسر منافقت پر مبنی ہے۔

۳۔ تساہل پسندی اور آزاد خیالی۔ اسلام انسانی زندگی کو جن حدود و قیود کا پابند بنانا چاہتا ہے ان سے چھٹکارا انکار حدیث کے بغیر ناممکن ہے۔ ظاہر ہے۔ یہ پنج وقتہ نمازیں۔ یہ سالانہ روزے، یہ زکوٰۃ، یہ عشر اور صدقات کا ایک مرتب نظام۔ یہ حج پر از مشقت سفر۔ اور قربانی۔ دینی زندگی کا یہ مربوط نظام احادیث ہی نے تو ترتیب دیا ہے پھر معاملات میں حلال و حرام کی تمیز، جائز و ناجائز کی پہچان، یہ زن و شوہر کے حقوق یہ پردہ۔ اور عفت و عصمت کے مضبوط اصول یہ پاکی ناپاکی کے مسائل، یہ معاش اور معاشرت، تجارت اور سیاست کے بارے میں بعض ہدایات۔ یہ سب کچھ ہمیں اسوۂ حسنہ کی پیروی ہی سے تو ملا ہے۔ اغراض کے وہ بندے اور حرص و آرزو کے وہ غلام جو اباحیت مطلقہ چاہتے ہیں۔ وہ ان قیودات کا تحمل کیسے کر سکتے ہیں۔ ان کا تساہل پسند اور دلدادۂ عشرت مزاج اور ان کی آزاد خیالی ان پابندیوں کی ہرگز روادار نہیں۔ مگر وہ مسلمان بھی رہنا چاہتے ہیں، اسلام کو چھوڑ کر مسلمان رہنے کا بہترین نسخہ انھوں نے یہ سوچا ہے کہ احادیث کو اوہام و خرافات کا انبار قرار دے کر قرآنی اصطلاحات میں من مانی تاویلات کر لی جائیں۔

۴۔ تشتت و افتراق۔ بعض مجتہدین کا خیال یہ ہے کہ امت کے باہمی اختلاف اور افتراق کا سبب احادیث ہیں اگر احادیث نہ ہوں تو یکایک ساری کی ساری امت یک جان دو قالب ہو جائیگی۔ لہٰذا یہ حضرات پوری نیک نیتی کے ساتھ احادیث کے دفترہائے کتب کو سپرد آتش کر دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انتشار امت کا سبب احادیث نہیں بلکہ ترک احادیث ہے، پہلی امتوں میں بھی افتراق و انتشار اسی وقت رونما ہوا۔ جب انھوں نے انبیاء کرام علیہم السلام کی سنتوں کو چھوڑ دیا، اور اس امت میں بھی خوارج، شیعہ، معتزلہ، مرجئہ، جہمیہ، قادیانی، پرویزی، احادیث ہی سے اعراض و اغماض کی وجہ سے نمودار ہوئے۔ صاف بات یہ ہے کہ فرقہ بندی کا باعث نہ قرآن ہے نہ احادیث، بلکہ وہ عقل ہے جو صرف اپنے اعتماد پر مذہب کا نقشہ تیار کرنا چاہتی ہے۔ وہ خواہشات ہیں جن کی غلامی انسان نے اختیار کر رکھی ہے۔ وہ اغراض ہیں جو ہر جائز و ناجائز پر انسان کو مجبور کر دیتے ہیں۔ یورپ کی وہ اندھی تقلید ہے جس نے ہم سے کھرے اور کھوٹے کی پہچان کی صلاحیت چھین لی ہے۔

۵۔ مستشرقین پر بے جا اعتماد:۔ انکار حدیث کا پانچواں سبب یورپی مستشرقین کی تحقیقات پر بے جا اعتماد ہے

بلکہ منکرین کا سارا اعتماد ہی ان ہی غارت گروں کی تالیفات پر ہے۔ ان میں سے اکثر اصلی مآخذ و مراجع سے قطعاً نابلد ہیں۔ اور ان کا مبلغ علم انگریزی تراجم اور یورپین مصنفین کی تالیفات ہیں حالانکہ یورپی مصنفین نے اپنی مؤلفات میں جس بددیانتی اور بغض و عناد کا ثبوت دیا ہے وہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

۶۔ مرعوبیت:۔ یورپ کی سائنسی ایجادات اور مادی ترقی سے مرعوبیت بھی انکار حدیث کا ایک بڑا سبب ہے، ہم جدید انکشافات اور تحقیقات سے استفادہ کو معیوب نہیں گردانتے۔ مگر ان سے اس درجہ مرعوب ہوجانا کہ یورپ سے برآمد نظریہ اور ہر عقیدہ کو الہامی خیال کرنا اور اس کے مطابق دین اسلام میں قطع و برید اور تحریف کر دینا کہاں کی شرافت ہے، حقیقت میں ایک طویل عرصہ تک انگریز کی غلامی نے ہمارے بعض تعلیم یافتہ حضرات کو ذہنی غلامی کا خوگر بنالیا ہے، جلتی پر تیل کا کام ہمارے نظام تعلیم نے کیا ہے، جو دراصل لارڈ میکالے کا ترتیب کردہ ہے۔ اس نظام تعلیم کے بدولت دفتروں کے کلرک، اباحیت پسند بابو اور مطلق العنان لیڈر تو بھلے پیدا ہوسکتے ہیں مگر صاحب کردار اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کا پیدا ہونا مشکل ہے۔

۷۔ قساوت قلبی:۔ بعض لوگوں کے قلوب آلودۂ معصیت ہونے کی وجہ سے اس قدر سخت اور سیاہ ہوجاتے ہیں کہ بھلی باتیں بھی ان کو بری محسوس ہوتی ہیں، یہ اپنی برائیوں کو چھوڑنے پر تیار نہیں۔ اس لئے انھوں نے احادیث ہی کا انکار کر دیا۔ تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری، اگر ان کی قساوت قلبی اور باطنی ظلمت دور ہو تو احادیث کی اہمیت اور قدر و قیمت ان کو یقیناً محسوس ہو۔

طریق کار منکرین حدیث اپنے فاسد خیالات کو عام لوگوں میں پھیلانے اور انھیں متأثر کرنے کیلئے مختلف دسیسہ کاریاں کرتے ہیں۔ ہم اپنی محدود معلومات اور مطالعہ کی حد تک یہاں ان کی وضاحت کرتے ہیں۔

۱۔ قرآن کی مظلومیت کی دہائی دینا پوری امت پر تغافل بے علمی اور بدفہمی کی تہمت لگانا اور اپنے آپ کو قرآن کے ہمدرد و غمخوار، اور اس کے علوم و معارف کا ماہر و حاذق جتلانا۔

۲۔ قرآن و سنت کو باہم متضاد ثابت کرنا اور یہ تأثر دینا کہ سنت قرآن کی شرح نہیں ہے بلکہ اس کے صریح احکام کی نفی کرتی ہے۔

۳۔ قرآنی نصوص کو من مانی تاویلات اور تعبیرات کا تختۂ مشق بنانا اور اسے اپنے برخود غلط قیاسات اور خیالات کے تابع بنانا۔ ایسے قیاسات اور ایسی تعبیرات کرنا جن سے امت آج تک ناواقف تھی۔

۴۔ مغرب سے درآمدہ اوہام اور خرافات کو عین اسلام ثابت کرنے کے لئے ہٹ دھرمی اور سینہ زوری سے کام لینا۔

۵:۔ مختلف مکتبہ ہائے فکر کے فروعی اختلافات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا۔ ان کو اصولی اور اساسی رنگ دینا۔ اور پھر اس بنیاد پر یہ ثابت کرنا کہ اس سارے تشتت وافتراق کی اصل وجہ احادیث ہیں۔ اگر اس دفتر پارینہ کو غرق کر دیا جائے تو کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

۶:۔ بعض خوارق اور معجزات کا محض اس لئے مذاق اڑانا کہ وہ مافوق العقل ہیں اور بقول ان کے ہر وہ چیز ردی میں پھینکنے کے قابل ہے جس کا احاطہ عقل انسانی نہیں کر سکتی۔ خواہ وہ سید الانبیاء کے فرمودات ہی کیوں نہ ہوں۔

۷:۔ بزرگان دین، اکابر امت اور سلف صالحین کے بارے میں بے پر کی اڑانا، ان کو تضحیک وطعن و تشنیع کا نشانہ بنانا۔ ان کے کردار وعمل پر پھبتیاں کسنا۔ اور (خاک بدہن منکرین) ان کو زر پرست اور حکومت وقت کا کاسہ لیس ثابت کرنا۔ ان کو وضاع اور کذاب قرار دینا اور پھر اس الزام کا مورد ان کو ٹھہرانا جس سے ان کی حیثیت مجروح ہو اور ان کے متعلق لوگوں میں بدگمانی اور بے اعتمادی پیدا ہو

۸:۔ اسلام کے اساسی احکام وعقائد وعبادات اور معاملات کے بارے میں تشکیک پیدا کرنا۔

۹:۔ صریح عبارتوں اور نصوص میں تحریف کرنا اور ان کے معنی اور مراد کو غلط بیان کرنا۔

۱۰:۔ حوالے نقل کرنے میں خیانت قطع وبرید اور کتمان حق سے کام لینا ادھوری یا سیاق وسباق سے کٹی پھٹی عبارتیں نقل کرنا۔

۱۱:۔ آں حضورؐ کے خانگی زندگی کے واقعات کو نقل کر کے (نعوذ باللہ) ان پر فحش کاری اور برہنگی کا لیبل لگانا اور پھر جاہل اور کم علم لوگوں سے دہائی دینا کہ لوگو یہ کتب احادیث کیسے قابل اعتماد ہو سکتی ہیں جبکہ انہیں سراسر فحاشی اور عریانی کی داستانوں سے بھر دیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ خانگی واقعات منقول ہیں اس لئے درج ہیں۔ تاکہ افراد امت کو زن وشوہر کے تعلقات اور مسائل میں رہنمائی حاصل ہو۔ ہر واقعہ، عقیدہ، اور آپؐ کے ہر ارشاد کو اپنی عقل مستعار کی میزان میں تولنے اور پرکھنے کی کوشش کرنا اور یہ دعوی کرنا کہ ہر وہ بات جو ہماری لنگڑی عقل میں نہیں سماتی وہ قرآن کے بھی خلاف ہے۔ لہذا رد کر دینے کے قابل ہے۔

۱۲:۔ اپنی تمام تر تحقیقات اور نام نہاد علمی کاوشوں کا مدار اسلام کے بارے میں مستشرقین کے انگریزی لٹریچر پر رکھنا اور انہیں اس سلسلے میں حرف آخر سمجھنا اور اصل وحقیقی ماخذ اور مراجع سے بے تعلق رہنا

۱۳:۔ احادیث کی معتبر کتابوں کی بجائے ادب وتاریخ، شعر وسخن اور حکایات وقصص کی کتب کا سہارا لینا۔

مثلاً دمیری کی کتاب حیوٰۃ الحیوان، یا الف لیلہ، دلیلہ یا العقد الفرید یا کتاب الاغانی وغیرہ۔ حالانکہ یہ کتابیں ہر طرح کے رطب و یابس اور مشتبہ روایات سے بھری پڑی ہیں۔ اور یہاں بھی ان کا مقصد مسائل کی تحقیق یا دینیات کی بحث ہرگز نہیں ہوتا۔

۱۴:۔ دین کے کسی ایک جز کو نہیں، شریعت کے کسی ایک حکم کو نہیں، رسول اکرمؐ کے کسی ایک فرمان کو نہیں بلکہ پورے دین کو اپنی تحقیق اپنی اور اجتہاد پر از فساد کا تختۂ مشق بنانا۔ براہین کے (معجزات تک۔ عبادات سے لے کر معاملات تک، معاشرت سے لے کر معیشت تک، سیاست سے لے کر تجارت تک) ہر شعبہ میں اپنی رائے کو فوقیت دینا اور قرون اولیٰ سے مروج مسائل ان کی تعبیرات اور ان کے طریق کار کو ناقابل اعتماد ٹھہرانا۔

اگر آپ دورِ حاضر کے منکرین کے درج ذیل دعاوی پر غور فرمائیں گے تو ہمارے مدعا کی مزید تصدیق فرمادیں گے۔

- اللہ و رسول سے مراد مرکز ملت اور اولو الامر سے مراد افسران ماتحت ہیں۔
- اللہ اور رسول کی اطاعت سے مراد مرکزی حکومت کی اطاعت ہے۔
- ختم نبوت سے مراد یہ ہے کہ اب دنیا میں انقلاب شخصیتوں کے ہاتھوں نہیں بلکہ تصورات کے ذریعہ رونما ہوا کرے گا۔ اور انسانی معاشرہ کی باگ ڈور اشخاص کی بجائے نظام کے ہاتھوں میں ہوا کرے گی۔
- وراثت، قرضہ لین دین، صدقہ و خیرات سے متعلق احکام اس عبوری دور سے متعلق ہیں جس میں سے معاشرہ گذر کر انتہائی منزل تک پہنچتا ہے۔
- خدا عبارت ہے ان صفات عالیہ سے جنہیں انسان اپنے اندر منعکس کرنا چاہتا ہے۔
- مرنے کے بعد جنت اور جہنم مقامات نہیں انسانی ذات کی کیفیات ہیں۔
- قرآن ماضی کی طرف نگاہ رکھنے کے بجائے ہمیشہ مستقبل کو سامنے رکھنے کی تاکید کرتا ہے اسی کا نام ایمان بالآخرت ہے۔
- ملائکہ سے مراد نفسیاتی محرکات ہیں جو انسانی قلوب میں اثرات مرتب کرتے ہیں۔
- انکشافات حقیقت کی روشنی (ذریعہ یا وسطہ) کو جبرائیلؑ سے تعبیر کیا گیا ہے۔
- جنت سے نکلنے والا آدم کوئی خاص فرد نہیں تھا بلکہ انسانیت کا تمثیلی نمائندہ تھا۔
- نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قرآن کے سوا (جو عقلی معجزہ ہے) کوئی اور معجزہ نہیں دیا گیا۔

- خیال ہے کہ اگر یہ واقعہ (معراج کا واقعہ) خواب کا نہیں تو یہ حضور اکرمؐ کے شب ہجرۃ کا بیان ہے۔ اس طرح مسجد اقصیٰ سے مراد مدینہ کی مسجد نبوی ہوگی جسے آپؐ نے وہاں جاکر تعمیر کیا۔
- قرآن کریم نے نماز پڑھنے کے لئے نہیں کہا، قیام صلوٰۃ یعنی نماز کے قیام کا حکم دیا۔
- اگر جانشین رسولؐ (قرآنی حکومت) نماز کی کسی جزئی شکل میں جس کا تعین قرآن نے نہیں کیا۔ اپنے زمانے کے کسی تقاضے کے ماتحت کچھ ردوبدل کرنا ناگزیر سمجھے تو وہ ایسا کرنے کی مجاز ہوگی۔
- زکوٰۃ اس ٹیکس کے علاوہ اور کچھ نہیں جو اسلامی حکومت مسلمانوں پر عائد کرے۔ اس ٹیکس کی کوئی شرح متعین نہیں کی گئی۔
- صدقات ان ٹیکسوں کا نام ہے جو حکومت اسلامیہ کی طرف سے ہنگامی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ان پر عائد کئے جاتے ہیں۔ انہی میں صدقہ فطر ہے۔
- حج عالم اسلامی کا وہ عالمگیر اجتماع ہے جو اس امت کے مرکز مخصوص (کعبہ) میں اس غرض کے لئے منعقد ہوتا ہے کہ ملت کے تمام اجتماعی امور کا حل قرآنی دلائل و حجت کی روسے تلاش کیا جائے۔
- حج عالم اسلامی کی بین المسلمی کانفرنس کا نام ہے اس کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کے خورد و نوش کے لئے جانور ذبح کرنے کا ذکر قرآن میں ہے۔ بس یہی قربانی کی حقیقت جو آج کیا سے کیا بن کر رہ گئی۔
- یہ عقیدہ کہ بلا سمجھے قرآن کے الفاظ دہرانے سے ثواب ہوتا ہے یکسر غیر قرآنی عقیدہ ہے۔
- قرآن کی رو سے صرف مردار، بہتا خون، لحم خنزیر، اور غیر اللہ کی طرف منسوب چیزیں حرام ہیں۔ ان کے علاوہ اور کچھ حرام نہیں (بحوالہ پرویز کے بارے میں علماء کا متفقہ فتویٰ)

(بشکریہ ختم نبوت)

معیار افضلیت

حبیب الرحمٰن قاسمی

حضرات خلفاء اربعہ میں سب سے افضل کون ہے

حضرت مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے اپنی معرکۃ الارار اور لاجواب تصنیف "تحفۂ اثنا عشریہ" کی تالیف کے بعد اپنے بعض اصحاب کی درخواست پر "السر الجلیل فی مسئلۃ التفضیل" کے نام سے ایک رسالہ مرتب فرمایا جس میں حضرات خلفاء اربعہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان فرق مراتب اور ترتیب مراتب کو ایسے عمدہ طریقے پر ثابت کیا ہے کہ متلاشی حق کے لئے اب اس مسئلہ میں کسی قسم کے ریب و شک کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ یہ رسالہ اس وقت کی علمی زبان فارسی میں لکھا گیا تھا اور اب چونکہ فارسی تقریباً متروک ہو چکی ہے اس لئے اس رسالہ سے استفادہ عام طور پر ممکن نہیں رہا بالخصوص اردو خواں طبقہ تو اس سے مستفید ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی طبقہ کی رعایت میں اس رسالہ کو اردو کے قالب میں پیش کیا جا رہا ہے اس سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ تحت اللفظ ترجمہ کے بجائے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے مفہوم کو عصری اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس لئے بہت سی جگہوں پر توضیحی عبارت کا اضافہ ناگزیر ہو گیا ہے اگرچہ یہ چیز خشیہ ترجمہ کے لئے عیب شمار ہوتی ہے لیکن مفہوم کی وضاحت کے مقابلہ میں یہ عیب انگیز کیا جانا چاہیے۔

حبیب الرحمٰن قاسمی

اس مسئلہ پر گفتگو سے پہلے فضیلت کی قسموں کو جان لینا ضروری ہے کیونکہ اسی پر افضلیت کا مدار ہے کتاب و سنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فضیلت کی دو قسمیں ہیں (۱) فضیلت اختصاصی (۲) فضیلت اکتسابی (جسے حضرت شاہ عبد العزیز قدس سرہ نے فضیلت جزئی سے تعبیر کیا ہے۔

فضیلت اختصاصی | یہ محض عطیہ الٰہی اور موہبت ربانی ہے جس میں اطاعت و عبادت کا

کوئی دخل نہیں ہے بس اللہ تعالیٰ اپنے فضل بے پایاں سے ایک شئے کو دوسری شئے پر فضیلت و فوقیت عطا کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ مالک مطلق ہے اپنی مملوکات میں سے جسے چاہے اپنی عنایت خاص سے سرفراز کر دے۔

جسے چاہے مالک دوجہاں اسے رفعتوں سے نواز دے

یہ فضیلت اپنے اندر بڑی وسعت اور عمومیت رکھتی ہے۔ انسان، حیوانات، جمادات بلکہ جواہر و اعراض تک کو اس سے کچھ نہ کچھ حصہ ملا ہے۔ درج ذیل مثالوں سے اس کی ہمہ گیری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

فضیلت اختصاصی کی چند مثالیں

مثلاً فرشتوں کو وجود اور پیدائش میں تمام مخلوق پر اولیت اور تقدم کی فضیلت حاصل ہے کیونکہ خلعت وجود سب سے پہلے انھیں کو عطا کیا گیا، اسی طرح حضرات انبیاء کو منصب نبوت سے سرفراز فرما کر تمام انسانوں پر انھیں فوقیت و فضیلت دی گئی، دنیا کے تمام کمسن بچوں کے مقابلہ میں آں حضرت ؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کو شرف فضیلت سے نوازا گیا، عالم کی تمام اونٹنیوں پر حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو بزرگی عطا کی گئی حرمین شریفین (مکہ و مدینہ) کو تمام شہروں پر فضیلت اور برتری مرحمت ہوئی، یوم جمعہ اور یوم عاشورہ (دسویں محرم) کو دیگر ایام کے مقابلہ میں امتیاز و اختصاص بخشا گیا۔ اور عشرۂ ذی الحجہ کو باقی تمام دنوں سے محترم بنایا گیا، فرض کو نفل پر برتری دی گئی، عصر و فجر کو دوسرے فرائض کے مقابلہ میں افضلیت حاصل ہوئی اور سجدہ کو باقی ارکان صلوٰۃ کے مقابلہ میں قرب و منزلت سے نوازا گیا۔

ان مثالوں سے جہاں فضیلت اختصاصی کی وسعت اور ہمہ گیری کا پتہ چلتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس فضیلت کا حصول کسی عمل پر موقوف نہیں ہے بلکہ اس کا تمام تر مدار قسمت اور تقدیر الٰہیہ پر ہے (ذلك تقدير العزيز العليم)

فضیلت اختصاصی کے اقسام

اس کی کل چار قسمیں ہیں (۱) فضیلت معلوم الوجہ (۲) فضیلت مجہول الوجہ، (۳) فضیلت اصلی، (۴) فضیلت تبعی۔ سطور ذیل میں ہر قسم کی کچھ تفصیل ذکر کی جا رہی ہے تاکہ بات واضح ہو کر سامنے آ جائے

(۱) معلوم الوجہ:۔ جس میں سبب فضیلت تک عقل انسانی کی رسائی ہو جائے اور آدمی سمجھ لے کہ اس فضیلت کی وجہ کیا ہے مثلاً یہ بات سب کو معلوم ہے کہ دوسری جگہوں کے مقابلہ میں مساجد کی بزرگی اور فضیلت اس کے محل عبادت اور مقام ذکر ہونے کی وجہ سے ہے البتہ خود اس جگہ کا عبادت گاہ مسجد کے لئے منتخب کیا جانا محض عنایت خداوندی کی بنا پر ہے اس اختصاص کا سمجھنا فہم انسانی کے دائرہ قدرت سے بالاتر ہے۔

(۲) مجہول الوجہ :۔ وہ فضیلتیں کہلاتی ہیں جن کے اسباب و وجوہ کی دریافت سے انسانی عقل قاصر ہے۔ جیسے حجرِ اسود کی دوسرے پتھروں پر اور مکان کعبہ کی دوسرے مکانات پر فضیلت کے اسباب و وجوہ کیا ہیں! عقل انسانی ان کے ادراک سے عاجز و درماندہ ہے۔

(۳) فضیلت اصلی :۔ صاحب فضیلت کو یہ شرف و فضل بلا کسی واسطہ کے اصالۃً حاصل ہوا ہو جیسے حجرِ اسود کہ اس کی فضیلت اصلی ہے۔ کیونکہ اس میں کسی واسطہ کا دخل نہیں ہے۔

(۴) فضیلت تبعی :۔ صاحب فضیلت کو یہ فضیلت کسی واسطہ اور وسیلہ سے حاصل ہوئی ہو جیسے صاحبزادہ رسول حضرت ابراہیم کی بزرگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ اور طفیل سے ہے۔

فضیلت اختصاصی کی اس تفصیل سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ فضیلت کی اس قسم کا مدار فضیلت حق جل مجدہ کی تخصیص پر ہے عمل یا کوشش کا

(۲) **فضیلت اکتسابی** | یہ فضیلت اطاعت و عبادت کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ اور فضیلت کی پہلی قسم یعنی اختصاصی کے اعتبار سے اس میں محدودیت ہے کیونکہ اس کا مدار اعمال پر ہے لہٰذا یہ انہیں لوگوں کے حصہ میں آئے گی جو عمل کی استعداد اور صلاحیت رکھتے ہوں ان کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہو گی اور اہل عمل کی صرف تین جماعتیں ہیں، ملائکہ، جنات اور انسان۔ یہ فضیلت تو بظاہر عمل کے معاوضہ کے طور پر عطا کی جاتی ہے لیکن اگر دقت نظر سے دیکھا جائے تو اس کا منتہا بھی وہی فضیلت اختصاصی ہی ہے جیسا کہ آیندہ کی تفصیلات سے معلوم ہو گا۔

اختلاف اور نزاع کا محل یہی فضیلت اکتسابی ہے۔ فضیلت اختصاصی میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں کیونکہ اس کے ثبوت کے لئے کتاب و سنت کا بیان کافی ہوتا ہے۔ اس موقع پر یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ تمام حضرات صحابہ کو پوری امت پر فضیلت اختصاصی حاصل ہے جس کا ثبوت ذیل کی حدیث سے ہو رہا ہے "اختار اللہ لی اصحابا و اصحارا و انصارا"، (اللہ تعالیٰ نے میرے لئے اصحاب، رشتہ دار اور مددگار منتخب فرمائے ہیں) اور یہ اختصاصی بزرگی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور صاحبزادیوں کو بھی حاصل ہے۔ لیکن یہاں گفتگو امت کے مقابلے میں حضرات صحابہ کی فضیلت کے اثبات میں نہیں ہے وہ تو حضرت شارع علیہ السلام کے فرمودات سے ثابت ہے بلکہ اس وقت تو خود حضرات صحابہ کے درمیان فرق مراتب کی وضاحت مقصود ہے۔ کیونکہ محل اختلاف یہی امر ہے۔

بعض احادیث سے بظاہر ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ ان حضرات میں سے ایک کو دوسرے پر جو فضیلت اور بزرگی دی گئی ہے۔ اس کا تعلق فضیلت اختصاصی سے ہے۔ لیکن آیات قرآنیہ میں غور کرنے اور احادیث پر گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فضیلت اکتسابی ہی ہے۔ ہاں ترتیب خلافت میں اگر

بعض خلفاء کی بعض پر تقدیم کو فضیلت اختصاصی میں شمار کیا جائے تو مناسب ہے۔ جس پر حدیث عائشہ صدیقہؓ "فابی علی الاتقی یہ ابی بکر" (آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کے بجائے کسی کی تقدیم کو پسند نہیں کیا) کے علاوہ دیگر احادیث بھی دلالت کرتی ہیں۔

فضیلت اکتسابی کی قسمیں

فضیلت اکتسابی کی بھی چند قسمیں ہیں۔ اب ان اقسام پر بغور نظر ڈال کر محل اختلاف میں جو قسم قابل اعتبار ہو اس کو جاری کرنا چاہیے تاکہ فضیلت اکتسابی کے مصداق کی تعیین ہو جائے اور اختلاف ختم ہو اس سلسلہ میں یہ جان لینا ضروری ہے کہ ایک عمل کو دوسرے عمل پر سات وجہ سے فضیلت حاصل ہوتی ہے ان سات کے علاوہ کوئی اور وجہ اور صورت مدار فضیلت نہیں ہو سکتی۔

وجوہ مدار فضیلت یہ ہیں (۱) ماہیت عمل (۲) نیت عمل (۳) کیفیت عمل (۴) کمیت عمل (۵) زمان عمل (۶) مکان عمل (۷) امور خارجہ۔ سطور ذیل میں ان ساتوں وجوہ کی قدرے وضاحت پیش کی جارہی ہے تاکہ بات منقح ہو کر سامنے آجائے۔

ماہیت عمل:۔ یعنی خود عمل اپنی ذات وصفت کے اعتبار سے۔۔۔ دوسرے عمل پر فوقیت رکھتا ہو جیسے فرائض کی فوقیت اور افضلیت نوافل پر۔ لہذا دو آدمیوں میں ایک جملہ فرائض کو ادا کرتا ہے اور دوسرا بعض کو بجالاتا ہے اور بعض کو چھوڑ دیتا ہے مگر ساتھ ہی نوافل کا بھی پابند ہے، یا دونوں تمام فرائض کو پابندی سے ادا کرتے ہیں اور ساتھ ہی کثرت سے نوافل بھی پڑھتے ہیں لیکن ایک کی نوافل دوسرے سے بڑھی ہوئی ہیں، یا ان میں سے ایک نماز کے اندر تلاوت، تسبیح اور حمد وثنا کثرت سے کرتا ہے اور دوسرا خارج صلوٰۃ ذکر واذکار کی کثرت رکھتا ہے، یا دو شخصوں میں سے ایک جہاد میں جان کی پرواہ کئے بغیر دشمنوں کی صفوں میں گھس کر داد شجاعت دیتا ہے اور دوسرا مجاہدین کی مدد رسانی اور ان کے آس پاس سے دشمنوں کو دور رکھنے میں کوشش کرتا ہے، یا ایک جہاد میں مصروف رہتا ہے اور دوسرا جہاد کے بجائے نماز روزہ اور دیگر عبادات میں لگا رہتا ہے۔ غرض ان تمام صورتوں میں اول دوسرے کے مقابلے میں افضل مانا جائے گا کیونکہ پہلے کا عمل ذاتی طور پر دوسرے کے عمل سے افضل اور اعلیٰ ہے۔

(۲) نیت عمل:۔ عمل کی غایت وغرض جسے عرف شرع میں نیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص صرف رضائے الٰہی اور خوشنودیٔ مولیٰ کی نیت سے کوئی عمل کرتا ہے اس کے سوا اس کی کوئی اور غرض نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا شخص بھی وہی عمل کرتا ہے مگر اس کے اخلاص نیت میں کمی ہے کہ رضائے الٰہی کے ساتھ اس کی نظر دنیوی منافع ومصالح پر بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلا عمل حسن نیت اور

کمال اخلاص کی بنا پر دوسرے سے افضل ہوگا۔

(۳) کیفیت عمل۔ یعنی عمل کو اس کے تمام آداب و حقوق کی رعایت کے ساتھ انجام دینا۔ مثلاً ایک شخص ہر عمل کو اس کے جملہ واجبات و سنن اور آداب و حقوق کو پورا کرتے ہوئے ادا کرتا ہے۔ اور دوسرا ان کی پوری رعایت نہیں کرتا ہے، یا ایک شخص کا عمل ہر قسم کے گناہوں کی مصاحبت اور تلویث سے پاک و صاف ہے اور دوسرا عبادت و ریاضت کے ساتھ گناہوں میں بھی مبتلا رہتا ہے، یا ایک شخص حضور قلب اور پورے خشوع و خضوع کے ساتھ عبادت کرتا ہے اور دوسرا بے توجہی اور بے التفاتی کے ساتھ، یا ایک شخص وضو کے ساتھ ذکر و تلاوت کرتا ہے اور دوسرا بے وضو ہو کر۔ ان تمام صورتوں میں پہلا عمل اپنی کیفیت کی بنا پر دوسرے عمل سے بڑھ جائے گا۔

۴۔ کمیت عمل:۔ عمل کی مقدار و تعداد کے لحاظ سے افضلیت کا ثبوت۔ مثلاً دو شخص فرائض کی ادائیگی میں برابر ہوں لیکن ان میں سے ایک کی نفلیں دوسرے سے زائد ہوں تو اس زیادتی مقدار کی بنا پر اسے فضیلت ہوگی۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے کہ دو اصحاب بیک وقت مشرف با سلام ہوئے اور ساتھ ہی ہجرت بھی کی پھر ان میں سے ایک صاحب کسی جہاد میں شہید ہوگئے اور دوسرے حیات سے رہے۔ ان دونوں حضرات کے متعلق ایک سلسلۂ گفتگو میں بعض حضرات صحابہ نے کہا کہ شہید کا مقام و مرتبہ اپنے ساتھی کے اعتبار سے بلند ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے فرمایا، «فاین صلوٰتہ بعد صلوٰتہ وصیامہ بعد صیامہ» (شہید کے بعد زندہ رہنے والے کی نماز اور روزے کہاں جائیں گے)، مطلب یہ تھا کہ اگر ایک کو شہادت کا شرف حاصل ہے تو دوسرے کے لئے زیادتی صلوٰۃ و صوم کی فضیلت متحقق ہے۔ اس لئے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

۵۔ زمان عمل۔ یعنی کبھی وقت کے لحاظ سے عمل کی اہمیت اور فضیلت بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً ابتداء اسلام میں یا مسلمانوں کی زبوں حالی کے وقت جہاد اور صدقہ و خیرات کرنا یقینی طور پر اس جہاد اور صدقہ و خیرات سے افضل ہوگا جو اسلام کی شوکت اور مسلمانوں کے استغنار کے زمانہ میں کیا جائے۔ چنانچہ ایک موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سابقین رضی اللہ عنہم کی دیگر حضرات پر افضلیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا «لو انفق احدکم مثل احد ذھبا ما بلغ مد احدھم ولا نصیفہ» (یعنی الغرض اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر سونا اللہ کی راہ میں خرچ کر دے جب بھی وہ ثواب میں ان حضرات کے ایک۔ (تقریباً آدھ سیر) بلکہ نصف کے برابر بھی نہیں پہنچ سکتا) اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن حکیم میں زمان عمل کی اہمیت کو ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے۔ «لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ

دَرَجَةً مِنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا ‎،، (فتح مکہ سے پہلے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور جہاد کرنے والے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان لوگوں کے اعتبار سے اعلیٰ وارفع ہیں جنھوں نے فتح مکہ کے بعد انفاق وجہاد کیا)

اسی طرح تنگ دستی اور احتیاج کی حالت میں یا صحت وتندرستی کے وقت اللہ کے راستہ میں ایک روپیہ خرچ کرنا ثروت وتمول کی حالت میں کثیر رقم صدقہ کرنے اور بیماری اور حیات سے ناامیدی کی حالت میں ہزاروں کی وصیت سے بہتر ہوگا۔ یوں ہی جو فرائض اور عبادات، خوف، مرض، سفر، مشقت قلت فرصت اور کثرت مواقع کے وقت ادا کی جائیں وہ اطمینان وراحت، اور صحت وفراغت کے وقت کی عبادتوں سے افضل قرار پائیں گی چنانچہ ارشاد ہے عمرة فی رمضان یعدل بحجة ومن تقرب فیہ بخصلة من الخیر کان کمن ادی فریضة فیما سواہ ومن ادی فریضة فیہ کان کمن ادی سبعین فریضة فیما سواہ۔ (ماہ رمضان میں عمرہ ادا کرنا حج کے برابر ثواب رکھتا ہے۔ اور جو شخص اس مبارک مہینہ میں نفلی عبادت بجالائے تو اس کا ثواب غیر رمضان کے فرض کی طرح ہوگا اور اس ماہ کے ایک فرض کا ثواب دوسرے مہینوں کے ستر فرائض کے برابر ہوتا ہے) اسی طرح فرمایا گیا کہ ''افضل الصیام بعد شهر رمضان شهر الله المحرم ،، رمضان کے روزوں کے بعد افضل ترین ماہ محرم (عاشورۂ محرم) کے روزے ہیں۔ اسی طرح اشہر حرم (ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب کے مہینے) ہیں دیگر مہینوں کے اعتبار سے اعمال کے ثواب میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

۶۔ مکان عمل۔ یعنی عبادت کے مکان ومحل کے اعتبار سے بھی فضائل میں اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ احادیث سے ثابت ہے کہ جو نماز مسجد حرام یا مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں پڑھی جائے وہ دیگر مقامات میں ادا کی ہوئی ہزاروں نمازوں سے افضل ہے۔ اسی طرح دارالحرب میں جہاد کے موقع پر روزہ رکھنا دوسرے مقام کے روزہ سے افضل ہوتا ہے حدیث پاک میں ہے ''من صام یوما فی سبیل الله حرم الله علی النار ،، (جس شخص نے جہاد کے موقع پر روزہ رکھا اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کی آگ حرام کردیں گے

۷۔ امور خارجی۔ عمل کے ساتھ خارج سے کوئی ایسی چیز آکر مل جائے جس سے عمل کے ثواب میں اضافہ ہوجائے۔ یہ سبب خارجی کبھی تو خود عمل کرنے والے کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ اور کبھی عمل کرنے والے کے ساتھ کسی دوسرے کی شرکت ومقارنت اضافہ فضیلت کا سبب ہوجاتی ہے۔ جیسے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک رکعت غیر نبی کی ہزاروں رکعتوں سے افضل ہوتی ہے۔ ذاتی نبی ورسول کے ساتھ ادا کی ہوئی نماز دیگر نمازوں کے مقابلہ میں بدرجہا اعلیٰ ہوگی۔ اسی بنا پر وہ صدقہ وخیرات اور روزہ وجہاد جو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عمل

میں لائے یا آپ کی معیت وصحبت میں حضرات صحابہؓ سے وقوع پذیر ہوئے۔ دیگر صدقات، صیام اور جہاد سے ہزاروں درجہ بڑھے ہوئے ہیں۔ اسی اصول کے پیش نظر حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اپنے ان اعمال و عبادات کو جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انجام دیئے تھے وہ درجہ نہیں دیتے تھے جو درجہ اور مقام آپ کی معیت وصحبت میں کئے ہوئے اعمال کو دیتے تھے۔ قرآن پاک میں متعدد جگہوں پر اس کے اشارات موجود ہیں چنانچہ ایک جگہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لٰكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ أُولٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (لیکن رسول خدا اور جو لوگ ان کے ساتھ ایمان لائے اور اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کیا انھیں کے لئے تمام بھلائیاں ہیں اور وہی کامیاب ہیں)

اسی سے ابو ہاشم جبائی کا یہ نظریہ کہ "اگر کسی شخص کو طویل عمر مل جائے تو اسکے اعمال نبی کے اعمال کے برابر ہو سکتے ہیں" پادر ہوا ہو جاتا ہے علاوہ ازیں اس تفصیل سے یہ بات بھی روز روشن کی طرح آشکارا ہو گئی کہ جماعت صحابہ میں سے حضرت انس بن مالک، ابو امامہ باہلی، عبد اللہ بن بشیر، عبد اللہ بن الحارث، سہل بن اسعد ساعدی اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم جنھوں نے طویل عمریں پائیں اور کثرت سے اعمال خیر کئے۔ وہ حضرت ابو بکر صدیق عمر فاروق، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، ابو عبیدہ بن الجراح، زید بن حارثہ، جعفر بن ابو طالب، مصعب بن عمیر، عبد اللہ بن جحش، سعد بن معاذ اور عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہم کے مقام و مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتے حالانکہ اول الذکر حضرات میں سے بعض ثانی الذکر حضرات کے بعد لگ بھگ اسی نوے سال تک حیات رہے اور طاعات وعبادات میں لگے رہے۔ لہذا یہ بات پورے یقین و وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جو شخص آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت دوسروں سے افضل تھا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دوسرے لوگ اعمال کے ذریعہ اس کے مقام و مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتے۔

ثمرۂ فضیلت فضیلت خواہ اختصاصی ہو یا اکتسابی اس سے دو فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں مفضول یعنی کم درجہ رکھنے والے پر افضل کی تعظیم و تکریم واجب کر دیتے ہیں۔ اس عزت افزائی میں تمام افاضل اور بلند درجہ کے حاملین شریک ہیں چاہے وہ جمادات حیوانات اور ازمنہ سے تعلق رکھتے ہوں جیسے خانہ کعبہ، حجر اسود، مساجد، یوم جمعہ، ماہ رمضان اور ناقہ حضرت صالح علیہ السلام وغیرہ۔ یا انسان اور ملائکہ کی جماعت سے متعلق ہوں جیسے حضرات انبیاء، صحابہ کرام، ازواج مطہرات وغیرہ کہ حکم تعظیم ان سب کو عام ہے اور ان میں سے سب ہی کی تعظیم و تکریم واجب ہوگی۔

اور فضیلت کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ آخرت میں انھیں قرب و منزلت کے اعلیٰ و ارفع مقام پر فائز

کیا جائے گا کہ ان سے کم مرتبہ کو یہ مقام ومرتبہ حاصل نہ ہو سکے گا اگر فضیلت کے یہ دو ثمرات ظاہر نہ ہوں تو پھر فضیلت ایک لفظ بے معنی ہو کر رہ جائے گا اس لئے فضیلت سے دونوں کا حاصل ہونا ضروری ہے۔ فضیلت کے یہ دونوں ثمرات چونکہ جنات اور انسان کے ساتھ مخصوص ہیں ان کے علاوہ کسی اور میں نہیں پائے جاتے اسی وجہ سے ان دونوں (جن وانس) کے سوا فضیلت اکتسابی کا ثبوت کسی چیز میں نہیں پایا جاتا۔ یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ دخول جنت بھی کبھی محض اختصاصی طور پر بغیر کسی عمل کے ہوتا ہے جیسے عام مؤمنین اور حضرات انبیاء علیہم السلام کے کمسن بچے کہ انھیں بغیر کسی عمل کے جنت عطا کی جائے گی۔

اور فضیلت کے اس نتیجے سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ شریعت نے جن چیزوں کی تعظیم وتکریم کا حکم ہمیں دیا ہے وہ سب کی سب صاحب فضیلت ہیں۔ اس موقع پر یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے۔ "کافر والدین کی تعظیم کا شریعت نے ہمیں حکم دیا ہے۔ حالانکہ ان کے اندر قطعاً کوئی فضیلت نہیں ہے"، کیونکہ شریعت کی جانب سے ہمیں کافر والدین کی جس تعظیم کا حکم ہوا ہے وہ حقیقت میں تعظیم نہیں ہے بلکہ حسن سلوک اور مروت کا معاملہ ہے اور کسی کے ساتھ مروت اور حسن سلوک سے پیش آنے کے لئے اس کا صاحب فضل ہونا ضروری نہیں ہے۔

مدار فضیلت اور اس کے ثمرات ونتائج کی وضاحت کے بعد اب حضرات صحابہ اور ازواج مطہرات واولاد اطہار کے مابین فرق مراتب اور ان کی ایک دوسرے پر فضیلت وبزرگی محقق طور پر معلوم کرنے کے لئے درج ذیل مقدمات اور اصول کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کیونکہ ان مقدمات کو ذہن نشین کئے بغیر اس مقدس جماعت کے باہمی فرق مراتب اور ان کی ایک دوسرے پر فضیلت وبرتری کا صحیح طور پر معلوم کرنا نہایت دشوار ہے۔

مقدمہ ۱: ازواج مطہرات کی عظمت۔ یہ امر قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہے کہ خدا کی عظمت و کبریائی کے بعد رسول خدا کی تعظیم وتکریم واجب ہے اور صرف تعظیم ہی نہیں بلکہ تعظیم کا وہ درجہ مطلوب ہے کہ حضرات انبیاء کے سوا کوئی اس تعظیم وتکریم میں ان کا شریک وسہیم نہیں ہو سکتا۔ پھر حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کا استحقاق تعظیم نص قرآن سے اس طور پر ثابت ہے کہ دوسرے لوگوں کے لئے اس طرح کا استحقاق ثابت نہیں۔ ارشاد حق جل مجدہ ہے۔ "اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ"، نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) مؤمنین کے ان کی جانوں سے زیادہ قریب ہیں اور ان کی بیویاں مومنین کی مائیں ہیں۔ اس آیت پاک سے ثابت ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات کے حق میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی فضیلت اکثر حضرات صحابہ کے اعتبار سے

قوی تر ہے کیونکہ ان کی صحبت بلحاظ عام صحابہ کی صحبت کے ایک بلند مقام کی حامل ہے اس کے علاوہ امت کی دینی ماں ہونے کی ... خصوصیت نے ان کے استحقاق تعظیم کو مزید دوبالا کر دیا ہے۔

مقدمہ ۲۔ جس وقت کسی ایک کی دوسرے پر فضیلت کے بارے میں گفتگو ہو تو اس وقت جہت فضیلت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا کیونکہ دو چیزوں کے درمیان ایک کی دوسرے پر فضیلت اسی وقت متحقق ہو سکتی ہے جبکہ دونوں میں جہت فضیلت ایک ہو اور پھر اس جہت میں ان کے اندر کمی و بیشی ہو اور اگر دونوں کے فضائل مختلف جہت سے ہوں تو ان میں باہم تفاضل اور ایک کی دوسرے پر بڑائی متحقق نہیں ہو سکتی۔ لہذا اگر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے بارہ میں سوال کیا جائے کہ ان دونوں میں افضل کون ہے تو اس کے جواب میں یہ کہنا کہ رمضان المبارک افضل ہے یا ناقۂ حضرت صالح بہتر ہے۔ درست نہ ہوگا۔ کیونکہ مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کی وجہ فضیلت اور ہے اور رمضان المبارک اور ناقۂ حضرت صالح علیہ السلام کی وجہ فضیلت اور۔ البتہ اگر یہ پوچھا جائے کہ ناقۂ حضرت صالحؑ افضل ہے یا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی عضباء، تو اس کے جواب میں ناقۂ صالح یا ناقۂ عضباء کو کہنا صحیح ہوگا کیونکہ دونوں میں جہت فضیلت متحد ہے اب جس کے اندر یہ جہت قوی ہوگی اسے اپنے مقابل پر فضیلت ہوگی۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہوگیا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی فضیلت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں ثابت نہ ہوگی کیونکہ دونوں حضرات کے درمیان وجہ فضیلت مختلف ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؓ کی فضیلت کسی عمل کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ محض اختصاصی ہے۔

مقدمہ ۳:۔ جنت میں درجات کی بلندی کبھی کسی کی تبعیت اور طفیل میں ہوتی ہے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کمسن اولاد کے مدارج کی بلندی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تبعیت اور طفیل میں ہے اس طرح کی بلندیٔ درجات فضیلت اکتسابی پر افضلیت کو ثابت نہیں کرتی یعنی جو فضیلت عمل اور طاعت کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے اس سے یہ بلندی درجات کی فضیلت جو کسی کے طفیل میں حاصل ہوتی اعلی اور افضل نہیں ہوگی۔

اور کبھی یہ بلندی درجات اصالۃً اپنے عمل کے مقابلہ میں حاصل ہوتی ہے یہ بلندی درجات فضیلت اکتسابی پر افضلیت کو ثابت کرے گی مثلاً دو آدمیوں کو ان کے عمل کے عوض میں بلند درجہ ملا ہے لیکن ان میں سے ایک کا درجہ دوسرے سے بلند ہے تو یہ بلندیٔ درجہ اس فضیلت اکتسابی کے مقابلہ میں افضلیت پر دلالت کرے گا جس کے عوض میں کم تر درجہ حاصل ہوا ہے۔

اسی طرح جنت میں داخل ہونا، حوض کوثر پر پہلے پہنچنا یا حساب وکتاب میں سابق ہونا بھی انھیں دو قسموں پر ہے یعنی کسی کو یہ امور تبعاً حاصل ہوں گے اور کسی کو اصالۃً اپنے عمل کے بدلہ میں پہلی قسم فضیلت اکتسابی پر افضیلت کو ثابت نہیں کرے گی دوسری قسم اس افضلیت پر دلالت کرے گی۔ چنانچہ انھیں امور مذکورہ (یعنی شفاعت وحساب وکتاب اور حوض کوثر پہ پہنچنے وغیرہ) میں امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا حضرات انبیاء پر تقدم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تبعیت اور طفیلی ہونے کے طور پر ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے "هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلَالٍ عَلَى الْأَرَائِكِ مُتَّكِئُونَ" وہ لوگ اور ان کی بیویاں جنت کے سایہ میں آراستہ تختوں پر مسند نشیں ہوں گے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے "أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ" ہم نے ان کے ساتھ ان کی اولاد کو لاحق کردیا۔ لہذا یہ تقدم وسبقت حضرات انبیاء کے مقابلہ میں امت محمدیہ کی فضیلت پر دلالت نہیں کرے گا۔

مقدمہ ۴: سیادت (سرداری) اور فضیلت دو الگ الگ حقیقتیں ہیں کیونکہ سیادت تو صاحب سیادت کی ذاتی شرافت کو بتاتی ہے۔ لہذا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد اطہار اس ذاتی بزرگی کی بنا پر جو انھیں حاصل ہے سادات اور سردار ہیں اور فضیلت کا مدار عمل کی جزا پر ہے یعنی صاحب عمل کو فضیلت بطور عمل کی جزاء کے عطا ہوتی ہے

اسی طرح امارت کے لئے فضیلت لازم نہیں ہے بلکہ بسا اوقات اعلیٰ کے مقابلہ میں ادنیٰ کو امارت مل جاتی ہے چنانچہ حضرت عمرو بن عاص کی امارت کے وقت حضرت عمر فاروق کو ان کی اطاعت کے لئے مامور کیا جانا اس کی واضح دلیل ہے۔ اسی طرح حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ کی امارت کے موقع پر اکابر صحابہ مثلاً حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت علی وغیرہ رضی اللہ عنہم کو انکی اطاعت پر مامور کیا گیا۔ اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ کسی شخص کی اطاعت کا کسی پر واجب ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ جس کی اطاعت واجب کی گئی ہے وہ اطاعت گذاروں سے افضل اور بزرگ تر ہے۔

مقدمہ ۵: جس وقت فضیلت کی مذکورہ سات وجوہ میں باہم تعارض واقع ہوجائے تو کتاب وسنت کی روشنی میں طے کرلینا چاہیئے کہ ان متعارض وجوہ میں سب سے زیادہ قابل اہمیت اور لائق اعتبار کون سی وجہ ہے چنانچہ شریعت سے یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ کیفیت عمل کے مقابلہ میں کمیت (مقدار) عمل کا چنداں لحاظ نہیں ہے۔ اسی طرح خود کمیت وکیفیت کا زمان عمل کے مقابلے میں کم درجہ ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ" تم میں سے جس نے فتح مکہ سے پہلے اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور جہاد کیا وہ دوسروں کے برابر نہیں ہوں گے۔ اور احادیث صحیحہ

سے یہ امر واضح ہے کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جو اعمال آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت اور صحبت میں کئے ان کے مقام و مرتبہ کو ان کے بعد کے اعمال نہیں پہنچ سکتے۔ اور یہ بات بھی قطعی طور پر معلوم ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے برابر کسی کا عمل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اصحابہ کرام جس عمل میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے ہوں اس کے مقام و مرتبہ تک کسی دوسرے عمل کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ شرکت جماعت کی بناء پر ایک نور وحدانیت پیدا ہو جاتا ہے جس سے صحابہ کا عمل آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رنگ ہو گیا۔ جیسے مرکب دواؤں میں مزاج کی ایک کیفیت وحدانیت پیدا ہو جاتی ہے کہ مرکب کے ہر ہر جز میں باہمی تشابہ رونما ہو جاتا ہے۔ (نماز جماعت کی مشروعیت کی ایک اہم ترین وجہ یہی ہے) اس اعتبار سے تمام حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو پوری امت پر عظیم بزرگی اور فضیلت حاصل ہے پھر اس مقدس اور پاکباز جماعت کے درمیان حسب تصریح آیت کریمہ "لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ" الخ سبقت تقدم کا اعتبار ہو گا کہ جو حضرات پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے وہ بعد والوں سے افضل ہوں گے کیونکہ جس قدر زمانی تقدم اور سبقت ہو گی اسی قدر۔۔۔۔ اسلام کی نصرت، تائید اور تقویت کی احتیاج بھی زیادہ ہو گی چنانچہ ایک موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر حضرات صحابہ کے مقابلہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی افضلیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "فقال صدقت و قلتم کذبت" انھوں نے (ابوبکر صدیق) ابتداء میں میری تصدیق کی اور تم لوگوں نے اس وقت میری تکذیب کی۔ اس اعتبار سے وہ حضرات صحابہ جو ہجرت سے پہلے کی زندگی ہی میں اعمال اسلامی پر عمل پیرا تھے ان حضرات سے افضل ہوں گے جو اس کے بعد ان اعمال پر کاربند ہوئے مثلاً ابوبکر صدیق، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، عثمان بن مظعون، طلحہ، زبیر، مصعب بن عمیر، عبدالرحمٰن بن عوف، عبداللہ بن مسعود، سعید بن زید، زید بن حارثہ ابوعبیدہ، بلال، سعد، عمار بن یاسر، ابوسلمہ بن الاسد، عبداللہ بن جحش، وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین جو بالکل ابتداء ہی میں حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے۔ دوسروں سے زیادہ افضل ہوں گے۔ ان کے بعد ان حضرات کا درجہ ہو گا جنھوں نے ہجرت سے پہلے عقبۂ اولیٰ میں شرف بیعت حاصل کیا، پھر عقبۂ ثانیہ میں بیعت کرنے والے حضرات ہوں گے، پھر غزوۂ بدر میں شریک ہونے والے حضرات کا مقام و مرتبہ ہو گا۔ پھر غزوہ بدر کے بعد دیگر غزوات میں شرکت کرنے والے تاریخ و سن کی ترتیب کے موافق ایک دوسرے سے افضل ہوں گے۔ یہ سلسلہ غزوۂ حدیبیہ تک جاری و ساری رہے گا۔ کیونکہ ان تمام غزوات میں شریک ہونے والوں پر سکینہ کا نزول اور ان کے قلوب کا پاک و صاف ہونا حسب تصریح قرآن مجید ثابت ہے۔ لیکن غزوۂ حدیبیہ کے بعد کوئی غزوہ ایسا نہیں ہے جس میں شرکت کو معیار فضیلت قرار دیا جائے کیونکہ اس کے بعد تمام غزوات میں منافقین بھی شریک ہوتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

ربیع الاول کی تاریخی اہمیت اور شرعی حیثیت

مولانا امام علی دانش قاسمی

تاریخی اہمیت

سرور کائنات فخر موجودات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ربیع الاول کے مہینہ میں مکہ مکرمہ کی سرزمین پر وہاں کے معزز ترین قبیلۂ بنو ہاشم کے چشم وچراغ بن کر عالم ارواح سے دنیائے آب وگل میں جلوہ افروز ہوئے اور حیات طیبہ کے چالیس سال اس شان سے گذرے کہ ہر شخص ان کی سچائی، امانت داری، راست بازی، مسکین پروری، یتیم نوازی، کردار کی بلندی، اخلاق کی پاکیزگی، طبیعت کی نکوئی بردباری، شرافت و دیانت کا اعتراف و اقرار کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا جس راستے سے گذر جاتے دیکھنے والے پکار اٹھتے وہ دیکھو، "الصادق والامین" جارہے ہیں ان قابل ستائش عادات واخلاق کے حامل حضرت محمدؐ ابن عبد اللہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا قلب بے چین ہوا ذہن فکر مند ہوا انھیں مخلوق کی بے راہ روی اور خالق کی اطاعت سے روگردانی، باطل پرستی، حق تلفی، ظلم وسرکشی کے تاریک ماحول میں وحشت محسوس ہونے لگی وہ آبادی سے باہر جاکر غار حرا کے خلوت کدہ میں تفکر اور تجسس کی عبادت ادا کرنے لگے رحمت الٰہی نے دستگیری فرمائی جبرئیل امین کو اسی ربیع الاول کے مہینہ میں حکم ہوا کہ غار حرا میں حاضر ہوکر مکہ کے "صادق الامین" تک پیغام ربانی پہونچائیں اور انھیں منصب رسالت ونبوت پر فائز ہونے کے ازلی انعام کا اعلان بندوں میں کرنے کی بشارت سے نوازیں اس طرح وحی کے نزول کا آغاز ہوا اور مسلسل تیئیس برس تک موقعہ بموقعہ خالق کائنات کا کلام بلاغت نظام "القرآن الحکیم" نازل ہوتا رہا مکہ میں پیغام حق کی صدائے دل نواز گونجنے لگی، سعادت مند لوگوں نے بڑھ کر استقبال کیا سلیم الطبع بندے ایمان کی دولت سے نوازے گئے ایک جانب رحمانی طاقتیں دین کا پرچم سربلند کرنے کے لئے آگے بڑھیں دوسری جانب شیاطین الانس والجن کبر ونخوت کے ساتھ چراغ ہدایت کو بجھانے کے لئے رات دن سرگرداں پھرنے لگے تیرہ سال تک حق وباطل کی کشمکش جاری رہی ایک ایسا بھی دن آیا جبکہ اعلیٰ اخلاق وکردار کے پیکر مکہ کی محبوب ترین

شخصیت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جاں نثاروں کو وطن سے بے وطن ہونا پڑا یہ ہجرت نبوی کا مشہور واقعہ بھی ربیع الاول کے مہینہ میں پیش آیا ہجرت کا واقعہ بظاہر اہل حق کی پسپائی محسوس ہو رہا تھا مگر تائید غیبی سے یہی واقعہ اسلام کی سربلندی اور اہل اسلام کے غلبہ کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا مدینہ منورہ اہل اسلام کا مرکز قرار پایا اہل باطل نے مرکز اسلام کو تباہ کرنے کی جتنی سازشیں اور کوششیں کیں ان کا نتیجہ اہل اسلام کے حق میں ہمیشہ فلاح و کامرانی اور فتح مندی و سربلندی کی شکل میں نمودار ہوا آخر کار اللہ نے فتح و نصرت کی نعمتوں سے نوازا دین حق کو غلبہ نصیب ہوا پرچم اسلام سربلند ہوا کعبہ مکرمہ کو شرک و کفر کی نجاستوں سے پاک کر دیا فوج در فوج دیوانہ وار مخلوق خدا حلقہ بگوش اسلام ہونے لگی وہ دن آگیا جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا حجۃ الوداع کے موقع پر دین کے مکمل ہونے اسلام کے آفاقی اور دائمی خدائی مذہب قرار دیئے جانے کی خوش خبری سنا دی گئی کلام اللہ کی آخری آیت نازل ہو گئی خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لاکھ چوبیس ہزار قدسیوں کے مجمع میں اسلام کے کامل و مکمل دین ہونے اور دور جاہلیت کے عقائد باطلہ اور رسوم فاسدہ کے مٹائے جانے اور شریعت محمدی کے غیر منسوخ سرمدی و دائمی ہونے کا مژدہ جانفزا سنایا اور دین کی امانت سپرد کرتے ہوئے امت کو یہ وصیت فرمائی "فلیبلغ الشاھد الغائب" جو مخاطب ہیں اور صحابیت کے شرف سے فیضیاب ہیں ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ سلسلہ در سلسلہ غیر مخاطبین غائبین تک پیغام ربانی پہونچائیں۔ خاتم النبیین کی بعثت کا مقصد پایۂ تکمیل تک پہونچا۔ تیئیس ۲۳ سال کی مختصر مدت میں تاریخ انسانیت کا انقلاب عظیم رونما ہوا خاتم النبیین کا اعجاز ظاہر ہوا اور قیامت تک سلسلۂ رشد و ہدایت جاری رہنے کا خدائی انتظام ہو گیا شاعرانہ زبان میں کسی نے کیا خوب اظہار حقیقت کیا ہے۔ ؎

درفشانی نے تیری قطروں کو دریا کر دیا — دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کر دیا

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے — کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

اب وہ وقت آگیا جو ہر دنیا میں آنیوالے کے لیے مقدر ہے ربیع الاول کا مہینہ ہے (علی اختلاف الروایتین) ۲، ۹ یا بارہ ۱۲ تاریخ اور پیر کا دن ہے زوال کے وقت یا اس سے کچھ قبل یہ حادثہ جانکاہ پیش آتا ہے کہ ختم نبوت آفتاب ہدایت کی ضیا پاشیوں کا رخ عالم ظاہر سے عالم برزخ کی طرف موڑ دیا جاتا ہے سرکار دو عالم کا وصال ہو جاتا ہے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم دم بخود ہیں غمگیں ہیں اپنے محبوب کی جدائی کا غم ہے اگرچہ سب سے زیادہ غمزدہ یار غار صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں مگر خدا تعالیٰ کی قدرت اور غیبی امداد دیکھئے کہ حضرت ابوبکر کو صبر و استقلال کا پہاڑ بنا دیا جاتا ہے انھیں تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اتفاق رائے سے اسی ربیع الاول میں خلیفہ رسول اللہ منتخب کرتے ہیں ان کو پیغام نبوت کی حفاظت و اشاعت کی توفیق دی جاتی ہے ان کی سربراہی میں صحابۂ کرام

رضی اللہ عنہ اپنے آقا و مولیٰ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سپرد کردہ امانت دینِ اسلام کو پھیلانے کیلئے سربکف ہو کر نکلے اور انسانیت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کی ناخدائی کر کے ساحل نجات تک پہونچا دیا صحابہ کرام کے بعد تابعین تبع تابعین پھر مجدد دین اسلام مصلحین امت، علماء، فقہاء، محدثین، صوفیاء، شہداء صالحین کے ذریعہ دین کا پیغام زندہ رہا اور انشاء اللہ قیامت تک زندہ رہے گا زبان رسالت سے یہ خوشخبری مل چکی ہے "میری امت میں ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا جو امداد غیبی سے بہرہ یاب ہوگا جو انھیں رسوا کرنا چاہے گا وہ کوئی انھیں نقصان نہ پہونچا سکے گا۔ یہاں تک کہ اللہ کا آخری فیصلہ (یوم قیامت اسی حال میں آجائیگا،

(مشکوٰۃ مجتبائی ص ۵۶۷)

شرعی حیثیت ربیع الاول کی مذکورہ تاریخی خصوصیات سے انکار نہیں کیا جا سکتا اسی کے ساتھ بلاشک یہ حقیقت بھی مسلّم ہے کہ ان خصوصیات کی بنا پر امت کے کسی طبقہ یا کسی فرد کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے کہ وہ ربیع الاول میں شریعت کی حدود سے تجاوز کرے اور ولادت باسعادت کے متبرک نام پر غیر قوموں کی نقالی کرتے ہوئے مسرت و شادمانی کے اظہار کے لئے غیر شرعی طریقے نکالے اور انھیں رائج کرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، بزرگان دین، ائمہ مجتہدین، فقہائے ملت، ربیع الاول کی تاریخی اہمیت سے بخوبی واقف تھے اور اخلاف سے زیادہ علم و تقویٰ میں فوقیت رکھتے تھے اس کے باوجود اسلاف نے ربیع الاول میں عید میلاد النبی نہیں منائی وہ ہر ہر قدم پر اسوہ نبی کو پیش نظر رکھتے تھے سنت مصطفےٰ پر اپنی جانیں قربان کرتے تھے عشق رسول کی دولت سے مالا مال تھے محبت نبوی کی شراب سے مدہوش تھے اس کے باوجود صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور دین کے پہلے بزرگوں میں سے کسی نے بھی اس طریقہ پر جشن ولادت نہیں منایا جیسے کہ آج کے دور میں بہت سے مسلمان جلوس نکال کر اور غیر معتبر روایتیں، موضوع قصے غیر متشرع لوگوں کی زبانوں سے سننے کے لئے محفلیں منعقد کرتے ہیں اسراف کی حد تک فضول خرچیاں کرتے ہیں بعض لوگوں کی ناواقفی یہاں تک بڑھ چکی ہے کہ وہ یہ کہنے لگے ہیں کہ ربیع الاول کو رمضان المبارک پر بھی فضیلت حاصل ہے اور دلیل پیش کرتے ہیں کہ رمضان المبارک میں کتاب نازل ہوئی اور ربیع الاول میں صاحب کتاب کا ظہور ہوا یہ نکتہ آفرینی عقل و نقل کے خلاف ہے کیونکہ خود صاحب کتاب رمضان المبارک کو افضل قرار دے چکے ہیں صاحبِ کتاب کی زبان مبارک سے ہدایت یافتہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم رمضان شریف کی افضلیت و برتری کے قائل تھے ان حضرات میں یوم ولادت یا یوم وفات منانے کا کوئی رواج نہیں تھا ائمہ اربعہؒ اور دیگر فقہائے کرامؒ اور سلاسل تصوف کے کسی مقتداء نے اس دور میں رواج یافتہ میلاد و قیام اور جشن چراغاں کو شریعت کا کوئی حکم نہیں بتایا ہے جو لوگ ذکر ولادت کے نام پر ______ خاص طور سے ربیع الاول میں محفلیں منعقد کر کے

اور جلوس نکالنے کو ارکانِ اسلام (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ) سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر سمجھتے ہوئے بوقتِ سلام قیام کرتے ہیں ان کے پاس اِن اعمال کے جائز و مشروع ہونے کی کوئی شرعی دلیل (قرآن وسنت واجماع امت و اجتہاد) میں سے موجود نہیں ہے تعظیم کے نام پر حدود شریعت کو توڑنا محبت کا نام ہے کر سنت نبوی کی مخالفت کرنا اور دین میں بدعت ایجاد کرنا قطعی طور پر شفیع المذنبین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی ہے اور ان کی نافرمانی کرنے والا کبھی سرخ رو اور کامیاب نہیں ہو سکتا ہے

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

بیجا بدگمانی کا ازالہ

بعض لوگ ربیع الاول کی شرعی حیثیت بیان کرنے والے اور حدود شریعت سے تجاوز نہ کرنے کی ہدایت کرنے والے علماء کرام اور بزرگانِ دین کے خلاف عوام میں یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ یہ لوگ ذکر ولادت، ذکر رسولؐ اور درود و سلام کے منکر ہیں ہر شخص کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیئے اور روز آخرت کے حساب کیلئے فکرمند ہونا چاہیئے خلاف تحقیق الزام تراشی افترا اور اتہام بازی بہت بڑے گناہ ہیں ان سے بچنا چاہیے ہر مسلمان کو یہ سوچنا چاہیئے کہ صحابہ کرامؓ اور فقہائے ملتؒ سے بڑھ کر بلکہ ان کے برابر بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عقیدت اس دور کے مسلمان میں نہیں ہو سکتی پھر آخر کیا وجہ ہے کہ تاریخ ولادت اور تاریخ وصال یقینی طور پر متعین نہیں ہے اگر یوم ولادت یا یوم وفات منانے کا شرعی حکم ہوتا تو تاریخ ولادت اور تاریخ وفات میں اختلاف ہرگز نہ ہوتا بلکہ فقہ کی کتابوں میں عید میلاد النبیؐ اور میلاد و قیام کے مسائل درج ہوتے ان عنوانات پر مستقل ابواب ہوتے اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ اور بزرگانِ دینؒ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر پاک اور ان کی سیرت طیبہ کا بیان صرف ربیع الاول میں کرنے کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ ہر مہینہ اور ہر دن اور ہر گھڑی آقا و مولیٰ تاجدار اعظمؐ کا اسوۂ حسنہ پیش نظر رکھتے تھے درود و سلام پڑھنے کے لئے ان کے یہاں کوئی مخصوص ہیئت متعین نہیں تھی وہ روزانہ صلوٰۃ و سلام سرکار کی عربی زبان میں پیش کرنا وظیفۂ حیات بنائے ہوئے تھے ان حضرات کی زندگیوں کا اوڑھنا بچھونا قال اللہ و قال الرسول (ذکر خدا و رسول) رہا ہے یہی طریقہ ہر مسلمان کو اختیار کرنا چاہیئے۔

میلاد مروجہ کب سے رائج ہوئی؟

میلاد مروجہ ہر نیا طریقہ ہے جسے ۶۰۴ھ میں سلطان ابو سعید الشیخی نے رواج دیا اور قیام تو اس کے بہت بعد سیکی مرحوم مجذوب نے ایجاد کیا ہے میلاد و قیام کے یہ نئے طریقے جو صحابہ کرامؓ تابعینؒ تبع تابعینؒ اور چاروں اماموںؒ کے بعد نکالے گئے ہیں اگر کوئی شخص اسے مباح سمجھ کر کرتا ہو تو اسے بھی سنت کا عامل نہیں کہا جا سکتا مگر یہ کتنی بڑی زیادتی ہے کہ خیر القرون کے بعد نکالے گئے طریقوں کو اتنا بڑا اسلامی رکن سمجھا جانے لگا ہے کہ ان کی مخالفت کرنے والوں کو دشمن رسالت بے ادب گستاخ کافر تک کہہ دیا جاتا ہے اعاذنا اللہ من شرور انفسنا

سہ　　حقیقت خرافات میں کھو گئی　　یہ امت رسومات میں کھو گئی

علماء دیوبند کا مسلک

خاص طور پر علماء دیوبند کو اس سلسلہ میں مطعون کیا جاتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سلسلۂ دیوبند کے اکابر علماء پکے سنی حنفی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے شیدائی، بزرگانِ دین کے معتقد اور ائمہ دین کے مقلد ہیں اور آخری دور میں تجدید و احیائے دین و ملت کی بلند پایہ خدمت پر مامور ہیں سید الطائفہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے مکاتیب رشیدیہ صفحہ ۹۷ پر فرمایا ہے۔

" ذکر اشغال و سیر اور ولادتِ فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر عین سعادت اور موجب برکات ہے اور جہاں ذکر خیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوئے گا نزول ملائکہ اور رحمت کا ہوئے گا اس میں کسی کو کلام نہیں "

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری مہاجر مدنی اپنی لاجواب کتاب براہین قاطعہ صفحہ ۴۰ پر لکھتے ہیں۔

" نفس ذکر میلاد فخر دو عالم کو کوئی منع نہیں کرتا بلکہ ذکر ولادت آپ کا مثل دیگر سیر و حالات کے مندوب ہے "

اسی کتاب میں دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

" زمانہ صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ و تبع تابعین رحمہم اللہ اور چھ سو سال تک ذکر فخر عالم کا اور بعد ولادت کے حالات اور شرح صدر و نبوت اور بیان احکام و قصص وغیرہ کا تعلیم و تعلم کی طرح ہوتا تھا جیسا درس و تدریس علم کا ہوتا ہے اس میں عقد مجلس خانہ اطعام طعام نہ کوئی زائد امر جیسا کہ خود فخر عالم کے وقت میں ہوئی تھی " (صفحہ ۱۵۹)

اور حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھانوی اپنے وعظ ذکر الرسول صفحہ ۳۲ پر فرماتے ہیں۔

" حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر سے روکنا تو اس کو کہتے ہیں کہ نہ تو کلمہ پڑھنے دے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لینے دے ایسے شخص کو بے شک منکر کہیں گے ایک شخص کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر واجب ہے مگر تعجب ہے کہ اس کو منکر کہا جاتا ہے "

غرضیکہ اکابر علماء نے اپنے فتاویٰ مکتوبات و ارشادات میں واضح فرما دیا ہے اور عملی طور پر ان کا طریقہ بھی یہی ہے کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر پاک کو خواہ وہ ذکر ولادت ہو یا ذکر معجزات ہو یا ذکر مغازی ہو یا ذکر وصال ہو جبکہ صحیح روایات کے ساتھ بیان کیا جائے خیر و برکت اور رحمت کے نزول کا ذریعہ یقین کرتے ہیں اور اسلاف امت کے طریقہ پر گامزن رہنے ہی میں سعادت سمجھتے ہیں ہر مسلمان کو چاہیئے کہ غیر قوموں کی مشابہت سے بچے اور نمائشی طور پر خلافِ شرع طریقہ سے جلسوں اور محفلوں کو منعقد کرنے کے بجائے ہمیشہ ہر موسم میں جب اللہ تعالیٰ توفیق دے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ بیان کرے اور بیان کروائے بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں انفرادی اور اجتماعی حالات میں عقائد و اعمال میں

بادشاہی میں فقیری

ہماری تاریخ کا ایک باب یہ بھی ہے!

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

(۱) خدام کے آرام وراحت کا خیال

سلطان التمش جس نے ۶۰۷ھ سے ۶۳۳ھ تک نہایت کروفر کے ساتھ ہندوستان میں حکمرانی کی حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی المتوفی ۶۳۳ھ اپنے ملفوظات "فوائد السالکین" میں اس کے اخلاق حمیدہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں "التمش صحیح العقیدہ تھا، وہ راتوں کو جاگتا، اگر کبھی اتفاقاً نیند آجاتی تو فوراً بیدار ہوجاتا اور وضو کرتا، اپنے نوکروں چاکروں میں سے کسی کو نہ جگاتا اور کہتا کہ آرام سے سونے والوں کو کیوں تکلیف دی جائے۔ رات کو فقیروں کے بھیس میں باہر نکل جاتا۔ اس کے ہاتھ میں اشرفیوں کا تھیلا ہوتا، لوگوں کے دروازوں پر جاتا، انھیں دستک دے کر باہر بلاتا ان کے حالات دریافت کرتا اور ان کی حسب ضرورت مدد کرتا اور قسمیں دے کر ان سے کہتا کہ جب ان کے پاس کھانے پینے کی چیزیں نہ ہوں یا ان پر کوئی ظلم وزیادتی کرے تو وہ اس کے دربار کے پاس آکر لٹکی ہوئی زنجیر عدل کو ہلائیں تاکہ وہ حالات سے باخبر ہو کر انصاف کرسکے کیونکہ قیامت کے دن ان کی فریاد کے بار کو اٹھانے کی طاقت اس کے اندر نہیں ہے (فوائد السالکین ص ۲۹)

(۲) افشائے راز

شیخ قطب الدین بختیار کاکی نے اپنے وصال کے وقت وصیت کی تھی کہ میری نماز جنازہ ایسا شخص پڑھائے جس میں یہ تین وصف جمع ہوں (۱) ہمیشہ عفیف رہا ہو کسی غیر محرم پر اس نے کبھی نظر نہ اٹھائی ہو (۲) اس کی عصر کی سنتیں قضا نہ ہوئی ہوں (۳) اور ہمیشہ نماز باجماعت میں تکبیر اولیٰ سے شریک رہا ہو۔ نماز جنازہ کے وقت جب اس وصیت کا اعلان کیا گیا تو کوئی آگے نہیں بڑھا کچھ دیر انتظار کے بعد سلطان التمش یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا کہ میری خواہش تو یہی تھی کہ میرا حال لوگوں سے پوشیدہ رہے لیکن خواجہ نے آج اس راز کو فاش کر دیا۔ (خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۲۷۵)

(۳) بیوی کو صبر کی تلقین

سلطان التمش کا لڑکا سلطان ناصر الدین محمود بھی باپ ہی کی طرح نہایت عابد وزاہد اور درویشانہ صفات کا حامل تھا۔

وہ ۶۴۴ھ میں تخت نشین ہوا اور بیس سال تک حکمرانی کے فرائض انجام دیئے وہ اپنے ذاتی مصارف کا بار خزانہ پر بالکل نہیں ڈالتا تھا بلکہ کلام پاک کی کتابت سے اپنے اخراجات پورے کرتا تھا اس لئے اس کی زندگی بڑی عسرت اور تنگی میں گزرتی تھی گھر گرہستی کے کاموں کو انجام دینے کے لئے اس کے محل میں کوئی خادمہ تک نہ تھی ایک روز اس کی ملکہ نے شکایت کے طور پر کہا کہ میں آپ کے لئے روٹی پکاتی ہوں تو میرے ہاتھ جل جاتے ہیں اور ان میں آبلے پڑ جاتے ہیں سلطان ملکہ کی یہ تکلیف سن کر رونے لگا۔ پھر بیوی کو مخاطب کر کے کہا کہ یہ دنیا گذر جانے والی ہے یہاں اس تکلیف کو برداشت کر کے صبر کرو قیامت میں اللہ تعالیٰ اس کے اجر میں تم کو تمہاری خدمت کے لئے حور عطا فرمائیگا ابھی تو میں تمہارے لئے بیت المال سے کوئی کنیز و خادمہ نہیں خرید سکتا۔ سلطان کی نیک دل بیوی نے درویش شوہر کی رائے سے اتفاق کیا۔ (البدایونی ج ۱ ص ۹۰)

(۵) احساس دیانت

شاہان بلبن کے بعد جلال الدین فیروز شاہ دہلی کے تخت و تاج کا مالک ہوا رسم تاجپوشی کے موقع پر دو رکعت شکرانہ کی . . ادا کرنے کے بعد تخت شاہی پر بیٹھا اور اپنے امراء سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے بار سلطنت اٹھا تو لیا ہے لیکن متحیر ہوں کہ میرا انجام کیا ہوگا اس کے بعد وہاں سے اٹھ کر سلطان بلبن کے محل میں گیا جس کا نام "کوشک لعل" تھا اس وقت اس کے ساتھ ایک درباری ملک احمد حبیب تھا اس درباری نے سلطان فیروز شاہ سے کہا کہ اب آپ کو اس دار الامارت میں سکونت اختیار کرنی چاہیئے سلطان نے جواب دیا کہ سلطان غیاث الدین بلبن نے بادشاہ ہونے سے پہلے اس کی تعمیر کی تھی اب یہ ان کی اولاد کی ملکیت ہے میرا اس پر حق نہیں ہے۔ ملک احمد حبیب نے کہا کہ امور حکمرانی میں اتنی پابندی کی گنجائش نہیں۔ سلطان نے برجستہ جواب دیا کہ دنیا کے چند روزہ مفاد کی خاطر اسلامی احکام کی خلاف ورزی نہیں کروں گا اور نفس کی پیروی میں کوئی کام انجام نہیں دوں گا۔

(۶) مکارم اخلاق

سلطان بہلول لودی ۸۵۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ یہ نیک دل سلطان اپنی بادشاہت کے زمانہ میں پانچوں وقت کی نماز جماعت سے ادا کرتا تھا، شریعت کی پابندی کا بے حد خیال رکھتا، لوگوں کی درخواستوں کو خود دیکھتا اور سب کے ساتھ عدل کرتا، دربار میں تخت پر نہ بیٹھتا اور نہ . . امراء کو اپنے سامنے کھڑا ہونے دیتا۔ اس کے امیروں یا لشکریوں میں کوئی بیمار ہو جاتا اس کی عیادت کے لئے ضرور جاتا۔ اگر کسی کو اس سے رنج پہنچ جاتا تو اس کے پاس جا کر معذرت خواہ ہوتا۔ میدان جنگ میں پہلے دو رکعت نماز پڑھتا۔ اسلام اور مسلمانوں کے لئے فلاح کی دعائیں مانگتا پھر جا کر دشمن سے مقابلہ کرتا اپنی تخت نشینی کے بعد جب پہلی مرتبہ جمعہ کی نماز پڑھنے جامع مسجد گیا تو خطیب نے خطبہ پڑھنے کے دوران افغانوں کا یہ کہہ کر مذاق اڑایا کہ سبحان اللہ! یہ بھی عجیب قوم پیدا ہوئی ہے، شاید یہ دجال کے پیش رو ہوں

ان کی زبان یہ ہے کہ ماں کو موری بھائی کو ر ور ، گاؤں کو ہشور اور لشکر کو تور کہتے ہیں۔ اپنی قوم کی اس قدر تضحیک کے باوجود سلطان نے مسکرا کر صرف اتنا کہا کہ خطیب صاحب بس کیجئے ہم لوگ بھی خدا کے بندے ہیں۔ (حکمرانوں کی تو خیر بڑی بات ہے علماء و صلحاء کی جماعت میں بھی حلم و بردباری کی ایسی مثال کم ملے گی) تاریخ داؤدی ص ۱۱

پاکبازی

احمد نظام الدین شاہ والیٔ احمد نگر المتوفی ۹۱۴ھ نہایت ہی پاک خصلت اور نیک طینت فرماں روا تھا۔ وہ جب باہر نکلتا تو راستے میں دائیں بائیں دیکھنے کے بجائے اپنی نظریں نیچے کئے رہتا۔ ایک بے تکلف امیر نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ شہر سے گذرتے وقت میری سواری کا تماشا دیکھنے کے لئے مرد و عورت آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں میں ڈرتا ہوں کہ میری نگاہ کسی نامحرم پر نہ پڑ جائے اور اس کا وبال مجھ پر نازل ہو۔ تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۱۰۰

حق بحق دار رسید

سکندر لودھی کے عہد حکومت میں سنبھل کے علاقہ میں ایک شخص کو پندرہ ہزار اشرفیوں کا ایک دفینہ دستیاب ہو گیا، سنبھل کے حاکم میاں قاسم نے اشرفیوں کو اس شخص سے وصول کر لیا اور سلطان سکندر کے پاس ایک درخواست بھیج کر پوچھا کہ اس دفینے کے بارے میں کیا حکم ہے سلطان نے حکم دیا کہ پانے والے کو واپس لوٹا دیا جائے حاکم سنبھل نے پھر لکھ کر بھیجا کہ اتنی بڑی رقم پانے کا یہ شخص مستحق نہیں ہے سلطان نے اسکو لکھا کہ اے احمق جس نے اس شخص کو یہ دفینہ عطا کیا ہے وہ بہتر جاننے والا ہے اگر یہ مستحق نہ ہوتا تو وہ کیوں دیتا ہم لوگ سب خدا کے بندے ہیں وہی بہتر جانتا ہے کہ ہم میں کون کس چیز کا مستحق ہے۔ (تاریخ داؤدی ص ۴۲)

خوفِ آخرت

والیٔ گجرات سلطان محمود بیگڑہ کا جانشین سلطان مظفر ایک دن قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا۔ قیامت کے ذکر پر مشتمل آیتوں کو پڑھ کر بے اختیار رونے لگا اور بولا معلوم نہیں اس وقت میرا کیا حال ہو گا۔ اس کے ایک ندیم شیخ جیو نے کہا جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ سے کوئی گناہ کبیرہ نہیں ہوا ہے۔ کثرت عبادت آپ کا مشغلہ ہے، خلق خدا بھی آپ سے خوش ہے توقع ہے کہ آخرت میں آپ کو بلند ترین درجات ملیں گے۔ سلطان نے یہ سن کر کہا شیخ جیو میری گردن پر بار گراں ہے اسی لئے روتا ہوں کیا تم نے پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نہیں سنی ”ونجا المخففون و ھلک المثقلون“ ہلکے پھلکے لوگ نجات پالیں گے اور جو گراں بار ہے وہ ہلاک ہو گا۔ (مرأۃ سکندری ص ۱۷۰)

انجام کی فکر

سلطان محمود بیگڑہ جس نے ۸۶۳ھ سے ۹۱۷ھ تک صوبۂ گجرات میں حکمرانی کی اپنی آخر عمر میں عبادت میں مشغول رہتا اور اکثر روتا رہتا تھا اس کے ایک درباری امیر ملک سارنگ نے سلطان کو برابر روتے ہوئے دیکھ کر ایک دن عرض کیا کہ دولت بھی ہے شہنشاہی بھی ہے

پھر رونے کی کیا وجہ ہے؟ سلطان نے کہا اے بے عقل! تم کو کیا بتاؤں مجھے کیا غم کھائے جا رہا ہے۔ مرے مرشد شاہ عالم نے اگرچہ میرے لئے دعا فرمائی ہے کہ "محمود کی عاقبت محمود ہو" لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میری عاقبت محمود نہ ہو سکے گی۔ عمر کی نہر برابر جاری ہے اور اس سے جو حصہ بہہ جاتا ہے وہ کبھی واپس نہیں لوٹے گا۔ اسی لئے روتا ہوں، افسوس اور حسرت تو اس پر ہے کہ اپنے ولی نعمت کی قدر جتنی جانی چاہیئے تھی اتنی نہ جان سکا اور جتنی جانی اس پر عمل نہ کر سکا (مرأۃ سکندری ص ۷۹)

حسن خاتمہ علاء الدین حسن گانگو المتوفی ۷۵۹ھ جس نے گلبرگہ، احمد آباد اور بیدر میں گیارہ سال تک بڑی کامیاب حکمرانی کی۔ اپنے مرض موت میں ایک دن اپنے چھوٹے بیٹے شہزادہ محمود کو پاس نہ دیکھ کر پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ بتایا گیا کہ مکتب میں پڑھ رہا ہے۔ حسن گانگو نے صاحبزادہ کو بلوا کر پاس بٹھایا اور پوچھا کہ کیا پڑھ رہے تھے شہزادے نے جواب دیا کہ شیخ سعدی شیرازی کی بوستاں پڑھ رہا تھا۔ گانگو نے پوچھا کون سی حکایت شہزادہ نے کہا وہ حکایت جس میں یہ ہے۔

شنیدم کہ جمشید فرخ سرشت — بسر چشمۂ بر بسنگے نوشت
بدیں چشمہ چوں ما بسے دم زدند — برفتند چوں چشم برہم زدند
گرفتند عالم بمردی وزور — ولیکن نبردند باخود بگور

جس وقت گانگو نے تیسرا شعر سنا تو اس پر بے اختیار گریہ وزاری ہو گیا۔ اور اسی وقت اپنے خزانچی کو بلایا، اور اپنے ذاتی خزانہ کے تمام اثاثے کو نکلوایا اور اپنے بیٹوں کے حوالے کیا کہ انھیں لے جا کر جامع مسجد میں علماء، فقراء میں تقسیم کر دو۔ شہزادوں نے باپ کے حکم کی تعمیل کی۔ اور جب تمام تقسیم کر کے باپ کو واپس آکر اس کی اطلاع دی تو حسن گانگو نے کہا "الحمد للہ" اور اسی وقت روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ (تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۸۱)

(بقیہ صفحہ ۳۷)

اخلاق و کردار اور عادات میں طرز و تمدن اور طریقۂ معاشرت میں گفتار و کردار، نشست و برخاست میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سکھائے ہوئے طریقوں اور بتائی ہوئی شاہراہ پر چل کر اللہ تعالیٰ اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رضامندی و خوشنودی حاصل کرے۔ و اٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

عالم اسلام ایک منظر میں

نام مملکت	صدر مقام	رقبہ مربع میل میں	آبادی لاکھوں میں	سرکاری زبان	مسلم تناسب آبادی
۱۔ اپر وولٹا	اواگاڈوگو	۱۰,۵,۸۶۹	۶۵	فرانسیسی	۲۰ فیصد مسلم
۲۔ اردن	عمّان	۹۷,۷۴۰	۳۰	عربی	۹۳٫۶ فیصد مسلم
۳۔ افغانستان	کابل	۲,۵۳,۸۶۱	۲,۰۵	پشتون (ایرانی)	مسلم سنی
۴۔ الجیریا	الجیرز	۹۱,۹,۹۵۱	۱,۹۱	عربی	مسلم سنی
۵۔ امارات العربیہ للمتحدہ	ابوظہبی	۲۳,۲۷۸	۶۵	عربی	۹۷ فیصد مسلم
۶۔ انڈونیشیا	جکارتا	۷۳۵۲۶۸	۱۵۱۰	ملائی	۹۰ فیصد مسلم
۷۔ ایران	تہران	۶۳۶۳۶۳	۳۶۳	فارسی	۹۶ فیصد مسلم بیشتر شیعہ
۸۔ بحرین	منامہ	۲۳۱	۳	عربی/فارسی	۵۰ فیصد مسلم سنی شیعہ ۵۰
۹۔ بنگلہ دیش	ڈھاکہ	۵۵,۱۵۶	۸۶۷	بنگالی	۸۵ فیصد مسلم
۱۰۔ بے نن (داہومی)	پورٹونوو	۴۳,۴۸۳	۳۵	فرانسیسی	۱۳ فیصد مسلم
۱۱۔ پاکستان	اسلام آباد	۳۴۲,۷۵۰	۷۹۰	اردو۔ انگریزی	۹۶ فیصد مسلم
۱۲۔ ترکی	انقرہ		۴۴۳	ترکی	۹۹ فیصد مسلم
۱۳۔ تنزانیہ	دارالسلام	۳۶۳,۷۰۸	۱۷۰	سواحلی، انگریزی	مسلم ۳۰ فیصد عیسائی ۳۰
۱۴۔ تیونس	تیونس	۶۳,۳۷۸	۶۳	عربی، فرانسیسی	مسلم
۱۵۔ جزائر القمر	مورونی	۲۹۳	۴	عربی، فرانسیسی	مسلم
۱۶۔ جیبوتی	جیبوتی	۸۸۰۰	۳٫۲	عربی	مسلم
۱۷۔ سعودی عرب	ریاض	۸۷,۳۰۰۰	۱۰۰	عربی	مسلم
۱۸۔ سینیگال	ڈاکار	۷۶,۱۲۴	۵۵	فرانسیسی	۹۰ فیصد مسلم
۱۹۔ سوڈان	خرطوم	۹۶۷,۴۹۱	۱۷۲	عربی	۲۷ فیصد مسلم
۲۰۔ سیرالیون	فری ٹاؤن	۲۷,۹۲۵	۳۴٫۷	انگریزی	۲۵ فیصد مسلم
۲۱۔ سیریا (شام)	دمشق	۷۱,۴۹۸	۸۳٫۵	عربی	۸۸ فیصد مسلم
۲۲۔ شاڈ (چاڈ)	جمینہ	۴,۹۵,۷۵۲	۴۴	فرانسیسی	۴۰ فیصد مسلم
۲۳۔ صومالیہ	مقدیشو	۲,۴۶,۱۵۵	۳۵٫۳	صومالی، عربی	۹۹ فیصد سنی مسلم
۲۴۔ عراق	بغداد	۱۷۲,۰۰۰	۱۲۶٫۸	عربی	۹۵ فیصد مسلم

آزاد مسلم مملکتیں اور جہاں مسلمان بڑی اقلیت میں ہیں وہ ممالک

مرتبہ۔ ڈاکٹر رشید نواز

نوعیت حکومت	صدر ریاست	ملکی تقسیم	سکہ	زرعی اہم پیداوار	معدنیات
جمہوریہ	سانگول لامی زانا	دس صوبے	فرانک	اناج، روئی، چاول، مکئی، پھل	مینگنیز، سونا، ہیرے
شاہی	حسین بن طلال	آٹھ صوبے	دینار	زیتون، پھل، ترکاریاں	پٹاش، فاسفیٹ
فوجی	بابرک کرمل (ظہیر افغانی)	۲۸ صوبے	افغانی	کپاس، روغنیات، پھل	کروڈ آئیل
جمہوریہ	شاذلی بن جدید		دینار	مکئی، انگور، زیتون، تمباکو	تیل، لوہا، سیسہ، کوئلہ، قدرتی گیس
وفاقی جمہوریہ	الشیخ زاید بن سلطان	۷ ریاستیں	درہم	کھجور، ترکاریاں	تیل ہی تیل
جمہوریہ	سوہارتو	۲۶ صوبے	روپیہ	چاول، مونگ پھلی، تمباکو، کافی	زنک، تیل، کوئلہ، مینگنیز، تانبہ
اسلامی جمہوریہ	آیت اللہ الخمینی	۲۰ ضلع	ریال	چاول، میوہ، گنا، کپاس	تیل، گیس، کرومائٹ، لوہا، سیسہ، مینگنیز
شاہی	امیر الشیخ عیسیٰ ابن سلیمان	۶ شہر	دینار	پھل ترکاریاں	تیل قدرتی گیس
عوامی جمہوریہ	جنرل ارشاد	۱۹ ضلع	ٹکہ	پٹسن، چاول، چائے	قدرتی گیس تیل
عوامی جمہوریہ	میتھیو کیرے کو	۶ منطقے	فرانک	کھجور، مونگ پھلی، روئی، کافی	تیل
جمہوری فوجی	ضیاء الحق	۴ صوبے	روپیہ	چاول، گیہوں، روئی، روغنیات	سلفر، جپسم، نمک، کرومائٹ، قدرتی گیس
عوامی جمہوریہ	جنرل کنعان الفورین	۶۷ صوبے	لیرا	تمباکو، نالیں، روئی، زیتون	تیل
جمہوریہ	جولیس کیاراگے	۲۴ منطقے	شلنگ	روئی، کافی، چائے، تمباکو	ہیرے، سونا، ٹن
جمہوریہ	حبیب بورقیبہ	۱۸ صوبے	دینار	اناج، کھجور، زیتون، ترکاریاں	فاسفیٹ، لوہا، تیل، سیسہ، جست
وفاقی جمہوریہ	احمد عبد اللہ	۳ جزیرے	فرانک	ناریل، ولایتی پھل	نمک
جمہوریہ	حسن جولید	۵ ضلع			
شاہی	ملک فہد بن عبد العزیز	۱۸ صوبے	ریال	کھجور، گیہوں، جو، پھل	تیل، قدرتی گیس، سونا، چاندی، لوہا
جمہوریہ	لیوپولڈ سیدا	۸ منطقے	فرانک	مونگ پھلی، مکئی، چاول	فاسفیٹ
جمہوریہ	جعفر محمد نمیری	۱۸ صوبے	پونڈ	روئی، تیل، مونگ پھلی	چاول، گنا، کروم، سونا، تانبہ
جمہوریہ	سیاکا پی اسٹیفن	۴ صوبے	لیون	کوکو، کافی، کھجور، مغزیات	ہیرے، لوہا، باکسائیٹ
جمہوریہ	جنرل حافظ الاسد	۱۳ صوبے	پونڈ	روئی، زیتون، ترکاریاں	تیل، فاسفیٹ، جپسم
جمہوریہ	غلکس ناکوم گاکوتی	۱۳ صوبے	فرانک	کپاس، روئی	یورینیم
جمہوریہ	محمد صیاد بری	۱۶ صوبے	شلنگ	لوبان، شکر، موز	لوہا، ٹن، جپسم
جمہوریہ	جنرل صدام حسین	۱۶ صوبے	دینار	چاول، کھجور، کپاس، تمباکو	تیل، قدرتی گیس

۲۵۔ عمان	مسقط	۹۲,۰۰۰	۸٫۸	عربی	۵۷ فیصد مسلم
۲۶۔ قطر	دوحہ	۴۰۰۰	۲	عربی	۹۸ فیصد مسلم
۲۷۔ کویت	کویت	۷۷۸۰	۱۲٫۸	عربی	مسلم
۲۸۔ کیمرون	یاؤندے	۱۸۳۵۶۸	۸۰	انگریزی، فرانسی	۱۲ فیصد مسلم
۲۹۔ گابون	لیبرول	۱۰۲,۳۱۷	۵٫۹	فرانسی	۲۵ فیصد مسلم
۳۰۔ گیمبیا	بنجول	۴۰۰۳	۵٫۹	انگریزی	۸۵ فیصد مسلم
۳۱۔ گنی	کوناکری	۹۴۹۲۵	۴۹	فرانسی	۷۰ فیصد مسلم
۳۲۔ گنی (بساؤ)	بساؤ	۱۳۹۴۸	۵٫۵	پرتگالی	۳۰ فیصد مسلم
۳۳۔ لبنان	بیروت	۴۰۱۵	۳۲٫۵	عربی	۵۷ فیصد مسلم
۳۴۔ لیبیا	طرابلس (تریپولی)	۶۷۹,۵۳۶	۲۸	عربی	۹۷ فیصد مسلم
۳۵۔ مالدیپ	مالے	۱۱۵	۱٫۵	دیہوی	سنی مسلم
۳۶۔ مالی	باماکو	۴۶۴,۸۷۳	۶۳	فرانسی	۹۰ فیصد مسلم
۳۷۔ مراکش	رباط	۱۷۱,۹۵۳	۱۸۴	عربی	۹۹ فیصد مسلم
۳۸۔ مصر	قاہرہ	۳۸۶,۸۷۲	۴۰٫۵	عربی	۹۲ فیصد مسلم
۳۹۔ ملائشیا	کوالالمپور	۱۲۸,۳۲۸	۱۳۲	ملاوی	اکثریت مسلم
۴۰۔ موریطانیہ	نواکشوط	۴۱۹,۲۲۹	۱۴	فرانسی عربی	۹۵ فیصد مسلم
۴۱۔ نائیجیریا	لاگوس	۳۵۶,۶۶۹	۷۰٫۵	انگریزی	۷۴ فیصد مسلم
۴۲۔ نائیجر	نیامی	۴۸۹,۳۰۶	۵۱	فرانسی	۸۵ فیصد مسلم
۴۳۔ جنوبی یمن	عدن	۱۱۲,۰۰۰	۱۹	عربی	۹۱٪ سنی مسلم
۴۴۔ یمن	صنعاء	۸۵۲۸۹	۷۳	عربی	صد فیصد مسلم
۴۵۔ برونی			۳ لاکھ	عربی	۹۰ فیصد مسلم

۴۶۔ ہندوستان: تقریباً ۱۳ لاکھ مربع میل کی سرزمین میں مسلمان زائد از ۸ کروڑ ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۱۵ فیصد شائع کیا ہے۔ جزائر لکشادیپ میں ۹۴٫۴ فیصد، یوپی میں ۱۵٫۵ فیصد، بہار میں ۱۳٫۵ فیصد اور آندھرا پردیش میں ۸٫۱ فیصد ہیں۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری میں ۴۲ لاکھ، کیرالا میں ۴۳ لاکھ اور آندھرا پردیش میں ۳۵ لاکھ، کرناٹک میں ۳۱ لاکھ، جموں و کشمیر میں ۔۔۔ دیگر ریاستوں میں نسبتاً کم ہیں۔ ان کی عمومی زبان اردو ہے۔ جو عربی زبان کے الفاظ سے معمور ہے

شاہی	سلطان قابوس بن سعید	۱۰ منطقے	ریال	کھجور گندم، ترکاریاں	تیل
امارت	امیر خلیفہ بن حمد آل ثانی		قطری ریال	کھجور، ترکاریاں	تیل
امارت	امیر شیخ جابر الاحمد الصباح	۳ صوبے	کویتی دینار		تیل، قدرتی گیس
جمہوریہ	احمد وا جنجو	۷ صوبے	فرانک	کوکو، کافی، چائے، روئی	تیل
جمہوریہ	عمر	۹ صوبے	فرانک	کوکو کافی، چاول، موز	مینگنیز، تیل، یورنیم، لوہا، قدرتی گیس
جمہوریہ	دودا کیرا باجاورا	۶ صوبے	دلاسی	مونگ پھلی، چاول	
جمہوریہ		۲۹ منطقے	سیلی	موز، اناناس، چاول، مکئی	باکسائیٹ، لوہا، ہیرے
جمہوریہ	لوئی ڈی لیڈا کابرال	۱۲ منطقے	اسکیوڈو	مونگ پھلی	باکسائیٹ تیل
جمہوریہ	الیاس سیر یکسی	۵ صوبے	پونڈ	مچھلی، زیتون تمباکو	لوہا
اشتراکی جمہوریہ	کرنل معمر قذافی	۱۰ صوبے	دینار	کھجور، زیتون، پھل	تیل، قدرتی گیس
جمہوریہ	نعمان عبدالقیوم	۱۹ جزائر	روپیہ	ناریل پھل	
جمہوریہ	موسیٰ تراوڑی	۶ فرامنطقے	فرانک	مکئی چاول، روئی	
شاہی	شاہ حسن ثانی	۲۴ ضلعے	درہم	پھل، کھجور انگور	فاسفیٹ، کوبالٹ مینگنیز تیل
جمہوریہ	حسنی مبارک	۲۵ صوبے	جنیہ (پونڈ)	اناج ترکاریاں	تیل فاسفیٹ، لوہا مینگنیز سونا
جمہوریہ	شکو یحیی بیپرا	۱۳ ریاستیں	رنگٹ	ناریل، چاول پھل	ٹن، لوہا، تیل
اسلامی جمہوریہ	خونا ولد حیداللہ	۸ منطقے	اوقیہ	کھجور، اناج	لوہا، تانبہ
وفاقی جمہوریہ	الحاج شیخو شکاری	۱۹ ریاستیں	فائرہ	کوکو، تمباکو، کھجور، روئی	تیل کولمبیم، قدرتی گیس کوئلہ لوہا
جمہوریہ	سینی کونتے	۷ ضلع	فرانک	مونگ پھلی روئی	یورانیم (دنیا کا ۵٪ حصہ)
جمہوریہ	علی ناصر محمد	۶ صوبے	دینار	روئی، غلہ	
شاہی	عبداللہ صالح	۱۰ صوبے	ریال	روئی، کھجور، پھل کافی تیل	نمک تیل
شاہی	—	—	—	—	پٹرول

جو ہندوستان کی مجموعی آبادی کا تقریباً ۱۲ فیصد ہیں۔ رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے اپنے تخمینے کے بموجب جموں و کشمیر میں ۶۵٫۱۹ فیصد، آسام میں ۲۴ فیصد، مغربی بنگال میں ۲۰٫۵ فیصد، کیرلا میں ۱۹٫۵ فیصد کی بموجب اتر پردیش میں ایک کروڑ ۲۳ لاکھ، مغربی بنگال میں ۹۰ لاکھ، بہار میں ۷۵ لاکھ، مہاراشٹر گجرات میں ۲۲ لاکھ، تامل ناڈو میں ۳۱ لاکھ، مدھیہ پردیش میں ۱۸ لاکھ راجستھان میں ۱۷ لاکھ ہیں ۱۹۸۱ء کی مردم شماری میں ان اعداد و شمار میں کافی اضافہ ہوا ہے۔

باب الاستفتاء

از مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی

سوال: ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے جسم میں بذریعہ انجکشن چڑھانا شرعاً درست ہے یا نہیں! ۔ (۲) دوسرے کے لئے اپنا خون دینا کیسا ہے؟

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ خون انسان کے بدن سے الگ ہونے کے بعد وہ نجس اور ناپاک ہے یعنی نجاست غلیظہ ہے لہٰذا ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے بدن میں چڑھانا اصل قاعدہ کے اعتبار سے حرام ہونا چاہیے، اسی طرح انسانی اعضاء کی تکریم و تعظیم کے پیش نظر بھی حرمت کا ہی فیصلہ کرنا چاہیئے لیکن اضطراری حالات میں چند شرطوں کے ساتھ بقدر ضرورت حرام چیز کو استعمال کر لینے کی فقہاء نے اجازت دی ہے۔

پہلی شرط، یہ ہے کہ اضطرار کی حالت ہو اس طور پر کہ حرام کے استعمال نہ کرنے میں جان کا خطرہ ہو، دوسری شرط، یہ ہے کہ یہ خطرہ محض موہوم نہ ہو بلکہ کسی مسلمان ماہر اور معتمد حکیم یا ڈاکٹر نے قطعی طور پر یہ حکم دے دیا ہو کہ اس حرام کو استعمال کئے بغیر مریض جانبر نہیں ہو سکتا، تیسری شرط یہ ہے کہ ڈاکٹر یا حکیم کے کہنے کی بناء پر عادۃً یقین سا ہو، ان تین شرطوں کے ساتھ (اور یہ تینوں شرطیں قرآن سے مستفاد ہیں) ایسے مریض کو بقدر ضرورت دوسرے انسان کے خون کا اپنے بدن میں داخل کرانا جائز ہے، باقی رہی یہ بات کہ یہ انسانی کرامت اور شرافت کے خلاف ہے یعنی آدمی کے کسی جزو کا استعمال اس کے کرامت کی وجہ سے جائز نہیں ہے جیسا کہ عالمگیری میں ہے کہ الانتفاع باجزاء الآدمی لم یجز، قیل للنجاسة وقیل للکرامة وھو الصحیح کذا فی جواھر الاخلاطی ،، پس خون کے جزء انسان ہونے کا جہاں تک تعلق ہے اس میں غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بچہ کی ضرورت کے پیش نظر ماں کا یا کسی دوسری عورت کا دودھ پلانا جائز بلکہ واجب اور ضروری ہے، حتیٰ کہ فقہاء کرام نے بڑوں کے لئے بھی دوا اور علاج کی غرض سے عورت کے دودھ کو جائز بتایا ہے چنانچہ عالمگیری میں یہ جزئیہ موجود ہے ولا باس بان یسعط الرجل بلبن المرأة ویشربه للدواء ،، لہٰذا دودھ پر قیاس کرتے ہوئے کہا جائے گا کہ جس طرح عورت کا دودھ انسانی جزء ہونے کے باوجود ضرورت کی بناء پر بچوں اور بڑوں کے لئے شرعاً

جائز قرار دیا گیا ہے اسی طرح ضرورت کی بنا پر خون بھی دوسرے انسان کا اپنے جسم میں داخل کرانا جائز ہوگا فقط۔

(۲) کسی مریض کو اپنا خون دینے کے لئے حسب ذیل شرائط کا ہونا ضروری ہے اگر یہ شرطیں پائی جائیں گی تو خون کا دینا جائز ہوگا۔

۱ مریض کی ہلاکت کا خطرہ ہو اور مسلمان ماہر اور معتمد ڈاکٹر یا حکیم نے قطعی فیصلہ دے دیا ہو کہ خون کے سوا کسی اور صورت میں اس مریض کی جان بچنے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔

۲ مریض کی ہلاکت کا خطرہ نہ ہو لیکن ماہر ڈاکٹر یا حکیم نے کہہ دیا کہ خون کے بغیر مریض کو صحت ممکن نہیں۔

۳ خون نہ دینے کی صورت میں ماہر ڈاکٹر یا حکیم کی نظر میں مرض کے طویل ہونے کا قوی اندیشہ ہو مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں خون کا دینا جائز ہے جیساکہ قرآن کی آیتِ اضطرار سے مستفاد ہوتا ہے لیکن اگر خون دینے سے صرف منفعت یا زینت مقصود ہو یعنی ہلاکت یا مرض کی طوالت کا اندیشہ نہ ہو بلکہ حسن کے بڑھانے یا طاقت اور قوت کو زیادہ کرنے کے لئے ہو تو خون دینا جائز نہیں ہے۔

سوال: برش سے دانت صاف کرنے کا آج کل عام رواج ہو گیا ہے۔ برش خنزیر کے بالوں کے بھی ہوتے ہیں اور پلاسٹک یا نیلون کے بھی ہوتے ہیں۔ کیا یہ شرعاً درست ہے اور مسواک کی سنت اس برش سے ادا ہوجاتی ہے؟

جواب: جو برش خنزیر کے بالوں کے تیار کئے گئے ہوں وہ ناپاک ہیں ان کا استعمال قطعًا حرام ہے اور اگر مشکوک ہوں یعنی یہ تحقیق نہ ہو سکتی ہو کہ کس چیز کے بنے ہیں تو اس کا استعمال نہ کرنا اولی ہے۔ اور اگر مشکوک نہیں جیساکہ پلاسٹک، نیلون اور ریشے کے برش رائج ہیں یہ بلاشبہ پاک ہیں اور ان کا استعمال بھی درست ہے۔ لیکن بلا ضرورت مسواک کی سنت کے قائم مقام نہ ہوگا۔ کیونکہ سنت لکڑی کی مسواک سے ہی ادا ہوتی ہے البتہ اگر کسی موقعہ پر کوئی لکڑی مسواک کے قابل نہ ہو تو اس وقت انگلی سے یا موٹے کپڑے سے یا برش وغیرہ سے دانت صاف کرلے تو بوقت ضرورت مسواک کے قائم مقام ہوجائے گا لیکن بلا ضرورت اس کی عادت ڈالنا سنت کے خلاف ہے۔

سوال: ایک شخص کو پائریا کی بیماری ہے جب کبھی وہ وضو میں مسواک کرتا ہے یا انگلی سے دانت مانجھتا ہے تو مسوڑھوں سے خون نکلنے لگتا ہے ایسی حالت میں کیا وہ بغیر کلی کے وضو کرے تو اس کا وضو صحیح ہوگا یا نہیں؟

جواب :۔ ایسی مجبوری میں کلی نہ کرنا درست ہے بغیر کلی کے بھی وضو صحیح ہے اور اس وضو سے نماز بھی درست ہے ۔ درمختار میں ہے ۔ وغسل الفم بمیاہ وھما سنتان مؤکدتان. وقال الشامی فلو ترکھما اثم علی الصحیح سراج قال فی الحلیۃ لعلہ محمول علی ما اذا جعل الترک عادۃً لہ من غیر عذر ۔

سوال :۔ وضو یا غسل کر کے تولیہ یا رومال سے جسم کا پونچھنا کیسا ہے بہتر کیا ہے ؟ شریعت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں ۔

جواب :۔ حدیث شریف میں دونوں طرح کی روایتیں آئی ہیں یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں عمل ثابت ہیں اس لئے پونچھنا اور نہ پونچھنا دونوں طریقے جائز ہیں البتہ اس کی پسندیدگی میں علماء کا اختلاف ہے بعض نے لکھا ہے کہ رومال وغیرہ سے پونچھنا مکروہ (تنزیہی) ہے اور بعض نے پونچھنا بہتر اور پسندیدہ بتایا ہے اور آخری قول زیادہ قوی اور راجح ہے البتہ پونچھتے وقت زیادہ رگڑ کر نہ پونچھے بلکہ آہستہ سے پانی سکھائے تاکہ پونچھنے کے بعد دھونے کا اثر جسم پر باقی رہے درمختار میں ہے ومن الآداب التمسح بمندیل ۔ علامہ شامی نے اس مسئلہ پر خوب بحث کی ہے وہ لکھتے ہیں وانما وقع الخلاف فی الکراھۃ ففی الخانیۃ ولا بأس للمتوضی والمغتسل روی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ کان یفعلہ ومنھم من کرہ ذلک ومنھم من کرہ للمتوضی دون المغتسل والصحیح ما قلنا الا انہ ینبغی ان لا یبالغ ولا یستقصی فیبقی اثر الوضوء علی اعضائہ (ص ۱۲۱ / ج ۱) فقط

واللہ اعلم

مولانا محمد الیاس رحؒ نے فرمایا ۔۔۔ فرائض کا مقام نوافل سے بہت بلند تر ہے ، بلکہ سمجھنا چاہیے کہ نوافل سے مقصود ہی فرائض کی تکمیل یا ان کی کوتاہیوں کی تلافی ہوتی ہے غرض فرائض اصل ہیں اور نوافل ان کے توابع اور فروع ، مگر بعض لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ فرائض سے تو غفلت برتتے ہیں اور نوافل میں مشغول رہنے کا اس سے بدرجہا زیادہ اہتمام کرتے ہیں ، مثلاً آپ سب حضرات جانتے ہیں کہ دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف ، اور نہی عن المنکر ، (غرض تبلیغ دین کے یہ تمام شعبے ، اہم فرائض میں سے ہیں ، مگر کتنے ہیں جو ان فرائض کو ادا کرتے ہیں ، لیکن اذکار نفلیہ میں اشتغال اور انہماک رکھنے والوں کی اتنی کمی نہیں ۔

(از ملفوظات مولانا محمد الیاس رحؒ)

نگرانِ اعلیٰ حضرت الحاج مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند یوپی

دارالعلوم دیوبند کا علمی و دینی

ماہنامہ دارالعلوم

جلد نمبر ۶۷ | دسمبر ۱۹۸۴ء مطابق ربیع الاوّل ۱۴۰۵ھ | شمارہ نمبر ۳

طابع و ناشر

دارالعلوم معرفت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

مطبوعہ۔ محبوب پریس دیوبند (یوپی)

سالانہ زرِ اشتراک

ہندوستان سے ۲۵/-

سعودی عرب، کویت، ابوظہبی وغیرہ سے

بذریعہ ایرمیل ۹۰/- روپے

جنوبی مشرقی افریقہ، برطانیہ وغیرہ سے

بذریعہ ایرمیل ۱۰۵/- روپے

امریکہ۔ کناڈا وغیرہ سے بذریعہ ایرمیل ۱۱۶/- روپے

پاکستان سے بذریعہ رجسٹری ۴۵/- روپے

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے

فہرست مضامین

ضروری گذارش

اس دائرہ میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زرِ تعاون ختم ہو گیا ہے۔ اگلے سال کی رقم بھیج کر مشکور فرمائیں۔

″ ″ ″

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن قاسمی

خدائے کارساز کے لطف وکرم سے "دارالعلوم" نہایت اطمینان بخش حالات اور پرسکون ماحول میں کتاب وسنت کی تعلیم، اسلامی عقائد واحکام کی ترویج اور ملت کے جگر پاروں کی تربیت وتہذیب میں پورے طور پر منہمک ہے پچھلے کئی سالوں کے بعد احاطۂ دارالعلوم میں ایسی علمی چہل پہل اور دینی سرگرمیاں دیکھنے کو ملی ہیں۔ یہ کوئی خوش گمانی شخصی رائے نہیں ہے بلکہ اس وقت دارالعلوم کی علمی سیر کے لئے جو بھی آتا ہے سب ہی کا یہ متفقہ تاثر ہے۔ انتظامی اور مالی لحاظ سے بھی دارالعلوم ماضی قریب کی بنسبت بہتر حالت میں ہے۔ طلبہ کی زیادتی اور آسمان کو چھوتی ہوئی گرانی کے باوجود تمام مصارف بغیر کسی تنگی اور دشواری کے پورے ہو رہے ہیں۔ اور دارالعلوم اپنے منصوبے کے مطابق ترقی کی منزل کیجانب بڑھ رہا ہے آمد وصرف کے جملہ حسابات آئینہ کیطرح صاف وروشن ہیں جسکی تصدیق حالیہ مجلس شوریٰ نے بھی کی ہے۔ غرضیکہ اکابر رحمہم اللہ کے لگائے ہوئے اس گلستان کی آبیاری اور چمن بندی میں ان کے سچے وارثین انھیں کے آئین ودستور کے مطابق پورے عزم وحوصلہ اور کامل اخلاص کیساتھ ہمہ تن مصروف عمل ہیں۔ اور ان کی جدوجہد اور سعی وعمل کے عمدہ ثمرات اور بہتر نتائج روزِ روشن کیطرح ظاہر ہو رہے ہیں۔

لیکن برا ہو بغض وحسد اور شقاق وعناد کا کہ یہ خوش آئند حالات اور یہ دارالعلوم کے ترقی کی سمت بڑھتے ہوئے قدم بعض لوگوں کو ماہی بے آب کی طرح تڑپا رہے ہیں انہیں یہ قطعاً گوارا نہیں ہے کہ حضرات اکابر رحمہم اللہ کا لگایا ہوا یہ باغ بہارِ عناد ہو، برگ وبار لائے اور اس کے ثمرات سے قوم وملت بہرہ ور ہو۔ اسلئے وہ آئے دن اس کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں اور اسے نقصان پہنچانے کیلئے طرح طرح کے بے سروپا پروپگنڈے کرتے رہتے ہیں تاکہ دارالعلوم سے ملت اسلامیہ کا اعتماد اٹھ جائے اور مسلمانوں کی نگاہ میں اسکا اعتبار باقی نہ رہے

چنانچہ ادھر چند مہینوں سے مختلف ذرائع ابلاغ کے ذریعہ یہ بات پھیلائی جارہی ہے کہ دارالعلوم کو ایکٹ ۲۱ سنہ ۱۸۶۰ کے تحت رجسٹرڈ کرالیا گیا ہے کہ اس لئے اب اسکی سابقہ دینی و مذہبی حیثیت برقرار نہیں رہی اور شرعاً اب وہ مسلمانوں کے صدقات وعطیات کا مستحق نہیں رہا۔ یہ پروپیگنڈہ اس شد و مد اور قوت کے ساتھ کیا جارہا ہے کہ اسکی بازگشت پاکستان اور دیگر بلاد اسلامیہ تک سے سنائی دینے لگی ہے۔ لیکن ہم نے تہیہ کرلیا تھا کہ ہمیں ان لغو اور دور از حقیقت افواہوں سے کسی قسم کا کوئی تعرض کرنا نہیں ہے۔ کیوں کہ اس سے پہلے بھی جو کچھ لکھا گیا تھا وہ دل پر پتھر رکھ کر نہایت مجبوری کی حالت میں لکھا گیا تھا ورنہ دل اس جھمیلے میں الجھنے کیلئے بالکل آمادہ نہیں تھا۔ مگر ایک طرف سے زہر آلود اور انتہائی خطرناک پروپیگنڈوں کا غیر متناہی سلسلہ اور دوسری جانب سے مسلسل سکوت اور خاموشی دارالعلوم کیلئے کس قدر مضر اور نقصان دہ ثابت ہوتی اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ اس لئے دارالعلوم کے تحفظ، بقا اور استحکام کیلئے صحیح حالات و واقعات کا اظہار ناگزیر ہوگیا اور آج بھی محض دارالعلوم ہی کے مفاد کے پیش نظر دل پر جبر کر کے یہ سطور قلمبند کی جارہی ہیں۔

نہ تم ہم پر ستم کرتے نہ ہم فریادیوں کرتے ۔ نہ کھلتے رازِ سربستہ نہ یوں رسوائیاں ہوتیں۔

درحقیقت موجودہ انتظامیہ کو یہ الزام دینا کہ اس نے دارالعلوم کو سوسائٹی کے تحت رجسٹرڈ کرا کے اسکی حقیقت کو مسخ کردیا ہے جس کے نتیجہ میں دارالعلوم کے زکوٰۃ، خیرات اور صدقات کے صحیح مصرف ہونیکی شرعی حیثیت مشکوک ہوگئی ہے ایک خالص افترا اور ایسا جھوٹ ہے جس کی کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ خود حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے اب سے تقریباً انیس ۱۹ بیس سال پہلے یہ رجسٹریشن کرایا تھا جیساکہ مرحوم اپنے ایک مکتوب بنام مولانا مرغوب الرحمٰن مہتمم دارالعلوم میں رقمطراز ہیں۔

"۱۹۶۵ء کے قریب جب بعض حالات کے تحت ناگزیر سمجھا گیا کہ ایک رجسٹرڈ سوسائٹی بھی دارالعلوم دیوبند کے نام سے بنائی جائے جس سے انکم ٹیکس دینے والے چندہ دہندگان دارالعلوم دیوبند کو سہولت ہو اور دارالعلوم کیجانب سے مقدمات دائر کرنے میں قانون مروجہ کے ضوابط کے تحت انجمن نہ پڑے جیساکہ قانون داں حضرات نے بھی مشورہ دیا تھا تو ایک سوسائٹی کو ۳۱ رمارچ ۱۹۶۵ء کو برائے نام رجسٹرڈ کرالیا گیا الخ

(مکتوب حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ محررہ ۲۱ راگست ۱۹۸۲ء)

ناظرین کی معلومات اور اطمینان مزید کی غرض سے حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سوسائٹی کے رجسٹریشن کیلئے ڈمس سوسائٹیز اینڈ جٹس یوپی لکھنؤ میں جو درخواست پیش کی تھی اسکی مصدقہ نقل اسسٹینٹ رجسٹرار کا اردو ترجمہ نقل کیا جارہا ہے۔ جس سے یہ حقیقت نصف نہار کی مانند روشن ہوکر سامنے آجائے گی کہ دارالعلوم کو سوسائیٹی ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ کرانے کا الزام موجودہ انتظامیہ پر ہے یا خود حضرت مولانا قاری محمد طیّب صاحب مرحوم و مغفور پر ملاحظہ ہو ترجمہ

درخواست برائے رجسٹریشن

ایکٹ ۲۱ بابت ۱۸۶۰ء کے تحت دارالعلوم کے معاملہ میں دارالعلوم ایسوسی ایشن کا میمورنڈم

(۱) اس سوسائٹی کا نام دارالعلوم دیوبند ہوگا۔ (۲) اس سوسائیٹی کا صدر دفتر دیوبند میں ہوگا۔

(۳) اس سوسائٹی کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہوں گے۔

(الف) علوم عربیہ دینیہ (یعنی قرآن مجید و تفسیر و حدیث، فقہ، وعقائد و کلام و دیگر مذہبی فنون کی مسلمانان عالم کو تعلیم دینا۔ (ب) ثانوی درجہ میں دیگر علوم و فنون کی تعلیم جو عربی زبان کی تحصیل یا مذہبی اغراض کی تکمیل کیلئے ضروری یا مفید ہو اسی طرح فارسی اردو و دیگر زبانوں کی بقدر ضرورت تعلیم۔ (س) حفاظت و اشاعت اسلام کی خدمات بذریعہ تقریر و تحریر بجا لانا اور مسلمانوں میں دینی تعلیم و تبلیغ اور ان میں سلف صالحین جیسے اسلامی اخلاق و اعمال اور جذبات پیدا کرنا۔ (ل) دوسرے فنون اور حرفوں کو بقدر ضرورت اسی حد تک اختیار کرنا کہ اصل مقصد تعلیم میں نقصان واقع نہ ہو اور جنہیں اصل مقصد کیلئے معین و مددگار سمجھا گیا ہو۔ (ک) علوم دینیہ کی اشاعت کیلئے مختلف مقامات پر مدارس عربیہ قائم کرنا اور قائم شدہ مدارس کا دارالعلوم سے الحاق کرنا۔

(۴) دارالعلوم کے معاملات کا انتظام دارالعلوم کے دستور اساسی کے مطابق مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ کے سپرد ہے جس کے ممبران حسب ذیل ہیں۔

(۱) مولانا قاری محمد طیب — مہتمم و ممبر شوریٰ و مجلس عاملہ دارالعلوم — دارالعلوم دیوبند

(بقیہ ۱۹ حضرات کے نام ہیں جو اس وقت مجلس شوریٰ کے ممبر تھے ان میں بر وقت حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی حضرت شیخ الحدیث مولانا فخرالدین صاحب۔ مولانا محمد میاں صاحب دہلوی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، مولانا ڈاکٹر محمد مصطفیٰ علوی، مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی، مولانا مفتی محمود احمد صاحب نانوتوی اور مولانا فضل اللہ صاحب علی گڈھی، مولانا سید حمیدالدین صاحب وفات پاچکے ہیں اور بقیہ حضرات حیات ہیں

اور مجلس شوریٰ کے ایک کے علاوہ سب ہی رکن ہیں. اختصار کی غرض سے ان حضرات کے اسما نہیں لکھے گئے) دارالعلوم کے دستور اساسی کی نقل جسکے صحیح ہونیکی تصدیق مجلس شوریٰ کے سات ممبران نے کردی ہے میں میمورنڈم کے ہمراہ منسلک کرتا ہوں. ہم لوگوں نے جن کے پتے ذیل میں درج ہیں ان مقاصد کیلئے جو میمورنڈم میں درج ہیں اپنے آپکو متحد کر کے میمورنڈم میں درج کر دیئے ہیں اور آج ہم نے ایکٹ ۲۱ سنہ ۱۸۶۰ء کے تحت سوسائٹی قائم کر لی ہے" نیچے درج ہے ست کی تصدیق کرنیوالے ممبران کے دستخط کے ساتھ مولانا محمد عثمان صاحب کے بحیثیت پریسیڈنٹ میونسپل بورڈ دیوبند کے تصدیقی دستخط ہیں. چنانچہ اسی وقت سے دارالعلوم کا رجسٹریشن چلا آرہا ہے اور حسب دستور خود حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میعاد ختم ہونے پر اسکی تقریباً دوبار تجدید بھی کرائی ہے تیسری بار تجدید سنہ ۱۹۸۱ء میں حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے مددگار مہتمم ہونے کی حیثیت سے کرائی اس موقع پر بھی حضرت قاری صاحب نے ایک درخواست ۲۵ دسمبر سنہ ۱۹۸۱ء کو رجسٹرار آف سوسائٹیز کو دی کہ وہ اس سوسائٹی کی تجدید کا حق دارالعلوم کے دستور اساسی کے مطابق صرف مجھی کو ہے کیونکہ میں اس سوسائٹی کا سکریٹری ہوں کنوینر. ریکٹر اور مہتمم ہوں. بیلنس سیٹ مکمل ہوتے ہی تجدید کی درخواست پیش کروں گا. مؤدبانہ طور پر میں یہ بات جناب کے نوٹس میں لانا چاہتا ہوں کہ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب یا دوسرا کوئی شخص یا کوئی مددگار مہتمم یا زائد مہتمم کو کسی قسم کا اختیار نہیں ہے (ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا۔)

اب فیصلہ کیجئے کہ اس الزام کی کیا حقیقت ہے. اور موجودہ انتظامیہ پر یہ الزام تھوپ کر یہ ناخدا ترس گروہ کیسا سفید جھوٹ بول رہا ہے. دوسری بات یہ ہے کہ کسی ادارے کو رجسٹرڈ کرانے سے اسکی دینی و شرعی حیثیت میں کوئی بھی فرق نہیں آتا. کیونکہ اگر یہ بات ہوتی تو حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کبھی بھی دارالعلوم کو رجسٹرڈ نہ کراتے اور نہ ہی دوسرے ادارے کے ذمہ دار اپنے اداروں کو رجسٹر کراتے حالانکہ ہندوستان کے بڑے بڑے مدارس مثلاً دارالعلوم، ندوۃ العلماء لکھنؤ دارالعلوم مؤ اعظم گڑھ، مفتاح العلوم مؤ اعظم گڑھ، الجامعۃ الاسلامیہ بنارس، الباقیات الصالحات ویلور وغیرہ بہت سے مدارس رجسٹرڈ ہیں اور اب تو تقریباً ہر ادارے کے ارباب انتظام اپنے اپنے اداروں کے رجسٹرڈ کرانیکی فکر میں ہیں کیونکہ رجسٹرڈ نہ ہونے کی صورت میں انکی جائداد یں خطرے میں رہتی ہیں اور اسکے علاوہ بھی بہت سی دشواریاں پیش آجاتی ہیں جنکا حل رجسٹریشن ہی ہے اس لئے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ رجسٹریشن کیوجہ سے دارالعلوم کی حیثیت بدل گئی وہ ملت کو فریب دے رہے ہیں. ہم پورے اخلاص کے ساتھ دین وملت کے ہر بہی خواہ کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ خود دارالعلوم آکر یہاں کی علمی و دینی سرگرمیوں کو ملاحظہ فرمالیں. بحمداللہ اسوقت تین ہزار کے قریب طلبۂ علوم کی دارالعلوم علمی و دینی تربیت کر رہا ہے جس میں پندرہ سو سے زائد طلبہ کے طعام، لباس، دوا علاج وغیرہ کی مکمل ذمہ داری دارالعلوم پوری کر رہا ہے پھر بھی کہا جاتا ہے کہ اسکی حیثیت بدل گئی اور وہ مسلمانوں کی امداد و اعانت کا مستحق نہیں رہا. فالی اللہ والمشتکی۔

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

اس مضمون میں مندرجہ ذیل نظریات پر بحث کی گئی ہے

۱۔ قرآن مجید ایک مستقل عالم ہے، اور کائنات مادی کے مقابلہ میں اس کی آیات وسور کائنات روحانی ہیں"

۲۔ قرآن مجید اسی طرح مجمل ہے، جس طرح مثلاً زمین مجمل ہے پھر جسطرح انسان کی تمام جسمانی ضروریات اسی زمین سے نکلتے ہیں اسی طرح روحانی ضروریات قرآن سے پورے ہوتے ہیں۔

۳۔ قرآن مجید کی آیات میں بعض اوقات جو بے ربطی پیدا ہو جاتی ہے اس کی کیا وجہ ہے۔

۴۔ قرآن مجید سے بعض لوگ کیوں گمراہ ہو جاتے ہیں۔

۵۔ مسلمانوں کی موجودہ تباہیوں کا راز کیا ہے؟"

ونُنزّل من القرآن ما هو شفاءٌ — ہم قرآن میں ان چیزوں کو اتار رہے ہیں جو ایمانداروں

ورحمة للمومنين (حق سبحانہ تعالیٰ) | کے لئے شفا اور رحمت ہیں۔

انسان کچھ بھی ہو، اس کی قوتوں کی غیر محدود رسائیاں جس حد تک بھی پہنچتی ہوں، لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ باوجود اس کے بھی اگر غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ (تنہا وہ کچھ بھی نہیں ہے)

کائنات کا ہر ذرۂ عالم کی ہر چیز اس کی مدد و معاونت میں مصروف ہے اور وہی اسے پیغام عمل دیتی ہے، حتی کہ انہی کے بل بوتے پر وہ وہاں پہنچتا ہے، جہاں دوسرے نہیں پہونچتے،

وہ اپنی قوتِ دید کے متعلق مدعی ہے کروڑوں میل دور سے آفتاب کی طویل وعریض رقبہ کا احاطہ کر لیتا ہے، اور یقیناً کر لیتا ہے لیکن فضاء میں پھیلنے والی روشنی اگر بجھا دی جائے، تو اس کے بعد بھی اسے اس دعویٰ کی جرأت ہو سکتی ہے؟

ابر اور رات کی تاریکی میں وہی انسان جو دن کو اپنے دائرے بینائی میں نصف کرۂ عالم کو گھیرے ہوئے تھا، اگر کسی اندھیری کوٹھری میں ڈالدیا جائے تو پھر اس میں اور اس اندھے میں کچھ بھی فرق باقی رہ جاتا ہے جو بیچارہ سرے سے اس قوت پر ماتم کر کے بیٹھ چکا ہے۔؟

انسان سُنتا ہے اور اپنی قوت سامعہ کی بناء پر مدعی ہے کہ علاوہ عالم الوان وانوار کے ایک اور عالم اصوات (آواز) کا موجود ہے لیکن اگر درمیان کی ہوا، یا سالمات کی حرکت ارتعاشی، یا ذرات اثیریہ کے ذبذبوں کو معدوم کر دیا جائے تو کیا اس کے بعد بھی وہ اپنی اس قوت پر اسی قدر اکڑ سکتا ہے؟

وہ اپنی ایجادات داختراعات پر نازاں ہے وہ ریل بناتا ہے، انجن ہنکاتا ہے ہوائی جہاز اڑاتا ہے وہ منٹوں میں سیکڑوں میل کی آواز کو ایک خطہ سے دوسرے خطہ میں پہنچاتا ہے یقیناً یہ اس کے حیرت انگیز کارنامے ہیں لیکن فرض کر دکہ کوئلہ نہیں ہے، آگ نہیں ہے پانی نہیں ہے، لوہا نہیں ہے لکڑی نہیں ہے، الغرض انسان کے علاوہ اس عالم میں اور کچھ نہیں ہے کیا اس کے بعد بھی وہ یہ کر سکتا ہے یا وہ کر سکتا ہے، میں تم سے سچ کہتا ہوں اور تم بھی اس کو جانتے ہو کہ ایجاد و اختراع تو خیر، شاید اس کے بعد وہ چند گھنٹے بھی اپنی زندگی کے

نظام کو قائم نہیں رکھ سکتا۔

اور یہی وہ بلند پایہ نقطہ راہوا تخیل ہے جہاں پر انسان کے غرور دانانیت کا ایوان یکایک دھم سے گر جاتا ہے احمق اپنے کو سب کچھ سمجھتا ہے لیکن ایک عقلمند اپنے کو کچھ نہیں دیکھتا، آہ! کہ جب وہ اپنے ہر سانس میں غیر کا دست نگر ہے اپنی ہر حرکت دسکون میں دوسروں کا محتاج ہے تو پھر یہ غرور و بدمستی، کس پر پھر ہنگامہ انانیت کیوں؟ یہ شورش لمن الملکی کس بنیاد پر؟

تنک ظرف چھلک پڑتے ہیں۔ اکڑتے ہیں۔ غراتے ہیں، لیکن عمیق روحین مطمئن ہیں، وہ سب کچھ کرتی ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی جانتی ہیں کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

قل کل من عند الله فمالهولٰو	کہہ دا کہ سب کچھ اللہ ہی کے یہاں
القوم لا یکادون یفقهون	سے ہے پھر اس قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ
حدیثا (الحی القیوم)	بات سمجھنے کے قریب بھی نہیں آتے۔

بہر حال اس مختصر تبصرہ سے میری غرض اس وقت نقطہ اس قدر ہے کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے کائنات کی امداد و اعانت کی بنیاد پر کرتا ہے۔

انسان عقل دتدبیر، ہوش وحواس اور ادراک واحساس کے آلات کو لے کر کرہ زمین پر آتا ہے اور دیکھتا ہے اس کے سامنے مواد کا ایک غیر محدود ذخیرہ پھیلا ہوا ہے، وہ اپنی ادراکی قوتوں کو ان ہی مادوں میں سے کسی ایک کے ساتھ جوڑتا ہے ربط دیتا ہے پھر بھی تو اسی ارتباط کے بعد کائنات کا کوئی ناموس (راز) اس کے سامنے بے نقاب ہو جاتا ہے مثلاً وہ گلاب کی شاخوں سے ایک پھول توڑتا ہے اور قوت شامہ (سونگھنے کی قوت) کے ساتھ اسے ربط دیتا ہے حتیٰ کہ یکایک اس پر یہ منکشف ہو جاتا ہے کہ اس پھول میں ایک اور عالم (بو) ہے جس کو نہ آنکھ دیکھ سکتی ہے اور نہ کان سن سکتے ہیں نہ ہاتھ چھو سکتے ہیں نہ زبان چکھ سکتی ہے اور کبھی نقطہ جوڑنے سے کام نہیں چلتا، بلکہ وہ اپنی روح کو اس مادہ میں غرق کر دیتا ہے اس کے ظاہر دباطن میں پیوست ہوتا ہے، جس کے بعد بسا اوقات وہ ایسے عجوبہ طراز اسرار کا، اعلان کرتا ہے، جس کو اس سے پہلے کوئی نہیں جانتا تھا۔

مثلاً تم دیکھتے ہو، کہ یہی زمین جو ظاہراً فقط خاک اور دھول کا ایک تیرہ گوں، مجموعہ ہے کون باور کرسکتا تھا، کہ مٹی کے اسی ڈھیر میں گھی کی ندیاں بہہ رہی ہیں اور دودھ کی نہریں جاری ہیں کون یقین کرسکتا تھا کہ اسی مشت خاک کے ساتھ بالوشاہی اور شکر پارے رلے ملے ہیں۔ اسی میں مرچ کی تلخی بھی ہے اور املی کی ترشی بھی، اسی کے اندر تیلوں کے سرچشمے بھی ہیں اور بادام و پستے کے مغزیات بھی لیکن انسان اسی میں ڈوبا، اور گھسا حتیٰ کہ اب وہ ان تمام چیزوں کو اسی گرد و غبار چھان بین کر نکال لیتا ہے وہ اسی زمین سے گھانس، چارے اکھاڑتا ہے اور اپنی گائے بھینس کی منہ میں اسے ڈالدیتا ہے پھر تھوڑی دیر بعد اسی گھانس بھوسے کو، جو زمین کے اجزا سے تیار ہوئے تھے، دودھ کی شکل میں نچوڑ لیتا ہے، وہ ایکھ اور گنوں کی چھوٹی چھوٹی شاخوں کو اسی زمین پر نصب کردیتا ہے اور چند ہی دنوں کے بعد اس کے گھر میں شیرینی کی ریل پیل ہو جاتی ہے گویا زمین میں اس نے ایک شکر کش مشین گاڑ دی ہے، جو دھڑا دھڑ زمین کے اجزا شیریں کو مٹی سے الگ کرکے باہر پھینکتے رہتے ہیں۔ اسے کپڑے کی ضرورت ہوتی ہے، خدا جانے پہلے کیا کرتا ہوگا لیکن اب تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بنولے کے سیاہ اور کالے دانوں کو اسی مٹی میں ملا دیتا ہے اور اسی کے بعد وہ روئی کی گانٹھوں کو اندر سے باہر نکال لاتا ہے پھر اس کو مختلف ترکیبوں سے شیروانی، کوٹ کرتے پاجامے کی شکل میں ڈھال لیتا ہے، اور اسی کیطرف توجہ دلائی گئی۔

وفی الارض قطع متجاورات	اور زمین میں ملے جلے قطعات اور تختے ہیں جنہیں،
وجنٰت من اعناب وزرع	انگوروں کے باغ ہیں اور کھیتیاں ہیں اور درخت
ونخیل صنوان وغیر صنوان	ہیں، بعض چند شاخوں کے ساتھ نکلتے ہیں
یسقی بماء واحد ونفضل	اور بعض یہ اکیلے یہ سب ایک ہی پانی سے
بعضها علی بعض فی الاکل	سینچے جاتے ہیں مگر پھر بھی ہم بعض کو بعض
ان فی ذالک لایات لقوم	پر مزے کے اعتبار سے برتری عطا کرتے ہیں، اس میں
یعقلون[۱] (الحلیم الحکیم)	نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو عقل رکھتے ہیں۔

[۱] اس آیت میں نباتات کی تینوں قسم کی طرف اشارہ کیا گیا۔ (باقی آئندہ صفحہ پر)

اور جوں جوں زمانہ آگے بڑھ رہا ہے انسان کی قوت فکریہ، ایجاد شدہ چیزوں سے الگ ہوکر مادے کی نۓ معلوم نوامیس واسرار کے ساتھ متعلق ہوتی ہے اور آۓ دن نت نۓ انکشافات، وغوامض کا اعلان کرتی رہتی ہے، کچھ دن اس کا غلغلہ عالم میں بلند رہتا ہے، یہاں تک کہ جب کثرت استعمال کے بعد وہ راز بھی ایک پیش افتادہ حقیقت ہوجاتا ہے تو دوسری چیزیں سامنے آتی ہیں.

یقیناً کسی زمانہ میں مٹی اور کیچڑ کے اندر سے برتن کی قاشوں کے مواد کا بہم پہونچانا ایک عجیب دغریب نظریہ خیال کیا گیا ہوگا، لیکن اب یہ ایک معمولی بات ہے حتیٰ کہ اسی طرح رفتہ رفتہ انسان نے آتش وآب کی باہمی ارتباط سے بخار (اسٹیم) کی قوت کا پتہ چلایا، اور زمانہ اس پر محو حیرت ہوگیا، پھر اس نے مواد کی باہمی مصاکت ومصادمت کے قانون سے برق (الکٹرسٹی) کا راز دریافت کیا اور دنیا اسی پر سر دھن رہی ہے اور کسی کو کیا معلوم کہ اولاد آدم آئندہ چل کر، کن کن چیز پر سر دھنے والی ہے وعلم آدم الاسماء کی تاویل وتصدیق کے لۓ ابھی ہم کو بہت کچھ دیکھنا ہے، کیونکہ اس قضیہ کو کلیہ ہونا ہے اور ہوکر رہے گا.

آسمانی اشاروں میں ارتقاء، واکتشاف، کی اسی حقیقت کی طرف، وخلق لکم مافی الارض جمیعا سے راہنمائی کی گئی.[1]

اور زمین ہی نہیں، شوقین بصیرتوں کے سامنے تو اس سے بھی بڑا میدان پیش کیا گیا ہے.

وسخر لکم مافی السموات　　　اللہ نے تمہارے فائدہ کیلئے نہ صرف

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) بیل کھیتیاں درخت پھر ادھر اشارہ کیا گیا، کہ ایک ہی زمین میں ایک ہی پانی میں پرورش پانے کے بعد وہ کون سی قوت ہے جو انہیں مختلف ذائقہ پیدا کر دیتی ہے کسی میں ترشی، کسی میں شیرینی، کسی میں روغن، کسی میں تلخی وغیرہ

[1] اور تمہارے فائدہ کیلئے ہم نے وہ تمام چیزیں پیدا کی ہیں، جو زمین میں ہیں۔

وما فی الارض جمیعا منہ　　مادہ ارضیہ! بلکہ تمام چیزوں کو جو
(باری عز اسمہٗ)　　آسمانوں اور زمین میں ہیں مفتوح و مسخر
کردیا ہے۔

* * * *

پس جو چاہے۔ ان اشیاء کے دریچہ ہائے کمال میں جھانکے خود اس سے فائدہ اٹھائے، اور دوسروں کو مستفید ہونے کا موقعہ دے، یہ بتایا گیا ہے کہ انسان نہ صرف زمین، بلکہ فضائے آسمانی کے تمام کائنات سے ہر قسم کے منافع حاصل کرسکتا ہے وہ اس کی اعانت و امداد سے کبھی سرتابی نہیں کرسکتے اور یہی وہ حقیقت ہے کہ جس کی اہمیت سے انسان روز بروز واقف ہورہا ہے۔

وہ ہوا، وہ بادل، وہ آفتاب، اسکی گیس، بلکہ تمام سیارات کو اپنے منافع کیلئے کارآمد بنانے کی کوشش میں مصروف ہے، اور ہمیشہ رہے گا، خواہ سائنس کے ذریعہ سے ہو، یعنی حواس خمسہ کی مدد سے، یا باطنی قوی اور مخفی طاقتوں کی اعانت سے، لیکن جد وجہد کا یہ سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے اور جاری رہے گا کہ دراصل اس سے انسان کے کمالات اور کائنات کے کمالات کا انکشاف ہوتا ہے اور یہ دونوں ملکر میں کیا بتاؤں کہ کس کے کمالات قدوسیہ جبروتیہ کے آئینہ بنے ہیں۔

کیا ہوتا ہے اگر یہ آئینہ نے یہ نہیں سمجھا کہ میرے سامنے کس کی طلعت جہاں آرا نے برقعہ الٹ دیا ہے وہ اپنی اندر جھانکنے والی نگہ مست سے سرمشار نہیں ہوتا ہے، تو نہ ہو، وہ جاہل ہے، تو اسے جاہل رہنے دو، لیکن اسی ظلوم وجھول آئینہ میں صورت دیکھنے والا اپنی صورت بھی دیکھ رہا ہے، صاحب جلوہ بھی ہے اور اس کا جلوہ بھی ہے، وہ روشن بھی ہے ظاہر بھی ہے، اور ظاہر ہوتا رہے گا، کس شان کے ساتھ اسی آیت کے بعد نظر بازوں کو پیغام نظر دیا جاتا ہے۔

ان فی ذالک لآیات لقوم　　اس میں (یعنی گذشتہ بالا اعلان میں)
یتفکرون　　یقیناً کثرت سے نشانیاں ہیں اُن لوگوں
(الفدکس السلام)　　کیلئے جو اپنی قوت فکریہ سے کام نہیں لیتی۔

بہرحال میں کیا کہنے لگا۔ غرض یہ ہے کہ انسان اور کائنات کے باہمی تعلقات پر نظر

ڈالنے کے بعد یہ مسئلہ بالکل صاف ہوجاتا ہے کہ جس حکمت بالغہ نے ہم کو یعنی ہماری روحوں کو ھیکل جسمانی کے ساتھ وابستہ کیا ہے اسی نے محض اپنے فضل، عمیم، لطف کریم سے اس ہیکل کے بقا، وصحت، نشو و نما کیلئے ہر طرح کے سامان ہمارے ارد گرد پھیلا دیئے ہیں، اور پھر اسی نے ہمارے اندر ایسی قوتیں ودیعت فرمائی ہیں، جن کی راہنمائی سے ان تمام چیزوں پر مسلط حاصل کر لیتے ہیں۔

بسیط، زمین اور فضا، کائنات کے اس مادی سلسلہ میں جہاں تک غور کیا جائے گا، یہ بات قطعاً واضح ہوتی جائے گی کہ انسان اپنے مادی ڈھانچ کی پرورش کے لئے جن جن چیزوں کا محتاج ہے اس کے مہیا کرنے میں کوئی کمی نہیں کی گئی ہے۔

بدبخت نہ سوچنے والی قومیں کچھ ہی کہیں۔ لیکن بنی آدم کی بلند اختر قبیلوں نے اس کا اقرار کیا ہے۔ اور ہمیشہ اقرار کرتے رہتے ہیں، کاہلوں کو اپنے جسم کے پالنے میں تکلیف ہوتی ہو تو ہوان کے پچھتر فیصدی افراد کو جو بیس گھنٹوں کے اندر دو دفعہ بھی پیٹ بھر کر کھانا نہ ملتا ہو، تو نہ ملے لیکن قدرت پر یہ الزام غلط ہے، رونا اپنی عملی قوتوں کے بیکاری پر چاہیئے، ماتم ان زنگ آلود جمود کی طاقتوں پر کرو، جو ان سب میں ہیں، لیکن آہ! کہ کچھ دنوں سے کسی میں نہیں ان کے پاس اگر سردی سے بچنے کیلئے اچھے کپڑے نہیں ہیں، تو یہ جھوٹ ہے کہ خزائن السموات الارض میں ایسے کپڑے نہیں ہیں۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ اس خزانہ سے حاصل کرنے کیلئے جس سعی اور کوشش کی ضرورت ہے وہ ان میں نہیں ہے۔

قرآن حکیم کا اعلان عام ہے:-

وقدرنا فیھا اقواتھا سواءً للسائلین۔	اور ہم نے زمین میں تمام ذخیرے ناپ تول کر رکھدیئے ہیں جو ہر ایک جستجو کرنے والے کیلئے برابر ہے۔
حق سبحانہ وتعالیٰ	

پس جو دروازہ کھٹکھٹائے گا، اسکے لئے کھولا جائے گا وہ جو کنڈی نہیں ہلاتا اگر اس کے لئے دروازے نہیں کھلتے تو حسرت کس پر ہے؟

"کتاب روشن" میں تو تم سے کہا گیا تھا کہ۔

هو الذی جعل لکم الارض ذلولا فامشوا فی مناکبہا وکلوا من رزقہ والیہ النشور (پارہ ۲۹ سورہ ملک)

اس نے تمہارے فائدہ کیلئے زمین کو تمہارے لئے بالکل رام کر دیا ہے، پس اس کے کندھوں پر چلو پھرو، اور اسی کی پیداوار کو کھاؤ (اور یاد رکھو) کہ اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

* * *

ادیم زمیں سفرۂ عام اوست — چہ دشمن بریں خوان یغما چہ دوست

پھر جس میں سر پوش اٹھانے کا بھی سلیقہ باقی نہیں رہا ہے وہ دستر خوان پر اگر نہیں بیٹھ سکتا تو اپنے سلیقہ کو درست کرے خوان یغما کا کیا قصور،

لیکن جہاں اس چرم و استخوانی ہیکل کی تربیت و پرورش کیلئے خالق القویٰ والقدر نے مواد کا اتنا عظیم الشان ذخیرہ پھیلا دیا ہے کہ جس کی کوئی تباہ نہیں انسان خدا جانے کس زمانے سے اس کے ختم کرنے میں مصروف ہے لیکن وہ کس طرح ختم نہیں ہوتے۔

وہیں یہ کس قدر عجیب، اور کتنا حیرت انگیز سانحہ ہے کہ بعض سیاہ بھیجوں نے محض اپنی ازلی شقاوت اور انتہائی کور باطنی کے ساتھ قدرت قاہرہ جلیلہ فیاضہ پر یہ گستاخانہ اور ناپاک حملہ کر دیا کہ قدرت نے اگرچہ فانی جسموں، اور تباہ ہونے والے ڈھانچوں کیلئے یہ سب کچھ کیا ہے لیکن وہ جو اصل جوہر ذات ہے اور حقیقت انسانیہ اسی سے عبارت ہے بلکہ واقع میں انسان وہی ہے اس کے معاملہ میں انتہائی بخل اور غایت تنگدلی سے کام لیا گیا ہے حتیٰ کہ اب ان چرمی زبانوں سے یہ آواز بغیر کسی تذبذب کے عام طور سے نکل رہی ہے کہ اس کے لئے اس ساری کائنات میں کچھ نہیں ہے کائنات کے سلسلہ حوادث کی کوئی کڑی اس مقصد کیلئے مفید نہیں، العظمۃ للہ میں یہ سنتا ہوں اور میرے ہوش و حواس پر اختلال طاری ہوا جاتا ہے یہ کیا کہا گیا کہ اگر دانت میں کوئی معمولی سی چیز اٹک جاتی ہے تو اس کے نکالنے کے لئے اس عالم میں ہزاروں قسم کے خلال غیر محدود مقدار میں موجود ہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ کیسا دعویٰ ہے کہ انسان کے دانت میں نہیں، بلکہ خود

داس کے اندر اگر ہمیشہ کے لئے تباہ کرنے والی چیز اٹک جائے تو اس ساری کائنات میں اس کا کوئی علاج نہیں آخر یہ کس دیوانے نے کہا اور کن ابلہوں نے باور کیا، کہ ہمارے جوتوں کے میل صاف کرنے کیلئے تو اس عالم میں ہزاروں سامان موجود ہیں، لیکن اگر خود ہم پر گرد پڑ جائے، اور ہمارے اندر میل بیٹھ جائے اس کے لئے فیاض قدرت نے کچھ نہیں لکھا خدانخواستہ اگر ایسا ہے تو پھر قدرت کی بے مثال فیاضی جس کا ظہور ذرہ ذرہ میں بدیہی طور پر محسوس ہو رہا ہے کیا ایسا لفظ ہے جو کبھی شرمندۂ معنیٰ نہیں ہوا۔

آخر ہم ان مادوں کو لے کر کیا کریں گے، جو ہمارے جسم کی تو مدد کر سکتے ہیں لیکن خود ہماری اعانت سے مجبور ہیں، اگر یہ صحیح ہے کہ ہمارے استخوانی ہیکل کے لئے تو سب کچھ کیا گیا ہے اور خود ہمارے لئے کچھ نہیں ہے تو پھر یقیناً یہ کہنا ہی بالکل درست ہے کہ اس ہماری کائنات میں انسان کے لئے کچھ نہیں ہے۔

اور یہی نہیں کہ اس ذخیرہ میں ہمارے نفع کیلئے کچھ نہیں ہے بلکہ اس کے بعد قطعاً یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہمارے سامنے ہے اس میں انسان کے آرام و عیش و سرور و نشاط کے سامان نہیں، بلکہ دکھ درد تکلیف و مصیبت کی آگ بھری ہوئی ہے۔

مجھے عقل دی گئی ہے اور میرے سامنے گندھک، شورہ، سیسہ، لوہا، اور اسی طرح کے دوسرے مواد پھیلا دیئے گئے ہیں تاکہ میں ان میں سب کو ملا کر جلا کر وہ چیزیں تیار کردوں جن سے انسان کے جوڑ بند کھل جاتے ہیں — ترکیب اعضا کی تباہ ہو جاتی ہے۔ اُن کی آبادیاں خاک میں ملجاتی ہیں۔

میرے سامنے مادہ کا یہ انبار کیوں لگا یا گیا ہے۔ جبکہ میری یعنی میری روح کی درستی کیلئے ایک تنکا بھی نہیں پیدا کیا گیا اگر میری روح اور میری حقیقت کی پرورش کیلئے کچھ نہیں تھا، تو پھر میرے ڈھانچہ کے لئے بھی کچھ نہ ہوتا، تاکہ روحانی ضعف سے مجبور ہو کر اگر میں کچھ کرنا چاہتا تو بجائے بندوق چلانے کے صرف دانت نکال کر دوڑتا، سینگوں کی جگہ، صرف اپنے، ناخن سے دوسروں کو نوچتا میرے جنوں کا اثر محدود ہوتا، میری دیوانگی عالم گیر نہ ہوتی۔

اور بالغرض اگر کبھی میں اپنی مذبوحی حرکتوں سے تھک کر گر بھی پڑتا ہوں۔ تو اس وقت بھی ان مادوں سے مجھے کسی قسم کی تسلی نہیں ہوتی، میں اپنے پیٹ میں ان ہی مادوں کو مختلف الوان واشکال کی صورت میں ٹھونستا ہوں اور چینی کی رکابیوں سے اٹھا اٹھا کر ٹھونستا ہوں، مگر پھر جب غور کرتا ہوں تو گو کیسۂ شکم بھر جاتا ہے لیکن مجھ میں پھر بھی وہی خلاء باقی رہتا ہے میری اندرونی بے چینی میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوتی۔

ہم اپنی اس چرمی کالبد کو روئی کے ریشوں اوراون کے بالوں، ریشم کے تاگوں سے منڈھتے رہتے ہیں بلکہ کبھی کبھی اس میں نمونے کے تار، اور موتیوں کے ہار کو شریک کر لیتے ہیں۔ لیکن جب اپنے اوپر نظر ڈالتے ہیں، تو اپنی حقیقی بے سروسامانی میں کسی قسم کی تخفیف نہیں پاتے۔

انسان کا جسم مادہ کی غذا تلاش کرتا ہے لیکن خود انسان اس غذا سے اپنے اندر اطمنان کی خنکی نہیں پاتا۔ اور جو ولولہ پاتا ہے وہ شاید اطمنان کی برودت وسکنیت سے ہی ناآشنا ہے شاید اس نے اطمنانی سرور کے ساتھ اس کرۂ ارضی پر کبھی سانس نہیں لی۔

ہاں میں نے کائنات کے اس عریض وطویل سلسلے کو دیکھا، اور بغور دیکھا اس میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جن کی مجھے اس وقت تک ضرورت ہے، جب تک کہ اس زمین پر چل پھر رہا ہوں۔

تو کیا جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا، اور یقیناً چلا جاؤں گا تو قدرت نے میرے لئے وہاں کوئی سامان نہیں کیا، اگر وہاں نہیں کیا ہے تو پھر یہاں اتنی خاطر مدارات کی کیا ضرورت تھی۔ میں خوب جانتا ہوں کہ جب اس زمین سے میں اٹھا لیا جاؤنگا۔ تو پھر میں پنجاب کے گیہوں کو نہیں دیکھ سکتا۔ گنگا مجھے اپنا پانی نہیں پلا سکتی، برار کی روئی وہاں نہیں جاتی، مانچسٹر کے تھان اور نیو یارک کے قندیلوں کی مانگ وہاں نہیں ہے۔

تو کیا میں وہاں ننگا کر دیا جاؤں گا بھوک سے مروں گا، پیاس سے تڑپونگا اندھیرے میں بھٹکوں گا۔

آہ! کہ اگر ایسا ہے تو کیا اس زمین پر میں صرف اس لئے آیا تھا کہ میرا مذاق اُڑایا جائے ۔ کیا میں واقعی کسی کا مسخرا ہوں، یہ چیزیں یہاں مجھے محض بطور دل لگی کی دی گئی تھیں، تاکہ میں جب ان سے خوش ہو جاؤں تو مجھے پاگل و دیوانہ بنانے کے لئے ان سب کو ایک ایک کر کے مجھ سے چھین لیا جائے اور میں ان کی تلاش و جستجو میں اِدھر اُدھر مارا پھروں، اور مذاق کرنے والا میری اس سعنگم جستجو کو دیکھکر دل ہی دل میں خوش ہو ۔

نہیں تو کیا ایسا ہے کہ اس زمین کی زندگی (یعنی خود میں) ہمیشہ کیلئے معدوم کر دیا جاؤں گا، میرا اس کے بعد کچھ پتہ نہ ہوگا، نہ یہاں ہوگا، اور نہ کہیں اور ہوگا، اگر ایسا ہے تو پھر فیاض قدرت جس کی جود و کرم کا یہ کچھ چرچا ہے کیا اس نے مجھے اپنا شکار بنایا، وہ فیاض نہیں، بلکہ دانہ دے کر چھری پھیرنے والا صیاد ہے کیا میرے گھیڑے میں مادیات کا آٹا اس لئے اتار اگیا ہے تاکہ جب میں اس میں الجھ جاؤں تو زور سے جھٹکا دیا جائے، کھینچا جائے، اور پھر اس کے بعد میری ہستی ہمیشہ کیلئے برباد کر دی جائے تو کیا میں قدرت کی غذا ہوں، یا اس شغل سے اس کا جی بہلتا ہے کہ مجھے دانے دے دیکر مارے، کاٹے تباہ و برباد کر دے ۔

اللہ اللہ اس مسافر نواز شخص کو میں کیا کہوں جس نے راہ میں میرے لئے پانی کے مٹکے، رکھے کھانے کیلئے میوہ دار درخت لگائے، درختوں کی شاخوں پر دستر خوانوں میں لپیٹ کر ہر طرح کی غذا بھی رکھدی، میرے لئے تھوڑی تھوڑی دور پر اپنے دھوپ اور بارش سے بچنے کیلئے فرش و فروش لحاف و بستر سے آراستہ مکان بھی بنا دیئے۔ یہ سب کچھ کیا، لیکن جب میں اپنی منزل پر پہنچا تو اس نے میری گردن بلا وجہ اڑا دی، میرا سامان بھی چھین لیا۔ حالانکہ اس کو نہ میری ضرورت تھی نہ میرے گوشت و استخوان کی، اور نہ میرے کپڑے لئے کی یقیناً اگر میری زندگی اسی خاک داں تک ختم ہو جاتی ہے تو قدرت کے متعلق بیساختہ ہر شخص کی زبان سے وہی الفاظ نکل پڑیں گے، جو اس مسافر نواز کیلئے تجویز کئے جا سکتے

یہ کہ اس کے بعد کائنات اور اس کا مرتب نظام ایک فعل عبث، امر باطل، شغل لایعنی سے زیادہ کوئی رتبہ حاصل کر سکتا ہے۔

لیکن اَلحَمدُ لِلّٰہِ کہ بجز دیوانوں کے جن کا افراط صرف ابلہوں تک محدود ہے عالم نے اس خیال کو جھٹلایا، اور ہمیشہ اکثریت نے اس کو جنون اور ہذیان ٹھہرا دیا، بنی آدمؑ کے برگزیدہ نفوس بے لوث اور گرامی ہستیوں نے جب کبھی نظام تکوینی کے اس مرتب و متسق سلسلے کو دیکھا تو اُن کی مقدس روحوں سے غیبی آوازوں میں یہ صدا آئی۔

ان فی خلق السموات والارض واختلاف اللیل والنھار لایات لاولی الباب (الی ان قال) ربنا ما خلقت ھذا باطلا سبحانک (پاری ۴ع ۱۰)	بلاشبہ آسمان وزمین کی پیدائش اور رات دن کے الٹ پھیر میں کثرت سے نشانیاں ہیں، ان لوگوں کیلئے جن کے اندر مغز، عقل ہے، وہ اُن کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ اے پروردگار تونے ان چیزوں کو بیکار پیدا نہیں فرمایا۔ کہ تیری ذات لغویت سے پاک ہے۔

٭ ٭ ٭

ہاں! یہ قطعاً غلط ہے کہ جس نے میرے گوشت کے لوتھڑوں اور ہڈیوں کی پرورش نشوونما کے لئے، یہ کچھ سامان کیا ہے، اس نے میرے لئے میری ذات کیلئے کچھ نہیں کیا، ہو نہیں سکتا کہ جس نے محض میرے جوتے کی گرد پونچھنے کے لئے طرح طرح کی چیزیں مہیا فرمائی ہوں، اس نے خود میرے لئے کچھ نہیں کیا ہے

بلاشبہ ہم کو یہ واثق یقین کرنا چاہیئے کہ اس فیاض ہستی نے اس چیز کو بھی ضرور پیدا کیا ہے جنکی طرف میرا جوتہ اور میری چھڑی نہیں بلکہ خود میں محتاج ہوں، میری ذات محتاج ہے میری حقیقت محتاج ہے،

جن کا سراغ مواد کے ذخیروں میں نہیں ملتا۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا۔ کہ جو اس ذخیرے میں نہیں ہے۔ وہ واقع میں بھی نہیں ہے تو کیا قدرت اس قدر عاجز و لاچار ہے کہ اس ساری ایجاد کی زور آزمائیوں کا دائرہ اسی کثیف

مادے تک محدود ہے کیا وہ اس سے زیادہ لطیف زیادہ نفیس زیادہ پاکیزہ چیز نہیں پیدا کر سکتی، جس کو ہمارے جسم سے نہیں، بلکہ ہماری لطیف ذات سے مناسبت ہو اس مادی ذخیرے میں جتنی چیزیں ہیں، ان کا ڈنڈا، فقط میرے مادہ جسدی سے مل سکتا ہے لیکن جس چیز کی ضرورت میرے گوہر پاک کو ہے اگر وہ ان تاریک و ظلماتی ڈھیروں میں نہیں ملتی. تو کوئی حرج نہیں، کہ وہ اس میں مل بھی نہیں سکتی. مگر پھر بھی اگر وہ مادی کائنات کے دائرہ میں نہیں، تو کائنات کے دائرہ میں ضرور ہے کیونکہ ہم بھی اسی کائنات میں اس سلئے ہیں اس کو بھی اسی کائنات میں ہونا چاہئے

نازک احساس والوں نے آخر اسے ڈھونڈھا، اور اسی کائنات کے احاطہ میں پالیا، حق کہ آخر میں یہ ان ہی کا اعلان ہے کہ یہ امر مقدس قدرت کی فیاضیوں کا وہ پاک سلسلہ ہے جس کو ہم کبھی وحی کبھی نبوت کبھی رسالت کے لفظوں سے تعبیر کرتے ہیں.

کمزور بھیجوں کے انسان کہتے ہیں کہ ان ضرورتوں کے لئے ہم قدرت کیطرف سے بے نیاز ہیں، ان حاجتوں کو خود ہمارا دماغ پورا کر سکتا ہے اور کرتا ہے لیکن جو انسان اپنی ایک معمولی پھنسی کے لئے قدرت کی طرف ہاتھ پھیلانے کے لئے مجبور ہے، وہ کس طرح مدعی ہو سکتا ہے کہ اس کے جسم میں نہیں، بلکہ خود اس کے اندر جو گھاؤ ہیں، اُن کو وہ بغیر تائید قدرت کے اچھا کر لدیگا. اگر اس پر بھی وہ مصر ہے تو اس دلوانے کو چھوڑ دو، تاکہ اس کا زخم زخم ناسور بن کر رہے، وہ اسی کے اندر تڑپے، پھڑکے، مر بھی نہیں سکتا کہ یہ پھوڑا اس کے جسم میں نہیں بلکہ اس کی جوہر ذات میں ہے انسان اپنے جسم کو چھوڑ سکتا ہے اور چھوڑ دیتا ہے پھر اپنے آپ کو اپنے سے کس طرح علیحدہ کر سکیگا.

لیکن ایک عقلمند یہ کبھی نہیں کر سکتا. وہ جب اپنی مونچھ کے بالوں کو تراشنے کیلئے بھی لوہے کی کان میں جھانکنے کیلئے اپنے مجبور پاتا ہے تو پھر اس کی سمجھ میں یہ کس طرح آ سکتا ہے کہ اپنی ذات کی غیر فطری صفات کی قطع و برید کے لئے قدرتی چیزوں سے بے نیاز ہے، وہ جس سے اپنی جسدی ضروریات کو مانگت

اور اس سے مانگنے میں نہیں شرماتا۔ اسی سے اپنی ذاتی حاجات کو بھی طلب کریگا۔ اور طلب کرتا ہے اور پاتا ہے، کامیاب رہتا ہے اور کامیاب جاتا ہے اور ہمیشہ، کامیاب رہے گا۔

اولئک ھم المفلحون۔ یہی لوگ کامیاب ہیں۔

اس کی نگین ہستی پر ہمیشہ کیلئے منقوش کردیا جاتا ہے۔

بہر حال بات کہاں سے کہاں پہونچی، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ جس طرح ہیکل جسمانی کیلئے مواد کا ایک اجمالی ذخیرہ ہمارے سامنے موجود ہے جس کو ہم مادی "کائنات کہتے ہیں اور روزمرہ اپنی جسمانی ضرورتوں کو اسی سے نکال نکال کر پوری کررہے ہیں۔ ٹھیک" "اسی طرح سلسلۂ موجودات میں ایک ایسی چیز بھی ہے جو ظاہرًا اسی طرح محل ہے جس طرح مثلاً "زمین" کا مادہ لیکن جب سوچنے والوں اور دیکھنے والوں نے اس کی تحلیل و تفصیل کی تو انسانوں کے لئے ان منافع کا ایک دریا بہ پڑا جن کا تعلق انسان کے جوہر ذات اور اصل حقیقت سے ہے اور اسی سلسلہ کو ہم "روحانی کائنات" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں

اسی مقدس سلسلہ فیوض نے آغاز آفرینش بنی آدم سے ہمیں بتایا کہ مواد کے استعمال کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ ہم ان کو بجائے خون ریزی، شر انگیزی، جنگ و قتال کے، اپنی سلامتی اور امن و آسائش کا ذریعہ کس طرح بنا سکتے ہیں۔ سچی مدینت۔ پاکیزہ تمدن۔ مسرت افزا خصارت، کیونکر پیدا ہوسکتی ہے اجتماع افراد کو مفاسد، ذخباثت۔ شرارت، اور بے چینی کے زہروں سے کس طرح مصفا کیا جاسکتا ہے۔

پھر اسی قدوس فیض قدرت نے ہمیں سمجھایا کہ جب ہم اس زمین کو چھوڑ دیں گے" پھر ہم کہاں جائیں گے اور وہاں پُرامن زندگی سلامتی اور راحت کے ساتھ کیوں کر مل سکتی ہے۔

اسی نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس کائنات کی اصلی غرض کیا ہے مواد کا اتنا طویل و عریض جال کس لئے بچھایا گیا ہے اور انسان اس پر کس لئے قابض ہے کائنات اگر اس کے لئے ہے تو وہ خود کس کے لئے ہیں ہمنے قدرت کی اس رحمت عامہ کو پہچانا، اس کو جانچا، دیکھا سمجھا۔ اور اسی کے بعد، وہ تمام نجس باتیں برباد ہوگئیں جو قدرت کی تنگ نظری یا عبث کاری کے متعلق ناپاک کھوپڑیوں میں پیدا ہوتی تھیں۔

اس رحمت عام، اس کا فیض محیط، اس کی خبرگیری ہمہ گیر نظر آئی، اس نے میرے جوتے کی بھی خبر لی ہے، اس لئے میرے بال سنوارنے کا بھی سامان کیا۔ اس نے میرے ناخن تراشنے کیلئے بھی چیزیں دیں۔ اور اسی کے ساتھ اس نے خود میری اصل ذات کے لئے جو کچھ بھی چاہئے تھا، سب کچھ دیا۔ اور پھر کیسی کے ساتھ دیا اہتمام کے ساتھ دیا۔

وان تعد و انعمۃ اللہ لا تحصوھا — اگر تم خدا کی نعمتوں کو گننا چاہو گے تو گن نہیں سکتے۔ (حق سبحانہ تعالیٰ)

اور یہی پیغام ان والا صفات، گرامی سمات، بے غرض، مقدسین کا ہے جنکو ہم "انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات" کے مطہر عنوان سے یاد کرتے ہیں۔ صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین کائنات کے اس سلسلہ کا ظہور کبھی نوح علیہ السلام، کبھی ابراہیم علیہ السلام، کبھی موسیٰ علیہ السلام، یا اسی قسم کے دیگر برگزیدہ ارواح طیبہ کے ذریعہ سے ہوا۔ اور پھر اخیر میں وہ ایک نہایت مضبوط اور مستحکم اصولوں کے ساتھ بنی آدم کے فرد اعظم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و علی آلہ و اصحابہ کے قلب قدس سے بیابان فاران میں قرآن کے فطرت آرا بصیرت افروز شکل میں چہرہ پرداز ہوا، جیسا کہ خود "اسی نور مبین" کی روشنی میں ہم پڑھتے ہیں۔

شرع لکم من الدین	تم لوگوں کے لئے وہ راہ خدا نے مقرر
ما وصی بہ نوحا والذی	کی جس کی وصیت نوح کو کی گئی اور
اوحینا الیک وما وصینا بہ	جس کو (اے پیغمبر) ہم نے تم پر اتارا اور

ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ الآیۃ۔ | جس کی وصیت ہم نے ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ کو کی۔

(حق سبحانہ وتعالیٰ)

روحانی منافع کا یہ ذخیرہ اصل حقیقت کے اعتبار سے ہمیشہ ایک رہا ہے لیکن زمانہ کی تغیرات وتبدلات کے اعتبار سے اس میں بعض جزئی محاسن واوصاف کا اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک وقت وہ آیا، اس معدن میں جن جن چیزوں کا پیدا ہونا ضروری تھا سب پیدا ہوگئیں، اور ہر حیثیت سے بنی آدم کے اعالی واوانی کیلئے کافی ووافی کامل واکمل ہوکر ایک اکمل ترین روح کے ذریعہ سے نسل آدم کو سونپ دیا گیا۔ اور الحمدللہ کہ وہ اپنی تمام اپنی محاسن وجمال کے ساتھ اس وقت موجود ہے۔

لیکن میں کہہ آیا ہوں کہ قدرت نے ہم کو جو کچھ بھی دیا ہے، محض مجمل دیا ہے اصل شئے وہیں سے آئی ہے خواہ روحانی ہو یا مادی، باقی ان کی تشریح وتفصیل یہ انسانی کوششوں کے ساتھ وابستہ ہے۔

میں نے کہا تھا کہ باوجود اس بات کہ اسی زمین میں ہماری تمام ضرورتیں پوشیدہ اور مستور ہیں لیکن ان ضرورتوں سے ہم اس وقت تک مستفید نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اس کے اندر غور نہ کریں اپنی ادراکی اور تفتیشی قوتوں کو اس کے اندر غرق نہ کریں۔

بجنسہ قرآن کا بھی یہی حال ہے کہ ظاہرًا وہ بالکل ایک مختصر سی کتاب اور نہایت ہی مجمل سی چیز نظر آتی ہے لیکن روحیں اسی میں ڈوبتی ہیں، گھستی ہیں حتیٰ کہ جب نکلتی ہیں تو کوئی ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہما ہوجاتا ہے کوئی امام اعظم ابوحنیفہ بنتا ہے، کسی کو غوث اعظم کا رتبہ ملتا ہے کوئی حجۃ الاسلام غزالی۔ اور مولائی معنوی کے القاب سے نوازا جاتا ہے۔

اور میں تم کو کیا بتاؤں کہ کیا دیکھتا ہے۔ اور دیکھ کر کیا بنتا ہے، وہ اس کے اندر جاکر کیا سمجھتا ہے اور پھر اس سے کیا نکالتا ہے جو اس میں نہیں پڑا وہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے متعلق بہت کم اندازہ کرسکتا ہے۔

کم از کم اسی مثال سے سمجھو کہ ظاہراً اس پانی میں تمہیں کیا بجلی نظر آتی ہے لیکن جس نے غوطہ لگایا اسی نے اس میں اس کو پایا۔ بہرحال میں نہایت تفصیل سے بتایا آ رہا ہوں کہ مجمل مادہ میں ظاہراً کچھ نہیں لیکن سوچنے والے وہ سب کچھ اسی سے نکال لیتے ہیں جن کا تعلق مادہ انسانی سے ہے۔

پس اسی طرح گو تم کو قرآن کے چند گنے گنائے اوراق میں شاید کوئی زیادہ اہمیت خیز شی نظر نہ آئے، اگرچہ یوں بھی وہ کس کو بغیر تڑپائے چھوڑتا ہے تاہم قرآن چونکہ قدرتی چیزوں میں سے ہے، اس لئے وہ کوشش اور سعی کو دعوت دیتا ہے ہر شخص اپنی کوشش کی مقدار سے اس سے حصہ پائے گا جس طرح مادہ کے اسرار بھی جو جتنی کاوش کرتا ہے پاتا ہے۔

قرآن کی اس قدرتی اجمالی کیطرف، جو ہر ایک قدرتی شے میں نہیں طور پر نمایاں ہے، خود مہبط وحی صلے اللہ علیہ وسلم نے ان لفظوں میں اشارہ فرمایا:

لا تشبع منه العلماء ولا	اہل علم (دانش) اس سے (قرآن سے)
یخلق علے کثرة الرد ولا	کبھی سیر نہیں ہو سکتے وہ کثرت سے
تنقضی عجائبه۔	بار بار دھرانے کے بعد بھی کبھی پرانا
(رواہ الترمذی)	نہیں ہو سکتا اسکے عجائبات بھی ختم نہیں ہو سکتے

دیکھو! ٹھیک جس طرح دنیا اس زمین کی پیداواروں سے کبھی سیر نہیں ہو سکتی مادہ کے ایک راز کے انکشاف کے بعد طبعًا متجسس طبائع دوسرے اسرار میں مشغول ہو جاتے ہیں اور کسی طرح اس سے نہیں گھبراتے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم قرآن کے متعلق بھی یہی ارشاد فرماتے ہیں کہ اس سے علم کے متلاشی کبھی سیر نہیں ہو سکتے کہ اس کے ہر ناموس (راز) کے بعد دوسرا ناموس اپنی طرف تبلاتا ہے۔

تم دیکھ رہے ہو کہ خدا جانے کتنے زمانہ سے انسان اس مٹی کو کرید کرید کر منافع حاصل کر رہا ہے ہر سال اسی زمین کو جوتتا ہے اس میں دانے ڈالتا ہے فصل کاٹتا ہے لیکن پھر چند ہی مہینوں کے بعد۔ اس کے ہل، بیل اسی زمین پر موجود نظر آتے ہیں، غرض یہ ہے کہ باوجود اس الٹ پھیر کے، یہ زمین کسی طرح پرانی نہیں

ہوتی ٹھیک یہی قرآن کے متعلق ارشاد نبوی ہے کہ یہ جتنی دفعہ دہرایا جائے گا پُرانا نہیں ہوگا، اور ہمیشہ نئی فصل اس سے ہاتھ لگتی رہے گی، اسی لئے آپنے ایک دوسرے موقعہ پر ارشاد فرمایا:

نعم الحال المرتحل ۔ کیا اچھا ہے کہ وہ شخص جو اترنے کے بعد پھر سوار ہو جاتا ہے (یعنی قرآن ختم کرنے کے بعد پھر شروع کر دیتا ہے۔

پھر دیکھو! مادہ کے عجائبات مادی ضرورتوں کے لئے کبھی ختم نہیں ہوسکتے نت نئی چیزیں روزانہ ابل رہی ہیں۔

پس وہ چیز جو روح ہے اس کی عجائبات بھی روحانی منافع کے باب میں کبھی ختم نہیں ہو سکتے جیسا کہ ابھی ارشاد نبوی میں گذر چکا کہ "اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔"

اور یہی نہیں اس قدرتی مادے کے حالات دکوائف، خصائص واوصاف پر ہم جہاں تک غور کرتے ہیں۔ اسی سے اُس قدرتی روح کی بھی شرح ہوتی چلی جاتی ہے۔ تم دیکھتے ہو، کہ کبھی کبھی اس مادی کائنات کے بعض اجزا میں سخت بے ربطی نظر آتی ہے مثلاً ایک مدت تک یہ دیکھا جاتا تھا کہ سمندر میں جزرومد چاند کی زوال وکمال کے ساتھ پیدا ہوتا ہے لیکن اسرار مادی کی تلاش کرنے والوں پر بالکل نہیں کھلتا تھا، کہ آخر ان دونوں میں کیا ربط ہے، حتیٰ کہ سوچنے اور غور کرنے کے بعد آخر یہ راز فاش ہوگیا۔ اور عام طور سے مشہور ہے۔

اسی طرح، بارش، آفتاب، مون سون، سمندر، ان چیزوں میں مدتوں بے ربطی نظر آتی رہی۔ لیکن اب سمجھا جاتا ہے کہ ان سے زیادہ مضبوط ربط اور کسی چیز میں بھی نہیں۔

اور اسی پر کیا موقوف ہے، بعض مسخروں نے تو یہاں تک کہدیا، کہ اللہ میاں نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ستاروں کو کوٹھی میں بھر کر فضائے آسمانی میں چھڑک دیا، کہ ان میں کوئی نظام نہیں ہے، لیکن علم النجوم کے ماہرین سے جاکر پوچھو! کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ کیا اس سے زیادہ مرتب نظام دکھیں اور پاتے ہیں۔

لے دکذلک اوحینا الیک روحا من امرنا کی آیت میں خدا نے قرآن کو روح فرمایا ۱۲

ٹھیک اسی طرح ہم کبھی کبھی "روحانی کائنات" (قرآن) کے بعض اجزا میں سوت بے ربطی محسوس کرتے ہیں، اور چونکہ اس کو مصنوعی کلام پر قیاس کیا جاتا ہے اس لئے بسا اوقات کوئی ربط پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اخبار اسلام جو قرآن کو انسانی کلام پر نہیں بلکہ اسی جیسے دوسری کائنات پر قیاس کرتے ہیں تو ان کے سامنے تمام اسرار اسی بے ربط کے دریافت کرنے میں مستور نظر آتے ہیں۔

حتی کہ جس طرح آج کائنات مادی کی بنیاد وحدت پر قائم کیجاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ گو بادی النظر میں یہ تمام چیزیں جدا جدا نظر آتی ہیں لیکن واقع میں یہ سب ایک ہی زنجیر میں جکڑی ہوتی ہیں۔

یہ دعویٰ علماء قرآن کا بھی ہے۔

مادہ کا تلاشی کہتا ہے کہ ہمارا سارا فلسفہ یہی ہے کہ مادی موجودات کی باہمی ربط کو دریافت کرلیں۔

اسی طرح روح کا متجسس کہتا ہے کہ ہمارا سارا علم یہی ہے کہ روحانی موجودات (یعنی آیات قرآنی) کے باہمی ربط کا پتہ چلائیں۔

بہر حال ان کا دعویٰ یہی ہے کہ قرآن کوئی انسانی تالیف اور بشری صناعت نہیں ہے، بلکہ وہ ایک قدرتی حقیقت ہے، پس اسے ہمیشہ اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے، جس سے اور قدرتی چیزیں دیکھی جاتی ہیں۔ اس کو اسی طرح پڑھنا چاہئے جس طرح ہم اس مادی صحیفۂ فطرت کو پڑھتے ہیں

اس کی ہر آیت کو ایک مستقل موجود اسی طرح قرار دینا چاہئے، جس طرح اس مادی کائنات کے ہر موجود کو قرار دیا گیا ہے، اور جسطرح مادی کائنات کے خاص خاص موجود کیلئے خاص خاص، علم بنائے گئے۔ مثلاً درخت کے لئے ایک خاص علم ہے۔ پانی کا ایک خاص فن ہے الیٰ غیر ذالک۔

اسی طرح قرآن کی ہر آیت بھی یہی چاہتی ہے کہ اس کے ماننے والے اسکی ہر آیت کیلئے ایک مستقل فن بنائیں۔

اور اسی طرح ہم اس " روحانی کائنات " کے فوائد سے اسی طرح متمتع ہو سکتے ہیں، جس طرح " مادی کائنات " کے منافع سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

وہ ایک مستقل عالم ہے اور اسی لئے قرآن کیلئے ان تمام لوازم کی جستجو کرنی چاہئے جن کی تلاش ہم مادی عالم میں کرتے ہیں۔

حتیٰ کہ اس بنیاد پر بلا کسی خوف و تردید کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح اس مادی عالم کے بعض اجزاء سے ہمارے جسد استخوانی کو کبھی کبھی نقصان پہونچ جاتا ہے۔

ٹھیک یہی حال "روحانی کائنات" کی ہستیوں کا ہے، ایسا ہوتا ہے اور بسا اوقات ہوتا ہے کہ کبھی کبھی اسی کے بعض اجزاء سے بجائے کسی نفع کے حقیقت انسانیہ و روح کو ضرر اور ضرر عظیم پہونچ جاتا ہے اسی کی طرف خود قرآن نے بھی اشارہ کیا ہے

یضل بہ کثیرا ویھدی بہ کثیرا۔ (رب حکیم) — اسی قرآن سے بہت سی (روحوں) کو خدا گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو سیدھی راہ پر لے چلتا ہے۔

لیکن العیاذ باللہ، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان اجزاء اور آیتوں کو خداوند رحمٰن نے ضرر پہنچانے کیلئے اتارا ہے کیوں کہ اس کا امکان "روحانی کائنات" میں تو خیر اس "مادی کائنات" میں بھی نہیں۔

بلکہ اصل یہ ہے کہ اس عالم میں ہو، یا اس عالم میں، اصل ذات کے اعتبار سے، نہ کوئی چیز بیکار ہے اور نہ مضر، لیکن اسی کے ساتھ ہر چیز کے استعمال کا ایک قانون اور خاص طریقہ ہے مثلاً فرض کرو کہ اس عالم میں اُپلے بھی ہیں، گیہوں بھی ہے کون کہہ سکتا ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی بیکار یا مضر ہے لیکن فرض کرو کہ کسی نے اپلے کو رکابی میں چور کر کھانا شروع کیا۔ اور گیہوں کو ایندھن میں جھونک دیا، تو یہ قصور نہ اُپلے کا ہوگا نہ اور گیہوں کا بلکہ یہ طریقہ استعمال کی ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

اور یہ تو ایک مثال ہے میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جن لوگوں ہر چیز کے استعمال کا طریقہ معلوم ہے ان کے نزدیک اس عالم کی کوئی چیز نہ بیکار ہے اور نہ مضر، وہ سب ہی کو مفید سمجھتے ہیں اور حسب استطاعت ہر ایک سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

پس قرآنی "کائنات (آیات)" سے اگر بجائے ہدایت کے کسی میں ضلالت کے جراثیم پیدا ہوں تو اس میں کیا شبہ ہے کہ یہ اس آیت کا قصور نہیں ہے بلکہ اس احمق کی جہالت اور علمی کسمپرسی کا نتیجہ ہے۔ خود منزل قرآن جل شانہٗ نے اس کی تصریح ان لفظوں

میں فرمائی۔

وما یضل به الا الفاسقین — اور قرآن سے خدا نہیں گمراہ کرتا۔ مگر صرف فاسقوں کو۔

⁂ ⁂ ⁂

جو ان روحانی کائنات کی طریقہ استعمال اور قانون تناسب سے واقف نہیں ہے اور وہ ان نطرتی حدود کو جو ہر ایک آیت کے استعمال کیلئے مقرر ہے۔ پرواہ نہیں کرتا اسی کو فاسق کہتے ہیں۔

اس لئے اگر ان نادانوں کو قرآن سے کوئی نقصان پہنچا، تو یہ اُن کے ہی نقص کا خمیازہ ہے۔ ولا یحیق المکر السیئ الا باھلہ۔

اور یہی نہیں، بلکہ تم دیکھتے ہو کہ کبھی کبھی ہمارا ہیکل جسمانی کچھ اس طرح مریض ہو جاتا ہے کہ مادی عالم کا ہر چیز، اور اس کی ہر ایک چیز جسم کے لئے مضر ہو جاتی ہے حتیٰ کہ دنیا کی مفید سے مفید چیزیں ایسے وقت میں انسانی جسد کیلئے زہر قاتل کا کام انجام دیتی ہے۔

ٹھیک یہی حال اس "عالم روح" کا بھی ہے کہ کبھی نہ صرف اس کی بعض آیتیں بلکہ مسلم قرآن ان لوگوں کے حق میں سم قاتل ہو جاتا ہے، جنہوں نے اپنی روحانی صحت برباد کر لی ہے اس مسئلے کو خود قرآن نے واضح کیا ہے۔

واذا ما انزلت سورة	اور جب کوئی سورۃ اتاری جاتی ہے تو
فمنھم من یقول ایکم	ان میں کچھ تو ایسے ہیں، جو کہتے ہیں کہ
زادته ھذہ ایمانا فاما	تم میں سے کس کس کے اندر اس سورۃ نے
الذین امنوا فزادتھم	ایمانی قوت کا اضافہ کیا۔ پس ایمانداروں
ایمانا وھم یستبشرون و	کا تو یہ حال ہے کہ ان کے ایمان میں اس
اما الذین فی قلوبھم	سے بالیدگی پیدا ہوتی ہے اور اپنی اس
مرض فزادتھم رجسا الی	(روحانی مسرت) پر ایک دوسرے کو خوشی
رجسھم وماتوا وھم	کا پیغام سناتے ہیں، مگر وہ لوگ جنکے دل
کافرون (رب رحیم عزیز)	میں بیماری ہے تو پھر بھی سورۃ انکی نجاست
⁂ ⁂ ⁂	پر نجاست کا اضافہ کرتی ہے وہ مرجاتے ہیں اور کافر رہتے ہیں

بہرحال آیت قرآنی سے اگر کسی کی نجاست پر نجاست کا اضافہ ہوتا ہو، تو اس میں قصور اس شخص کا ہے جس نے حدود اللہ کی حفاظت نہ کی، اور ہر طرح کے خیالات کو بغیر کسی آئین و قانون کے اپنے اندر اتارتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ ان ہی بے اعتدالیوں نے آخر اس کی صحت برباد کر دی، اور جس کی صحت خراب ہو جاتی ہے کیا شبہ ہے کہ اس کے حق میں اعلےٰ سے اعلیٰ مفید سے مفید چیزیں بھی بد سے بدتر ہو جاتی ہیں۔

اور اسی لئے دونوں عالم کے موجودات سے فائدہ اٹھانے کیلئے اس کی سخت ضرورت ہے کہ انسان کے اندر صحیح اور سچی قوت ممیزہ ہو، اور پھر ہر موجود کی طریقہ استعمال سے بھی واقف ہو، ممکن ہے کہ بعضوں میں یہ قوت تمیزی فطری طور پر موجود ہو۔ لیکن اکثر افراد انسانی اس کیلئے اکتساب و تعلیم کیطرف محتاج ہیں خواہ وہ کسی مدرسہ میں ہو، یا جاننے والوں کی محض صحبت میں خصوصاً روحانی کائنات" کی چیزیں چونکہ بہت زیادہ لطیف اور بہت زیادہ دقیق و نازک ہیں۔ اس لئے اس کے حدود منازل طرق استعمال، کے علم کیلئے، روحانی بصیرت اور دلی تنور کی ضرورت ہے، جو بغیر کسب و ریاضت کے مشکل ہی سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

اسرار و حقائق کا یہی پاک سلسلہ ہے جو درجہ بدرجہ ترقی کرتا ہوا۔ اخیر میں اسلام کے اس طائفہ منصورہ کے یہاں علی وجہ الکمال بے نقاب ہو جاتا ہے جن کو ہم لوگ صوفیہ کرام اور اولیاء اللہ کہتے ہیں۔ اور خاص اصلاح میں ان کا سچا نام صدیقین ہے۔ رضی اللہ تعالےٰ عنہم و رضوا عنہ، کثر اللہ وجودہم فی الاسلام والمسلمین فانہم دعائم الدین وارکانہ

حبیب الرحمٰن قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند

دوسری قسط

معیارِ افضلیت

حضرات خلفائے اربعہ میں افضل کون ہے!

افضل کی تعیین کا طریقہ

ان مقدمات کی تفصیلات کے بعد ہمارے لئے اب یہ موقع آگیا ہے کہ ہم یہ فیصلہ کرسکیں کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ اجمعین میں سب سے افضل کون بزرگ ہیں اور اس ساری خامہ فرسائی کا مقصد بھی یہی ہے کیونکہ اختلاف اور نزاع اسی مسئلہ میں ہے کہ حضرات خلفاء اربعہ میں افضلیت کے مقام پر کون فائز ہے، اولیت سابقیت اور قدیم الایمان ہونے کی صفت میں تو یہ چاروں حضرات باہم مشترک اور مساوی ہیں۔ اور دوسرے اکثر حضرات صحابہ سے اس شرف میں سبقت اور تقدم رکھتے ہیں۔ اس لئے اس کے اعتبار سے کسی ایک کو دوسرے پر فضیلت نہیں دی جا سکتی۔ لہٰذا ان حضرات کے درمیان فرق مراتب کی تعیین میں ہمیں دو چیزوں کی جانب رجوع کرنا ہوگا۔ کیونکہ افضل واعلیٰ کو متعین کرنے کی بس یہی صورت ہے اوّل نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے احادیث پاک۔ دوم ان حضرات کے احوال و اعمال کی تلاش جستجو، یعنی پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان حضرات کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات ہیں ان میں سے کسی کی سب پر فضیلت اور بزرگی بیان کی گئی ہے، بعض حضرات کا خیال ہے کہ احادیث سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کیوں کہ اس سلسلہ کی احادیث باہم متعارض ہیں، لیکن یہ خیال درست نہیں ہے کیونکہ باہمی تعارض اس وقت پیش آتا جبکہ دو اصحاب کے بارہ میں ایک ہی مفہوم کے الفاظ وارد ہوئے ہوں اور ان سے دونوں کی بزرگی اور بڑائی یکساں طور پر ثابت ہوتی ہو حالانکہ احادیث

کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واقعہ ایسا نہیں ہے کیونکہ حضرات شیخین (صدیق اکبر وفاروق اعظم) رضی اللہ عنہما کے لئے احادیث میں لفظ "افضل وخیر" آیا ہے اور سیادت اجتیت۔ اور شرف کے الفاظ حضرت علی مرتضیٰ، حضرت فاطمۃ الزہرا، اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کے متعلق وارد ہوئے ہیں، اور گذشتہ تفصیلات سے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ الفاظ فضیلت اختصاصی کو ظاہر کرتے ہیں اور "افضل" و "خیر" سے فضیلت اکتسابی اور جزائی ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے ان روایات میں سرے سے تعارض ہی نہیں ہے۔

اعمال کی تحقیق اور حضرت ابوبکر صدیق کی افضلیت کا اثبات

دوسرا طریقہ جسکی روشنی میں کسی کی، افضلیت کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے وہ احوال واعمال کی تحقیق وتفتیش ہے شریعت نے جن اعمال کی وجہ سے کسی کو مستحق فضیلت اور بزرگی قرار دیا ہے ان میں اہم ترین حسب ذیل ہیں۔

(۱) جہاد (۲) علم (۳) تقویٰ (۴) زہد (۵) انفاق فی سبیل اللہ (۶) حسن سیاست

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ ان اوصاف واعمال میں حضرات خلفاء اربعہ میں سے کس کا درجہ بلند ہے۔ پھر اسی کی روشنی میں اس اختلافی مسئلہ میں فیصلہ ہوگا۔ (۱) جہاد، اسلام میں جہاد ایک عظیم فریضہ ہے قرآن وحدیث میں اسکی اہمیت وفضیلت کو بڑے اہتمام سے بیان کیا گیا ہے، اسی لئے ان اعمال میں جو مدار فضیلت ہیں یہ ایک اہم ترین عمل ہے۔ جہاد کی تین قسمیں ہیں (۱) جہاد باللسان۔ زبان سے اسلام کی دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دینا اور وعظ ونصیحت کے ذریعہ اسلام کی اشاعت کی سعی وکوشش بجالانا (۲) جہاد بالرائے، یعنی عقل وتدبیر اور رائے ومشورہ سے مسلمانوں کے اندر اجتماعیت اور استحکام پیدا کرنا، اور حکمت عملی سے دشمنوں کے دلوں میں رعب بیٹھانا اور ان کی صفوں میں انتشار پیدا کرنا۔ (۳) جہاد بالید۔ تیر وتلوار وغیرہ سے دشمنان اسلام کا مقابلہ کرنا اور حرب وضرب کے ذریعہ اشاعت اسلام کی راہ سے رکاوٹیں دور کرنا اور اسلام کی سربلندی کی کوشش کرنا۔

یہ بات یقینی طور پر معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شجاعت اور بہادری

میں تمام انسانوں سے بڑھے ہوئے تھے اور یہ بات بھی متحقق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی جہاد باللسان اور جہاد بالرائے میں گزری ہے۔ جہاد بالید میں آپ مشغول نہیں ہوئے، اس لئے جہاد کی پہلی دونوں قسمیں تیسری اور آخری قسم سے لازمی طور پر اعلیٰ اور افضل ہیں ورنہ لازم آئے گا کہ۔

آپ نے اعلیٰ وافضل کو چھوڑ کر ادنیٰ اور کمتر کو اختیار فرمایا اور یہ ممکن نہیں تاریخ وسیر اور آثار واحادیث سے ثابت ہے کہ جہاد باللسان اور جہاد بالرائے میں حضرت صدیق اکبر اور حضرت فاروق اعظم تمام حضرات صحابہ پر سبقت اور فوقیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت و تبلیغ سے حضرت عثمان غنی، حضرت عبدالرحمن بن عوف حضرت زبیر اور حضرت طلحہ وغیرہ (رضی اللہ عنہم) جیسے اجلہ صحابہ حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے جس سے اسلام کی ترقی اور اشاعت کی راہیں کھلیں۔ اور حضرت فاروق اعظم کے اسلام سے اسلام اور مسلمانوں کو جو عزت و شوکت حاصل ہوئی ہے وہ تاریخ اسلام کا ایک روشن باب ہے، آپ کے اسلام سے پہلے مسلمانوں کی کس مپرسی اور بیچارگی کا یہ عالم تھا کہ آزادی کے ساتھ وہ اسلامی شعائر کی بجاآوری نہیں کرسکتے تھے۔ لیکن جس دن سے حضرت فاروق اعظم زمرۂ اسلام میں شامل ہوئے اسی دن سے مسلمان اعلانیہ طور پر اسلامی عبادات واعمال کو ادا کرنے لگے۔

رائے اور مشورہ میں بھی یہ دونوں حضرات ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشیر اور وزیر کی حیثیت سے آپ کے شریک رہے اور کوئی غزوہ اور مہم ان دونوں حضرات کے مشورہ کے بغیر واقع نہیں ہوا۔ علاوہ ازیں آنحضرت کی زندگی میں مسلمانوں کے اندر اجتماعیت و استحکام پیدا کرنے اور مشرکین کی صفت میں انتشار واختلال برپا کرنے میں ان دونوں حضرات نے دیگر ـــــــــ......

حضرات صحابہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ خدمات انجام دی ہیں یہاں تک کہ مشرکین بطور خاص ان ہر دو بزرگوار کے وجود سے نہایت خائف اور بدل وجان ان کی ہلاکت کے آرزومند تھے چنانچہ غزوہ احد کے آخر میں ابو سفیان نے حضرات صحابہ میں سے انھیں دونوں حضرات کے بارے میں پوچھا تھا کہ کیا یہ دونوں ہلاک

ہوگئے یا زندہ ہیں؟ ان تفصیلات سے محقق طور پر ثابت ہوگیا کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کا جہاں دوسرے حضرات صحابہ مثلاً حضرت علی مرتضیٰ، حضرت زبیر، حضرت حمزہ، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت ابوطلحہ، حضرت سعد بن معاذ حضرت سماک بن حرب رضی اللہ عنہم اجمعین سے افضل اور اعلیٰ ہیں اس کے باوجود حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو تیسری قسم یعنی جہاد بالید میں بھی مشارکت حاصل ہے کما یدل علی ذالک التواریخ۔

(۲) علم۔ فضیلت کے اسباب میں سے ایک سبب علم بھی ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے کہ قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون (آپ کہہ دیجئے کہ اہل علم اور بے علم برابر نہیں ہیں؟)

کہا جاتا ہے کہ حضرات صحابہ میں مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ کا مرتبہ علمی اعتبار سے سب سے بلند ہے۔ میں کہتا ہوں کہ علم کی زیادتی کا پتہ دو طریقہ سے لگایا جاسکتا ہے اول کثرت روایات حدیث اور دوسرے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا کسی کو ایسا کام سپرد کرنا جو علم سے تعلق رکھتا ہو کیونکہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کسی کام کی ذمہ داری اسی شخص کے سپرد کرتے تھے، جو اس کا سب سے زیادہ اہل اور مستحق ہوتا تھا۔ اور یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو نماز، حج اور جہاد میں امام اور امیر بنایا ہے اور حضرت فاروق اعظم کو صدقات وزکوٰۃ کی وصولیابی کے لئے عامل مقرر فرمایا ہے، علاوہ ازیں کتب احادیث سے یہ بھی معلوم ہے کہ صدقات سے متعلق اکثر روایتیں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی کے واسطے سے امت تک پہنچی ہیں۔ مسائل زکوٰۃ کی تشریح و تفصیل انھیں سے منقول ہے اور زکوٰۃ کے سلسلہ میں جو حدیث حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے واسطے سے منقول ہے وہ محدثین کے نزدیک درجۂ صحت تک نہیں پہنچ سکی ہے مزید براں اس میں ایک ایسا وہم موجود ہے جسکی بناء پر علماء اسلام میں سے کسی نے اسے اپنا معمول نہیں بنایا۔ نیز یہ بھی ثابت ہے کہ حضرات شیخین سفر و حضر ہر موقع پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے رفیق صحبت و شریک مشورہ رہے تھے اور ظاہر ہے کہ علم کامل کے بغیر حضور انہیں اپنا مشیر و وزیر نہیں بنا سکتے تھے پھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی

صحبت و رفاقت جسقدر دراز ہوگی اسی اعتبار سے احکام و فتوی کی معلومات میں زیادتی ہوگی۔

رہا معاملہ کثرت روایات و فتوی کا تو چونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو زندگی کا بہت ہی کم موقع ملا اس کے علاوہ آپ کا دور صحبت نبوی سے بالکل قریب اور متصل تھا اس لئے لوگوں کو آپ سے روایت حدیث کی چنداں ضرورت بھی نہیں تھی پھر آپ حج وغیرہ کے علاوہ کبھی مدینہ سے باہر سفر میں بھی نہیں نکلے کہ دور دراز مقامات کے لوگ آپ سے روایت حاصل کرتے کثرت روایت کے ان موانع کے باوجود ایک سو پینتالیس (۱۴۵) احادیث صحیحہ آپ کے واسطے سے مروی ہیں جنہیں کبار صحابہ نے آپ سے روایت کیا ہے جس میں حضرت علی مرتضیٰ، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی بھی شامل ہیں، اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تقریباً تیس (۳۰) سال تک حیات رہے۔ طول طویل اسفار بھی کئے اور عہد نبوت سے بعید ہونے کی بنا پر لوگوں کو آپ سے روایت حدیث کی احتیاج بھی زیادہ تھی کثرت روایت کے ان اسباب و مواقع کے باوجود آپ کی کل مرویات صحیحہ کی تعداد پانچ سو چھیاسی (۵۸۶) سے زائد نہیں ہے۔ لہٰذا اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ کی مدت حیات سے دیگر حضرات صحابہ کی مدت حیات کا موازنہ کیا جائے اور آپ کے عہد کے مواقع روایت سے دوسروں کے مواقع روایت کا مقابلہ کیا جائے تو واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ کا علمی مقام دیگر حضرات صحابہ کے مقابلہ میں بہت بلند ہے اسی پر ان کے فتوی کو بھی قیاس کرنا چاہیے۔

اور کمال علمی میں یہی مقام حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا بھی ہے کیوں کہ انکی مرویات مسندہ کی تعداد پانچ سو سینتیس (۵۳۷) ہے اور فتاوی تو ان کے بے شمار ہیں حتی کہ ہر مسئلہ فقہیہ میں ان کا فتوی موجود ہے علاوہ ازیں عقائد، تفسیر اور تصوف کے باب میں بھی آپ نے داد تحقیق دی ہے اور اپنے پیچھے ان موضوعات پر ایک اچھا خاصا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" میں ان تمام روایات

کو جمع کردیا ہے جو ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ بات متحقق ہے کہ حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت فاروق اعظم سے تقریبا سترہ (۱۷) سال زیادہ حضرت علی کو دنیا میں رہنے کا موقع ملا ہے کیونکہ حضرت فاروق اعظم کی وفات یکم محرم ۲۴ھ کو ہوئی ہے اور حضرت علی مرتضیٰ کی وفات کا سانحہ ۴۰ھ میں پیش آیا۔ مگر اس مدت دراز کے حاصل ہونے کے باوجود حضرت فاروق اعظم کی مرویات سے آپکی مرویات صرف انچاس (۴۹) زائد ہیں۔ اور اگر حضرت فاروق اعظم کی متانت تقریر، قوت تفہیم اور حسن تعلیم کو سامنے رکھا جائے تو دونوں حضرات کے درمیان نمایاں تفاوت نظر آئے گا، کیونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں کوئی اختلافی مسئلہ منقح اور طے نہ ہوسکا برخلاف اس کے حضرت فاروق کے عہد میں بہت سارے مسائل طے ہوئے اس سے پتہ چلتا ہے کہ دوسروں کے بہ نسبت حضرت فاروق اعظم کا علم کئی گناہ زیادہ تھا اور یہ حقیقت اس وقت اور منقح ہوکر سامنے آجائے گی جب دونوں حضرات کے مسانید و فتاوی کا باہم موازنہ و مقابلہ کیا جائے۔

علم کا ایک اہم ترین شعبہ علوم قرآن ہے اس باب میں بھی حسب تصریح مورخین و محدثین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرات شیخین پر فضیلت اور فوقیت حاصل نہیں ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اس فن میں تینوں حضرات کا درجہ مساوی اور برابر ہے۔ البتہ قرأت قرآن، کتابت قرآن، قرآن کے الفاظ کی حفاظت اور امت ایک قرأت پر جمع کرنے کے سلسلہ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو ان تینوں حضرات پر سبقت حاصل ہے۔ لیکن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے یہ تمام مساعی جمیلہ حضرات شیخین ہی کے جمع کردہ مصحف کی روشنی میں انجام دیں ہیں اس لئے اس امر میں بھی حضرات شیخین ہی کو اولیت کا شرف حاصل ہے پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امامت نماز کیلئے حضرت صدیق اکبر کو منتخب فرمانا بھی یہی بتاتا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ علم و قرأت اور فقہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ سے بڑھے ہوئے نہیں تھے ورنہ لازم آئے گا کہ آپ نے اعلیٰ کو نظر انداز کرکے ادنیٰ کو ترجیح دی جو صاحب نبوت سے بعید ہے۔

(۳) تقویٰ ۔ اعمال فضیلت میں ایک اہم ترین عمل اتباع شریعت اور تقویٰ ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ" یقیناً تم میں سے سب سے باعزت اللہ کے نزدیک تمہارا سب سے بڑا متقی ہے کتاب وسنت اور آثار سے یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صدیق اکبر نے ایک کلمہ بھی کبھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے خلاف زبان سے نہیں نکالا۔ چنانچہ بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینے کے معاملہ میں اسی طرح حدیبیہ میں صلح کے سلسلہ میں بعض کبار صحابہ نے رائے اور مشورہ کے درجہ میں اختلاف کیا مگر حضرت صدیق اکبر کی رائے ان دونوں موقعوں پر بھی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے موافق رہی حتیٰ کہ ارادہ کے درجہ میں بھی آپ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے خلاف کبھی نہیں سوچا اور نہ کبھی آپؐ کے ارشادات و مرضیات کی تعمیل میں کسی قسم کی سستی و کمزوری گوارا کی یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ان سے آخر دم تک راضی و خوش رہے۔ حضرت فاروق اعظم کی رائے اگر بعض مواقع میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی رائے سے بظاہر مخالف ہوتی مگر یہ اختلاف شدت تشدد فی الدین اور حمیت اسلامی کی بنا پر پیش آیا۔ جو حقیقتاً عین اتباع و موافقت ہے یہی وجہ ہے کہ آخر میں بذریعہ وحی آپ کی تصویب کی گئی یہ اختلاف بھی آپ کے مناقب میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کے معاملہ اور نماز تہجد کی تفہیم کے سلسلہ میں مورد عتاب ہو چکے ہیں۔

(۴) زہد ۔ مدار فضیلت میں سے ایک عمل زہد اور دنیا سے بے نیازی ہے بعض لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ "ازہدالناس علیؓ رضہ" حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے بڑے زاہد تھے، ہم کہتے ہیں کہ زہد نام ہے دنیا کی لذت سے بے نیاز اور مال و دولت بیوی، اولاد اور حشم و خرم سے بے رغبت ہونیکا اور یہ بات محقق طور پر معلوم ہے کہ حضرت صدیق اکبر جس وقت مشرف بہ اسلام ہوتے ہیں وہ شہر مکہ کے چند سرمایہ داروں میں سے ایک تھے، لیکن قبول اسلام کے بعد انہوں نے اپنا سارا سرمایہ اللہ اور اس کے رسول کی رضاجوئی میں صرف کر دیا اور ضعفائے مسلمان کی ایک جماعت کو جو

غلامی کی دردناک زندگی گذارنے پر مجبور تھی ان کے ظالم وجابر آقاؤں سے انھیں خرید کر آزاد کیا غرضیکہ اسلام اور مسلمانوں کی امداد و اعانت میں اس طرح بیدریغ مال خرچ کیا کہ ان کے پاس ایک درہم بھی باقی نہ بچا اور اس دنیا سے اس طرح فارغ ہو کر گئے کہ اپنے پیچھے نہ کوئی جائیداد چھوڑی اور نہ زمین۔

زمانۂ خلافت میں بھی زہد کا یہ عالم تھا کہ بیت المال سے بطور گذارہ کے بس اتنی رقم لینا قبول کیا کہ کسی طرح گذرا وقات ہو جاتی تھی اور اس پر بھی یہ حال تھا کہ جب مال غنیمت وغیرہ سے کوئی رقم ان کے حصہ میں آتی تھی تو بیت المال سے لی ہوئی رقم کے عوض اسے کار خیر میں خرچ کر دیتے تھے۔

زہد اور دنیا سے بے رغبتی میں یہی حال حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا بھی تھا جسکی شہادت خود حضرات صحابہ نے دی ہے۔ اس کے برعکس حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے جائداد اور زمین خریدی کھیتیاں اور باغات لگائے اور وفات کے وقت اپنے پیچھے چار بیویاں انیس باندیاں، بہت سارے غلام و خدام اور تیس کے قریب اولاد چھوڑی اور اتنے بڑے کنبہ کیلئے اتنا ترکہ چھوڑا کہ اس کی وجہ سے سب کے سب غنی اور مالدار تھے، قصبہ ینبع میں آپ کی اتنی بڑی جائداد تھی کہ اس کی پیداوار میں غلہ کے علاوہ ایک ہزار وسق (آج کے حساب سے تقریباً پانچ ہزار ایک سو ترانوے من بیس سیر) کھجور سالانہ پیدا ہوتی تھیں۔

نیز زہد کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ نہ خود دنیا کی لذتوں سے نفع اندوز ہو اور نہ اپنے رشتہ داروں کو اس سے منتفع ہونے کا موقع فراہم کرے اس اعتبار سے بھی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو فوقیت حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے اعزا و اقربا کو حکومت کے عہدوں سے ہمیشہ الگ رکھا۔ حالانکہ آپ کے قریبی رشتہ داروں میں حضرت طلحہ بن عبید اللہ (بھتیجے)، حضرت عبد الرحمن بن ابی بکر (صاحبزادے) اور حضرت عائشہ صدیقہ (صاحبزادی) جیسے جلیل القدر عالم و فاضل صحابی موجود تھے جو کار دبار حکومت کو چلانے کی پوری صلاحیت و اہلیت رکھتے تھے مگر ان میں سے کسی کو کبھی کوئی منصب نہیں دیا۔ اسی طرح حضرت عمر فاروق نے بھی اپنے قبیلہ بنو عدی میں سے کسی کو حاکم و عامل نہیں مقرر کیا اگرچہ آپ کے خاندان میں بھی حضرت سعید بن زید

ابوجہم بن حذیفہ، خارجہ بن حذیفہ، معمر بن عبداللہ اور خود آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر حکومت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے تھے، لیکن آپ نے کسی کو بھی کوئی عہدہ اور منصب نہیں دیا. البتہ اپنے خاندان میں سے نعمان بن عدی کو کچھ دنوں کیلئے علاقہ منان کا حاکم بنا دیا تھا. لیکن جلد ہی انھیں اس منصب سے علیحدہ کر دیا.

اور حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اپنے چچازاد بھائیوں سے حضرت عبداللہ بن عباس کو بصرہ کا حاکم مقرر کیا. عبیداللہ بن عباس کو یمن کا اور قثم اور معبد ابنا، عباس کو علی الترتیب مکہ و مدینہ کا اور اپنے بھانجے جعدہ بن ہبیرہ کو کوفہ کا اور اپنے ربیب (سوتیلے بیٹے) محمد بن ابی بکرؓ کو مصر کا حاکم بنایا اور بوقت وفات اپنے بڑے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لئے نامزد فرمایا.

بلاشبہ یہ سب کے سب حضرات ان مناصب اور عہدوں کے بجا طور پر لائق اور مستحق تھے. اس لئے یہ کہنا قطعاً درست نہ ہوگا کہ حاشا و کلا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے محض قرابت کی بنیاد پر ان حضرات کو اس اعزاز سے نوازا تھا. مگر فرق مراتب کے وقت یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرات شیخین کے عزیزوں میں بھی ان مناصب کی اہلیت و صلاحیت رکھنے والے افراد موجود تھے مگر انھوں نے ان لوگوں کو کوئی عہدہ نہیں دیا جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں کا زہد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زہد سے اعلیٰ و ارفع ہے کیونکہ حضرت علی کرم اللہ کا زہد صرف اپنی ذات پر تھا اور حضرات شیخین کا اپنی ذات کے ساتھ اپنے عزیز و اقارب پر بھی۔

(۵) انفاق فی سبیل اللہ۔ اللہ کی راہ میں مال کا خرچ کرنا بھی ترقی درجات کا ذریعہ اور سبب فضیلت ہے. اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کو اس باب میں حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے ساتھ چنداں مشارکت نہیں ہے ہاں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اس معاملہ میں سب پر فوقیت رکھتے ہیں. لیکن حضرات شیخین رضی اللہ دیگر اسباب فضیلت، علم، جہاد، زہد وغیرہ میں ان سے بھی بڑھے ہوئے ہیں، اسی لئے اس ایک وصف میں زیادتی کی بنا، پر حضرات شیخین کے مقابلہ میں ان کی

فضیلت ثابت نہ ہوگی۔

(۶) **حسن سیاست۔** خلافت اور حسن سیاست بھی منجملہ اسباب فضیلت میں سے ایک سبب ہے اس شعبہ میں حضرت صدیق اکبر و فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کی پیش قدمی روزِ روشن کی طرح واضح ہے اس لئے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے پردہ فرماتے ہی بہت سے قبائل عرب میں ارتداد کا سنگین فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اگر بروقت اس فتنہ کی سرکوبی نہ کیجاتی تو اسلام کے حق میں یہ ایک ایسا عظیم خطرہ بن جاتا۔ جسکا مقابلہ ممکن نہ ہوتا۔ اس ہلاکت خیز فتنہ کے فرو کرنے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ نے جس جرأت ایمانی اور ثابت قدمی کا مظاہرہ فرمایا ہے وہ تاریخ اسلامی کا ایک درخشاں باب اور حکمت عملی حسن وسیاست کا ایک بے مثال نمونہ ہے اور بالآخر آپ ہی کی مساعی جمیلہ سے یہ فتنہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مر گیا۔

اسلامی فتوحات کے آغاز کا سہرا بھی آپ ہی کے سر ہے۔ کیونکہ آپ ہی کے دور خلافت میں قیصر وکسریٰ سے باقاعدہ جنگ کی ابتدار ہوئی اور آپ کے حسن تدبیر سے ہر محاذ پر مجاہدین اسلام کو کامیابی ملی اور اسلامی ریاست کا رقبہ فارس و عراق کی حدود تک وسیع ہوگیا۔ مسلمانوں کو خاصی مقدار میں مال غنیمت حاصل ہوئے جس سے انکی تنگ دستی دور ہوئی اور ان کی عزت وشوکت میں اضافہ ہوا۔

آپ کے دور میں مسلمانوں کی اجتماعی قوت نہایت مستحکم رہی آپس میں اتحاد و یگانگت پورے طور پر قائم رہی۔ باہمی اختلاف وانتشار کا کوئی نام ونشان تک نہیں تھا عام مسلمان امن واطمینان کیساتھ اسلامی علوم وعبادت کی تعلیم وتبلیغ میں منہمک ہے غرضیکہ آپ کا عہد خلافت اسلام اور مسلمان دونوں کیلئے سراپا خیر وبرکت تھا اور حضرت فاروق اعظم کے دور میں ان تمام امور حسنہ میں مزید استحکام اور ترقی ہوئی جسکی ابتدار اور آغاز عہد صدیقی میں ہوا تھا۔ اس کے بالمقابل حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے زمانہ میں اسلامی قلمرو میں کوئی اضافہ نہ ہوسکا اور نہ ہی مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا استحکام باقی رہا بلکہ مسلمانوں اختلاف وانتشار کے شکار ہوگئے اور نوبت خانہ جنگی تک پہنچ گئی، جسکی بنا، پر اسلامی معاشرہ مضمحل ہوگیا اور اسلام کی ترقیات رک گئیں ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہوکر سامنے آگئی کہ حضرت

شیخین رضی اللہ عنہما جملہ اوصاف کمال مثلاً علم، جہاد، زہد، تقویٰ، عشق و اطاعت انفاق فی سبیل اللہ، حسن سیاست وغیرہ کے اس اعلیٰ و ارفع مقام پر فائز ہیں۔ جہاں تک دوسروں کی رسائی نہیں ہوسکی ہے اور یہی وہ اوصاف و اعمال ہیں جنہیں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فضیلت و بزرگی کے موقع پر شمار فرمایا ہے لہٰذا، ثابت ہو گیا کہ حضرات خلفاء اربعہ میں سب سے افضل حضرت ابو بکر صدیق ہی ہیں ان کے بعد حضرت عمر فاروق کا درجہ ہے (رضی اللہ عنہما)

ایک شبہہ کا ازالہ بعض لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تمام اصحاب رسول صلے اللہ علیہ وسلم پر فضیلت کے اثبات میں یہ بات پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے کبھی بت پرستی اور شرک نہیں کیا بر خلاف دیگر حضرات کے کہ دور جاہلیت میں ان سے اس امر قبیح کا صدور ہوا ہے اس لئے حضرت علی مرتضیٰ سب سے افضل ہیں. لیکن صغر سنی اور کم عمری کی بناء پر کفر و شرک سے محفوظ رہنا وجہ فضیلت نہیں بن سکتا اور یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ دس برس کی عمر ہی میں مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے کیونکہ ارباب سیر و تاریخ اس پر متفق ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ۴۰ھ میں بعمر ترسیٹھ سال فوت ہوئے ہیں ۔ ۔ اور اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے تیرھویں سال ہجرت فرمائی ہے لہٰذا اس حساب سے بعثت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے وقت حضرت علی کی عمر دس سال قرار پائی ہے علاوہ ازیں یہ بات بھی معلوم ہے کہ حضرت علی نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر میں پرورش پائی ہے اور ان کا پورا زمانہ طفولیت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر میں گزرا ہے اور بچوں کا یہ نفسیاتی قاعدہ ہے کہ وہ اپنے بڑوں کی روش اور طور طریقے کو اختیار کرتے ہیں. پھر اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ شرک و بت پرستی سے بچ جانا علی الاطلاق موجب فضیلت اور وجہ بزرگی ہے تو لازمی طور پر یہ ماننا ہو گا کہ ہر وہ بچہ جو اسلام میں پیدا ہوا ہے وہ اکابر صحابہ مثلاً حضرت سلمان فارسی، حضرت سید الشہدا حمزہ، حضرت جعفر الطیار، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم وغیرہ سے افضل ہو حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے اس لئے کلی فضیلت

کے لئے اسے پیش کرنا ہی درست نہیں ہے۔

حضرت عثمان غنی و علی مرتضیٰ میں باہمی فضیلت

اب صرف یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ حضرات ختنین یعنی عثمان ذی النورین اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما میں افضل کون ہے اس سلسلہ میں علماء کی رائیں مختلف ہیں۔ اور اس مسئلہ میں کسی فیصلہ کن نتیجہ تک پہنچنا ہمارے لئے مشکل ہے۔ اس لئے کہ ان دونوں حضرات کے کمالات و فضائل مساوی اور ہم پلّہ ہیں۔ کیوں کہ اگر حضرت ذی النورین کو خدمت قرآن میں سبقت کا شرف حاصل ہے۔ تو حضرت مرتضیٰ کی روایت حدیث، اجتہاد اور فتاویٰ میں فوقیت مسلم ہے۔ اور اگر جہاد بالسیف کے سلسلہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ تو لشکر اسلام اور مجاہدین کی مالی امداد و اعانت میں حضرت عثمان غنی کا بیدریغ مال خرچ کرنا ایک مثالی کارنامہ ہے اسی طرح اگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے قتل کرنے میں نہایت ہی محتاط تھے کہ اپنی ذات کیلئے قید و بند اور قتل کی مشقت اذیت برداشت کر لی لیکن کسی مسلمان پر ہاتھ اٹھانا گوارا نہیں کیا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنے مخالفین کے سلسلہ میں زبان کو قابو میں رکھنے اور ان کے حق میں کلمۂ حق کے سوا کچھ نہ کہنے میں ملکۂ تامہ حاصل تھا۔ الحاصل دونوں حضرات کے فضائل عملیہ باہم معارض اور مساوی ہیں رہی فضیلت اختصاصی یعنی اللہ کے نزدیک کسی کا خیر و افضل ہونا تو اس میں بھی دونوں حضرات برابر کے شریک ہیں۔ اس لئے اس مسئلہ میں کوئی دوٹوک فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

از ادارہ

کوائفِ دارالعلوم

دارالعلوم دیوبند نہایت پرسکون اور اطمینان بخش ماحول میں نونہالان ملت کی دینی، علمی اور ثقافتی تعمیر و ترقی میں مصروف ہے۔ طلبہ و اساتذہ جس انہماک مستعدی اور دلجمعی کے ساتھ تعلیم و تعلم اور افادہ و استفادہ میں لگے ہوئے ہیں ایسی خوش آئند فضا عرصہ کے بعد دیکھنے میں آئی ہے۔ واردین وصادرین اور مؤقر مہمانوں کی آمد کا سلسلہ بھی جاری ہے اور جو بھی آتا ہے یہاں کی دینی و علمی سرگرمیوں سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ فالحمد اللہ علی ذالک۔

سفیر مصر برائے ہند کی دارالعلوم میں آمد

دارالعلوم کا مصر سے علمی و ثقافتی رابطہ طویل عرصہ سے قائم ہے چنانچہ آج سے تیس سال قبل جامعۂ ازہر کے دو ممتاز فاضل بحیثیت مبعوث کے یہاں جدید عربی ادب کی تدریس کی گرانقدر خدمت انجام دے چکے ہیں۔ لیکن ادھر چند سالوں سے یہ تعلق کچھ مضمحل سا ہو گیا تھا اور ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ کہ یہ علمی رابطہ پھر سے استوار کیا جائے۔ حضرت مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہم پورے حلقہ دارالعلوم کیطرف سے مستحق شکریہ ہیں کہ انکی سعی و کوشش سے اس کی صورت پیدا ہو گئی۔ اور گرامی منزلت جناب ڈاکٹر عمرو موسیٰ سفیر مصر حضرت مہتمم صاحب کی دعوت پر ۱۸ر صفر ۱۴۰۵ھ۔ ۱۲ر نومبر ۱۹۸۴ء کو دارالعلوم تشریف لائے۔ اور دارالعلوم میں گھوم پھر کر یہاں کی علمی و دینی سرگرمیوں کا بنظر غائر معائنہ کیا۔ موصوف یہاں کے خالص علمی و دینی ماحول سے بیحد متأثر ہوئے چنانچہ جلسہ عام کے موقع پر انہوں نے اس کا بار بار اظہار بھی کیا اور فرمایا کہ دارالعلوم کے بارے میں مصر کے نامور ادیب اور محقق عالم سید رشید رضا مرحوم نے بالکل سچ کہا تھا کہ لولم اد ھا لرجعت من الھند لحزینا۔ حقیقتاً دارالعلوم علم و دین کا

ایسا ہی عظیم مرکز ہے کہ اس کی زیارت بار بار کی جائے. میری دلی خواہش ہے کہ مجھے اس مرکز علمی میں مکرر سہ کرر آنیکا موقع ملے.

مہمان محترم نے دارالعلوم کیلئے حضرت مہتمم صاحب مدظلہ العالی کی خدمت میں مصر کی مطبوعات میں چند گرانقدر کتابیں بھی پیش کیں اور مزید کتابوں کے بھیجنے کا بھی وعدہ فرمایا. چونکہ عصرانہ کا اہتمام حضرت مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہم نے اپنے یہاں کیا تھا. اس لئے جلسے کے ختم ہوتے ہی مہمان محترم حضرت مہتمم صاحب وحضرت صدر مدرس صاحب زید مجدہما کی معیت میں حضرت مدنی دامت برکاتہم کے دولت خانہ پر تشریف للائے دارالعلوم کے تمام اساتذہ بھی مدعو تھے مہمان محترم نے یہاں بھی دوران گفتگو دارالعلوم کے ساتھ اپنی عقیدت وشیفتگی کا بڑے مؤثر انداز میں، تذکرہ کیا، اور آج سے تیس سال پہلے جامعہ ازہر اور دارالعلوم کے درمیان جو علمی رابطہ قائم تھا اسے پھر سے بحال کرنے کا بھی مسرت خیز تذکرہ کیا فجزاہ اللہ خیرا الجزاء. پروگرام کے مطابق اسی دن واپسی تھی اس لئے جانے سے فراغت کے بعد بذریعہ کار دہلی کے لئے روانہ ہوگئے.

مجلس شوریٰ کا سہ روزہ اجلاس

دارالعلوم کے دستور کے مطابق ماہ صفر کی ۲۵، ۲۶، ۲۷ تاریخوں میں مجلس شوریٰ کا اجلاس منعقد ہوا. اس مرتبہ یہ اجلاس دارالعلوم کے بجائے لکھنؤ میں کیا گیا کیونکہ محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اپنی مسلسل علالت کی بنا، پر طویل سفر کی سکت نہیں رکھتے تھے. اس لئے انہوں نے حضرت مہتمم صاحب کو لکھا تھا کہ اگر یہ اجلاس لکھنؤ یا قریب کے کسی مقام میں کر دیا جائے تو میری بھی شرکت ہو جائے گی. حضرت مولانا اعظمی کے علاوہ بعض دیگر حضرات ارکان نے بھی یہی خواہش ظاہر کی تھی اس لئے حضرت مہتمم صاحب نے لکھنؤ میں اس اجلاس کا انتظام فرمایا.

مجلس شوریٰ نے اس اجلاس میں متعدد اہم تعمیری فیصلے کئے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرات ارکان شوریٰ دارالعلوم کے مسائل سے دلچسپی بھی رکھتے ہیں اور واقفیت بھی اور ان کے نزدیک دارالعلوم کا مفاد ہر چیز پر مقدم ہے.

☆

مولانا منظور احمد مظاہری قاضی شہر کانپور کا مجلس شوریٰ کیلئے انتخاب

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی علیہ الرحمہ کے سانحۂ ارتحال کے وقت سے مجلس کی ایک اسامی خالی چلی آرہی تھی جسے دستور اساسی کے مطابق پر کیا جانا چاہئے تھا. چنانچہ مجلس نے اس اجلاس میں اس خالی جگہ کیلئے حضرت مولانا منظور احمد صاحب مظاہری قاضی شہر کانپور کا انتخاب کیا ہے یہ انتخاب ہر اعتبار سے لائق تحسین ہے. مولانا موصوف فضلاء مظاہر میں اپنے علم و فکر کے اعتبار سے امتیازی حیثیت کے مالک ہیں. جامع العلوم کانپور میں ایک طویل عرصہ سے درس حدیث کے ساتھ انتظامی خدمت بھی انجام دے رہے ہیں. ماضی قریب میں وہاں کا اہتمام بھی آپ ہی سے متعلق تھا مگر اپنے علمی تبلیغی مشاغل کی بناء پر اس سے الگ ہو گئے. رسالہ سنت کے نام سے ایک دینی و اصلاحی جریدہ بھی نکالتے ہیں کانپور کے قاضی شہر بھی ہیں. مولانا موصوف کو دارالعلوم دیوبند سے قلبی تعلق ہے اور اسکی ترقیات کے لئے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں انشاء اللہ مولانا کا انتخاب ہر اعتبار سے دارالعلوم کے لئے نفع بخش ثابت ہوگا.

حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کا معین مہتمم کے لئے انتخاب

دارالعلوم کے انتظام دارالعلوم میں زیادہ استحکام اور قوت پیدا کرنے کیلئے عرصہ سے ضرورت محسوس کیجارہی تھی کہ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی مساعدت و اعانت کیلئے کسی فعال متحرک اور مدبر شخصیت کو اہتمام میں لایا جائے حلقہ دارالعلوم میں حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی سے زیادہ موزوں اور مناسب کوئی اور نہیں تھا. جو اس اہم ترین خدمت کو بحسن و خوبی انجام دے سکے. اجلاس صدسالہ اور کیمپ دارالعلوم کے موقع پر مولانا موصوف کے جوش عمل. اصابت فکر اور قوت تنفیذ کی تحسین و توصیف اپنوں اور غیروں سب نے کی تھی. اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ان دونوں موقعوں پر مولانا کیرانوی صاحب نے سخت نا مساعدت حالات کے باوجود جس حسن انتظام قوت عمل اور ہمہ گیر صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا اسکی مثال تلاش کرنے سے بھی اس وقت نہیں ملے گی. اس لئے دیانتاً یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مجلس شوریٰ کا یہ انتخاب صدفی صد درست اور حق بحق دار سپرد کا صحیح مصداق ہے. دعا ہے کہ اللہ تعالے مولانا موصوف کو صحت و عافیت سے رکھے اور انہیں دارالعلوم

کی خدمت کا زیادہ سے زیادہ موقع عطا فرمائے۔ (آمین)

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

تعارف و تبصرہ

علماء دیوبند اور مشائخ پنجاب:- مرتبہ مولانا محمد عبداللہ صاحب مہتمم مدرسہ دارالہدیٰ بھکر پاکستان۔ تقطیع خورد، کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ۔ صفحات تریسٹھ (۶۳)، قیمت تین روپے ۳/ ناشر سٹیر کمیٹی مین روڈ بھکر پاکستان۔

اکابر دیوبند کثر اللہ امثالہم کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ علم و عمل، شریعت و طریقت دونوں کے جامع تھے ان کی درسگاہیں اگر دن میں قال اللہ و قال الرسول کی حکمت خیز صداؤں سے پُرشور ہوتی تھیں، تو شب میں اللہ ہو کی پرسوز آوازوں سے معمور ہوتی تھیں وہ ظاہری تعلیم و ترتیب کے ساتھ باطن کی تہذیب و تذکیہ کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ اس لئے ان کا رشتۂ اتحاد جہاں ملک بیرون ملک کے علماء و فضلاء، اور ان کی علمی سرگرمیوں سے قائم تھا وہیں وہ مشائخ و صوفیاء، اور انکی خانقاہوں سے رابطہ استوار رکھتے تھے۔ لیکن اس ربط و اتحاد کی وجہ سے وہ دینی معاملات میں کسی قسم کی مداہنت کے روادار نہیں تھے اس لیئے خلاف شریعت کوئی بات چاہے تعلیمی اداروں سے پیدا ہو یا خانقاہوں کی راہ سے اس کا ظہور ہو بلا کسی خوف و ہراس کے وہ برملا اسکی تردید کرتے تھے۔ اور اسکی مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے کہ ان کے اس رویہ سے کون خوش ہے اور کون ناخوش۔

علماء دیوبند کے اس دینی تصلب کی بناء پر بعض علماء سوء اور دنیا دار متصوفین نے (جنہیں درحقیقت تصوف کے ابجد سے بھی کوئی سروکار نہیں تھا) نے یہ غلط پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ "علماء دیوبند" تصوف اور صوفیاء کے مخالف ہیں

جس سے بہت سے لوگ غلط فہمی کے شکار ہو گئے۔ زیر تبصرہ کتاب میں فاضل مصنف نے اسی غلط فہمی کو دور کرنے کی سعی محمود کی ہے اور تاریخ کے مستند حوالوں سے صوبۂ پنجاب پاکستان کی تقریباً آٹھ نو خانقاہوں اور ان کے مشائخ سے علماء دیوبند کے روابط اور باہمی تعلقات ثابت کیا ہے کتاب کے آغاز میں حضرت مولانا محمد خان مدظلہ سجادہ نشین خانقاہ سراجیہ کا ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے جس سے کتاب کی افادیت دوبالا ہو گئی ہے۔ کتاب اپنے موضوع پر بہت خوب اور لائق مطالعہ ہے ضرورت ہے درسگاہوں اور خانقاہوں کو قریب تر لانے اور ان کے باہمی ربط وتعلق میں مزید استحکام وقوت پیدا کرنے کے لئے اس موضوع کے دائرہ کو اور وسیع کیا جائے۔

الدین الخالص :۔ از مولانا ابو جابر عبد اللہ دامانوی۔ متوسط تقطیع کاغذ کتابت وطباعت بہتر۔ صفحات ایک سو چھہتر (۱۷۶) قیمت تیرہ روپئے پچاس پیسے (۱۳/۵۰) ناشر حزب المسلمین فاروق اعظم روڈ۔ کیماڑی کراچی پاکستان

اس دور میں اسلام کو خود اسلام کے نادان دوستوں کے ہاتھوں جسقدر صدمات اٹھانے پڑے ہیں اسلام کی تاریخ میں اسکی کسی اور دور میں نظیر نہیں ملتی۔ نت نئے اسلامی عقائد و اعمال کے خلاف ایک نہ ایک فتنہ کھڑا کر دیا جاتا ہے اور بدقسمتی کی بات تو یہ ہے کہ یہ فتنے ان لوگوں کیطرف سے برپا کئے جاتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں بلکہ اپنی مسلمانی کے آگے وہ کسی اور کو مسلمان کہنے تک کے روادار نہیں ہیں۔ چنانچہ پاکستان میں آجکل مزید ایک جدید فتنہ نے جنم لیا ہے کوئی صاحب ڈاکٹر مسعود الرحمن عثمانی نام کے ہیں جو ایک عرصہ تک جماعت اسلامی سے وابسطہ رہکر اور مکمل ٹریننگ حاصل کر کے اسلام اور عقائد اسلام کی بیخ کنی کے لئے میدان میں نکلے ہیں" اور دعوت دین" کے عنوان سے سچے پکے مسلمانوں کو دین سے منحرف کرنے کی طاغوتی جدو جہد کر رہے ہیں۔ ابھی ابھی حال میں انھوں نے " عذاب قبر" کے نام سے ایک کتابچہ مرتب کر کے اپنی خود ساختہ ؟ " دعوت دین" کی جانب سے شائع کیا ہے۔ جسمیں انھوں نے عذاب قبر، حیات نی القبر اور اعادہ روح الی القبر کا نہ صرف صاف انکار کیا ہے بلکہ ان کے ماننے والوں کو کافر قرار دیا ہے چنانچہ امام

احمد بن حنبل، امام دین تیمیہ، علامہ ابن قیم، حافظ ابن کثیر اور حافظ بن حجر عسقلانی جیسے اساطین علم اور اسلام کی قابل فخر شخصیتوں پر نام لے کر کفر کا فتویٰ صادر کیا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذالک) زیر تعارف کتاب ڈاکٹر عثمانی کی اسی کتابچہ کی تردید اور علماء حق کی تائید میں مرتب کی گئی ہے۔ جس میں فاضل مرتب نے قرآن و سنت آثار صحابہ اور اقوال علمائے عذاب قبر وغیرہ کو ثابت کیا ہے اور خوب خوب داد تحقیق دی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر عثمانی کی دوراز کار موشگافیوں اور مغالطوں کی حقیقت بھی واضح کرتے گئے ہیں۔ اور زیر بحث مسئلہ سے متعلق اچھا خاصا مواد فراہم کردیا ہے کتاب ہر اعتبار سے عمدہ اور قابل استفادہ ہے البتہ فاضل ادیب کی بعض تحقیقات میں گفتگو کی گنجائش ہے لیکن اس سے کتاب کی افادیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

تعارف و تبصرہ

مولانا مفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی

نام کتاب ——— بن عبد البر

——— زبان عربی ———

نام مؤلف ——— ڈاکٹر محمد ظہور الحق صاحب

صفحات ——— ایک سو دس (۱۱۰)

ناشر ——— جامعہ علی گڈھ الاسلامیہ

قیمت ——— درج نہیں ہے

مؤلف ڈاکٹر ظہور الحق لکچرر شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

یہ کتاب عربی زبان میں ہے جو تقریباً ۷۶ عنوانات پر مشتمل ہے اس کتاب میں لائق مصنف نے بہت سے کتبخانوں کی سیر کر کے بہم اہم کتابوں سے بڑی کاوش اور عرق

ریزی کے ساتھ حافظ ابن عبدالبر اندلسی کی عبقریت، حیات، ماحول، ان کے اساتذہ اور معاصرین کا تحقیقی جائزہ لیا ہے کتاب کے ابتداء میں اندلس کے سیاسی، اجتماعی، علمی و ادبی حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے وہاں کے علم وادب اور اس کے اسباب عروج کی تاریخ بیان کی ہے۔

حافظ ابن عبدالبر کو علمی دنیا میں عام طور پر علم تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، انساب اور لغت میں ہی امام و مقتدا سمجھا جاتا ہے مگر فاضل مؤلف نے اس کتاب میں ابن عبدالبر کی علمی خدمات کا ایک نیا گوشہ بھی اجاگر کیا ہے۔ وہ ہے ان کی ادبی خدمات: یعنی ایک طرف مذکورہ بالا علوم میں ان کی کثیر تصانیف مشہور و معروف ہیں تو دوسری طرف غیر معمولی ادیب ہونے کے ناطے فن ادب میں بھی ان کی بہت سی خدمات ہیں۔ چنانچہ فن ادب میں (۱) بہجۃ المجالس (۲) کتاب العقل والعقلاء (۳) نزہۃ المستمعین (۴) دیوان ابی العتاہیۃ وغیرہ ان کے بہترین ادبی شاہکار ہیں۔

کتاب اپنی تحقیق و ریسرچ کے لحاظ سے غیر معمولی افادیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ تحقیق قابل تحسین ہے۔ اس کتاب پر مؤلف کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

شعر و سخن

جا بادِ صبا، سوئے حرم، بادِ صبا جا

از حضرت مفتی نفیس آبادی

(۱)

پھر گرم سفر ہونے لگا قافلہ تیرا
شرمندہ ہوں میں، ساتھ میں چلنے کا تھا وعدہ
بیٹھا ہوں میں تیار مگر مرضیٔ مولیٰ
ان کا کوئی پیغام ابھی تک نہیں آیا

جا بادِ صبا، بادِ صبا، بادِ صبا جا

ملتا نہیں آہوں کو ابھی اذنِ حضوری
نالے ہیں ابھی راہ میں، طے کرتے ہیں دوری

باقی ہے غم و درد کا کچھ دور عبوری
اشکوں کے بھنور میں ہے ابھی دل کا سفینہ

جا بادِ صبا، بادِ صبا، بادِ صبا جا

کوئے شہ ابرار میں جانا ہو مبارک
دربار گہربار میں جانا ہو مبارک
اس گلشن بے خار میں جانا ہو مبارک
کیا دوں تجھے نذرانہ یہ آنسو مرے لیجا

جا بادِ صبا، بادِ صبا، بادِ صبا جا

ہر ذرہ مری راہ کا یا خار ہے یا سنگ
افسوس کہ مجھ پر ہا ہیں وسعت ہی جہاں تنگ
شل ہو گئے بازو مرے اور پائے طلب لنگ
یارا ہی نہیں مجھ کو تری ہم سفری کا

جا بادِ صبا، بادِ صبا، بادِ صبا جا

———(۲)———

از جوہر قاسمی اعظمی

———(۱)———

جا بادِ صبا سوئے حرم بادِ صبا جا — بیمار محبت کے لئے خاک شفا لا
جا بارِ امانت کے لئے مہر و وفا لا — لا، مردہ بہاروں کے لئے آب بقا جا

جا بادِ صبا، بادِ صبا، بادِ صبا جا

(۲)

طیبہ کی فضا، نورِ حرا، بدر کا عالم — ایثار منیٰ، طوف حرم، جرعۂ زمزم
سرمستی مزدلفہ و عرفات کا موسم — یادوں کے چمن کیلئے پلکوں پہ ہے شبنم

جا بادِ صبا بادِ صبا بادِ صبا جا

(۳)

یہ دیدہ و دل کیا ہیں؟ درد و بام محبت — آتا ہے اسی راہ سے پیغام محبت

لا، ساقیٔ کوثر سے کوئی جام محبت
پیغام محبت ہے کہ انعام محبت
جا بادِ صبا باد صبا باد صبا جا

(۴)

اور گنبد خضریٰ مری ہستی کا نگینہ
کعبہ ہے زمانے کے لئے عرش کا زینہ
جو ہر کو وہاں جانے میں آتا ہے پسینہ
ہے داغ جگر، یاد سحر ہائے مدینہ
جا باد صبا. باد صبا باد صبا جا

(۵)

جھلسی ہوئی دنیا کے لئے ابر کرم تھے
اس ظلمت اوہام میں، ہم شمع حرم تھے
کہنا مرے آقا وہ نہیں پہلے جو ہم تھے
مرتے ہوئے انسان کے لئے دیدہ نم تھے
جا باد صبا باد صبا باد صبا جا

محبوب پرنٹنگ پریس دیوبند

نگرانِ اعلیٰ حضرت الحاج مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند یوپی

دار العلوم دیوبند کا علمی و دینی

ماہنامہ دار العلوم

جلد نمبر ٦٧ | جنوری ١٩٨٥ء مطابق ربیع الثانی ١٤٠٥ھ | شمارہ نمبر

طابع وناشر

دار العلوم معرفت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب

مہتمم دار العلوم دیوبند

مطبوعہ۔ محبوب پریس دیوبند (یوپی)

سالانہ زر اشتراک

ہندوستان سے ٢٥/٠٠

سعودی عرب، کویت، ابوظبی وغیرہ سے

بذریعہ ایرمیل ٩٠/٠٠ روپے

جنوبی مشرقی افریقہ برطانیہ وغیرہ سے

بذریعہ ایرمیل ١٠٥/٠٠ روپے

امریکہ کناڈا وغیرہ سے بذریعہ ایرمیل ١١٦/٠٠ روپے

پاکستان سے بذریعہ ریل ٤٥/٠٠ روپے

فی پرچہ ٢/٥٠

فہرست مضامین

ضروری گذارش

اس دائرہ میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زر تعاون ختم ہوگیا ہے اگلے سال کی رقم بھیج کر مشکور فرمائیں۔

فضلاء دارالعلوم توجہ فرمائیں

"تذکرہ فضلائے دارالعلوم" کے عنوان سے دارالعلوم اپنے فضلاء کے حالات و خدمات کا تعارف مرتب کرا رہا ہے اس سلسلہ میں ابناء دارالعلوم سے گذارش ہے کہ وہ درج ذیل معلومات فراہم کرکے ہمارا تعاون فرمائیں۔

(۱) نام مع مختصر شجرہ نسب (۲) تاریخ پیدائش اور جائے اقامت ضلع صوبہ اور ملک کی وضاحت کے ساتھ (۳) درسگاہوں اور اساتذہ کی تفصیل (۴) دارالعلوم میں داخلہ اور فراغت کی تاریخ دارالعلوم کے اساتذہ جن سے آپ نے استفادہ کیا ہے ان کی تفصیل (۵) علمی، دینی، تبلیغی اور سماجی خدمات کا جامع تعارف (۶) مطبوعہ تصانیف کی دو جلدیں ارسال فرمائیں (۷) غیر مطبوعہ تصانیف کی فوٹو کاپی۔

(۸) اگر تصانیف کسی مجبوری سے ارسال نہیں کی جا سکتیں تو ان کا تعارف جس میں موضوع کی تصریح صفحات کی تعداد سن طباعت، اور کتاب کی خصوصیت کا تذکرہ ضرور کیا جائے۔ (۹) آپ کے علم میں جو فضلاء وفات پا چکے ہیں اور ان کے حالات و کوائف سے آپ کو معلومات ہو تو براہ کرم ان کے حالات سے بھی مطلع فرمائیں۔

خط و کتابت کا پتہ:۔ دفتر رسالہ دارالعلوم۔ دارالعلوم دیوبند (یو۔پی)

ہندوستانی و پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

ماہنامہ "دارالعلوم" کے خریداروں سے گذارش ہے کہ جن حضرات کے ذمہ سالانہ چندہ ہے وہ اول فرصت میں ارسال کرنے کی کوشش کریں رسالہ دارالعلوم مسلسل ہر ماہ کا شائع ہو رہا ہے البتہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے تاخیر سے شائع ہو رہا تھا اسی وجہ سے چندہ کا تقاضہ بھی نہیں کیا مگر اب الحمدللہ بروقت شائع ہونے کا انتظام ہو گیا ہے انشاء اللہ ہر ماہ انگریزی مہینہ کی ۱۵ ر تاریخ میں پوسٹ کیا جائے گا، بعض حضرات کی مدت خریداری ختم ہوئے کئی کئی ماہ گذر چکے ہیں لہذا رسالہ پر سرخ نشان دیکھتے ہی چندہ روانہ کرنے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔

(مدیر)

حرف آغاز

حبیب الرحمن قاسمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ ○ **ترجمہ** اے ایمان والو! اگر کوئی شریر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے (جس میں کسی کی شکایت ہو) تو خوب تحقیق کر لیا کرو تاکہ کسی قوم کو نادانی میں کوئی ضرر نہ پہنچا دو پھر اپنے کئے پر پچھتانا پڑے۔

مندرجہ آیت کریمہ سورۃ الحجرات کی چھٹی آیت ہے۔ اس سورۃ پاک میں اہل ایمان کو آداب معاشرت اور مکارم اخلاق سے متعلق اہم ہدایات دی گئی ہیں اور معجزانہ اسلوب میں ادب کے پانچوں شعبے (ادب مع اللہ، ادب مع الرسول، ادب مع النفس، ادب مع المومنین اور ادب مع الناس کو اس مختصر سی سورۃ میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس سورۃ کو سورۃ الاخلاق اور سورۃ الآداب بھی کہتے ہیں۔ ادب و اخلاق کے ان مذکورہ شعبوں کے بیان میں اس بات کا بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر ایک ادب کی تعلیم کے وقت "یا ایہا الذین آمنوا" سے مسلمانوں کو مخاطب فرمایا ہے اسی اہتمام کی بنا پر اٹھارہ آیتوں پر مشتمل اس مختصر سی سورہ میں پانچ مرتبہ "یا ایہا الذین آمنوا" کا استعمال ہوا ہے۔ جس سے اس تعلیم کی اہمیت کے علاوہ اس بات کی جانب بھی اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ان آداب کی رعایت اور ان کا اپنے آپ کو خوگر بنانا تقاضائے ایمان سے ہے یعنی ہر مسلمان پر اس کے مؤمن ہونے کی حیثیت سے یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے طرز معاشرت کو ان آداب اخلاق کے مطابق بنائے۔

پیش نظر آیت کریمہ میں ان پانچوں اقسام میں سے ایک خاص ادب کی تعلیم دی گئی ہے کہ جب کوئی بے راہ رو شخص کسی کے بارے میں کوئی شکوہ شکایت کرے تو محض اس کے کہنے پر اعتماد نہیں کرنا چاہیئے بلکہ پہلے اس خبر کی اپنے طور پر مکمل تحقیق کرنے کے بعد اس سلسلے میں عملی قدم اٹھایا جائے۔ اس ہدایت کے ذریعہ آپسی اختلافات اور مناقشات کی جڑ کاٹ دی گئی ہے کیونکہ باہمی جھگڑوں کی ابتدا بالعموم جھوٹی اور بے سروپا خبروں اور پروپیگنڈوں ہی سے ہوتی ہے اس لئے مسلم معاشرہ سے اس جرثومہ کو ختم کرنے کیلئے یہ تعلیم دی گئی ہے تاکہ مسلم معاشرہ جھوٹی افواہوں کی بنیاد پر برپا ہونے والے فتنہ و فساد سے محفوظ رہے۔ فرض کیجئے اگر کوئی غیر معتبر شخص اپنے خیال و

جذبات سے بے قابو ہو کر آپ سے کسی شخص یا جماعت کی شکایت کر دے۔ اور آپ اس کے بیان پر اعتماد کر کے اس جماعت کے درپے آزار ہو جائیں پھر بعد میں واضح ہو کر اس نے شکایت غلط کی تھی تو بتلایئے آپ کو اپنے اس طرزِ عمل پر کس قدر ندامت ہوگی اور اس کے نتیجہ میں جماعت کے درمیان جو شقاق و اختلاف رونما ہوگا اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوگی۔ حضرات محدثین نے اس آیتِ پاک کا جو شان نزول نقل کیا ہے وہ بھی اسی طرح کا ایک واقعہ ہے جس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے علامہ حافظ ابن کثیر بحوالہ مسند امام احمد لکھتے ہیں کہ وہ قبیلۂ بنو المصطلق کے رئیس حارث بن ضرار (راوی حدیث) بیان کرتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے مجھے اسلام کی دعوت دی اور ادائے گی زکوٰۃ کا حکم فرمایا میں نے آپ کی دعوت قبول کر لی اور زکوٰۃ دینے کا بھی اقرار کر لیا اور مزید عرض کیا کہ میں اپنی قوم میں جا کر انھیں بھی اسلام، ادائے زکوٰۃ کی دعوت دونگا۔ میری دعوت کو جو لوگ قبول کریں گے ان کی زکوٰۃ جمع کروں گا آپ فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو اپنا کوئی قاصد بھیج دیجئے گا میں جمع شدہ رقم اس کے حوالہ کر دوں گا۔ چنانچہ حسب وعدہ اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دی اور ان میں سے جو اصحاب مسلمان ہو گئے ان کی زکوٰۃ بھی جمع کر لی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو تاریخ قاصد روانہ کرنے کی طے ہوئی تھی وہ تاریخ بھی گذر گئی مگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد نہیں آیا۔ تو مجھے یہ اندیشہ ہونے لگا کہ شاید آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم میری کسی بات پر ناراض ہو گئے ہیں اس لئے قاصد کو حسب وعدہ روانہ نہیں فرمایا ورنہ یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ وعدہ کے مطابق قاصد نہ بھیجتے۔ انھوں نے اپنے اس اندیشہ کا ذکر اپنے قبیلے کے ان سرداروں سے کیا جو مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے اور طے کیا کہ ہمیں خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونا چاہئے۔ چنانچہ یہ طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے سرداروں کے ایک وفد کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کیلئے چلے مدینہ ذرہ کے قریب انکی حضرت خالد بن ولید سے ملاقات ہوئی جو مجاہدین کے ایک دستہ کیساتھ تھے۔ انھوں نے پوچھا آپ کو کن لوگوں کی جانب بھیجا گیا ہے حضرت خالد نے کہا تمہاری ہی جانب تو ہمیں بھیجا گیا۔ حضرت حارث نے پوچھا کیوں؟ حضرت خالد نے فرمایا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عقبہ کو اموال زکوٰۃ کی وصولیابی کیلئے تمہارے پاس بھیجا تھا۔ انھوں نے واپس آکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع دی کہ بنو المصطلق نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور میرے قتل کا منصوبہ بنایا۔ حضرت حارث نے یہ بات سنی تو فرمایا اس خدا کی قسم جس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول برحق بنا کر بھیجا ہے میں نے ولید بن عقبہ کو دیکھا تک نہیں اور نہ وہ میرے پاس آئے۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ مقررہ پر حضرت ولید بن عقبہ کو قبیلہ بنو المصطلق کے پاس بھیجا تھا اور یہ گئے بھی لیکن اس قبیلہ سے ان کی پرانی رنجش تھی اس بناء پر انھیں یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ لوگ مجھے اس ناچاقی کی بناء پر قتل نہ کر دیں اس خوف سے راستہ ہی سے واپس لوٹ آئے اور اسی اپنے گمان کیمطابق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہہ دیا کہ ان لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور میرے قتل کا ارادہ کیا اس پر

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ناراضگی ہوئی اور حضرت خالدؓ کو ان کے پاس بھیج دیا الخ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

ان ساری تفصیلات کا حاصل یہی ہے کہ تحقیق و تفتیش کئے بغیر گری پڑی باتوں پر اعتماد و یقین کرکے کوئی اقدام کر بیٹھنا یہ ایمان حزم و احتیاط کے سراسر خلاف ہے جس کا نتیجہ ندامت اور آپسی عداوت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

افسوس کہ آج مسلمانوں نے اس قرآنی ہدایت کو بالکل فراموش کردیا ہے عوام کا ذکر چھوڑئیے یہ بیچارے تو کالانعام ٹھہرے ہمارے معاشرہ کے علماء میں بھی یہ مرض سرطان کی طرح پھیل گیا ہے۔ بس جہاں کان میں کوئی بات پڑی جھٹ سے اس پر یقین کرکے کوئی نہ کوئی فتویٰ صادر کردیا جاتا ہے اور مطلق اس کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی کہ کہنے والا کون اور کس حیثیت کا ہے۔ جو خبر دے رہا ہے اس کی صداقت عدل و ثقاہت کی میزان پر پوری اتر رہی ہے یا نہیں اسکی ایک تازہ ترین مثال سنتے چلئے ہمارے ایک معاصر ہیں جو اپنے آپ کو زمرۂ اہلحدیث میں شمار کرتے ہیں اور مدعی ہیں کہ وہ علماء کے اجتہاد اور فتوؤں کے بجائے براہ راست سنتِ رسول پر عمل کرتے ہیں اور اسی بنیاد پر مقلدین کو جادہ مستقیم سے ہٹا ہوا، تارک سنت، بدعت نواز وغیرہ مہذب گالیوں سے یاد کرتے ہیں اور طبیعت جب لہر میں آتی تو ائمہ مجتہدین اور صلحا متقدمین کے اندر بھی کیڑے نکالنے سے بھی پرہیز نہیں کرتے وہ اپنے مجلہ شمارہ ماہ دسمبر ۱۹۸۴ء میں ایک خبر شائع کرتے ہیں "کہ دارالعلوم دیوبند" کے چند ذمہ دار افراد سابق وزیر اعظم آنجہانی اندرا گاندھی کے قتل کے دن دہلی گئے اور جس جگہ انکی نعش رکھی تھی وہاں پہنچے اور کچھ دیر اسکے پاس سر جھکائے کھڑے کچھ پڑھتے رہے (یہ الفاظ ہمارے ہیں) انھوں نے آخر میں اس خبر پر تبصرہ کرکے اپنی ایمانی غیرت و حمیت کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ اور آج کل کے مطابق فتویٰ بھی صادر فرمایا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس خبر کی حقیقت کیا ہے ؟ تو اس کے متعلق میں پورے حلقہ دارالعلوم کی طرف سے پوری ذمہ داری کے ساتھ حضرت حارث بن ضرار مصطلقی رضی اللہ عنہ کی زبان میں کہتا ہوں کہ قسم ہے اس خدائے علیم و خبیر کی جس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے۔ اربابِ دارالعلوم کو اس بے حقیقت واقعہ کی نہ کوئی خبر ہے اور نہ اس موقع پر دارالعلوم سے کوئی وہاں گیا۔

ہمارے یہ کرم فرما دلی اور دیوبند سے تقریباً سات آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر رہتے ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ انھیں کسی ذریعہ ہی سے یہ خبر پہنچی ہوگی کیونکہ ہم انکے متعلق بہرحال یہ بدگمانی نہیں کرسکتے کہ انھوں نے دارالعلوم دیوبند کو بدنام کرنے کے لئے خود سے گھڑ کر یہ خبر شائع کردی البتہ اتنی بات تو ضرور کہیں گے کہ اس خبر کے بارہ میں پوری تحقیق و تفتیش کئے بغیر اسے شائع کرکے وہ بیک وقت قرآنی ہدایت کو ٹھکرانے، ایمانی تقاضے کو پامال کرنے اور ایک دینی و تعلیمی ادارے کو نقصان پہنچانے کے مرتکب ہونے کے ساتھ نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "وکفیٰ بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع" کے بھی نشانہ بن گئے۔

کائنات روحانی

دوسری قسط

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

اخیر میں مجھے اسی روحانی کائنات،، کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرنا ہے، فرض کرو کہ کوئی احمق یہ ارادہ کرتا ہے کہ ہم اپنے مادی شکم کو بغیر اعانت مادہ کے بھریں گے، تو اس کا آخری حشر بجز موت کے اور کیا ہوسکتا ہے۔

حالانکہ اس مادہ کی طرف خود وہ نہیں، بلکہ اس کا ہیکل جری محتاج ہے، جو ممکن ہے۔ کہ روح کی قوی کرنے سے کچھ دن اس کا ساتھ دے سکے۔

اسی طرح قرآن کے متعلق بھی سردار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی ارشاد فرمایا۔

ومن ابتغی الھدی فی غیرہ اضلہ اللہ — جو شخص قرآن کے سوا اور کسی چیز میں ہدایت کی جستجو کرتا ہے خدا اس کو بھٹکا دے گا۔

بلاشبہ جب مادی جسم مادہ سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ اور اس کی بقاء کے لئے ہر وقت اجزاء مادیہ کی ضرورت ہے۔ تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک انسان جس کی اصل ذات "روح،، ہے۔ وہ بغیر روح قرآنی کے اپنی اصلی زندگی کو قائم رکھ سکتا ہے۔ یا اس کو کسی اور چیز سے حاصل کرسکتا ہے۔ یہ گمراہی سرکشوں کو ابھی نہیں معلوم ہوتی لیکن جب روح کی راہوں کی تلاش کا وقت آئے گا۔ اس وقت یہ حقیقت خود بخود بے نقاب ہوجائے گی جو برسات میں اپنی کاشت کا انتظام نہیں کر رہا ہے تو اسے چھوڑ دو، تاکہ فصل کٹنے کے وقت اپنی حماقت پر خون کے آنسو روئے

علی الخصوص مجھے اس قوم تک یہ خبر ضرور پہنچا دینی چاہئیے جس نے قرآن کی حفاظت ونگرانی عمل واستعمال کا عہد باندھا ہے۔ کہ اس کے لئے تو شاید آنیوالے دن کا بھی انتظار کرنا پڑے۔ اور قبل اس دن کے وہ اسی زمین پر تباہ وبرباد ہوجائے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد ارشاد فرمایا تھا۔

من ترکہ من جبار قصمہ اللہ — اور جو جبر وعناد کی وجہ سے قرآن کو چھوڑے گا خدا اسے توڑ دے گا

دنیا کی اگر دوسری قومیں اس روح عرشی کی قدر وعزت نہیں کرتیں۔ تو زیادہ تر ایسی کی وجہ جبر وعناد

نہیں ہے بلکہ جہل ولاعلمی ہے۔ پھر وہ قوم جو یہ یقین کرتی ہے کہ "یہ کائنات" بھی اس کی نازل کی ہوئی ہے جس نے "مادی کائنات" کو پیدا فرمایا۔ اور یہ بھی جانتی ہے کہ اس کے علاوہ روحانی ہدایت اور کہیں نہیں مل سکتی ہے۔

اس کے بعد وہ جس طرح اس سے اعراض کر رہی ہے۔ تو اس کی علت بجز "جباریت" کے اور کیا قرار دی جائے۔

مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی، اور جہاں کہیں بھی انھوں نے قرآن کو چھوڑا۔ خداوند قدوس نے ان کو وہیں توڑ دیا۔ اندلس میں قرآن ماننے والی قوم جاتی ہے۔ رہتی ہے۔ کھاتی ہے پیتی ہے۔ کچھ دن اس کا اشتغال قرآن کے ساتھ رہتا ہے لیکن یکایک اس کا خیال بدل جاتا ہے۔ اور ارسطو کا فلسفہ، بطلیموس کی ریاضی اسے پاگل بنا دیتی ہے۔ قرآن کی عظمت اس کے دل سے جاتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اخیر میں اس کا مشغلہ فلسفہ اور ادب کے علاوہ اور کچھ نہیں رہتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ یہ پیشین گوئی کہ جس نے جبر وعناد کے ساتھ قرآن کو چھوڑا خدا اسے توڑ دیتا ہے۔ ان پر صادق آجاتی ہے۔

فتلك مساكنهم لم تسكن من بعدهم الا قليلا (حق سبحانہ وتعالیٰ) — وہاں جاکر یہ دیکھ آؤ ان کے مکانات ہیں جو ان کے بعد زیادہ دن تک آباد نہ رہ سکے۔

دجلہ کے کنارے بھی قرآن پڑھنے والی قوم آئی بھی اور مدتوں رہی، لیکن رفتہ رفتہ قرآن سے اس کا تعلق کمزور ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ جب یونان فلسفہ نے نصیر الدین طوسی اور علامہ سمرقندی جیسے لوگوں کو پیدا کیا اور قرآن سے اس قوم کا رشتہ بالکل ٹوٹ گیا۔ تو تم نے دیکھا کہ خدا نے بھی ان کو کس طرح توڑ دیا۔

اتاها امرنا ليلا او نهارا فجعلناها حصيدا كان لم تغن بالامس (القرآن) — ان پر ہمارا حکم رات یا دن کو آگیا۔ پھر ہم نے ان کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کل گویا آباد ہی نہ تھے۔

تم نے سنا ہوگا کہ اسی قوم کا ایک جرگہ جمنا کے ساحل پر بھی خیمہ زن ہوا تھا اس نے اس کے کنارے بڑی بڑی عمارتیں بنائیں۔ اور مدتوں آرام کیا۔ حتیٰ کہ اسی جرگہ کا ایک بادشاہ اٹھا۔ اور اس کے قرآن کو محض اپنے جبر واستکبار کے ساتھ چھوڑا۔ اس نے ہدایت کی تلاش قرآن کے علاوہ اور دوسری چیزوں میں شروع کی۔ حتیٰ کہ اس کے دربار میں بجز شعر وشاعری، دماغی عیاشی کے اور کچھ نہ رہا۔ قرآن کو اس زمانہ میں کسی نے چھوا بھی، تو فقط اس لئے کہ اپنا زور قلم دکھائے۔ عربی لغت میں جو اس نے عبور حاصل کیا تھا اس کا ثبوت دنیا کے سامنے پیش کرے پھر کیا حال ہوا اس قوم کا تم کو میں کیا بتاؤں، جاؤ، دلی کے کھنڈروں کی زبانی اس افسانہ کو سنو! آگرہ کے در و دیوار سے اس کا قصہ پوچھو! ۔

اللہ اللہ کتنا دردناک منظر تھا اس قرآن پر ایمان لانے والی قوم کا، کہ اسی بادشاہ کے پوتوں اور پڑپوتوں نے، یہ فیصلہ دیا کہ قرآنی تعلیم بت پرستوں کی مفروضہ کتابوں سے ماخوذ ہے مذہبی مدارس و تعلیم گاہوں میں بھی بجز ہیولیٰ اور صورت جسمیہ کے اور کسی کا تذکرہ باقی نہ رہا۔ قرآن درس سے خارج تھا۔ حدیث و آثار پڑھنے کی چیز نہ سمجھی گئی۔

سنبھالنے والوں نے سنبھالنا چاہا لیکن پانی سر سے گذر گیا تھا اور خدا کی بات کو پوری ہونی تھی۔

فدمدم علیهم ربهم بذنبهم فسواها　　پھر جھاں گیا ان کا خدا ان پر انکے گناہوں کی وجہ سے اور ان کو برابر کر دیا

حتیٰ کہ تخت طاؤس کا وارث عالم غربت میں بعد نیوائی و کس مپرسی ایک سمندر کے کنارے گودڑ میں لپیٹ کر دفن کر دیا گیا۔ اور یہ تھا اس بدبخت قوم کا آخری انجام جس نے خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر انسانی خیالات کی پیروی شروع کی۔

ایک افسوسناک مغالطہ جس میں یہ قوم مبتلا ہوئی۔ وہ یہ تھا کہ اس نے اپنے کو دوسری قوموں پر قیاس کیا۔ وہ اپنی زندگی کے قوانین کا انسباط بجائے آسمانی ہدایات کے غیر قوموں کی تاریخ سے کرنے لگی حتیٰ کہ اسی بنیاد پر کسی نے اس کو مشورہ دیا کہ وراثت کا قانون چھوڑ دو۔ ورنہ مر جاؤ گے حال ہی میں ایک نیک نیت آدمی نے اپنی زبوں حالی دیکھ کر ایک عام آواز دی کہ مسلمانوں سود کھاؤ تمہاری تنزل کا اصلی راز فقط یہی ہے۔ کہ تم نے شیر مادر کی طرح سود کے گھونٹ کو حلق میں نہیں اتارا ہے الی غیر ذلک المنشاورات۔

حالانکہ میں سچ کہتا ہوں۔ اور مجھ پر بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ اس قوم کا قانون حیات ان اقوام سے بالکل جدا ہے جنھوں نے خدا کی آخری عہد کو ابھی قبول نہیں کیا ہے ان کے نزدیک بجز "کائنات مادی کے اور کسی "کائنات" کا راز واضح نہیں ہوا ہے وہ جنھوں نے خدا کے اس آخری پیغام کو ابھی نہیں تسلیم کیا ہے

---

[1] یہ اشارات ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ اندلسی مسلمانوں کی دماغی روش کا اندازہ حضرت شیخ ابن عربی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کتابوں سے مل سکتا ہے کہ وہ قرآنی حقائق کو فلسفی اصطلاحوں میں سمجھانے پر مجبور ہیں کیونکہ ان کی مخاطب قوم فلسفہ کے علاوہ اور کسی چیز سے متاثر نہیں۔ امام رازی دولت عباسیہ کے ایام انحطاط میں اپنی تفسیر لکھتے ہیں اور طبعیات والٰہیات ریاضیات سب ہی کو اسمیں بھر دیتے ہیں کہ اس زمانہ میں کلام کے اندر وزن بغیر اس کے پیدا نہیں ہوتا تھا ہندوستان کے مصلح اعظم شیخ مجدد الف ثانی نے اپنی مکتوبات میں جو کچھ لکھا ہے اس سے آدمی سمجھ سکتا ہے کہ ہندی مسلمانوں کے اعمال و اخلاق کا کیا حال تھا ۱۲ منہ

ان میں سے ابھی بکثرت ایسے ہیں جن کے ساتھ خدا کا ٹھیک وہی تعلق ہے جو زمین پر بسنے والے دوسرے جانوروں اور چوپاؤں، درندوں، پرندوں کے ساتھ ہے، پس دوسرے اگر کائنات روحانی سے اعراض کر کے صرف "مادی کائنات" میں مشغول ہیں۔ تو خداوند رحمٰن ان کو اسی طرح کھلائے گا، پلائے گا جس طرح اپنی چڑیوں اور اپنے بندروں اور چوپاؤں کو کھلاتا ہے۔

ہمالہ کا بندر اپنی سر سبز درختوں کی ٹہنیوں پر آزادی سے اچھلتا ہے، اس کے پھلوں اور میووں کو سیر ہو کر کھاتا ہے، اور ٹھنڈے چشموں کے پانی سے دل و جگر کو سیراب رکھتا ہے۔ خدا کے پرندوں کو دیکھو کتنی نشاط کے ساتھ طاؤس دم کھول کر جنگلوں میں ناچتا ہے، اور چڑیاں جھوم جھوم کر شاخوں پر گاتی ہیں۔ چہچہاتی ہیں، بہر حال ان تمام جانوروں میں سے کون ہے جس کو مناسب غذا، عمدہ ہوا اور اچھا پانی میسر نہیں۔

لیکن جس قوم نے "کائنات روحانی" کی آخری ظہور و بروز کو پہچانا اور اسی کی روشنی میں چلنے کا عہد کیا پھر باوجود اس علم و یقین کے محض جبر و عناد، تکاسل و تہاون کی وجہ سے اس کو چھوڑا تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ خدا کا غضہ ان پر ختم جاتا، پیشگوئی پوری ہوئی۔ اور صاف نظر آگیا کہ جس قوم نے جاننے اور پہچاننے کے بعد "روحانی کائنات" کو چھوڑا، خدا بھی اسے اپنی "کائنات مادی" سے دھکیل رہا ہے اور وہ تو دھکیل بھی چکا۔

ہم نے ٹیگس و دجلہ جمنا پر آنسو بہایا۔ پھر اسی جرم میں کہا باسفورس اور نیل کی وادی میں رہنے والوں پر اعتراض نہ کیا جائے گا؟ یہ لے نے یونان و ہند کے دماغی سیلاب کے ساتھ اپنے کو تباہ کیا۔ اور پچھلوں نے برفستان یورپ کی طغیانیوں میں اپنے کو غرق کیا۔ یہ کہا جائے گا۔ اور قطعاً کہا جائے گا۔ میری یہی تحریر دلیل راہ بنے گی، آنے والی نسلیں اسی سے استدلال کریں گی۔

کہا جاتا ہے کہ "قرآن کو تھامو" ایک عام آواز ہے جو ہمیشہ مذہبی جماعت کی طرف سے مسلمانوں کی گھرانوں میں گونجتی رہی ہے خصوصاً اس عہد انحطاط و زوال میں تو واعظوں اور منادیوں نے اس جملہ کو اپنا سخن تکیہ بنا لیا ہے۔ جو آتا ہے۔ یہی کہتا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کی جس جماعت میں قرآن کی درس و تدریس شرح و تفسیر کا سلسلہ جاری ہے اس کی اخروی حالت کے متعلق تو کیا کہا جائے کہ وہ پیش نظر نہیں۔ لیکن دنیاوی حیثیت سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ "کائنات مادی" کا دروازہ جس قوم پر بند ہے وہ یہی قوم ہے۔ مسلمان دنیا کی سب سے زیادہ ذلیل و خوار قوم ہے اور اس میں سب سے زیادہ خراب حالت مولویوں کی ہے

یقیناً یہ صحیح ہے۔ اور اس کو یوں ہی ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ قرآن کے تھامنے کے معنی یہی

نہیں ہے کہ اس کا ترجمہ اور معنی سمجھ لیا جائے۔

قرآن کے معانی ومطالب سے تو ابوجہل بھی واقف تھا پھر کیا اس علم نے اس کو کچھ بھی فائدہ پہنچایا یقیناً قرآن کے محاورات وادبی نکات کو جتنا وہ سمجھتا ہوگا۔ ہندوستان کا ایک مولوی اتنا نہیں سمجھ سکتا پھر بھی اس کا خطاب ابوجہل کیوں ہوا۔

بلکہ اس ترجمہ کا جاننا ان کے لئے اور بھی وبال جان ہو جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ خداوند قدوس کا مواخذہ عموماً تبلیغ کی شدت وضعف کے ساتھ وابستہ ہے جس کو جس درجہ کی تبلیغ ہوئی ہے اس کا مواخذہ بھی اسی درجہ کا ہوتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے

وان کنت لاتدری فتلک مصیبۃ فان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

پس معنی کے جاننے والے مسلمان جن کو ہم علما، کہتے ہیں۔ یقیناً باعتبار تبلیغ کے ان کا رتبہ عام مسلمانوں سے بلند ہے۔ اور اسی لئے اگر خدا کی گرفت ان کے ساتھ سخت ہے۔ تو یہ خدا کی سنت ہے ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا اور میں یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ قرآن کے پڑھنے والوں میں ایسے بکثرت ہیں جن کی عملی حالت عام مسلمانوں سے بہت کم ممتاز ہوتی ہے اور جو کچھ ہوتی ہے وہ بھی قرآن کے اثر سے نہیں بلکہ اپنی شکم کے اثر سے وہ جلتے ہیں کہ اگر ہم ان باتوں کو بھی چھوڑ دیں گے تو پیٹ کی پیاس پھر کسی طرح بھی بجھ نہیں سکتی۔

میری یہ گفتگو بہتوں پر گراں گذرے گی۔ حتیٰ کہ خود مجھ پر گراں گذر رہی ہے۔ میرا نفس بھی اس حقیقت میں ڈالنا چاہتا ہے لیکن بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ولو القی معاذیرۃ۔

اور میں نے زیادہ تر اسی کے علی الرغم ان خیالات کو ظاہر کر دیا ہے۔ بہرحال درمیان میں ایک شبہ اور بھی آجاتا ہے اس کو بھی صاف کر لیا جائے پھر آئندہ جو کچھ کہلایا جائے گا کہوں گا۔

شبہ یہ ہے کہ میں نے گویا دنیاوی فراغ بالی اور افلاس کو خدا کی رضا اور عدم رضا کی علامت قرار دی ہے۔ حالانکہ صحیح آثار واحادیث ایسے موجود ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے غریب وفقیر محتاج ونادار ایسے ہیں جو گو دنیا کی نگاہوں میں ذلیل ہوں۔ لیکن خدا کی نگاہ میں ان کی عزت ہوتی ہے خود قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو کفار ان کی ناداری کی وجہ سے اذل اور اراذلنا بادی الرای وغیرہ کہتے تھے۔ اسلام میں ایسے اکابر اولیا اللہ بکثرت گذرے ہیں۔ جو دنیاوی حیثیت سے اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے تھے۔

بلاشبہ ایسا ہی ہے اور میں بھی اسی کا قائل ہوں لیکن یہاں پر ایک نکتہ قابل لحاظ ضرور ہے

کہ اس سلسلہ میں اشخاص و قوم، دونوں کے حالات مختلف ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ایک شخص خدا کے نزدیک مقرب اور معزز ہو آخرت میں اس کے درجات بڑے ہوں۔ لیکن باری عزاسمہ نے خاص حالات[1] کے اعتبار سے اس کے رزق کو محدود کر دیا ہو۔

لیکن قومی نکبت و فلاکت کی حیثیت اور ہے قرآن مجید نے کثرت سے اس مسکنت اور خواری کو عذاب آسمانی سے تعبیر کیا ہے مثلاً فرعون کی قوم کے متعلق ارشاد ہے۔

كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (حق سبحانہ و تعالیٰ)	کتنے باغ اور کتنے سرچشمے اور کتنے کھیت اور کتنے باعزت مقام اور کتنی نعمتیں جس میں خوشی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے، چھوڑ بیٹھے، اور یوں ہی ہوتا ہے اس کے بعد ہم نے دوسری قوم کو وارث بنا دیا۔

یا یہود کے متعلق مختلف مقامات میں ارشاد ہے کہ ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ الی غیر ذلک من الآیات۔ پھر بتاؤ کہ اگر میں آج اس قوم کے متعلق جو یلدیز وسرائے باغچہ کو چھوڑنے پر مجبور ہے یا اس سے پہلے، قلعہ معلی اور راعتماد الدولہ کی فلک ہما ایوانوں سے نکالے گئے۔

یا قصر حمرا و زہرا سے انھیں دھکیل دیا گیا۔ اس کو عذاب الٰہی نہ سمجھوں تو کیا سمجھوں۔

شخصی افلاس کا اثر مرکز قومیت، اور قوام ملت پر نہیں پڑتا۔ اور نہ قوم کے اصل مقصد کو اس سے کوئی گزند نہیں پہونچتا لیکن **قومی مسکنت** جڑ ہلا دیتی ہے اور جن مقاصد و اغراض کے لئے اس قوم کا وجود پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ سب اس کے بعد خاک میں مل جاتے ہیں۔ وہ آگے چل کر اٹھنا بھی چاہتی ہے تو اٹھ نہیں سکتی اس کی ساری قوتیں اس مصیبت کے بعد گم ہو جاتی ہیں بخلاف اس کے کہ کسی قوم کے کچھ لوگ فقیر و مسکین ہیں کہ اس کا اثر قومیت کے مضبوط چٹان تک نہیں پہونچتا بلکہ اگر غور کیا جائے۔ تو ایسے فقرا و مساکین سے نظام ملت میں مضبوطی پیدا ہوتی ہے اور کسی گھر کے بننے، اور کسی کے بگڑنے سے دولت کی حرارت بہت کچھ نقطۂ اعتدال سے قریب رہتی ہے واللہ اعلم بالصواب۔

بہرحال میرا یہ خیال ضرور ہے کہ چونکہ مسلمانوں نے خدا کی ”روحانی کائنات“ کو سمجھنے اور ماننے

---

[1] ان خصوصیات کا استیعاب بہت مشکل ہے کبھی رفع مراتب کے لئے ایسا ہوتا ہے۔ کبھی بعضوں کی نفسی شرارتوں کو توڑنے کے لئے بطور علاج کے ایسا کیا جاتا ہے۔ حدیثوں سے ان چیزوں کا پتہ چلتا ہے اور خود قرآن بھی اس کی طرف اشارہ فرماتا ہے جس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ۱۲

کے بعد چھوڑ دیا ہے اسی لئے خدا آج انہیں "مادی کائنات" سے محروم فرمارہا ہے اور یہ عقیدہ دل میں قرآن ہی سے پیدا ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ ہود میں ارشاد ہے۔

الٓرٰ قف کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اِنَّنِیْ لَکُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ۔ یُمَتِّعْکُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی وَّیُؤْتِ کُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ۔

(قرآن حکیم) ایک کتاب ہے جس کی آیتیں مضبوط و استوار کی گئی ہیں اور پھر جاننے والے دانشمند خدا نے اس کی تفصیل کی ہے کہ نہ پوجو لیکن ایک ہی خدا کو میں تم کو اس خدا سے ڈرنے والا اور مژدہ سنانے والا ہوں اور یہ کہ گناہ اپنے پروردگار سے بخشواؤ اور اسی کی طرف چل پڑو تم کو وہ اچھے فوائد ایک خاص وقت تک (یعنی دنیا) میں دے گا اور ہر شخص کو اس کی حیثیت کے موافق عطا فرمائے گا۔

اس لئے ضرورت ہے کہ اگر ہم پھر زندہ ہونا چاہتے ہیں تو خدا کی عالم روح کو پہچانیں، نہ اس طرح جس طرح کہ ابوجہل نے جانا کہ ایسا جاننا جہل سے زیادہ کوئی رتبہ نہیں رکھتا۔ بلکہ وہ جاننا جس کے متعلق صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین راوی ہیں۔

عن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ کنا اذا تعلمنا من النبی صلی اللہ علیہ وسلم عشر ایات من القران لم نتعلم العشر التی بعدھا حتی نعمل ما فیہ۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ ہم لوگ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے جب قرآن کی دس آیتیں سیکھتے تھے۔ تو اسکے بعد دس آیتیں نہیں سیکھتے جب تک اس پر عمل نہیں کر لیتے۔ پس اب بھی قرآن کی تعلیم کا یہی طریقہ ہونا چاہیئے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس اثر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین گویا ہر آیت پر عمل کرتے تھے۔ حالانکہ قرآن مجید میں عملی چیزیں تو بہت ہی کم ہیں اس میں زیادہ حصہ تو خدا کی تعریف اور اس کی شان و شوکت کا ہے، پھر قصص و امثال ہیں، اس کے بعد جنت و دوزخ کا تذکرہ ہے، اور سب سے کم جو چیزیں قرآن میں ہیں۔ وہ اعمال ہیں مثلاً نماز روزہ کو قرآن نے بیان کیا ہے۔ مگر وہ بھی محض اجمالی طریقے سے، پھر قرآن کی ہر آیت پر عمل کرنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟

یہ سوال ہے اور بہت بڑا سوال ہے ہم کو سوچنا چاہیئے کہ قرآن کی ہر آیت عملی قالب کس طرح اختیار کر سکتی ہے؟ اور صحابہ کرام کا طریق عمل کیا تھا؟ اور کیا کہیں مسلمانوں کی ساری خرابیوں کا راز اسی میں تو پوشیدہ نہیں حتیٰ کہ ان میں سے کبھی ایک نیک دل آدمی اٹھتا ہے۔ اس ولولہ کو لے کر اٹھتا ہے کہ قرآن ہی

جو کچھ چیزیں ملیں گی اس پر عمل کرتا جاوے گا لیکن اس کی مایوسی کی کوئی انتہا نہیں رہتی جبکہ بارون اور منزلوں کے بعد بھی اس کے سامنے عملی حکم کی کوئی آیت نہیں آتی یا آئی ہیں تو بہت زیادہ مجمل و مختصر اور اس کے بعد اس کا دل بیٹھ جاتا ہے۔ اخیر میں یہ سمجھ لیتا ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت ثواب ہے۔ پڑھنا چاہیئے۔ خواہ کچھ فائدہ ہو یا نہ ہو۔

لیکن اصل یہ ہے کہ ایک زمانہ سے مسلمانوں نے عمل کے معنی میں ترمیم کرلی ہے۔ اور عموماً اس کا اطلاق محض ان افعال پر ہوتا ہے جن کا تعلق ظاہر جسم سے ہے۔ یا اگر کبھی کسی نے کچھ وقت نظری سے کام لیا تو اس کے تحت میں نفسانی اخلاق کو بھی شریک کر لیا جاتا ہے مثلاً عموماً عمل کے یہ معنی لئے جاتے ہیں کہ نماز روزہ، صدقہ، خیرات وغیرہ کرنا چاہیئے جو زیادہ بالغ النظر ہیں وہ اس میں اور اضافہ کرتے ہیں کہ جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے۔ غیبت سے رکنا چاہیئے، اس سے بھی آگے نظر گئی۔ تو کہا جاتا ہے کہ حسد نہیں کرنا چاہئے بخل سے نجات حاصل کرنا چاہئے۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے، موجودہ وقت میں عموماً عمل کا دائرہ اسی سلسلہ پر پہونچ کر ختم ہو جاتا ہے۔

لیکن مندرجہ بالا آیتوں میں عمل کو اس سے کہیں زیادہ وسیع اور کشادہ معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

عمل کے اس اطلاق میں سب سے پہلا عملی کام یہ ہے کہ صحیح علم کے ذریعہ سے باطل علم کو تباہ کیا جائے حق سے باطل کو ہمیشہ برباد کرنے میں مشغول رہنا چاہیئے۔ یہ عمل کوئی جسمانی شغل یا دماغی قوت کے ساتھ وابستہ نہیں ہے بلکہ اس کا میدان ہم سے بہت آگے، اور ایک عالم ہے جس کا آسمان بھی روحانی ہے اور زمین بھی روحانی ہے وہاں صرف روح ہے اور اس کی فضا میں علاوہ روحانیات کے اور کسی چیز کی گذر نہیں پس جو "روحانی کائنات" سے فائدہ اٹھانا چاہتے وہ دن اچھائی تخموں کو مادی زمین کے کسی حصہ پر نہ چھڑکے کہ یہاں اس سے کوئی بہتر نتیجہ نہیں پیدا ہو سکتا بلکہ براہ راست ان کو روح کی زمین میں بوئے۔

پھر دیکھئے کہ اس عالم میں کیسے سرسبز شاداب کھیت لہلہا رہے ہیں، وہ جو ایک بنجر سے بھی زیادہ اجڑا ہوا میدان تھا کتنے سدا بہار پھولوں کو اپنے آغوش میں لے کر اکڑ رہا ہے۔ روم کے عارف نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ؎

علم را بر تن زنے مارے شود علم را بر جاں زنے یارے شود

بلاشبہ علم سے یقین مراد ہے اور یقین صرف قرآن کے ساتھ مخصوص ہے اس کا بنیادی پتھر صرف اسی حقیقت پر جمایا گیا ہے

ذلك الكتاب لاريب فيه (حق سبحانہ) یہی کتاب ہے جس میں شک نہیں ہے۔

بلکہ صرف یقین کی منزلیں اور حق و صدق کی راہیں ہیں۔ یہ کہنا کہ قرآن مجید خدا کے یہاں سے نازل ہوا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ قرآن میں انسانی اضافہ کو دخل دیتا ہے۔ قرآن صرف یہ کہتا ہے کہ اس کتاب کی بنیاد گمان، شک، وہم، تذبذب وغیرہ پر نہیں قائم کی گئی ہے بلکہ اس میں صرف یقین ہے۔ اور چونکہ موجودہ زمانہ میں قرآن کے پڑھنے والے عمارت کے پہلے ہی پتھر کو مضبوطی کے ساتھ نہیں جماتے۔ اس لئے اگر ثریا تک دیوار کج چلی گئی ہو، تو اس میں کوئی تعجب نہیں ہے۔

بلاشبہ قرآن کا یہ مطالبہ ہے اور بالکل بجا مطالبہ ہے کہ تمہارے اندر جتنے مادی ذرائع سے علوم و یقین پیدا ہوئے ہیں، اگر قرآن کے کسی دعویٰ سے وہ ٹکراتے ہیں تو دونوں کو خوب ٹکراؤ اپنے اختیار کو دخل نہ دو تھوڑی دیر کے بعد تم کو یہ تماشا نظر آئے گا کہ حق نے روح کو اندر جڑ پکڑ لی اور باطل بھسم ہوگیا۔

بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ — بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینکتے ہیں پس سچ جھوٹ کو لہولہان کر

فاذا ھو زاھق (حق سبحانہ وتعالیٰ) — دیکھیے اور اسی کے بعد یکایک وہ نیست و نابود ہو جاتا ہے

اور یہی وہ عمل ہے جس کی خبر ہم کو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ملی۔ صحابہ ہر آیت پر جو عمل کرتے تھے اس کے یہی معنی ہیں۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

دیکھنے میں یہ عمل نہایت آسان معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے لئے نہ ہاتھ ہلانے کی ضرورت ہے اور نہ پیر کے تھکانے کی انسان اس عمل کو کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہر وقت کر سکتا ہے۔

لیکن واقعہ یہ نہیں ہے، دنیا کے تمام اعمال و افعال جہد و کوشش اس وادی میں قدم رکھنے کے بعد محض آسان اور بالکل معمولی سمجھے جاتے ہیں۔

جس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان کو اس کے بعد ہر قدم پر اپنے جہل کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اس کا بھروسہ کان سے بھی اٹھتا ہے وہ اپنی آنکھوں کو بھی متہم کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ الغرض معلومات کے بہترین سرمائے میں آگ لگانی پڑتی ہے، جن چیزوں کو وہ اب تک بدیہی سمجھتا تھا نہ صرف ان کا نظری ہونا ثابت ہوتا ہے بلکہ ان کو غلط سمجھنا پڑتا ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ تم صحابہ کے طریقہ پر قرآن پڑھنا چاہتے ہو اور سورۂ الحمد شروع کرتے ہو جس کی پہلی آیت ہے

الحمد للہ رب العالمین — تمام اوصاف صرف اس خدا کے ساتھ مخصوص ہیں جو تمام عالم کا پروردگار ہے

اب اس پر عمل کرنے کے لئے ابتدائی طور سے یہ کہنا پڑے گا

(۱) دنیا میں کوئی عالم نہیں ہے۔ علم کی صفت کسی میں نہیں ہے، اس لئے کہ تمام اوصاف جن میں سے ایک علم بھی ہے خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہیں حالانکہ ایک تصور الیقین تھا اور ہے کہ

زید بھی عالم ہے، فخرالدین رازی میں بھی علم تھا، ارسطو بھی اس وصف کے ساتھ موصوف تھا بلکہ علم حیوانات اور تمام انسان کے لوازم میں سے ہے لیکن قرآن پر اگر عمل کرنا چاہتے ہو تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کے ذریعہ سے ان تمام علوم کو جلاؤ اور یقین کرو، کہ خدا کے علاوہ اور کسی ہستی میں کچھ نہیں ہے

(۲) اور صرف یہی نہیں کہ میں نہ کسی کو سننے والا سمجھوں، نہ دیکھنے والا سمجھوں نہ سونگھنے والا سمجھوں بلکہ اس کا مطالبہ صریح انداز میں یہ بھی ہے کہ میں اسی طرح نہ کسی میں کوئی قوت مانوں، نہ زور ہونے کا یقین کروں، یہ آیت مجھ میں یہ یقین پیدا کرتی ہے کہ یہاں کسی میں کچھ نہیں ہے، جن اوصاف کو ہم اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں یہ ہماری غیر حقیقی آنکھ کی غلطی ہے اور اسی غلطی کو قرآن مٹانا چاہتا ہے۔

(۳) میں یقین کرتا ہوں کہ ماں لڑکے کی پرورش کرتی ہے، بادشاہ رعایا کو نوکر رکھتا ہے عہدہ داروں کی مہربانیوں کی بدولت ہزاروں آدمی اپنے اور اپنے بال بچوں کو پال رہے ہیں۔ مجھ میں یہ علوم اس طرح سمائے ہوئے ہیں کہ ان کو ہم بالکل بدیہی اور قطعی خیال کرتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ نہیں ہے یہ علوم ہماری روح کے اصلی پیداوار نہیں ہے بلکہ کانٹے اور کچرے ہیں جو مادی سیلابوں میں بہ بہ کر میری جان کے اندر پیوست ہوگئے ہیں قرآن نے "رب العلمین" کے ذریعہ سے حقیقت کو بے نقاب کیا ہے۔ اب اس پر عمل کرنے کے یہی معنی ہیں کہ ان اغلاط پر "رب العلمین" کے اثر سے حملہ کیا جائے یہاں تک کہ آخر میں وہ خاک ہو کر بھسم ہو جائے اور یہ یقین بغیر کسی "ریب" و شک کے ہمارے اندر جلوہ گر ہو کہ کائنات کی ہر ذرہ کی پرورش صرف خداوند قدوس فرماتا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں کون ہے، جو قرآن کو اس عملی انداز کے ساتھ سیکھتا ہو سکھاتا ہو سلجیوں کا ایک گروہ ہے جو قرآن کے درس سے پہلے اپنے طلبہ کے سامنے دو مقدمے پیش کرتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہمارے حواس خمسہ جو علوم عطا کرتے ہیں۔ وہ بھی یقینی ہے۔ دوسرے یہ کہ قرآن میں جو کچھ ہے وہ بھی یقینی ہے۔ اس کے بعد ان کو سمجھاتا ہے کہ اگر دونوں میں کہیں تضاد پیدا ہو جائے تو یہ بھی غلط ہے کہ قرآن کو اپنی یقینیات و بدیہیات پر ترجیح دیجائے اور یہ بھی غلط ہے کہ اپنی یقینیات کو قرآن پر ترجیح دی جائے بلکہ اس وقت کھینچنے کی ضرورت ہے۔ منطقی زور آزمائیوں کے ذریعہ سے کچھ قرآن کو کھینچو اور کچھ اپنی علوم کو الٹو پلٹو۔ اور اس طرح گویا دونوں کا ڈانڈ املادو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو قرآن سے کچھ نہیں ملتا ہے وہ قرآن

ختم کرنے کے بعد بھی اپنے اندر ان ہی علوم کو دیکھتے ہیں جو پہلے سے ان کے اندر آنکھ، ناک، کان وغیرہ نے پیدا کئے تھے اور گوان کو برا معلوم ہوگا لیکن ان کے ذہن میں قرآن کی عظمت صرف ایک منہ دیکھی سی بات ہوتی ہے۔ یا کسی اجمالی تخیل کا ایک رعب انگیز اثر بیچارے جب قرآن کی کسی آیت کو اپنی روح کو خس وخاشاک سے منطبق کر دیتے ہیں۔ تو گو منہ سے نہ کہیں لیکن ان کا دل اندر سے بولتا ہے کہ یہ بات بگڑی چلی تھی لیکن میری ذہانت نے (العیاذ باللہ) قرآن کی عزت رکھ لی۔

لیکن محققین و صدیقین قرآن کی ابتداء ہی میں یہ سمجھا دیتے ہیں کہ "بس یہی ایک کتاب ہے جس میں کسی قسم کے شکوک و شبہات نہیں ہیں" پس جو علم، جو عقیدہ بھی اس سے ٹکرائے گا اس کو تباہ کرتے ہوئے آگے بڑھو اور یہ وہ جماعت ہے جس کو قرآن کی ہر آیت میں ایک جدید علم نیا نظریہ ہاتھ آتا ہے، اس کی روح علوم و معارف سے معمور ہوتی ہے۔ فضاء روحانی گرد وغبار سے صاف ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کائنات کا اصلی آفتاب چہرہ سے نقاب الٹتا ہے۔ اور جو کچھ یہاں غلط معلوم ہوتا تھا وہی اس کے بعد صحیح اور یقینی معلوم ہوتا ہے۔ غیب کی راہ سے قرآن لے چلتا ہے۔ اور مشاہدہ کے میدان میں لے جاکر کھڑا کر دیتا ہے

بہرحال میری اصلی غرض اس وقت جو کچھ بھی تھی وہ عرض کر چکا، اپنے نزدیک قرآن پر عمل کرنے کے یہی معنی ہیں۔ اور یہ سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کی ساری خرابیاں اسی عمل کے فقدان کا نتیجہ ہے۔

"تصوف" بھی ان دنوں اشغال اور اذکار کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے حالانکہ صحابہ کا تصوف صرف قرآن کے اس عمل کا نام تھا جس کا ایک حصہ ذکر و شغل بھی ہے۔ اخیر میں ایک نکتہ اور قابل لحاظ ہے کہ بعض لوگ قرآن مجید کی ان نظریات کو جو علوم باطلہ کے خلاف ہیں یا حواس خمسہ کے پیدا کئے ہوئے یقین کے مخالف ہیں مانتے ہیں اور ان پر یقین رکھتے ہیں لیکن صرف ایک اجمالی مبہم یقین اور وہ بھی ہمیشہ روح کے اندر منحصر نہیں رہتا بلکہ سالہا سال کے بعد کبھی خیال آجاتا ہے مثلاً یہ کہ واقعی خدا کے علاوہ اور کسی میں کچھ نہیں ہے اور ایسے لوگ بھی قرآن سے حقیقی طور پر مستفید نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ضرورت ہے کہ دس آیتیں لی جائیں اور جس طرح صحابہ کا عمل تھا کہ اپنے علوم کا اندازہ کیا جو اس آیت کے خلاف نظر آیا۔ اس کو تباہ کر دیا اور پھر اس علم صحیح کو دس پندرہ دن ہر وقت پیش نظر رکھا۔ کھاتے پیتے، اٹھتے بیٹھتے اس خیال کو اپنی جان سے لگائے رکھا۔ جب یہ اطمینان ہو جائے کہ اس علم صحیح نے روح کی صحن خانہ میں جڑ پکڑ لی تو پھر دوسری آیت کو لیا جائے اور اس طرح یہ عمل مسلسل جاری رہنا چاہیئے اور اس طرح اگر قرآن کی ایک سورت بھی کسی انسانی روح رکھنے والے کے زیر عمل آجائے گی تو میں کیا بتاؤں کہ وہ اپنے اندر کیا پائے گا اور اس کی قوت و قدرت پھر کہاں سے ابلنے لگے گی۔

موطا مالک میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق مروی ہے۔
مکث علی سورۃ البقرۃ ثمانی سنین یتعلمها　　کہ وہ صرف سورہ بقرہ کو ۸ سال تک جا کر سیکھتے رہے۔
بعض روایتوں میں ہے کہ بارہ سال کا زمانہ خرچ ہوا۔ حتیٰ کہ جب سورۂ بقرہ کی ہر آیت نے اس کے اندر علمی شکل اختیار کر لی۔ اور اس کے ذریعہ سے آپ نے تمام اندرونی غلط علوم کو جلا لیا تو اس خوشی میں احباب کی دعوت کے لئے ایک اونٹ ذبح کیا اور بارہ برس کیا، کبھی تو ساری عمر گذر جاتی ہے اور قرآن کی کسی ایک آیت کا استحضار بھی کسی سینہ میں نہیں ہوتا اس لئے کہ ابتدا میں انسان پر یہ بات سخت گراں گذرتی ہے کہ خود اپنے کو جھٹلائے، اپنی آنکھ، ناک، کان قوت دماغی سب پر پتھر مارے اسی لئے ضرورت ہے کہ تمام اعمال سے پہلے انسان اپنے اندر "لا ریب فیہ" کے مفہوم کو متیقن اور مستحضر کرے۔ کہ اس کے بعد اور چیزیں انسان کے ساتھ پیوست ہونا شروع ہوتی ہیں یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ مجھے علم یقینی کی ضرورت ہے اور یقینی علم بجز قرآن کے اور کسی سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ حواس خمسہ بھی جو کچھ عطا کرتے ہیں وہ محض سطحی معلومات ہوتے ہیں تخیل کرنے کے بعد ان کی دبی ہوئی چیزیں بھی گمان و تخمین سے آگے نہیں بڑھتیں فرض کرو کہ میری آنکھیں مجھے بتاتی ہیں ہمارے سامنے ایک جسم درخت کی شکل میں کھڑا ہوا ہے۔ ابھی تک آنکھ کہتی ہے۔ کہ اسے جسم سمجھو، ہم ذرا آگے بڑھتے ہیں تو کہتی ہے کہ اس میں دو چیزیں مانو ایں جسے دکھلا رہی ہوں، وہ جسم نہیں ہے بلکہ اعراض ہیں۔ اور جسم ان ہی اعراض کا محل ہے ہم ذرا اور آگے بڑھتے ہیں کہ اعراض کے لئے محل کی کیا ضرورت ہے؟ جواب ملتا ہے کہ جس کو جسم سمجھتے ہو، وہ چند اعراض کا مجموعہ ہے۔ پھر اعراض کیا ہیں، جواب ملتا ہے کہ سطح عدم الخط کو کہتے ہیں، اور خط نقاط کے مجموعہ کو، اور نقاط امور موہومہ میں سے ہے۔ اسی طرح الوان و رنگ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سرخی، سیاہی، زردی یہ سب اصل میں نور ہیں اور نور ہی ان مختلف شکلوں میں جلوہ پرواز ہوا ہے۔ الیٰ غیر ذلک من الامور تم نے دیکھا کہ اتنی بدیہی شئی کو جب حقیقت کے معیار پر جانچنا شروع کیا۔ تو اس علم نے کیا کیا قلابازیاں کھائیں۔ اور کس طرح لڑھکتا ہوا۔ آخر اس پر آکر ٹھیر گیا کہ اجسام کچھ تو عدمات اور بعض انوار کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ کاش تم قرآن پڑھتے تو تمہارے سامنے وہ اصل حقیقت کو بغیر کسی تذبذب کے بے نقاب کر دیتا ہے کسی عارف سے جا کر پوچھو کہ "جس کتاب میں شک کی گنجائش نہیں ہے،" وہ کیا بتاتی ہے؟
الحاصل ہر اس شخص پر جو قرآن پر عمل کرنا چاہتا ہے۔ یہ پہلا فرض ہے کہ ہمیشہ مہبط وحی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان جلوں کو پیش نظر رکھے۔

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

قرآن کریم اور محاکاۃ

جناب محمد محسن صاحب ٹونکی کراچی

قرآن کریم واقعات کو تصویر کشی اور منظر نگاری کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یہ تصاویر جیتی جاگتی۔ زندہ اور متحرک ہیں حرکت ہر تصویر میں اسی طرح موجود ہے جس طرح زندگی رنگ و شکل کے اختلاف کے باوجود مختلف صورتوں میں پائی جاتی ہے۔ حوادث ہوں یا مشاہد، قصص ہوں یا مناظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ تصویر کشی کا یہ طریقہ قرآنی تعبیر و بیان کی اساس ہے۔ یوں تو دنیا میں بہت سی چیزیں عبرت پذیری کے نقطہ نظر سے دیکھی جاتی ہیں مگر مٹے ہوئے دیار و بلاد شکستہ کھنڈرات۔ فنا شدہ زندگی کی باقی ماندہ یادگاریں۔ پامالِ خزاں گلشن اور گہنائے ہوئے آفتاب و ماہتاب انسانی جذبات و احساسات پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور انسان انہیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا ہے۔ بصارت اگرچہ ان کو ظاہراً دیکھتی ہے مگر بصیرت باطناً چشمِ متخیل سے ان کا ملاحظہ کرتی ہے فنا شدہ زندگی کو تصور میں لانے اور اس پر زحمتِ فکر و تامل گوارا کرنے کے لئے قرآن کریم قوت متخیلہ کو دعوت دیتا اور انسان کی نگاہ کو ان کھنڈرات کی جانب منعطف کراتا ہے، ملاحظہ فرمائیے۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ (الروم)

کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں کہ انہیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔

ایک اور انفرادی اور شخصی تصویر ملاحظہ کیجئے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللَّهَ عَلَىٰ حَرْفٍ (الحج)

اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتا ہے

کیسی حرف بہ حرف صحیح چلتی پھرتی اور جیتی جاگتی دلکش تصویر ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو دائرہ دین کے وسط میں نہیں بلکہ کنارے پر کھڑا ہے بالفاظ دیگر کفر و اسلام کی سرحد پر کھڑا ہو کر بندگی کر رہا ہے۔ یا کسی فوج کے کنارے پر کھڑا ہوا کوئی متزلزل اور مذبذب سپاہی ہے۔ اگر فتح ہوتی ہے تو فوج ہی میں مل جاتا ہے اور اگر شکست ہوتی ہے تو چپکے سے سٹک جاتا ہے۔ یہ شخص خام سیرت ہے مضطرب العقیدہ ہے اور بندہ نفس ہے

اس کا ایمان اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اس کی مرادیں۔ تمنائیں اور آرزوئیں پوری ہوتی رہیں۔ ہر طرح چین ہی چین نصیب ہو۔ نہ خدا کا دین اس شخص سے کسی قربانی کا مطالبہ کرے اور نہ دنیا میں اس کی کوئی خواہش اور آرزو پوری ہونے سے رہ جائے۔

مساعد حالات میں یہ شخص خدا تعالیٰ سے راضی ہے اور اس کا دین بھی اس کے نزدیک بہت اچھا ہے لیکن جہاں کوئی آفت آئی وہاں اس شخص کی جبین کا ذب اور جبینِ خالی ماسوا کے آستانہ پر جھک گئی اور پھر اس شخص کو توحید۔ رسالت اور دین کی حقانیت کسی چیز پر بھی اطمینان نہیں رہا۔

ایک اور عجیب تصویر ملاحظہ فرمائیے۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ (الحج)	جو شخص یہ گمان رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کی کوئی مدد دنیا اور آخرت میں نہ کرے گا اسے چاہیئے کہ ایک رسی کے ذریعہ آسمان تک پہنچ کر شگاف لگائے پھر دیکھے کہ آیا اس کی تدبیر کسی ایسی چیز کو رد کر سکتی ہے جو اسکو ناگوار ہے

اس اندازِ بیان میں تصویر کشی اور منظر نگاری کے ساتھ ساتھ کنایہ کا حسین امتزاج بھی شامل ہے اور کنایہ کے امتزاج سے زبان و بیان کی یہ شرابِ طہور دو آتشہ ہو گئی ہے جہاں کنایہ کار فرما ہوتا ہے وہاں حقیقی اور مجازی دونوں معنی مراد ہوتے ہیں یہاں بھی یہی صورت ہے حقیقی معنی تو ترجمہ ہی سے ظاہر ہے اور مجازی معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے بدگمانی کرنے والا شخص اپنا سارا زور لگا کر دیکھ لے۔ حتیٰ کہ اگر آسمان کو پھاڑ کر تھگلی لگا سکتا ہو تو وہ بھی کر کے دیکھ لے کہ آیا اس کی کوئی تدبیر تقدیر الٰہی کے کسی ایسے فیصلے کو بدل سکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے۔ آسمان پر پہنچنے اور شگاف دینے سے کنایہ ہے اس بڑی سے بڑی کوشش کی طرف جس کا انسان تصور کر سکتا ہو۔ اصل مراد یہی مجازی معنی ہیں۔ کلام کے سیاق و سباق اور سلسلۂ تقریر سے صاف واضح ہوتا ہے کہ یہ گمان کرنے والا شخص وہی ہے جو کنارے پر کھڑا ہو کر بندگی کرتا ہے اور نامساعد حالات میں خدا تعالیٰ سے پھر جاتا ہے اور غیر اللہ کے آستانہ پر جبہ سائی کرتا ہے۔
الغرض آیۃ کریمہ کا ادبی حسن و جمال تصویر کشی اور کنایہ میں پوشیدہ ہے۔ یہ تصویر کشی کسی مادی آلہ کی مرہونِ منت نہیں میں اس تصویر کو عالم واقعہ میں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ یہ اعجاز صرف الفاظ پر مبنی ہے اور دراصل یہ قرآن کے اسلوب کا اعجاز ہے۔

اور منظر دیکھئے۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ	جو شخص خدا تعالیٰ کے ساتھ شرک کرے وہ گویا آسمان

مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ۔ (الحج) — سے گر پڑا پھر اسے چاہے پرندے اچک لے جائیں یا ہوا اس کے پہنچے اڑا کر کسی دور دراز مقام پر پھینک دے

دیکھئے یہ بھی کیا منظر ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے گویا قدم رک گئے ہیں نہ بڑھتے ہیں نہ ہٹتے ہیں۔ محویت کا عالم ہے ہم تصویر کو ______ اور تصویر ہمیں دیکھ رہی ہے مصوّرِ حقیقی نے صرف الفاظ کے ذریعے جو تصویر کھینچی ہے مصورانِ مجازی کے رنگین کیمرے اور موئے قلم اس سے عاجز ہیں اس تصویر میں بھی پہلی تصویر کی طرح دو دو حسن دجمال ہیں۔ ایک منظر کشی کا حسن وجمال کیونکہ منظر کشی بجائے خود کلام کی تحسین و تزئین ہے۔ اور دوسرا کنایہ کا حسن دجمال۔ اس آیت کریمہ میں بھی کنایہ کارفرما ہے۔ اور اس کے مجازی معنٰی نہایت واضح ہیں۔

ایک اور جگہ اصحاب کہف کی غار سے گردش آفتاب کا منظر یوں پیش کیا گیا۔

وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ۔ (الکہف) — تم دیکھو گے کہ طلوع کے وقت سورج ان کے غار سے داہنی طرف اپنا موڑ موڑ لیتا ہے اسی طرح غروب کے وقت بھی وہ غار سے بائیں طرف کترا جاتا ہے اصحاب کہف غار کے وسیع حصہ میں استراحت فرما ہیں۔

دیکھئے جیتی جاگتی تصویر کشی اسی کو کہتے ہیں۔ آفتاب کا کیا حسین انداز اور کیسی نرالی ادائے گردش یہ تصویر پیش کرتی ہے۔ عصر حاضر کے آلاتِ جدید اور مصورانِ مجازی۔ آلاتِ تصویر، ضیاپاشی کے تمام ذرائع اور رسائل کے باوجود آفتاب کی اس ادا کی تصویر کھینچنے سے قاصر ہیں جس کی تصویر درج بالا الفاظ میں کھینچی گئی ہے۔ رب کائنات نے سورج کو حکم دیا ہے کہ وہ آسمان کے اسٹیج پر ضرور ضیاپاش ہو اور ناظرین کو اپنی کارگردگی سے متاثر کرے مگر غار سے بچ بچا کر۔ سمٹ سمٹا کر اور کترا کر نکل جائے تاکہ اس کی شعائیں غار کو روشن اور نمایاں نہ کریں اور اصحاب کہف کا تحفظ ہو سکے۔ تَزٰوَرُ اور تَقْرِضُ کے الفاظ سورج کی اس ادا کو ظاہر کرنے کے لئے اظہر من الشمس ہیں۔ یہ دونوں لفظ زبان پر ہلکے پھلکے ہیں طَلَعَتْ اور غَرَبَتْ کے بعد بالترتیب ان الفاظ کی ادائیگی کر کے زبان محظوظ ہوتی ہے اِدھر زبان مزے لیتی ہے اُدھر الفاظ کے ذریعہ کھینچی ہوئی متحرک اور ناطق تصویر سے سماعت، بصارت اور بصیرت لطف اٹھاتی ہے۔ اِدھر الفاظ کے حسنِ انتخاب کا حسن وجمال ہے۔ اور اُدھر منظر کشی کا حسن وجمال۔ اِدھر طَلَعَتْ اور غَرَبَتْ جیسے متقابل الفاظ کا حسن وجمال ہے۔ اور اُدھر ذَاتَ الْيَمِيْنِ اور ذَاتَ الشِّمَالِ جیسے متقابل الفاظ کا حسن وجمال تَزٰوَرُ اور تَقْرِضُ کے الفاظ میں نیرنگی جمال بھی ہے۔ تَزٰوَرُ کا لفظ اگر مکرر استعمال ہوتا ہے نیرنگی پیدا نہیں ہوتی۔ الغرض یہ چھوٹی سی آیہ مبارکہ حسن وجمال کا خرمن ہے ہر طرف جلوے ہی جلوے ہیں۔

زبان وبیان کا مذاق رکھنے والا قاری اس مختصر سی آیۂ کریمہ کو پڑھ کر محسوس کرے گا۔ کہ وہ حسن وجمال کے جلوہ زار میں حیران کھڑا ہوا ہے۔

ایک جگہ میدانِ حشر کی یوں منظر کشی کی گئی ہے۔

وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ (الحج)	لوگ تمہیں متوالے نظر آئیں گے مگر وہ متوالے نہیں ہونگے بلکہ (عذاب دیکھ کر) مدہوش ہو رہے ہوں گے۔ بے شک خدا کا عذاب بڑا سخت ہے۔

یہ زلزلۂ قیامت کی ہولناکی کا منظر ہے یہ ہنگامۂ محشر ہے۔ لوگوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اہلِ محشر مست اور متوالے بنو ہوئے ہیں نظر بہکی بہکی اور قدم لڑکھڑائے ہوئے ہیں ان پر نشہ کی کیفیت طاری ہے مگر انھوں نے نشہ استعمال نہیں کیا۔ یہ ساغر بلور پئے بغیر ہی مخمور اور سرشار ہیں۔ ہول اور دہشت کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ لوگ نشہ استعمال کئے بغیر ہی بے خود اور وارفتہ ہیں۔ دراصل یہ اللہ تعالیٰ کے شدید عذاب کی کارفرمائی ہے۔ دیکھئے خوف ودہشت اور مدہوشی کی کیسی عجیب تصویر کشی ہے۔ اس میں حرکت ہے۔ دلکشی اور رعنائی ہے مگر خوف افزا دلکشی اور دہشت انگیز رعنائی۔

اگر کوئی مصور اپنے رنگین برش سے اس ناطق تصویر کو خاموش تصویر کی شکل میں پیش کر سکتا تو اسے اس کا بڑا کمال تصور کیا جاتا۔ حالانکہ مصور کو تصویر کشی کا سب سامان استعمال کرنا پڑتا۔ لوگوں کو مست وبیخود اور متوالا دکھانے کے لئے میخانہ اور لوازم میخانہ بھی دکھانے پڑتے دشمن آگہی اور رہزنِ ہوش ساقی کو بھی دکھانا پڑتا مگر یہاں نہ صرف الفاظ ہی الفاظ ہیں نہ ساقی ہوش ربا ہے نہ مطرب نغمہ سرا۔ اور نہ دوسرے لوازم۔

ایک اور منظر ملاحظہ کیجئے۔

كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (الفتح)	وہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے (زمین سے) اپنی سوئی نکلی پھر اسے مضبوط کیا۔ پھر موٹی ہوئی اور پھر اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہوگئی اور کھیتی والوں کو خوش کرنے لگی تاکہ کافروں کا جی جلائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اس منظر میں ایک کھیتی سے تشبیہ دی گئی ہے منظر کشی کے حسن وجمال کے ساتھ ساتھ تشبیہ کا حسن وجمال بھی آیۂ کریمہ میں موجود ہے۔ یہ کھیتی نہ ریزہ ریزہ ہوتی ہے۔ نہ ہوا اسے اڑاتی ہے اپنی جگہ پر قائم رہنے والی کھیتی ہے نگاہ سے اوجھل نہ ہونے والا منظر ہے یہ منظر نہ تخیل سے غائب ہو سکتا ہے نہ مشاہدے سے دونوں تو بس اس منظر سے مکیف ہوتی ہیں۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ منظر طویل بھی ہے اور مختصر بھی۔ اس میں طوالت اور اختصار پہلو بہ پہلو موجود ہیں منظر کے ابتدائی اجزا یکے بعد دیگرے جلد جلد ختم بھی ہو رہے ہیں اور طول بھی پکڑ رہے ہیں کھیتی کے تدریجی مراحل اور ادوار دیکھئے کھیتی نے پہلے زمین سے اپنی سوئی نکالی۔ پھر وہ مضبوط ہوگئی۔ پھر موٹی ہوئی اور اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہوگئی یہ تمام مختصر مناظر ہیں اور طویل بھی نشو و نما کی ابتدا سے انتہا تک اس میں تغیرات بھی رونما ہوئے مگر تھوڑی سی مدت میں طاقت در ہونے اور اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہو جانے کے بعد پھر اس میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا۔ مسلمانوں کی ابتدائی حالت کی اس متحرک اور متکلم تصویر میں دو چیزیں نہایت واضح ہیں ایک یہ کہ ان کو اسلام لانے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور دوسرے یہ کہ وہ ایک حالت پر ٹھہرے رہے۔ انھیں قیام۔ ثبات اور استقلال حاصل رہا۔ جب ان کی نشو و نما مکمل ہوگئی تو پھر وہ ہمیشہ مستقل اور مستقیم ہی رہے۔ اس بیان کو پیکرِ تصویر میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اور یہ تصویری انداز بیان کس قدر دل آویز ہے۔

آیۂ کریمہ کے الفاظ کی تنظیم و ترتیب اور ان کے حسنِ انتخاب پر غور کیجئے: "فَآزَرَ" "فَاسْتَغْلَظَ" "فَاسْتَوٰی" کے الفاظ زبان پر کس قدر خفیف اور لطف انگیز ہیں۔ اور ان میں حرف (ف) کا تکرار کتنا مستحسن ہے "یُعْجِبُ" اور "یَغِیْظُ" جیسے افعال باہم متضاد ہیں۔ "کَزَرْعٍ" کے لفظ میں حرف تشبیہہ اور مشبہ بہ سمائے ہوئے ہیں اور یہ تشبیہہ پر دلالت کرتا ہے۔ یہ سب کچھ ادبی تحسین و تزئین ہے۔

نحوی اعتبار سے غور کیجئے۔ بظاہر چھوٹی سی آیت کریمہ ہے مگر اس میں چھ جملے ہیں چھ افعال ہیں اور ایک فاعل ہے۔ کچھ افعال لازم ہے اور کچھ متعدی۔ بعض زمانہ ماضی پر دلالت کرتے اور بعض زمانہ حال و مستقبل پر ان میں وحدت و کثرت کا امتزاج ہے لازم و متعدی کا امتزاج ہے اور زمانہ کا امتزاج ہے یہ متکلم حقیقی کے بے نظیر کلام کی گل افشانیاں ہیں

ایک اور تصویر دیکھئے۔ یہ بڑی ڈراؤنی اور منفی تصویر ہے طرز بیان میں کیسا زور اور مبالغہ ہے ملاحظہ فرمایئے

كَاَنَّمَاۤ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا (یونس)

ان کی روسیاہی کا یہ عالم ہوگا گویا انھیں اندھیری رات کے ٹکڑے اڑھا دیئے گئے ہیں۔

آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے چہروں کی سیاہی رنگ کی قسم کی چیز نہیں بلکہ وہ شب سیہ فام کا ٹکڑا ہے جو چہروں پر تھوپ دیا گیا ہے۔

یہ مناظر مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر بیان کئے گئے ہیں ورنہ قرآن کریم میں یہ مناظر بکثرت موجود ہیں۔ ان مناظر کو ہماری چشم تخیل ہی نہیں دیکھتی بلکہ ہم امر واقعہ کے طور پر ان کا مشاہدہ کرتے ہیں الفاظ کے ذریعے منظر کشی کا یہی اعجاز و کمال محاکات کہلاتا ہے۔

آں حضرتؐ سے نکاح کے وقت

حضرت خدیجہؓ کی عمر تاریخی حقائق کے آئینے میں

مولوی عزیز اللہ اعظمی متعلم شعبہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

ہر زمانہ میں اس دور کے ماہرین فن اور محققین کی نئی تحقیقات اور نئے انکشافات منظر عام پر آتے رہتے ہیں اور آتے رہیں گے لیکن ہر تحقیق کا صحیح ہونا اور اس کا قابل قبول ہونا ضروری نہیں ہر فن کی اپنی الگ تحقیق ہوتی ہے اگر وہ تحقیق اس فن کے اصول و قواعد کے مطابق ہے تو اس کے قبول کرنے میں کسی کو تامل نہیں ہونا چاہیے اسی طرح اگر تحقیق کسی کے شخصی حالات سے متعلق ہے اور اس کی صحت پر تاریخی شواہد اور روایات ساتھ دیتی ہیں تو اسے تسلیم کرنے میں ذرہ برابر جھجک نہیں ہونی چاہئے۔

ام المومنین حضرت خدیجہؓ کی عمر مبارک عقد کے وقت کیا تھی؟ اس سلسلے میں مختلف اقوال ملتے ہیں سیرت کی عربی کتابوں میں ۴۵، ۴۰، ۳۵، ۳۰، اور ۲۸، ۲۵ کے اقوال پائے جاتے ہیں اور سیرت کی اردو کتابوں میں عام طور پر ۴۰ کا قول ملتا ہے۔ سیرت النبیؐ، رحمت للعالمینؐ، نبی رحمتؐ، سیرت مصطفےٰ اور اردو کی دوسری کتابوں میں ۴۰ ہی کا قول اختیار کیا گیا ہے اور یہ قول عوام و خواص میں اس درجہ مشہور ہے کہ اگر اس کی جگہ دوسرا قول بیان کیا جائے تو کوئی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔

لیکن دو تین سال قبل رابطۂ عالم اسلامی سے سیرت نبی الہدی والرحمہ نامی ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کے مصنف الحافظ عبدالسلام الہاشم ہیں ان کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی عمر مبارک عقد کے وقت ۲۸ برس تھی موصوف کتاب مذکور میں "الزواج المیمون" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

کانت السیدۃ خدیجۃؓ فی نہایۃ عامہا الثامن والعشرین[1] وفی ھذہ السن اکتمل النضج والشباب وھی تحتفظ بالکثیر من جمال الصبا وروعۃ الانوثۃ التی تفقت علی الرناھۃ والیسر ولم یعجبہا تکرار الازواج وکانما کانت تنتظر من تہیأ لیظلہا اعظم انسان ص ۶۸

عبارت لکھنے کے بعد اسی صفحہ پر حاشیہ میں لکھتے ہیں۔

(۱) هذا اعلی خلاف من یذکرون بانها کانت فی الاربعین اذ تبین بعد التحقیق الدقیق صدق ما ورد فی بعض المراجع المعتبرة ص۹۶

اس تحقیق کے مطابق جو لوگ حضرت خدیجہؓ کی عمر ۴۰ سال بیان کرتے ہیں صحیح نہیں ہے کیونکہ تحقیق کے بعد ۲۸ والے قول کی صداقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے جیسا کہ بعض معتبر مراجع میں مذکور ہے۔

مصنف ممدوح نے صرف بعض مراجع کی طرف مبہم اشارہ کیا ہے صراحۃً ان مراجع کو بیان نہیں کیا جبکہ مصنف موصوف کی علمی و تحقیقی ذمہ داری تھی کہ ان مراجع معتبرہ کی نشان دہی کرتے تاکہ تلاش و جستجو کے شائقین اسے آسانی سے تلاش کر لیتے اور موصوف کی تحقیق کی صداقت کا صحیح اندازہ ہو جاتا لیکن موصوف نے ایسا نہیں کیا۔ اب ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ متقدمین و متاخرین کی لکھی ہوئی سیرت کی کتابوں کا مطالعہ کر کے موصوف کی تحقیق جدید کا تفصیلی جائزہ لیں اگر صحیح ہے تو قبول کریں اور اگر صحیح نہیں ہے تو تاریخی شواہد اور روایات کی روشنی میں جو قول راجح ہو اسے ثابت کریں۔

اس سلسلے میں ہم متقدمین و متاخرین اصحاب سیر و تاریخ اور محدثین کرام کی عبارتیں نقل کریں گے اور ان نقول و عبارات کی روشنی میں جو قول راجح معلوم ہوگا اس کو ثابت کرنے کی کوشش کریں گے آپ مورخین اسلام اور محدثین کرام کی عبارتیں پڑھیں اور ان کی رائے معلوم کریں۔

۱۔ علامہ ابن الاثیر الجزری کی رائے

ان کے نزدیک چالیس کے علاوہ دوسرا قول سرے سے معتبر ہی نہیں ہے لکھتے ہیں۔

نکح رسول اللہ صلعم خدیجةؓ بنت خویلد وهو ابن خمس وعشرین سنة وخدیجةؓ یومئذٍ بنت اربعین سنة (تاریخ الکامل ج۲ ص۳۱)

رسول اللہ صلعم نے حضرت خدیجہؓ سے ۲۵ برس کی عمر میں نکاح فرمایا اس وقت حضرت خدیجہ کی عمر ۴۰ سال تھی۔

۲۔ حضرت خدیجہؓ کی عمر سیرۃ ابن ہشام کی نظر میں

سیرت ابن ہشام میں ۴۰ کا قول راجح قرار دیا گیا ہے اور دوسرے اقوال قیل سے بیان کئے گئے ہیں جس سے ان کے مرجوح ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

وتزوجها رسول اللہ صلعم وهی یومئذٍ بنت اربعین سنة وقال وقیل خمس واربعین سنة وقیل ثلاثین وقیل ثمان وعشرین وقیل خمس وثلاثین وقیل خمس وعشرین (سیرۃ ابن ہشام ج۱ ص۱۴۰)

حضرت خدیجہؓ کی عمر نکاح کے وقت ۴۰ سال تھی۔ کچھ نے ۴۵، ۳۰، ۲۸، ۳۵ اور ۲۵ سال بیان کئے ہیں لیکن یہ سب اقوال ضعیف ہیں۔

جمہور کی رائے

علامہ ابن سید الناس جمہور کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

قال ابن اسحاق ولما بلغ رسول اللہ صلعم خمسا وعشرین سنۃ تزوج خدیجۃؓ بنت خویلد فیما ذکرہ غیر واحد من اہل العلم وقال ابن عبد البر وخرج رسول اللہ صلعم الی الشام فی تجارۃ لخدیجۃؓ سنۃ خمس وعشرین وتزوج خدیجۃ بعد ذلک بشہرین وخمسۃ وعشرین یوما فی عقب صفر سنۃ ست وعشرین وذلک بعد خمس وعشرین سنۃ وشہرین وعشرۃ ایام من یوم الفیل وقال الزہری کانت سن رسول اللہ صلعم یوم تزوج خدیجۃ احدی وعشرین سنۃ وقال ابو عمرو وقال ابو بکر بن عثمان وغیرہ کان یومئذ ابن ثلاثین سنۃ قالوا وخدیجۃؓ مذ بلغت اربعین سنۃ (عیون الاثر لابن سید الناس ص ۴۹ ج ۱)

ابن اسحاق لکھتے ہیں علماء کے بیان کے مطابق رسول اللہ صلعم نے حضرت خدیجہؓ سے ۲۵ سال کی عمر میں نکاح کیا تھا۔ علامہ ابن عبد البر لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم اپنی عمر کے ۲۵ ویں سال میں حضرت خدیجہ کا سامان تجارت لے کر شام تشریف لے گئے اور واپسی کے ۲ ماہ ۲۵ دن بعد ۲۶ھ میں صفر کے بعد حضرت خدیجہؓ سے عقد فرمایا اس وقت آپ کی عمر مبارک ۲۵ سال ۲ ماہ ۱۰ دن تھی۔ امام زہری کی رائے کے مطابق اس وقت آپ کی عمر ۲۱ سال تھی اور ابو عمرو، ابوبکر بن عثمان وغیرہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ اس وقت آپؐ ۳۰ برس کے تھے اور حضرت خدیجہؓ کے بارے میں سب بالاتفاق کہا ہے کہ آپ کی عمر اس وقت ۴۰ سال تھی۔

۴۔ علامہ عینیؒ شارح صحیح بخاری کی رائے

علامہ عینی باب تزویج النبیؐ خدیجہ وفضلہا کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں۔

تزوجہا رسول اللہ صلعم فی سنۃ خمس وعشرین من مولدہ فی قول الجمہور وقال ابو عمر کانت اذ تزوجہا رسول اللہ صلعم بنت اربعین سنۃ واقامت معہ اربعا وعشرین سنۃ وتوفیت وہی بنت اربع وستین سنۃ وستۃ اشہر وکان رسول اللہ صلعم اذ تزوجہا ابن احدی وعشرین سنۃ وقیل ابن خمس وعشرین وھو الاکثر (عینی شرح بخاری)

جمہور کے قول کے مطابق رسول اللہ صلعم نے اپنی عمر کے ۲۵ ویں سال میں حضرت خدیجہؓ سے عقد فرمایا۔ ابو عمر کہتے ہیں اس وقت حضرت خدیجہؓ ۴۰ سال کی تھیں ۲۴ سال کی طویل رفاقت کے بعد ۶۴ سال ۶ ماہ کی عمر میں آپ سے جدا ہو گئیں اور حضور کی عمر عقد کے وقت ۲۱ سال تھی لیکن اکثر کے نزدیک ۲۵ سال تھی

علامہ عینی بڑے پایہ کے محدث ومحقق ہیں ان کے نزدیک بھی ۴۰ کا قول ہی راجح اور معتبر ہے۔

۵۔ مؤرخ اسلام علامہ ابن کثیر کی رائے

علامہ ابن کثیر عام مورخین کی رائے سے الگ ایک الگ رائے رکھتے ہیں بیہقی عن حاکم کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

عقد کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر ۳۵ برس اور ایک ضعیف قول کے مطابق ۲۵ برس تھی۔

وقال یعقوب بن سفیان کتبت عن ابراہیم بن المنذر حدثنی ابن ابی بکر الموصلی حدثنی غیر واحد ان عمرو ابن اسد زوج خدیجۃؓ من رسول اللہ صلعم و عمرہ خمسا وعشرین سنۃ وقریش تبنی الکعبۃ و ھکذا نقل البیھقی عن الحاکم انہ کان عمر رسول اللہ صلعم حین تزوج خدیجۃؓ خمسا وعشرین سنۃ وکان عمرھا خمسا وثلاثین وقیل خمسا وعشرین سنۃ (البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج۲ ص۲۹۵)

ابن ابو بکر موصلی کہتے ہیں مجھ سے متعدد لوگوں نے بیان کیا کہ عمرو ابن اسد نے جس وقت حضرت خدیجہؓ کا نکاح پڑھایا اس وقت رسول اللہ صلعم کی عمر ۲۵ سال تھی اسی طرح بیہقی نے حاکم سے نقل کیا ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلعم کی عمر ۲۵ سال اور حضرت خدیجہؓ کی ۳۵ سال تھی اور ایک روایت کے مطابق ۲۵ ہی سال تھی۔

۶۔ علامہ محمد عبد الباقیؒ کی رائے گرامی

حضرت علامہ الزرقانی کی عبارت کی شرح میں لکھتے ہیں۔

وکان لھا حین تزوجھا النبی من العمر اربعون سنۃ رواہ ابن سعد واقتصر علیہ الیعمری وقدمہ مغلطائی والبرھان قال فی الغرر وھو الصحیح وقیل خمس واربعون وقیل ثلاثون وقیل ثمانیۃ وعشرون حکاہ مغلطائی وغیرہ (شرح الزرقانی ج۱ ص۲۰۰)

نبی کریم صلعم سے عقد کے وقت حضرت خدیجہ کی عمر ۴۰ سال تھی اس کو (۴۰ کا قول) ابن سعد نے روایت کیا اور یعمری نے اس کو صحیح سمجھتے ہوئے اسی قول پر اکتفا کیا اور مغلطائی نے بھی اسی کو تمام اقوال پر مقدم رکھا اور برہان نے اپنی کتاب غرر میں اس کو صحیح قرار دیا ہے تاہم اس کے علاوہ ۴۵، ۳۰، ۲۸ کے قول ملتے ہیں جو سب ضعیف ہیں۔

گویا علامہ محمد بن عبد الباقیؒ کے نزدیک بھی معتبر اور راجح قول ۴۰ ہی کا ہے اس کے علاوہ باقی تمام اقوال غیر معتبر ہیں۔

۷۔ شیخ محمد ابو زہرہ کی تحقیق جمیل

پروفیسر شیخ محمد ابو زہرہ ماضی قریب کے شہرۂ آفاق مصنف و محقق گذرے ہیں شخصیات پر ان کی کئی ایک گراں قدر کتابیں ہیں سیرت مبارکہ پر آپ کی شہرہ آفاق کتاب خاتم النبیین کی جلدوں میں ہے آپ نے

اس کی پہلی جلد میں حضور پاک صلعم اور حضرت خدیجہؓ کی عمر مبارک پر بڑی محققانہ اور بصیرت افروز بحث کی ہے لکھتے ہیں۔

والمشہور بین العلماء واصحاب السیر والتاریخ ان سنہ علیہ الصلوۃ والسلام فی وقت الزواج کانت خمساً وعشرین سنۃ وکانت ھی فی الاربعین من عمرھا ولقد کانت اقوال اخری فی سنیھما عند الزواج ولم یبلغ واحد منھا مرتبۃ الشہرۃ وقیل ان سنہ علیہ الصلوۃ والسلام کانت الحادیۃ والعشرین وقیل کانت التاسعۃ والعشرین وقیل کانت الثلاثین وقال ابن جریج کانت السابعۃ والثلاثین وھذہ اقوال لیس لھا سند والمشہور ھو المعتمد حتی یقوم الدلیل علی خلافہ وذلک فوق ان بعضھا لایتلاقی مع النسق التاریخی وذلک ان المتفق علیہ ان الزواج لم یکن فور حرب الفجار بل کان بعدہ بمدۃ ولو کان فی الحادیۃ والعشرین لکان فورہ والتقدیر بالسابعۃ والثلاثین بعید التصدیق لان مؤداہ ان النبیؐ عاش راھباً الی ان بلغ الی السابعۃ والثلاثین ان بناتہ غیر فاطمۃ تزوجن قبل الھجرۃ وبعضھن تزوجت وطلقت ثم تزوجت ولو کان زواجہ فی السابعۃ والثلاثین ما بلغن سن الزواج قبل الھجرۃ وخصوصاً انہ ما کان اول اولادہ من ام المؤمنین خدیجۃؓ انثی بل ولدہ القاسم الذی یکنی بہ ثم ابنہ الطیب ثم الطاہر ھکذا نری ان الساق التاریخی لایتسق الا مع المشہور وھو ذو السند ولا سند لغیرہ۔

واما سنھا رضی اللہ عنھا فقد کان المشہور الاربعین وقیل کانت فی الخامسۃ والثلاثین وقیل کانت فی الخامسۃ والعشرین ولا سند لھذہ الاقوال ولکن التاریخ یعتمد دائماً علی المشہور الذی لہ سند یعتمد علیہ ولا خلاف بین کتاب السیر فی ان سنھا رضی اللہ عنھا جزاھا اللہ عن الاسلام خیراً کانت اربعین۔ ھذہ اقوال منثورۃ لم یؤیدھا کتاب السیر والمحققین۔

ولسنا من الذین یتجھون الی الاغراب وان کان سائغاً فی بعض العلوم فھو لایسوغ قطعاً فی التاریخ لان تتبع الاغراب فی التاریخ انکار لما اشتھر ارتضاء بما لم یشتھر من غیر سند ان الحقائق ھی الامور المشہورۃ ویردھا ما عداھا الا اذا قام الدلیل انکذ المشہور بما لم ینقل عنہ قوۃ۔ واللہ اعلم۔ خاتم النبیین ج ۱ ص ۲۰۸

ترجمہ علماء اسلام اور اصحاب سیر و تاریخ کے نزدیک یہ بات مشہور ہے کہ نکاح کے وقت رسول اللہ صلعم کی عمر مبارک ۲۵ سال اور حضرت خدیجہؓ کی ۴۰ سال تھی اس کے علاوہ دوسرے اقوال بھی پائے جاتے ہیں لیکن سب غیر مشہور ہے چنانچہ ایک روایت کے مطابق آپ کی عمر ۲۱ سال اور ایک دوسری روایت کے مطابق ۲۹ اور ۳۰ سال بیان کی گئی ہے اور ابن جریج تو کہتے ہیں کہ اس وقت آپ کی عمر ۳۷ سال تھی یہ تمام اقوال غیر مستند ہیں صرف ۴۰ کا قول مستند اور مشہور ہے اور اس وقت تک قابل استناد رہے گا جب تک کہ اس کے خلاف کوئی دلیل نہ قائم ہوجائے۔

۴۰ والے قول کی بجائے دوسرا قول تسلیم کرنے میں یہ پریشانی ہے کہ تاریخ کے منظم واقعات ہیں جو رلط ہے وہ ختم ہوجاتا ہے مثال کے طور پر حضور پاک صلعم کا نکاح بالاتفاق جنگ فجار کے ایک عرصہ بعد ہوا اگر آپ کی عمر شریف اس وقت ۲۱ سال فرض کریں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ نکاح جنگ فجار کے فوراً بعد ہوا جو تاریخی شہادت کے بالکل خلاف ہے اس لئے کہ بقول سیرت ابن ہشام کے جنگ فجار کے وقت آپ کی عمر ۱۴ یا ۱۵ سال تھی اور ابن اسحاق کی رائے کے مطابق ۲۰ سال تھی علامہ ابن کثیر نے ابن اسحاق کی رائے کو ترجیح دی ہے دیکھئے (البدایہ والنہایہ صلہ ۲۹۵ ج ۲) ابن اسحاق کا قول مان لینے کے بعد اگر ۲۱ سال کا قول لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کا عقد جنگ فجار کے فوراً بعد ہوا جو تاریخی شہادت کے بالکل خلاف ہے اسی طرح اگر ۳۷ کا قول لیں تو یہ لازم آئے گا کہ حضور پر نور صلعم ۳۷ سال تک رہبانیت اور تجرد کی زندگی بسر کرتے رہے جبکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت فاطمہؓ کے علاوہ تمام صاحبزادیوں کی شادی ہجرت سے پہلے ہوگئی تھی بلکہ حضرت رقیہؓ کی تو دو مرتبہ ہوئی اول عتبہ ابن ابولہب سے پھر حضرت عثمان غنیؓ سے اگر بالفرض آپ صلعم کی عمر نکاح کے وقت ۳۷ سال تھی تو یہ تینوں صاحبزادیاں قبل ہجرت شادی کی عمر کو نہیں پہنچ سکتیں تھیں خصوصاً جب حضرت خدیجہؓ کے بطن سے پہلے صاحبزادے یعنی حضرت قاسم وعبداللہ تولد ہوئے (روایات تتبع سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت زینبؓ حضور صلعم کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں بعثت سے دس سال قبل یعنی جس وقت حضور کی عمر ۳۰ سال تھی پیدا ہوئیں (سیرۃ مصطفےٰ صلہ ۴۵ ج ۲) حضرت زینبؓ کے بعد حضرت رقیہؓ پیدا ہوئیں یہ بھی بعثت سے تقریباً ۵ سال پیشتر پیدا ہوئیں اب اگر حضور کی عمر نکاح کے وقت ۳۷ سال تسلیم کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت زینبؓ و رقیہؓ کی ولادت ۳۷ کے بعد ہوئی جبکہ تاریخ شاہد ہے دونوں صاحبزادیاں ۳۷ سال سے پہلے ہی پیدا ہوچکیں تھیں۔ پھر تاریخ مشہور و مستند قول کا اعتبار کرتی ہے اس کے نزدیک غیر مستند قول غیر معتبر ہوتا ہے۔

حضرت خدیجہؓ کا سن مبارک نکاح کے وقت مشہور قول کے مطابق ۴۰ سال تھا اس کے علاوہ ۳۵ اور ۲۵ کا قول بھی آتا ہے لیکن اس کی نہ کوئی سند ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی تاریخی وثیقہ ہے اصحاب سیر و تاریخ کا اس پر اتفاق ہے کہ عقد کے وقت آپ کی عمر ۴۰ سال تھی باقی تمام اقوال چلتے پھرتے اور غیر معتبر ہیں

اخیر میں محترم پروفیسر صاحب مغربیت زدہ طبقہ کو تنبیہہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اہل یورپ کی نئی تحقیقات اور ان کے نئے انکشافات سے مرعوب ہو جاتے ہیں البتہ اتنا ضرور ہے کہ بعض علوم میں اہل یورپ کو مہارت اور کافی دسترس حاصل ہے لیکن تاریخ جو مسلمانوں کا خاص فن ہے اس میں وہ ہم سے کبھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اور پھر ان کی تاریخی تحقیقات کا مقصد تو مشہور قول کو غیر مشہور اور صحیح کو غیر صحیح کر کے پیش کرنا اور حقائق کا انکار کرنا ہے ایسی صورت میں جو قول مشہور و مستند ہوگا اس کو قبول کیا جائے گا۔ البتہ اس کے مقابلے میں دوسری قوی دلیل قائم ہو جائے تو اس کے قبول کرنے میں تامل نہیں ہوگا۔

نتیجۂ بحث آپ حضرات نے متعدد علماء مورخین اور محدثین کرام کی عبارتوں کو پڑھا اس سے اندازہ لگایا ہوگا کہ حضرت خدیجہؓ کی طرح حضور صلعم کی عمر مبارک کے متعلق بھی مختلف اقوال ملتے ہیں اوپر کی عبارتوں کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ حضور پاک صلعم کی عمر کے بارے میں عام طور پر ۳۷، ۳۰، ۲۵ اور ۲۱ کے اقوال ملتے ہیں لیکن اوپر جن حضرات کی عبارتیں پیش کی گئیں ہیں ان میں سے اکثر کی رائے یہ ہے کہ حضورؐ کی عمر عقد کے وقت ۲۵ سال تھی اور علامہ عینیؒ نے اس کو جمہور کا قول نقل کیا ہے در حقیقت ۲۵ ہی کا قول ایسا ہے جس کے ماننے میں کسی قسم کی تاریخی اڑچن اور الجھن پیش نہیں آتی اس کے علاوہ جس قول کو اختیار کیا جائے تاریخی الجھن سے بچ نہیں سکتے اگر ۲۱ کا قول کیا جائے تو حضور کا نکاح جنگ فجار کے معاً بعد ہونا لازم آتا ہے جو واقعہ کے خلاف ہے ۳۷ کا قول اختیار کریں تو حضرت قاسم و عبد اللہ اور حضرت زینب و رقیہ کی ولادت باسعادت ۳۷ کے بعد ہونی چاہیئے شیخ ابو زہرہ کی تقریر سے اس قول کا بطلان اچھی طرح ثابت ہو چکا ہے اسی طرح ۲۹ اور ۳۰ کا قول بھی قابل اعتبار نہیں اس لئے کہ حضرت زینب کی ولادت باسعادت بعثت سے دس سال قبل یعنی ۳۰ھ میں ہوئی اور ان سے قبل حضرت قاسمؓ و عبد اللہؓ پیدا ہوئے اگر آپ کی عمر مبارک نکاح کے وقت ۳۰ سال مانتے ہیں تو حضرت قاسم و عبد اللہ کی ولادت ۳۰ کے بعد اور حضرت زینب کی ولادت ۳۱ سے اور بعد ہونی چاہیئے

سیرت ابن ہشام کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی عمر کے بارے میں ۴۵، ۴۰، ۳۵، ۳۰ اور ۲۸، ۲۵ کے اقوال آئے ہیں لیکن ۴۰ کا قول جمہور کے نزدیک معتبر اور راجح ہے اوپر جن علماء کی عبارتیں

نقل کی گئی ہیں ان سے صرف علامہ ابن کثیر اور علامہ محمد بن عبد الباقی نے ۳۵ کا قول نقل کیا ہے سیرت ابن ہشام اور علامہ محمد بن عبد الباقی نے ۴۵ اور ۴۰ کا قول نقل کیا ہے لیکن ۲۸ کا قول صرف مغلطائی نے نقل کیا ہے وہ بھی قیل سے جو ضعف اور کمزوری پر دلالت کرتا ہے اب آپ خود فیصلہ کیجئے اور ۲۸ والے قول کی حقیقت و صحت کا اندازہ لگائیے کیا خبر واحد کو خبر مشہور اور شخص واحد کی رائے کو جمہور کی رائے پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔

اور نیز عقلاً بھی ۴۰ کا قول معتبر سمجھ میں آتا ہے وہ اس طرح کہ حضرت خدیجہؓ حضور پاک صلعم سے قبل ابو ہالہ بن النباش التمیمی کے عقد میں تھیں اس کے انتقال کے بعد عتیق بن عائذ المخزومی سے نکاح کیا اس کے مرنے کے ایک عرصہ بعد حضور پاک کی زوجیت میں آئیں نکاح اول اور حضور کے نکاح کے درمیان ایک طویل وقفہ ہے اگر نکاح اول کے وقت حضرت خدیجہ کی عمر ۲۰ سال تھی (جس عمر میں عام طور سے لڑکی کی شادی کی جاتی تھی) تو ۲۰ اور ۲۸ کا درمیانی وقفہ تین نکاح کے لئے جبکہ ہر دو نکاح کے درمیان کافی فاصلہ ہے کیونکر کافی ہوسکتا ہے اگر ۴۰ کا قول مان لیتے ہیں تو تاریخی اور روایتی اعتبار سے کسی قسم کی کوئی الجھن پیش نہیں آئے گی۔ اس لئے ان قوی اور معتبر دلائل سے یہی محقق طور پر ثابت ہوتا ہے کہ عام مورخین اور محدثین کی نقل کردہ روایت ہی درست ہے۔ اور المحترم الحافظ عبد السلام الہاشم نے جس روایت کو ترجیح دی ہے وہ کسی طرح بھی قابل اعتنا و لائق ترجیح نہیں ہے۔ وباللہ التوفیق۔

(بقیہ صفحہ ۱۷)

من ابتغی الھدیٰ فی غیرہ اضلہ اللہ وھو حبل اللہ المتین وھو الذکر الحکیم وھو الصراط المستقیم وھو الذی لا یزیغ بہ الاھواء ولا تلتبس بہ الالسنۃ (رواہ الترمذی)

جو شخص قرآن کے علاوہ کسی اور جگہ ہدایت کی تلاش کرتا ہے خدا اسے گمراہ کر دیتا ہے وہی (قرآن) خدا تک پہونچنے کا مضبوط رسہ ہے، وہی مستحکم نصیحت اور یادداشت ہے، وہی سیدھا راستہ ہے قرآن ہی ہے کہ خواہشیں اسکے ساتھ کجروی اختیار نہیں کرسکتیں اور نہ زبانیں اس میں گڑبڑ ڈال سکتی ہیں۔

ھذا والسلام والصلوٰۃ علی النبی المصطفیٰ والانبیاء والاولیاء ۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

حیات شیخ الاسلامؒ کا ایک ورق

مولانا عبداللہ بستوی مقیم حال مدینہ منورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم وعلی آلہ وصحبہ واتباعہ اجمعین اما بعد۔

غالباً ۱۳۵۹ھ کا زمانہ تھا جب میری قسمت کا ستارہ چمکا رحمت باری میری طرف متوجہ ہوئی ظلمت کفر میں ایمان کی کرن چمکی پھر میری دنیا و آخرت سنورنے کے اسباب پیدا ہو گئے میں فخر ایمانی سے منور اور شرف اسلام سے مشرف ہو کر آغوش پدری کو خیرباد کہہ کر مدرسہ دینیہ مونڈ ڈیہا بیگ ضلع بستی میں بانیان مدرسہ حضرت مولانا عبدالوہاب صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد رفیق صاحبؒ کی آغوش تربیت میں داخل ہو گیا۔ یہ دونوں شیخ الاسلام سیدنا و مولانا و استاذنا و مرشدنا و شیخنا الاعظم السید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کے دو روشن چراغ تھے جن کی نورانیت سے بے شمار چراغ جلے اور اب سارے عالم میں نورانیت پھیلا رہے ہیں فطری طور پر ان کی مجلسیں شیخ الاسلامؒ کے ذکر سے معمور ہوتی تھیں اور میرے کان اس ذات عالی صفات سے مانوس اور قلب مالوف ہو گیا تھا ۱۳۶۶ھ میں جب دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تو حضرتؒ کی محبت ان کی عظمت قلب میں گھر کئے ہوئے تھی متفرق طور پر چھ سال دارالعلوم دیوبند میں رہا میری آنکھوں نے بہت سے راسخین فی العلم دیکھے بے شمار نجوم ہدایت کی چمک دمک سامنے آئی لیکن اس ماہ کامل کے سامنے سب ماند تھیں قدرت نے اس ذات عالی میں بہت سارے انسانی کمالات یکجا جمع کر دیئے تھے ان کے بعد ان کی سوانح لکھنے والوں نے لکھا اور بہت خوب لکھا مگر سب یہ کہہ گئے۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ حضرت سے تعلق رکھنے والا ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ حضرتؒ کو میرے ساتھ بڑا خاص تعلق ہے۔ مگر مجھ کمزور نادار، بیمار پر تو بہت ہی خاص نظر تھی میں نے اپنے سامنے پیش آئے ہوئے چند واقعات تو پہلے ہی جمع کر لئے تھے اور کچھ اب یاد آتے گئے جن کو زینت قرطاس

کر رہا ہوں ان سے معلوم ہوگا کہ تواضع کی آخری سیڑھی پر کھڑے ہونے والے سبط پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ کتنا عالی نظر کتنی دقیق رائے کتنی صائب اور ذات گرامی کس قدر کرامات سے پر تھی

(۲) دیکھئے میرا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے کہاں ہے

ایک دن حضرتؒ بالائی دارالحدیث میں درس حدیث کے لئے تشریف لائے ساتھ ساتھ چلنے والوں میں راقم الحروف بھی تھا حضرتؒ کا پیٹ کسی قدر بڑھ گیا تھا پائجامہ کھسک کر ٹخنوں سے نیچے پہنچ گیا میں نے بھی دیکھا مسند درس پر بیٹھتے ہی کسی نے پرچی لکھ دی کہ حضرت آپ کا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے ہے حضرتؒ فوراً کھڑے ہو گئے واللہ نہ بدن کھینچا نہ ہاتھ لگایا مگر پائجامہ ٹخنوں سے اوپر پہنچ گیا اور حضرتؒ یہ فرمار ہے تھے دیکھئے میرا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے کہاں ہے اور روئے مبارک پر ذرا بھی ناگواری نہیں ہوئی یا للحلم

اس واقعہ میں تواضع کی نرالی شان کرامت کا بین اور واضح پہلو اور یوم لا یخزی اللہ النبی والذین آمنوا معہ کا حسن منظر خوب خوب روشن ہے۔

(۳) قطب الاقطاب حضرتؒ ہی ہیں

قیام تاؤلی کے زمانہ میں زیارت اساتذہ کے لئے دیوبند گیا ہوا تھا مدنیؒ کے اس حصہ میں جہاں قاری اصغر علی صاحبؒ قیام پذیر تھے قاری صاحب کے علاوہ مولانا مبارک علی صاحبؒ نائب مہتمم، منشی محمد شفیع صاحب محاسبی دارالعلوم، مولانا محمد میاں صاحبؒ شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی اور صدر نجمن شیخ الاسلامؒ موجود تھے ان میں راقم الحروف بھی جاملا حضرتؒ پوری جولانی پر تھے کلام قطب الاقطاب وغیرہ خدام خلق باطنیہ پر ہورہا تھا اچانک حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ نے دریافت کر لیا کہ اس وقت قطب الاقطاب کون ہے اپنے آپ کو ننگ اسلاف سمجھنے والا خاموش ہو گیا تھوڑی دیر خاموشی کے بعد گھر میں تشریف لے گئے اس کے بعد سب حضرات علی مافات پر افسوس کرنے لگے پھر باتیں شروع ہوئیں ان میں یہ بات بھی تھی کہ اس وقت قطب الاقطاب حضرتؒ ہی ہیں شواہد و اقوال بھی بیان کئے جو مجھے یاد نہیں رہے انتم شھداء اللہ فی الارض نصاب پورا ہے حضرتؒ اپنے دور کے قطب الاقطاب تھے رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

(۴) آپ کیوں آئے خادم نے نو آنے کیلئے لکھ دیا تھا

ایک دن دوپہر کو بخاری شریف کا سبق ہورہا تھا مدرسہ کی چھٹی ہو چکی تھی مگر ابھی دورہ حدیث کے طلبہ فیضان مدنیؒ سے مستفیض ہو رہے تھے یکایک کسی نے حضرتؒ کو

خبر دی کہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ رائپوری تشریف لائے ہیں حضرتؒ نے اعلان فرمادیا اور سبق بند ہوگیا حضرتؒ گھر کی طرف چلے آپ کے ہمراہ طلبہ بھی چل رہے تھے ادھر خبر دینے والے نے حضرت رائپوریؒ کو بھی خبر کر دی وہ مہمان خانہ سے استقبال کے لئے چل پڑے اور دارالشفاء میں شمس و قمر یکجا ہوگئے ہدیۂ سلام کا تبادلہ ہوا حضرت مدنیؒ نے فرمایا آپ کیوں آئے خادم نے تو آنے کے لئے لکھ دیا تھا حضرت رائپوریؒ نے فرمایا جو خادم تھا آگیا ماشاء اللہ ہر ایک بایں عالی مقام ایک دوسرے کا خادم بن رہا تھا حضرت رائپوریؒ نے فرمایا حضرت ہوا بہت تیز چل رہی ہے حضرت مدنیؒ نے فرمایا جی ہاں ایک ظلم آپ نے کیا ایک ہوا کر رہی ہے حضرت رائپوریؒ خاموش رہے اور سب مہمان خانہ میں تشریف لے گئے راقم السطور واقعہ کے وقت موجود تھا تواضع کی عالی مثال بھی آنکھوں نے دیکھی۔

(۵) کرامات الاولیاء حق

مکتوبات شیخ الاسلام جلد دوم صفحہ ۳۳۸ پر آپ میرے نام ایک حکم دیکھیں گے فلا تقعد بعد الذکری مع القوم الظلمین واقعہ یہ ہوا تھا کہ میرا انتساب جماعت اسلامی سے مشہور ہوگیا تھا جس کے ظاہری اسباب تھے میں جماعتِ اسلامی کے طرز کا مکتب چلاتا تھا اگرچہ میں جماعت اسلامی سے متفق نہیں تھا البتہ ان کا طرز تعلیم بہت ہی پسند تھا نیز حکم پہونچتے ہی میں نے عریضہ لکھا کہ میں نعلمی کے ساتھ دکان داری ہوں جس میں سامان تو بہت ہے مگر بے قرض کا یہ سامان فوراً ایک نہیں سکتا قرض ادا کرنے کی اور کوئی اور صورت نہیں اور بلا قرض ادا کئے اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتا دعا فرمائیں قرض ادا ہوجائے اس کے بعد فوراً دیوبند حاضر ہوجاؤں گا حضرتؒ نے بدست خود پھر جواب تحریر فرمایا جس میں دعا کا وعدہ فرمایا اور ایک وظیفہ تحریر فرمایا کہ پانچ سو مرتبہ حسبنا اللہ ونعم الوکیل با وضو قبلہ رخ بیٹھ کر مقصد کا دھیان کرکے ایک یا کئی مجلسوں میں پڑھ لیا کرو میں نے عمل شروع کر دیا دو مہینے بھی نہیں گذرے تھے کہ سب قرض ادا ہوگیا ادر میں مادر علمی مدرسہ دینیہ موتڈ ڈیہا بیگ کو خیرباد کہہ کر دارالعلوم دیوبند پہونچ گیا اس وقت میرے پاس اچھی خاصی رقم جمع تھی جس کو سفر دیوبند میں استعمال کیا ان دنوں کے لئے ظاہر اسباب بہت معمولی قریب قریب منفی تھے یہ صرف کرامات مدنیؒ کا نتیجہ تھیں بفضل اللہ حضرت کی دعا سے مشکل حل ہوئی ہفتہ میں ایک دن دکانداری کرنا تھا جس میں ۲۰، ۲۵ روپیہ کی بکری ہوتی تھی کچھ اخراجات میں آجاتے تھے۔

(۶) آپ وہاں کی تکلیف برداشت نہیں کرسکیں گے

سنہ ۱۹۵۴ء کا رمضان قریب آیا حضرتؒ کا قیام ٹانڈہ میں

ملے ہوا میں نے سعیت میں رمضان شریف گذارنے کی درخواست دی جو بے تردد منظور ہوگئی میرے دوست مولانا عبدالحمید صاحب بستوی نے بھی اس غرض سے درخواست پیش کی کہ اس سفر میں وہ میرے مساعد رہیں گے کیونکہ میں مریض تھا جب درخواست کا پرچہ حضرتؒ کے دست مبارک میں پہونچا تو حضرت نے غور فرمانے کے بعد فرمایا کہ آپ وہاں کی تکلیف برداشت نہیں کرسکیں گے مولانا عبدالحمید صاحب نے عرض کیا نہیں حضرت! حضرت نے فرمایا میں آپ کو منع نہیں کرتا چلئے ہم دونوں خوش ہوگئے دیوبند سے بستی اور وہاں سے فیض آباد ہوتے ہوئے ٹانڈہ پہونچ گئے وہاں پہونچ کر مولانا عبدالحمید صاحب سخت بیمار ہوئے آخر مجبور ہو کر کچھ بستی واپس ہونے والے مہمانوں کے ساتھ انکو بستی واپس کرنا پڑا بیچارے ایسے بیمار ہوئے کہ آج تک صحت واپس نہ ہوئی اللہ تعالیٰ ان کو شفاء کاملہ اور اجر عظیم سے نوازے آمین ثم آمین حضرت مدنیؒ کو کشف ہوگیا تھا کہ یہ صاحب جائیں گے ضرور اس لئے اجازت مرحمت فرمائی اور یہ کہ وہاں بیمار ہوں گے تکلیف برداشت نہیں کرسکیں گے جس کی خبر دے دی مگر دیکھنے کے لئے چشم بینا چاہیئے ہم نہیں سمجھ سکے۔

(۷) حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کے گھر کی غذا دوا ہے (یا کھانا دوا ہے)

چونکہ میں زمانہ سے بیمار چل رہا تھا جب روانگی قریب ہوئی تو اپنے معالج حکیم شفیق صاحبؒ سے ملنے گیا احوال سنائے اور یہ کہ وہاں پرہیز نہیں ہوسکے گا نان اور بھینس کا گوشت کھانا پڑے گا حکیم صاحبؒ صرف حکیم نہیں بلکہ عالم باعمل مشائخ کے دلدادہ تھے حضرت مدنیؒ سے بے حد محبت تھی فرمانے لگے مولوی صاحب وہاں پرہیز کرنے کی ضرورت نہیں حضرت مدنیؒ کے گھر کی غذا دوا ہے (یا یوں فرمایا کہ کھانا دوا ہے) اور ایک دوا دی کہ اس کو افطاری کے وقت دودھ سے کھالیا کرنا الحمدللہ نان اور بھینس کے گوشت سے صحت برابر بہتر ہوتی گئی (حکیم صاحب کی دوا تو کئی مہینہ سے چل رہی تھی) اور عید تک بالکل تندرست ہوگیا یہ سرکار مدنیؒ کی کرامت تھی اجازت کے وقت ہی نور ایمانی سے دیکھ لیا تھا کہ ٹانڈہ کا قیام میری روحانیت اور جسمانیت دونوں کے لئے مفید تر ہے۔ فیا للبصیرۃ۔

ہونہار برواکے چکنے چکنے پات

اس واقعہ میں دوا کو دودھ سے کھانے کا تذکرہ ہے میں نے ٹانڈہ پہونچ کر اس کا انتظام کرنا چاہا مگر نہیں کرسکا حضرتؒ کے گھر میں دودھ آتا تھا میرے لئے دودھ ضروری تھا اور وہ کسی طرح نہیں مل سکا تو مجبور ہو کر میں نے اپنے کل کے رفیق درس اور آج کے اپنے شیخ پیر و مرشد حفظہ اللہ ونصرہ فی المواطن کلہا سے عرض کیا آپ اس کا انتظام کروادیں میں پیسے ادا کردوں گا فدائے ملت حضرت مولانا اسعد صاحب زادہ اللہ شرفاً ومجداً نے فرمایا کہ کب چاہیئے عرض کیا کہ افطار سے قبل فرمایا بہت اچھا اور عید تک بلاناغہ ایک پاؤ دودھ اپنے دست مبارک

سے بلا واسطہ پہونچاتے رہے جزاہ اللہ احسن الجزاء قیمت کا تو سوال ہی ناممکن تھا۔

لا یوجد الجود الا فی معادنہ والبخل حیث اردت اللہ موجود

ایک اور واقعہ | قیام دیوبند میں بیماری کی وجہ سے کچھ قرض ہو گیا مونڈ ڈیہا بیگ چھوڑ چکا تھا کہیں اور تعلقات نہیں تھے بڑی پریشانی ہوئی ادھر ضروریات مزید قرض چاہتی تھیں بے قراری میں پڑھا کرتا وہ ہمارا بھی کوئی ہمدرد ہے اس وقت دنیا میں۔۔۔ پکارا ہر طرف منہ سے کسی کے ہم نہیں نکلا،،

سوچتے سوچتے حضرت فدائے ملت زادہ اللہ شرفاً ومجداً پر نظر پڑی حاضر خدمت ہو کر عرض کیا کہ آپ کے شہر میں تعلقات ہیں۔ میرے پاس اونی شیروانی ہے اس کو گروی رکھوا کر کچھ قرض دلوا دیں مجھے سخت ضرورت ہے فرمایا کتنے پیسے کی ضرورت ہے عرض کیا تیس ۳۰ روپیہ فرمایا کل عصر کے بعد آنا میں شیروانی پہن کر عصر بعد پہونچ گیا سلام کا جواب دینے کے بعد تیس روپیہ نکال کر عطا فرمادیئے میں شیروانی نکالنے لگا تو فرمایا کیا کر رہے ہو اس کی ضرورت نہیں یہ آپ کے ہیں ان کو واپس نہیں کرنا ہے بعد میں معلوم ہوا کہ آپ کی جیب خرچ سے بہت سے طلبہ کا نفقہ مقرر تھا۔

فدائے ملت حفظہ اللہ ونصرہٗ کا ایک اور واقعہ | ۱۹۵۵ء میں حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی معیت میں زیارت حرمین سے مشرف ہوا تو میرے پاس زاد سفر قلیل تھا یہاں تک کہ مدینہ شریف کی حاضری کا ارادہ مذبذب تھا مدنیؒ کے کشف کے مطابق حاضری ہوئی اور حج سے قبل ہوئی دل میں قربان کی تمنا تھی زمانہ سخت گرمی کا تھا کہ شریف کی گرمی کی شہرت بھی سن رہے تھے قربانی کی طاقت نہیں تھی آخر سفر مکہ شریف سے کچھ پہلے ہی احرام باندھ کر تین روزے شروع کر دیئے احرام کی حالت میں فدائے ملت کی نظر میرے اوپر پڑی تو خفا ہوئے اور فرمایا یہ تم نے اپنے اوپر کیا ظلم کیا ہے پہلے تو میں خاموش رہا لیکن جب خاموشی سے خفگی اور بڑھ گئی تو قرآن کریم آیت فمن لم یجد فصیام ثلثۃ ایام فی الحج پڑھ دیا سن کر خاموش ہو گئے جب مجلس برخواست ہوئی تو فرمایا کہ عصر بعد قیام گاہ پر ملنا کچھ کام ہے جب حاضر ہوا تو خاص رہائش گاہ پر لے گئے اور ۳۰ ریال نکال کر عنایت فرمائے یہ فرماتے ہوئے کہ یہ قربانی کے لئے کافی ہوں گے۔ میں خاموش حیرت میں تھا کہ زبردستی میرے ہاتھ میں دیدیئے اور چلتا کر دیا جزاہ اللہ جزاء حسنا وحفظہ حفظا تاما ونصرہ نصراً عزیزاً آمین ثم آمین یا رب العالمین۔

(۸) دوا نہیں غذا سے شفا ہوتی تھی | تاؤلی ملازمت کے زمانہ میں بھی حکیم شفیق صاحبؒ ہی میرے معالج ہوتے تھے جب بیمار ہوا دیوبند چلا گیا۔

حکیم صاحبؒ سے دوائی اور آستانۂ مدنیؒ سے روٹی شوربا گے دن تندرست ہو کر واپس تاؤلی آ گیا ایک مرتبہ جو

شامت آئی تو طلبہ دار العلوم میں جا ٹھہرا جب حضرت مدنیؒ سے مصافحہ کیا تو حضرت نے آمد کا سبب دریافت فرمایا عرض کیا طبیعت خراب ہوگئی تھی دوا کے لئے آیا فرمایا دوا لے لی عرض کیا جی ہاں فرمایا پرہیز کیا ہے تاکہ اس کا انتظام کرادوں عرض کیا حضرت طلبہ میں ٹھہر گیا ہوں وہ انتظام کر رہے ہیں فرمایا وہاں کیوں ٹھہر گئے غریب خانہ تو موجود ہی تھا جب میں چپ رہا تو ارشاد فرمایا اچھا! اور دولت خانہ میں تشریف لے گئے چار روز دیوبند پڑا رہا دوا ہوتی رہی فائدہ نام کو نہیں ہوا ناچار ٹانڈہ واپس آگیا وہاں پہونچا تو انہی دواؤں سے فائدہ ہوگیا پس شفا میں تاخیر ہوئی معلوم ہوا کہ جلد شفا ہونا دوا نہیں غذا سے کی وجہ سے تھا جو حضرت شیخ کامل کی توجہ کا نتیجہ اور ان کی کرامت تھی۔ ذلك فضل الله یؤتیه من یشاء۔

(۹) ۱۹۵۵ء میں حضرتؒ نے رمضان المبارک ٹانڈہ میں گذارے مجھے بھی بخوشی اجازت مرحمت فرمائی لیکن میں جب ٹانڈہ پہونچا تو معلوم ہوا کہ حضرتؒ اس سال حج بیت اللہ کو تشریف لے جانے والے ہیں مجھے بھی شوق ہوا اور بڑھتا ہی گیا آخر ایک دن ہمت کر کے عریضہ پیش کیا میرے گاؤں کے ایک سیٹھ (چچا عبدالرزاق صاحب) ہیں جو مجھ سے محبت کرتے ہیں اجازت ہو تو ان سے صرف کرایہ کی رقم طلب کر لوں تاکہ آپ کے ساتھ زیارت حرمین سے مشرف ہو جاؤں حضرتؒ نے عریضہ ملاحظہ فرمانے کے بعد فرمایا کہ نہیں اصل ہے یا مکان میں نے عرض کیا حضرت مکین۔ فرمایا وہ تو یہاں بھی موجود ہے اس کے لئے سوال کیوں کرتے ہو میں خاموش ہوگیا حضرتؒ بھی خاموش ہوگئے اس وقت شاید حضرت کو کشف ہوا کہ اس سال میری قسمت میں حج ہے اور فرمایا تشریف لے چلنے میں روکتا نہیں بس کیا تھا وہاں سے بستی پھرتا دلی ہوتا ہوا بمبئی پہونچ گیا۔ الحمد للہ زیارت حرمین سے مشرف ہوا۔

(۱۰) المؤمن ینظر بنور القلب

بقصد حج بمبئی جب پہونچا تو معلوم ہوا کہ میرا جہاز اسلامی ہے اور حضرتؒ کا محمدی اس طرح طریق سفر جدا جدا ہو جائیگا کوشش شروع کی خوب دوڑ دھوپ کی لیکن نتیجہ صفر ایک دن چچا سیٹھ عبدالرزاق صاحب بھی صبح سے شام تک لگے رہے حاجی تجمل حسین تمنا وغیرہ بڑے لوگوں سے ملے مگر کامیاب نہ ہوئے رات کو میں نے عرض کیا فجر کی نماز حضرت کے ساتھ پڑھنی ہے صبح حضرت کا جہاز روانہ ہوگا ہم صبح قیام گاہ پر پہونچ گئے غالباً وہ صحن مسافر خانہ تھا میں نے ایک ڈھائی سطری ایک عریضہ لکھ رکھا تھا فجر کی نماز کے بعد پیش کیا حضرت نے اس کو بڑی دیر تک ملاحظہ فرمایا اس میں صرف یہ تحریر تھا کہ میری تمنا تھی کہ آپ کے ساتھ صلوٰۃ وسلام پیش کرتا مگر ایسا نہیں ہوسکے گا میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا اب تمنا یہ ہے کہ آپ اپنی زبان مبارک سے بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں صلوٰۃ وسلام پیش فرمادیں بڑی دیر بعد حضرتؒ نے سر مبارک اوپر اٹھایا اور فرمایا کیوں ادھر حضرتؒ نے کیوں فرمایا ادھر آہستہ سے ایک صاحب نے مجھے خبر دی کہ تیرا انتظام اسی جہاز سے ہوگیا میں نے حضرتؒ سے عرض کیا حضرت یہ کہتے ہیں

تیرا انتظام ہوگیا حضرت نے فرمایا آپ تو کہتے تھے میں نہیں جا سکتا جائیے جلدی تیاری کیجئے حضرتؒ کا یوں فرمانا بڑے عجیب انداز کا تھا جس کی کیفیت اب بھی قلب میں محفوظ ہے حضرتؒ کو کشف ہوگیا کہ میں اسی جہاز سے سفر کروں گا اسی لئے فرمایا کیوں

(۱۱) صورت مبارک دیکھتے ہی دوران سر ختم جہاز پر سوار ہوئے جوں توں کر کے عشاء تک جاگتا رہا اس کے بعد ساری رات سارے دن ہوش ہی نہ آیا عصر کے وقت ہوش آیا اٹھے نمازیں قضا کیں ابھی کھانے پینے کی نوبت نہ آئی تھی کہ سر تکیہ سے جا لگا اور اگلے دن ظہر کے وقت ہوش آیا نمازیں قضا کیں اور ہمت کر کے اوپر پہونچے عصر کا وقت ہوچکا تھا حضرت کی زیارت ہوئی تھوڑی دیر خدمت اقدس میں بیٹھنے کا موقع ملا اس کے بعد نہ چکر آیا نہ پریشانی ہوئی بے ہوشی تو دور کی بات ہے پھر تو برابر خدمت اقدس میں حاضری ہوتی رہی حضرت کی صحبت کی برکت سے جہاز کا سفر بڑا راحت کا سفر بن گیا فللّٰہ الحمد۔

(۱۲) یہ جدائی عارضی ہے آپ جلد آملیں گے جب جہاز جدہ پہونچا تو سید حبیب صاحب حضرتؒ کے سگے بھتیجے سفیر ہند اور کچھ سعودی معززین حضرتؒ کے استقبال کے لئے تشریف لائے وہ لوگ اگن بوٹ سے سمندر کے اندر ہی آگئے تھے جب ان کے آنے کی خبر گرم ہوئی تو لوگ جو حضرتؒ کے پاس تھے انھیں دیکھنے چلے گئے دل میں عجیب بے چینی تھی کہ پیسے کم ہونے کی وجہ سے میں مدینہ نہیں جا سکتا ہوں اور حضرتؒ چلے جائیں گے جب لوگ ہٹ گئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا حضرت کرسی پر تشریف فرما تھے مڑ کر دیکھا تو فرمایا کیوں رو رہے ہو عرض کیا حضرت بڑی مشکل سے صحبت نصیب ہوئی تھی اب پھر جدائی ہوجائے گی آپ مدینہ شریف تشریف لے جائیں گے میں نہیں جا سکوں گا حضرتؒ تھوڑی دیر خاموش رہے اور میں سسکتا رہا پھر فرمایا نہیں یہ جدائی عارضی ہے آپ جلد آملیں گے اتنے میں لوگ آگئے جہاز گودی پر لگا حضرت مدینہ شریف تشریف لے گئے جہاز کے سبھی لوگ مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ تشریف لے گئے میں اکیلا جدہ مسافر خانہ میں پڑا رہا طوفان غم میں غوطے لگا رہا تھا کئی روز بعد جہانگیری جہاز آیا اور اس کے مسافروں کے ساتھ حضرتؒ کے کشف کے مطابق مدینہ شریف پہونچ گیا اور حضرتؒ کی معیت میں صلوٰۃ وسلام پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوتی رہی فللّٰہ الحمد والمنۃ۔

(۱۳) آپ ہندوستان چلئے آپ کو وہاں کام کرنا ہے طائف اور مکہ مکرمہ میں میرے استاذ حضرت مولانا عبدالوہابؒ کا خاندان آباد ہے اسی سفر حج میں میرا ارادہ ان کے پاس قیام کا ہوگیا میرے رفیق سفر اور دارالعلوم حسینیہ کے روح رواں ممبر و بانی حضرت حاجی نظام الدین صاحبؒ نے مخالفت کی آخر فیصلہ حضرت کے

اد پر چھوڑ دیا گیا اور دونوں ایک دن حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے ہر ایک کی بات سننے کے بعد حضرتؒ نے مجھ کو مخاطب کرکے فرمایا مجھ کو نہیں دیکھتے میرا یہاں مکان ہے (حضرت کا آبائی مکان محفوظ تھا جس کو بنانے میں حضرتؒ نے بھی بڑی محنت کی تھی) خاندان ہے۔ بھائی ہیں رہ کتے بھی ہیں پھر بھی جا رہا ہوں۔ آپ ہندوستان چلئے آپ کو وہاں کام کرنا ہے میں نے بسر وچشم قبول کیا اور واپس تاؤلی آگیا چند ہی دنوں کے بعد اس پارٹی بندی کا زہر جو میرے بعد پیدا ہوچکی تھی شدت کے ساتھ نمودار ہوا اس نے مدرسہ کی جڑ کو متزلزل کر دیا اسی سلسلہ میں دو رؤیائے صالحہ عنقریب تحریر کروں گا میرا وجود اس وقت مدرسہ کیلئے کیمیا ثابت ہوا مدرسہ دلدل سے نکلا اور آگے بڑھا اور اب بام عروج پر ہے ۵ سے بڑھ کر ۲۵۰ امدادی طلبہ داخل ہونے لگے تعلیم کافیہ سے مشکوٰۃ المصابیح اور بیضاوی شریف تک مدرسین ۴ سے ۲۲ تک اور درس گاہ وحجرات ۱۱ سے ۴۰ تک پہونچ گئے فللہ الحمد والمنہ اسی کے ساتھ زندگی کے ایام نہایت ہی معزز طریق پر گذر رے حالانکہ مفسدین وحاسدین نے پورا زور لگایا اور لایضرونك الا اذا کا منظر خوب سامنے آیا مگر جس کو قدرت خداوندی آگے بڑھائے اس کو کون پیچھے کھینچ سکتا ہے میرے ضرر کی ہر تدبیر میری رفعت کا سبب بنی اور مدرسہ پر بھی چار چاند لگتے گئے اللھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت مالك الملك توتی الملك من تشاء لك الحمد والشکر والنعمۃ

اور سیدالطائفہ شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کو پہلی ہی زندگی کشف ہوچکا تھا فرمایا آپ ہندوستان چلئے آپ کو وہاں کام کرنا ہے

(۱۴) رؤیائے صالحہ جس کی تعبیر واقع ہوئی

ابھی تاؤلی کا مدرسہ چھوٹا سا پودا تھا گیارہ چھوٹے کمرہ مغرب میں اور ۵ درسگاہیں جنوب میں بنی ہوئی تھیں شمال ومشرق میں تقریباً ایک گز اونچی چہار دیواری تھی مشرقی دروازہ نہیں تھا جگہ کھلی ہوئی تھی اسی دور میں ایک رات تاؤلی ہی میں خواب میں دیکھا کہ حضرتؒ سفید لباس سفید عمامہ لمبے لمبے موزے پہنے ہوئے تھے دروازہ کی شمالی جانب کرسی پر تشریف فرما ہیں صبح اشراق کا وقت ہے اور مغربی جانب کمروں کے سامنے جہاں اب برآمدہ ہے گنا بویا ہوا ہے پود تقریباً ایک ہاتھ لمبی ہوچکی ہے دیسی کھاد بکھری ہوئی ہے پانی آرہا ہے اور میں پھاوڑا لے کر پانی دے رہا ہوں اسی حالت میں دیکھا کہ گاؤں کی طرف سے کچھ چودھری لوگ عمامہ باندھے ہوئے آرہے ہیں اور آکر حضرت کے پاس کھڑے ہوگئے میں نے سوچا چل دیکھ یہ لوگ کیوں

آئے ہیں جب میں پہونچا تو یہ لوگ اپنی بات ختم کرچکے تھے حضرتؒ ان سے فرمارہے تھے میرے پاس وقت کہاں ہے دیکھتے نہیں میں یہاں باغبانی کررہا ہوں وہ خاموش سنتے رہے اور میری آنکھ کھل گئی میں نے یہ خواب حضرتؒ سے عرض کیا تو صرف یہ فرمایا کہ اچھا خواب ہے حضرتؒ کی توجہ تام دعا اور کوشش ہی کا نتیجہ ہے کہ مسلم جاٹ مہذب اور اہل علم بن گئے اور مدرسہ طوفانِ حوادث میں کشتیٔ نوح کی طرح محفوظ ہی نہیں بلکہ ترقی ہی کرتا رہا اور مفاد پرست حقیر فانی نفع کے لئے ناکردنی کرتے رہے فللّٰہ الحمد والیہ المشتکیٰ۔

(۱۵) ایک اور خواب ایک رات دیکھا کہ تاؤلی سڑک والی جامع مسجد میں اشراق کے بعد جب سبھی لوگ جاچکے تھے حضرت تشریف لائے حضرتؒ چمڑے کے موزے پہنے ہوئے تھے جو اوپر تک کیچڑ میں سن رہے تھے میں دیکھتے ہی بے تاب و پریشان ہوگیا جلدی سے سقاوہ سے پانی بھر کر لایا حضرتؒ نالی کے کنارے کھڑے ہوگئے میں پاؤں مبارک دھو رہا تھا اور افسوس کررہا تھا اتنے میں میری نظر شمالی جانب پڑی تو اس وقت کے مہتمم صاحب کو دیکھا کہ کھڑے ہنس رہے ہیں اب تو پریشانی غصہ میں بدل گئی جل بھن گیا مگر حضرت کے خوف اور حلم اور اپنی مشغولی کی وجہ سے اس وقت ان کو کچھ نہیں کہہ سکا اور آنکھ کھل گئی جب یہ خواب حضرتؒ کی خدمت میں عرض کیا تو سن کر خاموش رہے اور کچھ نہیں فرمایا۔ چند دنوں بعد ہی وہ قیامت خیز فساد مدرسہ میں ہوا جو اللہ کے فضل اور شیخ کی دعا سے ختم ہوا مگر دنیں ہوا اور اپنا اثر چھوڑ گیا جو برسوں باقی رہا اس فساد کے موقع پر حضرتؒ بار بار تاؤلی آئے حضرت مولانا استاذنا شیخ الادب و الفقہ اعزاز علی صاحبؒ اور مولانا و استاذنا فخر الحسن صاحبؒ کو بار بار بھیجتے رہے بہت پریشان ہوئے تھے یہ عاجز بھی بہت پریشان ہوا تھا فجزاہم اللہ خیر الجزا بفضلہ ومنہ۔

(۱۶) دعاء سے درد ختم دار العلوم دیوبند کے قیام ثانی میں چند دنوں بعد ہی طبیعت خراب ہوگئی تھی جس کا تذکرہ بار بار آیا ہے ایک دن اچانک کلیجہ پہ درد شروع ہوا اور بڑھتا ہی گیا کمرہ میں اِدھر اُدھر لوٹنے پوٹنے لگا خوب زور زور سے چلا رہا تھا اہل کمرہ اور قریب والے جمع تھے مگر کسی کے بس میں گیا ہے کوئی حکیم محمد عمر صاحب مدظلہٗ طبیب مدرسہ سے گولیاں لایا اور کھلایا کوئی بھاگا ہوا طبیب خاص حکیم شفیق صاحب کے پاس گیا۔ مجھے یاد آیا کہ حضرتؒ سفر سے واپس تشریف لائے ہیں اور یہ وقت ان کے باہر تشریف رکھنے کا ہے ایک ساتھی کو بھیجا کہ حضرت کو خبر کردو میری آنکھوں کے سامنے موت نظر آرہی تھی جب حضرت کو خبر دی گئی تو پانی

طلب فرمایا اور کچھ پڑھ کر دم کر دیا وہ پانی مجھ کو پلایا گیا میں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر پی لیا اللہ اکبر علوًا کبیرا ٹھنڈا پانی درد کو ٹھنڈا کرتا چلا گیا پیٹ تک پانی پہونچتے پہونچتے بالکل ہی درد ختم ہو گیا مجھے بستر پر ڈال دیا گیا فوراً نیند آگئی وکان ذلک بفضل اللہ

دعاء سے درد کا فور

اس زمانہ میں پسلیوں میں ہر وقت درد رہتا تھا ایک دن درد نے شدت اختیار کی ظہر بعد کا وقت تھا خدمت میں پہونچ گیا اور درد کی شکایت کی حکم ہوا جہاں درد ہوا پکڑ لو میں نے ہاتھ رکھ دیا حضرت نے کچھ پڑھنے کے بعد چھوڑنے کو فرمایا اور حالت دریافت فرمائی عرض کیا درد ہے فرمایا پھر پکڑ لو میں نے پکڑ لیا کچھ پڑھنے کے بعد چھوڑنے کا حکم دے کر حالت معلوم کی عرض کیا اب بہت کم ہے فرمایا اچھا اور پکڑ لو پکڑ لیا اور غور سے سننے لگا کہ کیا پڑھ رہے ہیں کیونکہ تھوڑی تھوڑی آواز آ رہی تھی معلوم ہوا کہ سورہ فاتحہ پڑھ رہے ہیں پڑھنے کے بعد فرمایا کہ چھوڑ دو میں نے چھوڑ دیا پھر فرمایا اب کیا حال ہے عرض کیا کہ حضرت اب ٹھیک ہے فرمایا اچھا تشریف رکھئے وہ وقت عام چائے کا تھا جس میں مدنی پودینہ اور زعفران کی چائے سبھی حاضرین کو پیش کی جاتی تھی کم بانت کرامتہ ولکن لم یشتھر بھذہ الصفۃ لعلہ لانھماکہ فی السیاسیات۔

(۱۸) ایک نظر میں کیمیا بنا دینا

حضرت مولانا عبد الوہاب صاحب رح بستوی کا بچہ عزیزم ظفر احمد سلمہ رام پور جماعت اسلامی کی درسگاہ میں تعلیم حاصل کرتا تھا وہاں سے بھاگ کر گھر آگیا مولانا نے اس کو مولانا جماعت اللہ صاحب سفیر دار العلوم کے ساتھ واپس رام پور بھیج دیا وہ رام پور جانا نہیں چاہتا تھا میرے پاس آنا چاہتا تھا مولانا جماعت صاحب اس کو دیوبند لائے اتفاق سے میں دیوبند موجود تھا اس کو لے کر حضرت مدنی رح کی خدمت میں پہونچا اور عرض کیا کہ یہ وہاں جماعت چہارم میں پڑھتا تھا اب میں کیا پڑھاؤں حضرت رح نے فرمایا کہ حفظ کراؤ میں نے قاری انوار الحق کے سپرد کر دیا قاری صاحب حفظ کے ماہر تھے مگر چھ مہینہ میں پارۂ عم کا نصف آخر بھی حفظ نہیں کر سکا بچہ بالکل ابتدائی نہیں تھا میں بہت گھبرایا کہ مولانا عبد الوہاب صاحب رح مجھ پر خفا ہوں گے کہ میرے بچہ کی زندگی خراب کر دی حسن اتفاق سے حضرت مدنی کا گذر بلا طلب دار العلوم حسینیہ پر ہوا حضرت اس مدرسہ سے اس کے مخصوص حالات کے پیش نظر ایسا کرتے تھے میں نے ظفر احمد سلمہ کو حضرت رح کے سامنے کھڑا کر دیا اور سب حالات ذکر کئے حضرت نے دو تین مرتبہ نیچے سے اوپر تک دیکھا اور کچھ نہیں فرمایا دم بھی نہیں کیا دوسری طرف مشغول ہو گئے اس کے بعد یہ بچہ بڑی آسانی سے

ایک رکوع روز حفظ کرنے لگا مگر استاذ پورا پڑھنا صرف ایک پارہ میں شروع کر نے تھے اس طرح ڈھائی سال میں قرآن پورا ہوا سالانہ امتحان قاری نعمان صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند نے ناشتہ کے بعد سے دوپہر تک لیا کم از کم ہر پارہ میں تین سوال کئے امتحان کے بعد فرمایا کہ ایسا بچہ آج تک نہیں دیکھا ایک بھی سوال جس کا جواب نہ دیا ہو پہلی محراب مدرسہ کے نائب صدر مدرس مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب مدظلہ نے سنی عید بعد فرمایا کہ اَلَمْ تَرَ کَیْفَ پارہ عم میں متشابہ لگا اور پورے قرآن میں لقمہ نہیں لیا۔ فللّٰہ الحمد والمنۃ نفعہ کما مۂ واضحۃ لسیدنا ومولانا سبط النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(۱۹) مسجد کدھر بنے گی

دارالعلوم حسینیہ تاؤلی کی خشت اوّل رکھنے کے بعد جب حضرت بنیاد سے باہر آئے تو اس کونے کی طرف جہاں اب عالیشان مسجد کھڑی ہے رخ انور کرکے فرمایا کہ مسجد کدھر بنے گی تاؤلی والوں نے عرض کیا حضرت مسجد کی کیا ضرورت ہے یہ چند قدم پر جامع مسجد موجود ہے حضرتؒ نے پھر کچھ نہیں فرمایا بات ختم سی ہوگئی لیکن جب دارالعلوم حسینیہ کا ننھا سا پودا اتنا درخت بنا تو مسجد کی ضرورت پیدا ہوئی جب بنیاد کی نوبت آئی تو اختلاف رائے ہوا اور انجام کار اسی طرف جس طرف منہ کرکے حضرت مدنیؒ نے مسجد کی باتیں کی تھیں پرانی عیدگاہ پر اتفاق رائے ہوا جب بنیاد پڑ چکی تو حاجی نیاز احمد صاحب ممبر مدرسہ نے یہ واقعہ سنایا یہ بھی بتلایا کہ ہم لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ بڑے میاں کیا فرما رہے ہیں کہ ہم مکتب کی بنیاد ڈال رہے ہیں جس سے چند قدم پر مسجد ہے اور بڑے میاں کہہ رہے ہیں کہ مسجد کدھر بنے گی یہ کشف تھا جو مخفی تھا پھر واقعات نے اس کی تصدیق کی پھر بھی نا اہل نابینا ہی رہے یھدی من یشاء ویضل من یشاء بیدہ الخیر۔

(۲۰) حضرت کو کشف ہوگیا تھا کہ میں تاؤلی والوں کی خدمت کیلئے ہوں

حضرت کے حکم پر جب میں مونڈڈیہا بیگ ضلع بستی کو چھوڑ کر دیوبند آیا تو حضرت شیخ الادب والفقہ استاذنا ومولانا اعزاز علی صاحبؒ نے اٹارسی اور پھر رڑکی بھیجنا چاہا مگر حضرتؒ نے نہیں جانے دیا میں نے چاہا کہ دینی کتب جو اردو میں ہیں ہندی میں منتقل کروں تاکہ صرف ہندی جاننے والے بچے دینیات سے واقف ہوسکیں حضرتؒ نے منظور نہیں فرمایا لیکن جب تاؤلی کے لوگ پہونچے تو مولانا عبدالرحیم مظفرنگری صدر مدرسہ کے نام گرامی نامہ بتعلم شیخ الادبؒ تحریر فرماکر اس عاجز کو روانہ کردیا الحمدللہ اس قوم کی خدمت کا

اچھا موقع ملا بتوفیق اللہ ہر نوع کی خدمت کرنے میں کامیاب ہوا۔

(۲۱) دو واقعے بڑوں کے لئے اسوۂ حسنہ | تاؤلی مدرسہ کے ایک دور فساد میں مدرس کو نا قابل کہہ کر نکال دیا جاتا تھا میں بھی اسی دور میں مہتمم اور صدر مدرس بنا کر بھیجا گیا مگر بفضل اللہ یہ حربہ میرے اوپر کارگر نہ ہو سکا تو پھر صدر مدرسہ مولانا عبدالرحیم صاحب سادے بزرگ کو پھانس لیا ان کی مدد سے نکالنا چاہا وہ جب دیوبند میری شکایتوں کا پلندہ لے کر گئے تو حضرت مدنیؒ نے سن کر فرمایا کہ آپ امتحان لیں وہ آگئے اور امتحان لیا اور دیوبند جا کر میری بڑی تعریف کی اور پھر ساری زندگی میرے خلاف کسی کی شکایت نہ سنی شکایت کرنے والوں کو بھی خوب ڈانٹا پھٹکارا حضرت مدنیؒ نے اتنے بڑے عالم کی شکایت پر توجہ نہ دی بلکہ تحقیق کا حکم دیا بحمد اللہ شکایت بے جا نکلی فاعتبروا یا اولی الابصار واعملوا علی سنتہ فانہا مقتبس من القرآن الکریم۔

(۲۲) دوسرا واقعہ | ایک مہتمم صاحب نے بعض دیوریاوی طلبہ کے بارے میں (جو غلطی سے ان کے مدرسہ میں داخل ہو گئے تھے) جو میری طلب پر ان کے مدرسہ سے تاؤلی واپس کر دیئے گئے اور بچوں کے سرپرست نے ان کی ایک نہ سنی حضرت مدنیؒ سے شکایت کی جس کی خبر مجھ کو قاری اصغر علی نے بھیج مجھ کو بھی اور فرمایا کہ نہ حضرت تجھ سے خفا ہے نہ بدظن اور میں بھی نہ خفا نہ بدظن لیکن تم کس دنیا میں رہتے ہو سنبھل کر رہنا چاہیئے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ حضرتؒ نے ایک طرف کی سن کر رائے قائم نہیں فرمائی۔ میں نے کمال اختصار کے ساتھ دونوں واقعے اس لئے نقل کر دیئے کہ بڑوں کے پاس چاپلوسی خوشامدی، مطلب برآری کرنے والے خود غرض غلط سلط خبریں پہونچاتے رہتے ہیں تاکہ بزعم خود مقرب بن جائیں کچھ فائدہ حاصل کر لیں بڑوں کا فرض ہے کہ بلا تحقیق کسی کی چغلی کی وجہ سے کسی کے بارے میں بدظن نہ ہوں تحقیق کی ضرورت ہو تو تحقیق فرمائیں ورنہ خالی الذھن ضرور رہیں اور قرآن عظیم یاایہا الذین آمنوا اذا جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا۔الآیۃ پر نظر اور رول کامل کا اسوہ حسنہ سامنے رکھیں دونوں عالم کا نفع ہوگا۔ اگرچہ میرا یہ کلام چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ مگر اضطراراً لکھا ہی گیا کہ زندگی میں بار بار شکار ہوا ہوں اور اب بھی غیر محفوظ ہوں اللھم انی اعوذ بک من شر حاسد اذا حسد۔

(۲۳) ختامہ مسک | حضرتؒ کو جہاں دینی مدارس اور دینی علوم سے انتہائی محبت تھی جس کے شاہد بے شمار واقعات اور لا تعد

و لاتحصی اسفار ہیں جو دینی مدارس کے لئے ہوتے تھے وہیں اس رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب وابن کو کمزوروں ضعفاؤ کی دلداری ازحد مرغوب تھی اس حقیر و عاجز کے نام سفر آخرت سے صرف ۲ دن پہلے ایک لفافہ تحریر فرمایا جس کو اپنی حماقت سے بلا عکس لئے اصل ہی مولانا نجم الدین اصلاحی مدظلہ العالی کو بھیج دیا نہیں معلوم وہ معرض شہود پر آئے گا یا نہیں اس گرامی نامہ میں اہم ترین پہلو کمزوروں کا پاس اور ان کی دلداری تھی تاؤلی جواب مدرسہ والی تاؤلی ہے کبھی چوروں والی تاؤلی تھی لوگ بے حد جاہل اور لڑاکا تھے بات بات پر لڑتے رہتے تھے جہالت کے نتیجہ میں علماء صلحاء کا ادب واحترام تو بڑی بات تھی بد سلوکی عام اور معمولی بات تھی میں جب گھبرا جاتا دیوبند حاضر ہوتا حضرت کے کلماتِ طیبات نئی روح اور نئی زندگی بخش دیتے تھے حضرتؒ اکثر میرے سینہ پر دم بھی کرتے تھے ایک مرتبہ تسلی دیتے ہوئے فرمایا آپ کو معلوم نہیں میرے ساتھ کیا کیا گیا (یا کیا جا رہا ہے) عرض کیا حضرت معلوم ہے فرمایا تو صبر کیوں نہیں کرتے عرض کیا حضرت کریں گے الحمدللہ وعدہ پورا ہوا صبر کیا اور خوب کیا ہوشیار لوگوں نے میرے صبر سے خوب خوب فائدہ اٹھایا (بزعم خود) ایک مرتبہ تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

ما نجا اللہ و رسولہ معا   من لسان الوری فکیف انا

قیل ان الالہ ذو ولد   قیل ان الرسول قد کہنا

ایک دن موسم سرما میں بارش ہوتے ہوئے دیوبند پہونچا تو دسترخوان پر بیٹھے بیٹھے خوش طبعی فرمائی

برکھا میں کہو نہیں گھر سے نکلے   تمہیں اکیلی مدیس جو یا ،،

اللھم ارفع درجتہ فی اعلی علیین واجعلنالہ صدقۃ جاریۃ لاتنقطع ابدا و انصارنی و ذریتہ و انصارہٗ ومن مشی مشیہٗ عزیزا واجعلنامن من عبادک المخلصین المقبولین عندک یا ارحم الراحمین وصل وسلم و بارک علی سیدنا و مولانا محمد و آلہ وصحبہ کما تحب وترضی عدد ماتحب وترضی

منطق و فلسفہ ایک تحقیقی و علمی جائزہ

مولانا محمد اطہر حسین بسنوی فاضل دیوبند

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی جمیع الانبیاء والمرسلین خصوصاً علی سیدنا و مولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔ اما بعد

اندلس کا نامور فلسفی ابن رشد متوفی ۵۹۵ھ اپنی کتاب فصل المقال بین الحکمۃ والشریعۃ من الاتصال میں فلاسفہ کی بے دینی کا جواب دیتے ہوئے ایک جگہ لکھتا ہے۔

"اصل یہ ہے کہ بے دینی فلسفہ کا لازمی نتیجہ نہیں، کیا صرف فلاسفہ ہی بے دین ہوتے ہیں؟ فقہا کبھی گمراہ نہیں ہوتے؟ حالانکہ تجربہ بتاتا ہے کہ فلسفہ سے زیادہ فقہ سے بے دینی کی اشاعت ہوتی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ فقہ کی بے دینی پر جبہ و عمامہ پردہ ڈالے رہتے ہیں، اس کی بداخلاقیاں ہمیشہ مذہبی رنگ میں ظاہر ہوتی ہیں اس لئے عام لوگوں کی اس پر نظر نہیں پڑتی۔ (ابن رشد ص ۱۶۶)

ابن رشد کون تھا؟ اس کے اخلاق و عادات اور افکار و خیالات کیا تھے؟ اس کو آگے بیان کیا جائے گا اور انشاء اللہ اس پر تفصیل کلام کیا جائے گا، سردست یہ کہنا ہے کہ یہی ہے وہ زہر آلود بیان جس نے اس ہیچمدان کو قلم اٹھانے پر مجبور کیا اور یہ مقالہ معرض وجود میں آیا فلسفی ابن رشد نے اپنے تیروں کی بوچھار علم فقہ اور فقہاء کرام رحمہم اللہ رحمۃ واسعہ پر کر دی اور انھیں گمراہ، بے دین اور بد اخلاق کہہ ڈالا حالانکہ انہی کے ذریعہ دین ہم تک پہونچا اور ہم نے انھی کی بدولت خدا اور رسول اور ان کے احکام کو پہچانا۔ نیز آج کل منطق و فلسفہ کے بڑھتے سیلاب کو دیکھ کر بار بار دل میں تقاضا بھی ہوتا تھا کہ اگر کسی کتاب کے ذریعہ اصل حقیقت کی نقاب کشائی کر دی جائے تو بہت بہتر ہوگا تاکہ لوگ ان کے جرائیم سے محفوظ ہو جائیں اور ان کا دامن ان علوم سے داغدار نہ ہونے پائے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو

قبول فرمائے اور پڑھنے والوں کو زیادہ سے زیادہ نفع پہونچائے۔ آمین۔

اس کتاب میں تاریخی حقائق اور اکابر کے ارشادات کی روشنی میں منطق و فلسفہ کی تاریخ تدوین و ترتیب، یونانی تہذیب کا تحقیقی جائزہ رسائل اخوان الصفا کی تحلیل و تجزیہ، اس سے برآمد ہونے والے آثار و نتائج، علماء حق کا رد عمل، اکابر امت کی آراء اور شعرائے اسلام کے خیالات — پیش کئے گئے ہیں جن کے ضمن میں اور بہت سے عنوانات آگئے ہیں جو انشاء اللہ سامان عبرت فراہم کریں گے اور ان علوم سے اشتغال رکھنے والوں کے لئے تازیانۂ عبرت ثابت ہوں گے۔

اصل بحث شروع کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ منطق و فلسفہ کے لغوی و اصطلاحی معنی بیان کر دیئے جائیں تاکہ ناظرین کو کتاب کے مقاصد سمجھنے میں سہولت ہو۔

فلسفہ در اصل ایک کلی مفہوم ہے جس کے تحت مختلف جزئیات ہوتے ہیں ارثماطیقی، ریاضی، ہندسہ، حساب، ہیئت، موسیقی، طبعیات، الٰہیات، عنصریات، منطق۔ ان سب علوم کے مجموعہ کا نام فلسفہ ہے، اس لئے اور اجزاء کی طرح منطق بھی فلسفہ کا جزء ہے، لیکن عرفاً دونوں کو جدا جدا فن تصور کیا جاتا ہے اس لئے ہم بھی دونوں کی تعریف الگ الگ ذکر کرتے ہیں، کتاب کے نام میں منطق مقدم ہے اس لئے اس کی تعریف بھی مقدم بیان کی جاتی ہے۔

منطق کا لغوی و اصطلاحی معنی

منطق نُطق سے مشتق ہے نَطَقَ يَنْطِقُ نُطْقًا و مَنْطِقًا (ضرب)، بولنا، نطق کا استعمال نطق ظاہری یعنی گفتگو وغیرہ کے لئے بھی ہوتا ہے اور نطق باطنی یعنی فہم و ادراک کے لئے بھی مَنْطِقٌ بر وزن مَضْرِبٌ اسم ظرف ہے بمعنی جائے نطق، یا مصدر میمی ہے بمعنی لہجہ گویائی، خوش کلامی، گفتگو، اور کبھی مَنْطِقٌ کا لفظ انسان کے علاوہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے جیسے قرآن کریم میں حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہما الصلوٰۃ والسلام کا قول مذکور ہے!

عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ (نمل) اور ہم کو پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے۔

منطقیوں کے نزدیک منطق اس قانونی آلہ کو کہا جاتا ہے جس کی رعایت ذہن کو غور و فکر کی غلطی سے بچاتی ہے۔ (ظفر المحصلین باحوال المصنفین صفحہ ۳۱)

فلسفہ کا لغوی و اصطلاحی معنیٰ

فلسفہ کے لغوی معنی حکمت و دانائی کے ہیں، اہل عرب کہا کرتے ہیں تَفَلْسَفَ الرَّجُلُ بمعنی

ے ہونا، مسائل علمیہ میں بحث کرنا، حذاقت کا دعوی کرنا، فیلسوف بمعنی فلسفی اس کی
ملا سفہ آتی ہے، غیاث میں لکھا ہے کہ فلسفہ مصدر جعلی ہے بمعنی دانشمند ہونا
نی لفظ فیلسوف سے ماخوذ ہے جو اصل میں فیلا بمعنی دوست اور سوف بمعنی علم سے مرکب
فلسفہ اصطلاحاً اس علم کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ موجودات کے نفس الامر احوال حسب طاقت
مریہ معلوم ہوں، بالفاظ دیگر موجودات کے احوال واقعیہ کو بقدر طاقت انسانی جاننے کا
علمت و فلسفہ ہے (ملفوظ المحصلین باحوال المصنفین ص ۳۳۳)

مولانا سید مناظر احسن گیلانی ؒ نے سوانح قاسمی میں نصاب تعلیم کے ذکر کے موقع پر فلسفہ
ی اصلی اور حقیقی تعریف بیان کی ہے جسے ذکر کرنے کو بے ساختہ جی چاہتا ہے مولانا لکھتے ہیں۔

"کتابوں میں فلسفہ کی فنی تعریف کچھ بھی کی جاتی ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ کائنات
کے متعلق انسانی فطرت میں جو بنیادی سوالات پیدا ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ کائنات
جس میں انسان شریک ہے کیا ہے؟ اس کی ابتدا کیا ہے؟ اس کی انتہا کیا
ہے؟ اس کا مدعا کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ، ان سوالوں کے حل کی قدرتی راہ وحی
ونبوت سے بے نیازی اختیار کر کے جانے بغیر اپنے اپنے زمانہ کے چرب زبانوں
نے خود تراشیدہ وسوسوں کے جس مجموعہ کو فرض کر کے مشہور کر دیا کہ
یہی ان بنیادی سوالوں کا صحیح جواب ہے اسی کا نام فلسفہ رکھ دیا گیا ہے
چونکہ ان جوابوں کا تعلق حقائق و واقعات سے نہیں ہوتا بلکہ وہ مفروضہ
اوہام سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتے اسی لئے مقبول ہونے کے بعد تھوڑے
تھوڑے دنوں پر ہر زمانہ کا فلسفہ مسترد ہوتا رہا ہے، پہلے بھی یہی ہوتا
رہا، اب بھی یہی ہو رہا ہے، آئندہ بھی یہی ہوتا رہے گا۔"

(سوانح قاسمی جلد دوم ص ۲۹۷)

اسی لئے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں کسی شاعر کا نہایت
خوب شعر نقل کیا ہے ؎

فلسفہ چوں اکثرش باشد سفہ پس کلّ آں
ہم سفہ باشد کہ حکم کلّ حکم اکثر است

یعنی فلسفہ کے لفظ کا بڑا حصہ "سفہ" یعنی حماقت ہے اس لئے وہ کل کا کل حماقت ہے کیونکہ

اکثر کا حکم کل کا حکم ہے۔ (مکتوب ۲۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی)

اور لسان العصر اکبر الہ آبادی مرحوم نے تو صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے ؎

کچھ نہیں کار فلک حادثہ پاشی کے سوا
فلسفہ کچھ نہیں الفاظ تراشی کے سوا

آئندہ سطروں میں ہم یونانیوں کی تہذیب اور ان کے تمدن پر کلام کرنا چاہتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ کن معاشرتوں اور تہذیبوں نے منطق و فلسفہ جیسے علوم کو جنم دیا اور ان کے پیچھے کون سا تہذیب و تمدن کام کر رہا تھا انشاء اللہ ہم تاریخی حقائق کی روشنی میں کلام کریں گے

باب اول

یونانی تہذیب

یونانیوں کے اخلاق وعادات اور افکار وخیالات کی تحلیل تجزیہ سے ان اجزاء کو نظرانداز کرنے کے بعد جو اصل نہیں بلکہ فروعات ومتعلقات کا درجہ رکھتے ہیں اور جو عام انسانی تہذیبوں کے درمیان مشترک ہیں اس کا ایک مخصوص مزاج معلوم ہوتا ہے جس کی خصوصیات حسب ذیل ہیں

(۱) غیر محسوسات کی بے وقعتی اور ان میں اشتباہ۔
(۲) خشوع وخضوع اور روحانیت کی کمی۔
(۳) دنیاوی زندگی کی پرستش اور دنیاوی فوائد ولذائذ کا اہتمام شدید۔
(۴) حب وطن میں افراط وغلو۔

ہم ان متعدد اجزاء اور پہلوؤں کو اگر ایک مفرد لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو اس کے لئے تنہا مادیت کا لفظ کافی ہے، پس یونانی تہذیب کا مابہ الامتیاز "مادیت" ہے۔

اہل یونان اور ستارہ پرستی

یونان قدیم کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کو طبعیات وریاضت وغیرہ علوم کا یہ وسیع اور عظیم سرمایہ عطا کرنے والا ملک تاریخ کے بیشتر حصہ میں بت پرست اور ستارہ پرست واقع ہوا تھا اور صدہا توہمات وخرافات میں گرفتار تھا، جدید تاریخ نے یونان کے علم الاصنام اور اس کے قومی دیو مالا کو بے نقاب کر دیا ہے اور اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ یونان قدیم میں دیوتاؤں، دیویوں اور ستاروں کے معبدوں اور ہیاکل کا ایک جال بچھا ہوا تھا یونان

کا جو فلسفہ عالم اسلام میں ترجمہ ہو کر آیا اور پھر اس کے ذریعہ یورپ تک پہونچا وہ اسی صنم پرستی اور ستارہ پرستی کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے، علامہ ابن تیمیہؒ کئی صدی پہلے اس نکتہ کو فاش کر گئے ہیں کہ اہل یونان کی علم ہیئت و کواکب و نجوم سے دلچسپی کا سبب یہ ہے کہ وہ ان کو معبودیت و عظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان فنون میں کتابیں لکھتے تھے، چنانچہ علامہ فرماتے ہیں۔

أَمَّا قُدَمَاءُ الْيُونَانِ فَكَانُوا مُشْرِكِيْنَ مِنْ أَعْظَمِ النَّاسِ شِرْكًا وَسِحْرًا يَعْبُدُوْنَ الْكَوَاكِبَ وَالْأَصْنَامَ وَلِهٰذَا عَظُمَتْ عِنَايَاتُهُمْ بِعِلْمِ الْهَيْئَةِ وَالْكَوَاكِبِ لِأَجْلِ عِبَادَاتِهِمْ وَكَانُوا يَبْنُوْنَ لَهَا الْهَيَاكِلَ

(تفسیر سورۃ الاخلاص ص۵۰)

جہاں تک قدماء یونان کا معاملہ ہے تو واقعہ یہ ہے کہ وہ پکے مشرک تھے اور ان کو سحر سے بڑی دلچسپی تھی، وہ ستاروں اور بتوں کی پرستش کرتے تھے علم ہیئت اور کواکب کی طرف غیر معمولی توجہ کرنے کا یہی راز ہے اس لئے کہ وہ ان کی پرستش کرنا چاہتے تھے اور ان کے لئے معبد اور ہیکل تعمیر کرتے تھے۔

علامہ ابن تیمیہؒ دوسری جگہ لکھتے ہیں

وَلِهٰذَا كَانَ رُؤُسَاءُهُمُ الْمُتَقَدِّمُوْنَ وَالْمُتَأَخِّرُوْنَ يَأْمُرُوْنَ بِالشِّرْكِ فَالْأَوَّلُوْنَ يُسَمُّوْنَ الْكَوَاكِبَ الْآلِهَةَ الصُّغْرٰى وَيَعْبُدُوْنَهَا بِأَصْنَافِ الْعِبَادَاتِ كَذٰلِكَ كَانُوْا فِيْ مِلَّةِ الْإِسْلَامِ لَا يَنْهَوْنَ عَنِ الشِّرْكِ وَيُوْجِبُوْنَ التَّوْحِيْدَ بَلْ يُسَوِّغُوْنَ الشِّرْكَ أَوْ يَأْمُرُوْنَ بِهٖ أَوْ لَا يُوْجِبُوْنَ التَّوْحِيْدَ

(نقض المنطق ص۱۷۱)

اسی لئے ان کے متقدمین و متاخرین پیشوا شرک کا حکم دیتے تھے متقدمین کواکب کو آلہۂ صغریٰ (چھوٹے خدا) کے لقب سے یاد کرتے تھے اور مختلف طریقوں سے ان کی عبادت کرتے تھے مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے ان کی پیروی کی ان کا بھی حال یہ ہے کہ وہ شرک سے نہیں روکتے اور توحید کو ضروری قرار نہیں دیتے بلکہ شرک یا تو جائز کہتے ہیں یا اس کا حکم نہیں دیتے یا کم از کم توحید کو ضروری قرار نہیں دیتے۔

باقی آئندہ

سالانہ زر اشتراک

ہندوستان سے ۰۰/۲۵

سعودی عرب، کویت، ابوظہبی وغیرہ سے

بذریعہ ایرمیل ۰۰/۹۰ روپے

جنوبی مشرقی افریقہ، برطانیہ وغیرہ سے

بذریعہ ایرمیل ۰۰/۱۰۵ روپے

امریکہ، کناڈا وغیرہ سے بذریعہ ایرمیل ۰۰/۱۱۶ روپے

پاکستان سے بذریعہ ریل ۰۰/۴۵ روپے

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے

مجلس ادارت

مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی

مولانا ریاست علی صاحب (مدیر مسئول)

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب (مدیر)

طابع و ناشر

دار العلوم معرفت حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مطبوعہ

محبوب پریس دیوبند (یوپی)

ضروری گذارش

○ اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینے یا اس سے پہلے کسی مہینہ میں آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے بذریعہ سرخ نشان اس کی آپ کو اطلاع بھی دی جا چکی ہے لہٰذا اب اگر آئندہ شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا کوئی خط یا چندہ نہ آیا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو وی، پی ہی سے زر اشتراک ادا کرنے میں آسانی ہے اگلا شمارہ ۰۰/۳۱ روپے کے مطالبہ میں وی پی کر دیا جائیگا (مدیر)

فہرست مضامین

ہندوستانی اور پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

(۱) ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ فرمائیں

(۲) پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ ۴۵/.. روپے مولانا عبدالستار صاحب مقام کرم علی والہ تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان (پاکستان) کو بھیج دیں اور انھیں لکھیں کہ اس چندہ کو رسالہ دار العلوم کے حساب میں جمع کرلیں۔

(۳) خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں، خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

(مدیر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن قاسمی

دارالعلوم دیوبند نے اپنی ایک سو بائیس ۱۲۲ سالہ زندگی میں علمی، عملی اور دفاعی میدانوں میں جو محیرالعقول خدمات اور نادرۂ روزگار کارنامے انجام دیئے ہیں مدارس اسلامیہ کی تاریخ میں اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

دارالعلوم کا قیام جن حالات میں عمل میں آیا تھا اس وقت عیسائیت کا فروغ پورے عالم اسلام کے لئے ایک عظیم فتنہ بنا ہوا تھا۔ بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں پر تو ظلم وستم کے ایسے ایسے پہاڑ توڑے گئے کہ اس نے تاتاریوں کی قیامت خیز تاراج اور اندلس میں صلیبیوں کے خونی ڈرامہ کی یاد تازہ کردی۔

اس پرآشوب دور اور انتہائی سنگین حالات میں دارالعلوم نے اللہ کے اعتماد پر اس فتنۂ ہمہ گیر کی سرکوبی کے لئے قدم آگے بڑھایا اور حکومت واقتدار کی تمام تر طاقتوں کے باوجود عیسائیت کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اور بحث ومناظرہ، تصنیف وتالیف کے ہر میدان میں عیسائی مبلغین کو شکست فاش دی اور انھیں ہمیشہ کے لئے اس میدان کو خیرباد کہنے پر مجبور کردیا۔ فرزندان دارالعلوم نے اس موضوع پر ہزاروں صفحات لکھے۔

فتنۂ عیسائیت ہی کے زیر سایہ یہاں کے مسلمانوں کو عقیدۂ توحید سے محروم کردینے کے لئے شدھی وسنگٹھن کے نام سے ایک تحریک ابھری اس تحریک کے مقابلہ میں بھی دارالعلوم نے مناظرہ ومباحثہ اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ وہ فریضہ انجام دیا کہ یہ فتنہ تاریخ کے شہر خموشاں میں ہمیشہ کے لئے دفن ہوگیا۔ اس موضوع پر بھی فضلاء دارالعلوم کی سیکڑوں تصانیف عالم اسلام کے کتبخانوں کی زینت ہیں۔

شاطر انگریزوں کی پالیسی لڑاؤ اور حکومت کرو نے یہاں کے مسلمانوں میں انتشار واختلال پیدا کرنے کے لئے جو فتنے برپا کئے ان میں سب سے اہم فتنۂ قادیانیت تھا جس نے علمی اور اعتقادی طور پر

ملت اسلامیہ میں بڑا خلفشار پیدا کیا۔ بفضلہ تعالیٰ علماء دارالعلوم کی انتھک اور بے پناہ کوششوں سے یہ فتنہ کفر کی صف میں کھڑا کر دیا گیا اور آج قادیانیت صرف ملت اسلامیہ کے اندر نہیں تاریخ انسانیت میں ایک بہتان اور کالی بن کر رہ گئی ہے۔ اس سلسلہ میں دارالعلوم کی خدمات کی شہادت ہزاروں صفحات میں پھیلی ہوئی فضلاء دارالعلوم کی تصانیف اپنی خاموش زبانوں سے آج بھی دے رہی ہیں۔

ملت اسلامیہ کے اندر ایک اور فتنہ بدعات کے فروغ کا شروع کیا گیا جو چیز اسلام میں نہ تھی اسے اسلام بنانے کی مذموم جسارت کی گئی اور دین و مذہب کے نام پر طرح طرح کی شرکیہ رسومات ایجاد کی گئیں۔ دارالعلوم نے آگے بڑھ کر اس فتنہ کا بھی تعاقب کیا یہ معرکہ عرصہ دراز سے جاری ہے اور آج بھی برصغیر ہندو پاک میں کہیں کہیں اکھڑی ہوئی سانس لے رہا ہے اس سلسلے میں یہ حقیقت قابل لحاظ ہے کہ دارالعلوم نے ایک طرف تزکیہ و احسان کے بہترین نمونے، رجوع اور انابت الی اللہ کے اعلیٰ ترین شاہکار عملی طور پر امت کے سامنے پیش کئے اور علمی انداز سے بھی اس فتنہ کے سد باب میں بھرپور کوششیں کیں۔ فضلائے دارالعلوم کی ہزارہا تصانیف اس خدمت گرامی کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔

ان تمام فتنوں اور گمراہ کن تحریکوں کے علاوہ جب بھی کسی فرد یا جماعت نے ”ما انا علیہ واصحابی“ کے جادۂ مستقیم سے انحراف کیا اور ملت کے اندر ان کے غلط افکار اور فاسد نظریات کے سرایت کر جانے کا اندیشہ ہوا تو دارالعلوم کی جانب سے بلا خوف لومۃ لائم ان پر کھل کر نکیر کی گئی اور ان غلط نظریات کے مفاسد کو علمی انداز میں امت کے سامنے ظاہر کرکے اس کا سد باب کیا گیا اور اس کی جگہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متوارث صحیح اسلام کو امت کے سامنے پیش کرنے کی سعیٔ بلیغ کی گئی۔ مودودیت اور عدم تقلید میں غلو اختیار کرکے ائمہ مجتہدین اور صلحاء امت پر زبان طعن و تشنیع دراز کرنے والوں کو اس کی نظیر میں پیش کیا جا سکتا ہے

ان دفاعی تالیفات کے علاوہ اسلامی علوم و فنون میں سے کوئی فن ایسا نہیں ہے جس کی جماعت دارالعلوم نے وقیع خدمات انجام نہ دی ہوں۔ متعدد و کامل تفسیروں کے علاوہ علوم قرآنی سے متعلق تصانیف کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے۔ فن حدیث میں متعدد نئی قابل قدر اور ضروری تالیفات کے اضافہ کے ساتھ اس فن سے متعلق متقدمین

محدثین کی اکثر مشہور کتابوں کی توضیح وتشریح کا بھی پورا پورا اہتمام کیا گیا ہے اور اس موضوع سے متعلق صفحات کی تعداد بھی یقیناً لاکھوں سے متجاوز ہے عقائد وفقہ کے فن پر جو خدمات انجام دی گئی ہیں ان کا شمار بھی مشکل ہے سیکڑوں فضلاء کرام نے اس موضوع پر ہزاروں تصانیف امت کے نذر کیں سیرت، اخلاق واحسان تاریخ، ادب، لغت وغیرہ سے متعلق فرزندان دارالعلوم نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اگر صرف ان کی فہرست تیار کی جائے تو وہ اپنی ضخامت میں خود ایک مستقل تصنیف سے کم نہ ہوگی لیکن یہ ساری علمی وتصانیفی خدمات اس طرح سے منتشر اور پھیلی ہوئی ہیں کہ ان کی وسعت وہمہ گیری کا کچھ اندازہ ہی نہیں چلتا

عصر جدید تصنیف وتاریخ کا دور ہے۔ آج ہر زندہ قوم اور متحرک ادارے اپنی خدمات اور تاریخ کو مرتب کرکے دنیا میں نشر کر رہے ہیں حتیٰ کہ جن قوموں اور اداروں کے پاس اپنی کوئی واضح تاریخ نہیں ہے، وہ تاریخ سازی کرکے دنیا میں اپنے آپ کو روشناس کرا رہی ہیں۔

مگر افسوس ہے کہ دارالعلوم کی ان ہمہ گیر علمی خدمات اور تابناک تاریخ کو آج تک مرتب شکل میں دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا جا سکا۔ جس کی وجہ سے عالم اسلام میں دارالعلوم کو وہ مقام اب تک حاصل نہیں ہو سکا ہے جن کا وہ مستحق ہے اس لئے عرصہ سے اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ فضلاء دارالعلوم کی اس ہمہ گیر علمی خدمات کو دور حاضر کے اسلوب میں مدون کرکے پیش کیا جائے شیخ الہند اکاڈمی دارالعلوم دیوبند نے اس عظیم خدمت کا بار اپنے ذمہ لے لیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ کام بغیر فضلاء کرام کے تعاون کے انجام نہیں دیا جا سکتا ہے اس لئے فضلاء دارالعلوم سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ اس سلسلے میں اکاڈمی کے ساتھ تعاون فرمائیں، جس کی صورت یہ ہے کہ خود اپنے حالات وخدمات کا مکمل تعارف اور جن فضلاء کی خدمات سے آپ کو واقفیت ہو ان کے حالات مرتب فرما کر جلد از جلد بھیجنے کی کوشش فرمائیں اس سلسلے میں ایک سوالنامہ بھی مرتب کیا گیا ہے اسے سامنے رکھ کر حالات وکوائف لکھے جائیں تو سہولت ہوگی سوالنامہ رسالہ کے صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ کر لیا جائے۔

اسلام میں رسول کا تصور

مولانا محمد بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ

اسلام میں خدا کے تصور کی طرح رسول کا تصور بھی تمام مذاہب سے جداگانہ اور بالاتصور ہے۔ یہاں انسان کامل کی آخری سرحد اور لاہوت و جبروت کے ابتدائی تصور میں کوئی نقطہ مشترک نہیں نکلتا۔ ایک انسان اپنی فطری اور وہبی استعداد کا ہر کمال بالفعل حاصل کر لینے کے بعد بھی الوہیت کے کسی ادنیٰ سے تصور کے قابل بھی نہیں ہو سکتا اسلام میں اللہ تعالیٰ کا تصور اتنا بلند ہے کہ وہ حلول واتحاد، ولادت وقرابت اور اس طرح کی تمام نسبتوں میں سے کسی نسبت کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اسی معنی سے اس کو احد و صمد کہا جاتا ہے ؎

دو بینانِ بارگاہِ الست   بیش ازیں پے نہ بردہ اند کہ ہست

رسول و اوتار و بروز

اس لئے اسلام میں رسول نہ خدا کا اوتار ہو سکتا ہے کہ خدائی اس میں حلول کر سکے اور نہ خود خدا ہو سکتا ہے کہ ہیکل انسانی میں جلوہ نما ہو۔ رسول کے متعلق خدائی کا تصور عیسائیت کا راستہ ہے اور خدا کے متعلق یہ عقیدہ کہ وہ رسول کی صورت میں بروز کرتا ہے براہمہ کا عقیدہ ہے۔ اسلام کی تعلیم ان دونوں سے علیحدہ ہے بلکہ یہ دونوں تصور اسلام میں بے مصداق ناممکن اور محال ہیں۔ عام حیوانات کو دیکھئے قدرت نے ان میں بھی ہر ہر نوع کی جدا جدا خصوصیات اور صورتیں بنائی ہیں اور اس طرح ہر نوع کے درمیان ایک ایسا خطِ فاصل کھینچ دیا ہے کہ ہزار ترقی کرنے کے بعد بھی ایک نوع دوسری نوع کے سرحد میں قدم نہیں رکھ سکتی بلکہ ہر نوع اپنے الٰہی قدرتی حدود کے درمیان گردش کرتی رہتی ہے اور اسی حدبندی سے اس عالم کا نظام قائم رہتا ہے۔

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ   نہ سورج چاند کو پکڑ سکتا ہے اور نہ رات دن سے

وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ۔ آگے بڑھ سکتی ہے ہر چیز چکر میں پڑی گردش کھا رہی ہے۔

جب مخلوقات کے دائرہ کی یہ سرحدیں اتنی مضبوط ہیں تو خالق کے متعلق یہ گمان کرنا کہ کوئی انسان اپنے دائرہ سے ترقی کر کے اس کی سرحد میں قدم رکھ سکتا ہے سفیہانہ خوش عقیدگی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے فلسفۂ ارتقاء (Evolution) تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی مخلوقات کے کسی کڑی کا عالم قدس سے کوئی اتصال ثابت نہیں ہوتا اس لئے رسول کا تصور اسلام میں بلا کسی ادنی شائبہ تنقیص کے یہ ہے کہ وہ ایک انسانِ کامل ہوتا ہے اور اپنی تمام عظمتوں اور مراتب قرب کے باوجود الوہیت کے تصور سے یکسر خالی ہوتا ہے۔

انسانیتہ رسول کا ایک کمال ہے

رسول ایک انسان ہوتا ہے اور عام انسانوں پر اس کی برتری سمجھنے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا فرستادہ اور اس کا پیغمبر ہے۔ اس کی جانب سے منصب اصلاح پر کھڑا کیا گیا ہے اور اس لئے اس کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک انسان ہو کیونکہ اصلاح کے لئے صرف علم کافی نہیں احساس کی بھی ضرورت ہے۔ جو غم نہیں کھا سکتا وہ ایک غمزدہ کی پوری تسلی بھی نہیں کر سکتا۔ جو بھوک سے آزاد ہے وہ ایک بھوکے کے ساتھ صحیح دل سوزی کرنا بھی نہیں جانتا۔ اور جو فطرت انسانیوں کی کمزوریوں سے آشنا نہیں وہ ان کمزوریوں پر اغماض بھی نہیں کر سکتا۔ اسی لئے قرآن کریم نے جا بجا بعثت کے ساتھ رسولوں کا انسان ہونا ایک مستقل انعام قرار دیا ہے لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ الخ یہاں امتنان و احسان کے موقع میں منجملہ اور باتوں کے تین امور کو بالخصوص نمایاں کیا گیا ہے۔ بعثت رسول پھر اس انعام کیلئے سرزمین عرب کا انتخاب اور سب سے بڑھ کر اس رسول کا انسان ہونا۔ حضرت خلیلؑ نے جب بنی اسمٰعیل میں ایک نبی کے لئے دعا فرمائی تو انھوں نے بھی اس اہم نقطہ کو فراموش نہیں کیا اور اپنی دعا میں فرمایا۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اے ہمارے رب ان میں رسول بھیج جو انہیں میں سے ہو۔

پھر جب اس دعاءِ مستجاب کے ظہور کا وقت آیا تو دعاءِ خلیل میں لفظ "منہم" کی استجابۃ کو مزید تاکید کے ساتھ لفظ من انفسھم سے ذکر کیا گیا ہے لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْہِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِہِمْ یعنی اس رسول کو انسانوں میں تو بھیجا ہی تھا مگر ان میں بھی جس سے انہیں قریب سے قریب تر علاقہ ہو سکتا تھا ان میں بھیجا ہے انسانوں میں عرب، عربوں میں قریشی اور قریش میں ہاشمی بنایا مگر ان چند در چند خصوصیات کے باوجود پھر وہ ایک انسان ہی رہا۔ یہی وہ عقیدہ تھا جو ابتداء میں اولاد آدم کو بنیادی طور پر بتا دیا گیا تھا۔

یَا بَنِیْ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیَاتِیْ فَمَنِ اتَّقٰی وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔	اے اولادِ آدم اگر تمہارے پاس تم ہی میں کے رسول آئیں جو تمہارے سامنے ہماری آیات پڑھ پڑھ کر سنائیں تو جو تقویٰ کی راہ اختیار کرے اور نیک رہے تو ان پر نہ کوئی خوف و ہراس اور نہ کوئی غم۔

آیتِ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم کی ابتداء میں جن باتوں کی اولادِ آدمؑ کو بنیادی طور پر تعلیم دی گئی تھی ان سے ایک بعثت رسول، دوم رسولوں کے انسان ہونے کا عقیدہ تھا۔ اسی عقیدہ کے مطابق دنیا میں خدا کے بہت سے ـــــــ رسول آئے جن کی صحیح تعداد خدا ہی کو معلوم ہے۔

علاوہ اس کے کہ رسول اگر انسان نہ ہوں تو وہ انسانوں کی پوری اصلاح نہیں کر سکتے۔ نسل انسانی پر یہ ایک بدنما داغ ہوتا کہ اشرف المخلوقات کا مصلح و مربی کسی اور نوع میں پیدا کیا جائے اس لئے خود رسول اور نوعِ انسانی کا شرف و کمال یہی تھا کہ رسول انسانوں میں سے ایک انسان ہوتا۔

لفظ رسول کی تشریح

رسول کا صحیح مقام سمجھنے کے لئے خود لفظِ رسول سے زیادہ صحیح اور آسان کوئی اور لفظ نہیں ہے۔ اس لفظ سے محبت و عظمت کے وہ تمام تقاضے بھی پورے ہو جاتے ہیں جو ایک کامل سے کامل انسان کے لئے فطرت انسانی میں موجزن ہوتے ہیں اور عبد و معبود کی وہ ساری حدود بھی محفوظ رہتی ہیں جو کفر و ایمان کے درمیان خط فاصل ہو سکتی ہے اسی لئے خدائے تعالیٰ
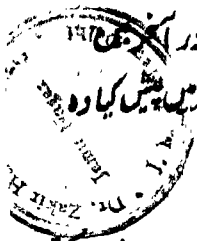
کے سب رسولوں نے اپنا تعارف اسی لفظ رسول کے ذریعہ پیش کیا ہے اور آخر میں قرآن کریم نے سب سے افضل اور سب سے برتر رسولؐ کا تعارف بھی جس لفظ میں پیش کیا وہ یہی لفظ رسول ہے۔

(۱) محمد رسول اللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے پیغمبر ہیں۔

(۲) وما محمد الا رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبر ہونے کے سوا الوہیت کا شائبہ تک نہیں رکھتے

معلوم ہوا کہ یہ کلمہ ایسا پر عظمت کلمہ ہے کہ نبی الانبیاء کے تعارف کے لئے بھی اس سے زیادہ موزوں کوئی اور کلمہ نہیں ہے صوفیاء نے بڑے بڑے مجاہدات کے بعد یہاں کچھ خوشنما کلمات استعمال کئے ہیں۔ وجود کا نقطۂ اول۔ حقیقۃ الحقائق۔ برزخیۃ الکبریٰ۔ مگر انصاف یہ ہے کہ ان سب کلمات کے تکرار سے کچھ غلط فہمیاں تو پیدا ہوگئیں لیکن آپ کا صحیح مقام پھر اتنا دریافت نہیں ہو سکا جتنا کہ لفظ رسول سے اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا لفظ ہر دور میں مشہور و معروف تھا۔ اس کے لوازم سب کے ذہن نشین تھے۔ اس کے فرائض و خدمات سب کو معلوم تھے اس کی شخصیت واحترام سے سب آشنا تھے اور یہ تو کسی ناسمجھ سے ناسمجھ انسان پر بھی پوشیدہ نہ تھا کہ بادشاہ اور اس کے رسول کے درمیان نوازش و کرم کے واسطہ کی اور مساوات کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ اس لئے جب کوئی رسول دنیا میں آتا تو یہی کہہ دیتا کہ میں احکم الحاکمین، ملک الملوک کا ایسا ہی ایک رسول ہوں جیسا کہ دنیا کے بادشاہوں کے رسول ہوا کرتے ہیں بس اسی ایک لفظ سے سامعین کے دلوں میں وہ ساری غلطیاں دوڑنے لگتیں، محبت و توقیر، اطاعت و حکم برداری کے وہ تمام جذبات امنڈنے لگتے جو ایسے رسول کے لئے امنڈنا چاہئیں۔ اور بیک وقت وہ تمام حدود بھی نظروں کے سامنے آجاتیں جو ایک بادشاہ اور اس کے رسول کے درمیان فاصل رہنی چاہئیں۔ اس لئے محبت و اطاعت کے ان تمام جذبات کے ساتھ ان کا جوہر توحید بھی کفر و شرک کی گرد سے کبھی بے آب نہ ہوتا۔

رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے

درحقیقت یہ مسئلہ ایک پیچیدہ مسئلہ تھا کہ ایک طرف اسلام کی نازک توحید خدا ہی کی اطاعت اور اسی کی محبت کا مطالبہ کرتی ہے اور دوسری طرف وہ اپنے سوا رسول کی محبت و اطاعت کا بھی حکم دیتی ہے۔ قرآن کریم نے بتایا کہ نسبت رسالت

کے بعد رسول کی ہستی درمیان میں صرف ایک واسطہ ہوتی ہے۔ پھر اس کی اطاعت و محبت خدا ہی کی محبت و اطاعت ہو جاتی ہے اسی لئے فرمایا۔

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ جو رسول کا کہنا مانے اس نے خدا کا کہنا مانا

یعنی اصل حکم برداری تو خدا کی چاہئیے۔ ظاہری سطح میں رسول کی اطاعت گو اس کے خلاف نظر آئے مگر حقیقت میں وہ خدا ہی کی حکمبرداری ہوتی ہے بلکہ اس کی اطاعت و محبت سے بغیر خدا کی محبت و اطاعت کا کوئی اور راستہ ہی نہیں اور اس طرح یہ اطاعت و محبت کتنی ہی پھیلتی چلی جائے مگر اسکا اصل مرکز خدا ہی کی ذات پاک رہتی ہے۔

رسول و وکیل

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہو گیا کہ رسول خدا نہیں، اس کا اوتار و بروز نہیں اور اس کا بیٹا بھی نہیں۔ اب یہ سننے کہ وہ اس کا وکیل و مختار بھی نہیں۔ عربی میں دوسرے کی خدمت سرانجام دینے کے لئے دو لفظ ہیں (۱) رسول (۲) وکیل ان دونوں کا تصرف دراصل دوسرے کے لئے ہوتا ہے اپنے لئے نہیں ہوتا مگر ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ وکیل کا تصرف بہ نسبت رسول کے زیادہ صحیح اور زیادہ قوی ہے۔ وکیل اپنے موکل کی طرف سے مختار ہوتا ہے جو چاہے بطور خود بھی کر سکتا ہے اسی لئے خصومت و جواب دہی کا بھی اس کو حق حاصل ہوتا ہے۔ رسول صرف اس امانت کے پہنچا دینے کا ذمہ دار ہوتا ہے جو اس کے سپرد کی گئی ہے۔

مثلاً اگر ایک بادشاہ کسی کو اپنا وکیل و مختار بنا دے تو اس کو حق ہے کہ وہ موقعہ و محل کے لحاظ سے جو مناسب سمجھے گفتگو کرے بلکہ چاہے تو اس کے قوانین میں ترمیم و تنسیخ بھی کر ڈالے مگر ایک پیغامبر کو اس کے سوا کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ جو پیغام اس کے ذریعہ بھیجا گیا ہے وہ بے کم و کاست اس کو پہنچا دے اس لحاظ سے وکیل کی حیثیت گو بلند ہے مگر بلحاظ ذمہ داری سخت بھی بہت ہے قرآن کریم نے بہت جگہ اس کا اعلان کیا ہے کہ جنھیں ہم بھیجیں گے وہ صرف ہمارے رسول ہوں گے نہ کہ وکیل۔ بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ جب خدا خود ہی سب کا وکیل بن گیا ہے تو اب اس کا وکیل کوئی اور کیسے ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی بڑے سے بڑے انسان میں اس کی طاقت نہیں کہ وہ اس ذمہ داری کا بار اٹھا سکے جو خدا تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے۔ پھر اس کی طرف سے وکالت کیسے متصور ہو سکتی ہے۔

(۱) اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور

شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۔ وہی سب کا وکیل و کارساز ہے

(۲) اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۔ میرے سوا کسی اور کو اپنا وکیل و کارساز مت بناؤ۔

(۳) قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۔ آپ کہہ دیجئے کہ میں تم پر وکیل بنا کر نہیں بھیجا گیا رسول مقرر ہوا ہوں

(۴) مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۔ جو راہ یاب ہوا اپنے فائدہ کے لئے اور جس کے گمراہی اختیار کی اپنا ہی نقصان کیا اور میں تو تم پر وکیل و مختار مقرر نہیں ہوا کہ جوابدہی میرے سر ہو۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ رسولؐ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ احکام الٰہیہ پہنچا دے اور بس شریعت کے ایک شوشہ اور ایک نقطہ بدلنے کا حق اس کو نہیں کسی کی ہدایت و گمراہی کا بار اس پر نہیں اور نہ آخرت میں کسی کے اعمال کا وہ جواب دہ ہے ۔ جہاں تک کارخانۂ عالم کی ذمہ داری و کارسازی کا تعلق ہے اس کے ذرہ ذرہ کی کفالت و وکالت خدائے تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی ہے اور اس کا اعلان بھی کر دیا ہے اور رسولوں کی پوزیشن صاف کرنے کے لئے اپنی اور رسولوں کی زبانی یہ بات واضح کر دی ہے کہ ان کی حیثیت صرف رسالت کی حد تک ہے وکالت کی نہیں ہے تاکہ ہر انسان سوچ سمجھ لے کہ ہدایت و ضلالت کی جوابدہی اسے خود براہ راست کرنی ہے جسے رسولوں کی ذات پر ٹالا نہیں جا سکتا ۔

وکالت تو بہت دور کی بات ہے اگر کہیں ہر شخص سے خدائے تعالیٰ کا باتیں کرنا خالقیت کے خلاف نہ ہوتا تو شاید اس کے اور اس کی مخلوق کے درمیان رسالت کا واسطہ بھی نہ ہوتا۔ مگر جس طرح دنیا میں بادشاہ اپنی رعایا سے بلا واسطہ کلام نہیں کیا کرتے اسی طرح خدائے تعالیٰ نے بھی اپنی ہر مخلوق سے براہ راست کلام کرنا پسند نہیں فرمایا، بلکہ اس کیلئے کچھ ہستیاں منتخب کرلی ہیں جو اس کی نظر میں اس کے لئے اہل بنائی گئی تھیں پھر ان میں بھی یہ حوصلہ نہیں ہے کہ بے حجابانہ وہ جب چاہیں اس سے باتیں کرلیں اس لئے ان کی برداشت کے بقدر اپنے ہم کلامی کی صورتیں مقرر کر دی ہیں

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ ۔ کسی آدمی کی طاقت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے باتیں کر سکے مگر اشارہ سے یا پردہ کے پیچھے سے یا

أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِإِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ط (الشوری ع ٦) — کوئی فرشتہ بھیجے، پھر وہ خدا کے حکم سے جو اس کو منظور ہو اس کا پیغام پہنچا دے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (آل عمران ع ۹) — یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو براہ راست غیب کی خبر دے دیا کرے لیکن اس کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے چھانٹ لیتا ہے۔

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دستور نہیں رکھا کہ عام لوگوں کو بلاواسطہ غیب کی یقینی خبریں دیا کرے بلکہ اس کام کے لئے وہ رسولوں کا انتخاب کرتا ہے اور ان کے ذریعہ سے پھر تمام مخلوق سے ہم کلام ہوتا ہے اور یہ دستور اس لئے رکھا ہے کہ عام بشر تو درکنار رسول بھی اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ خدائے تعالیٰ سے جس طرح چاہیں بالمشافہ کلام کر سکیں۔ اس لئے ان سے کلام کرنے کی بھی چند صورتیں اختیار کی گئی ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ متکلم خود ذات پاک ہو مگر سامنے نہ ہو بلکہ پس پردہ ہو۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر کلام۔ دوسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ کے ذریعہ سے کلام کرے۔ اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ نبی خود بشریت سے ملکیت کے قریب آجائے دوم یہ کہ ملک یعنی فرشتہ بشریت کے قریب آجائے ان دونوں صورتوں میں رسول سے بالواسطہ کلام ہوتا ہے۔ ان سب صورتوں میں چونکہ خدائے تعالیٰ کی ذات پاک رسول کے سامنے نہیں ہوتی اس لئے کلام الٰہی کی شوکت و طاقت رسول کے لئے قابل برداشت ہو جاتی ہے اگر کہیں آمنے سامنے آکر کلام ہو تو بشریت کی ضعیف تعمیر برباد ہو جائے۔

رسول اور مصلح ریفارمر

جس طرح کہ رسول وکیل و مختار نہیں ہوتا اسی طرح وہ صرف ایک مصلح و ریفارمر بھی نہیں ہوتا۔ رسول اور ریفارمر میں فرق ہے ایک ریفارمر اور مصلح کی پرورش عام انسانوں کی طرح ہوتی ہے ان ہی کی طرح وہ تعلیم حاصل کرتا ہے پھر اپنی فطری صلاحیت و دل سوزی کی بنا پر قومی اصلاح کی خدمت انجام دیتا ہے جب اس کی فہم و فراست، ہمدردی و نیک نیتی کے اثرات قوم میں نمایاں ہوتے ہیں تو قوم کی نظروں میں وہ خود بخود ایک مصلح اور ریفارمر کا رتبہ حاصل کر لیتا ہے مگر رسولوں کی تربیت صفت اجتبار و اصطفار کے ماتحت ہوتی ہے ان کی ہر نشست

برخاست ہر قول و فعل کی قدرت خود نگراں ہوتی ہے اور اسی حفاظت کی وجہ سے ان کو صفت عصمت حاصل ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک مناسب عمر پر وہ خود انھیں منصب اصلاح پر فائز کرتی ہے۔ ریفارمر عصمت کا رسمی نہیں ہوتا غلطی کا احتمال اس پر ہر وقت جائز ہے۔

رسول کی دو زندگیاں رسالت سے پہلی اور رسالت کے بعد اس قدر ممتاز ہوتی ہیں گویا بلحاظ ذمہ داری وہ دو انسان ہوتے ہیں۔ رسالت سے پہلے وہ عام انسانوں کی صف میں شامل ہوتا ہے، نہ کوئی دعویٰ کرتا ہے۔ نہ عام انسانوں کے عقائد و اعمال سے کوئی ذمہ دارانہ سروکار رکھتا ہے اس کی دعوت میں کوئی تدریج کوئی تمہید نہیں ہوتی وہ خود بھی اس سے بے خبر ہوتا ہے کہ کل اسے کیا کہنا ہے وہ بالکل خاموش خاموش نظر آتا ہے اور جوں ہی منصب رسالت پر فائز ہو جاتا ہے تو اس طرح بولتا ہے کہ کسی کا خوف و خطر اس کے آس پاس نہیں آتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احوال پر نظر کیجئے یا تو وہ فرعون کے خوف سے اپنا وطن چھوڑ کر بھاگ رہے تھے یا رسالت کی دوسری ہی ساعت میں پھر اسی کی طرف واپس جاتے ہوئے نظر آ رہے ہیں اور وہ بھی کس کام کے لئے؟ اس سرکش کو خدا کے عذاب سے ڈرانے کے لئے جس کے عذاب سے ڈر کر کل خود بھاگ رہے تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے یا تو وہ عزلت نشینی تھی کہ غار حراء میں چالیس چالیس دن تک اس کی خبر بھی نہ رہتی تھی کہ دنیا کدھر جا رہی ہے یا اب کوئی بازار نہیں، کوئی مجمع نہیں، کوئی محفل نہیں جہاں دنیا کی اصلاح و خبر گیری کے لئے آپ چیخ نہ رہے ہوں خلاصہ یہ کہ رسول کی زندگی کسب و اکتساب، تکلف و تصنع کے تمام قیود سے آزاد ہوتی ہے، وہ از خود نہ رسول بنتے ہیں نہ بن سکتے ہیں اور نہ خود قوم کسی کو رسول بنا سکتی ہے بلکہ یہ دست قدرت کا براہ راست انتخاب ہوتا ہے جسے چاہے اس منصب کے لئے انتخاب کر لیتا ہے۔

رسول ریاضت سے نہیں بنتے وہ پہلے سے منتخب شدہ ہوتے ہیں

رسالت ایک قسم کی سفارت ہے

ہر سفیر کے لئے قابل ہونا تو ضروری ہے مگر ہر قابل انسان کے لئے سفیر ہو جانا ضروری نہیں یہ بادشاہ کی اپنی مصلحت اور صواب دید پر موقوف ہے کہ وہ کس کو اس کا اہل سمجھتا ہے۔ خدا کی زمین پر دنیا کے جس قدر رسول آئے آپ سب کی سیرت بالتفصیل مطالعہ کر چکے۔

ان کی زندگیوں کا ورق ورق لوٹ جائیے مگر قرآن وحدیث سے کہیں ثابت نہیں ہوگا کہ کسی کو منصب رسالت کسی رسول کی اتباع واطاعت کے صلہ میں ملا ہو۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی سیرت سے آپ کو یہی ثابت ہوگا کہ بوقت ضرورت براہ راست ان کو اس منصب سے نواز دیا جاتا ہے بلکہ رسول کا خود مفہوم بھی یہ بتاتا ہے کہ یہ گروہ عام انسانوں اور خدائے تعالیٰ کے درمیان پیغامبری کے لئے بنایا گیا ہے تاکہ ان کے واسطے سے لوگ شریعت پر عمل اور خدا کی عبادت کرنا سیکھیں اس لئے نہیں کہ شریعت پر عمل کر کے یہ خود خدا کے رسول بن جائیں۔ چنانچہ جب وہ آتے ہیں تو گمراہوں میں راہنما، جاہلوں میں عالم، مفسدوں میں مصلح، اور کافروں میں اول مسلم بن کر آتے ہیں۔ رسالت سے پہلے بھی ان کا دامن شرک وکفر کی تمام نجاستوں سے پاک ہوتا ہے اور جو حرکات ادیانِ سماویہ میں ناقابل برداشت ہیں وہ نبوت ورسالت سے پہلے بھی ان سے دور ہی دور رہتے ہیں اور اپنی اس بے لوث اور پاک وصاف زندگی کی وجہ سے قوم میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی ریاضت وعبادت اس لئے نہیں ہوتی کہ انھیں رسول بننا ہے بلکہ اس لئے ہوتی ہے کہ ان کی یہ پاک وصاف زندگی قوم کی نظروں میں نمایاں کی جائے اور اس لئے نمایاں کی جائے کہ جب وہ رسالت کا دعویٰ کریں تو خود ان کی یہی زندگی ان کی تصدیق کا بڑا سامان ہو جائے۔

اگر بالفرض رسالت کسب واکتساب کا ثمرہ ہوتی تو رسولوں کی بعثت یا فترت کا مدار عبادت کی سرگرمی یا عبادت میں سرد مہری پر ہوتا حالانکہ یہاں معاملہ برعکس ہے یعنی جتنی عبادت زیادہ ہوئی اسی قدر رسولوں کی آمد میں تاخیر ہوئی اور جتنی گمراہی وضلالت نے شدت اختیار کی اسی قدر رسولوں کی آمد کا زمانہ قریب تر ہوتا گیا۔ پھر جب خدا کا کوئی رسول آگیا اس کی زیر قیادت عبادت کر کے ایک بھی رسول نہیں بنا اور جب اس کی تعلیمات کے نقوش مٹنے لگے تو ایسے ایسے رسولوں کی آمد ہوئی جن کا پہلی شریعت سے کوئی تعلق بھی نہ تھا یا تعلق تھا تو ادر نسخ کا تعلق تھا اس لئے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں ہے کہ رسول کسی عبادت وریاضت سے نہیں بنتے بلکہ خود بنے بنائے آتے ہیں۔ قرآن کریم کے لفظ ”یَاْتِیَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ“ میں بھی اسی کی طرف اشارہ نکلتا ہے۔ یعنی اے بنی آدم تم میں کوئی فرد عبادت کر کے خود رسول نہیں بنے گا بلکہ رسول تمہارے پاس اس طرح آئے گا جیسا کہ حکومت کی جانب سے کوئی حاکم مقرر ہو کر آیا کرتا ہے ڈگریاں بڑی سے بڑی حاصل کی جاسکتی ہیں مگر حکومت کا کوئی عہدہ بلا انتخاب

مت حاصل نہیں ہوتا ہاں لیاقت و استعداد کے بعد اس کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ
حکومت اگر اسے انتخاب کرنا چاہے تو کرلے اسی طرح رسالت و نبوت کی کیفیت ہے یہ ایک
مب اور عہدہ ہے نہ کہ انسان کے ممکن الحصول ارتقائی کمالات میں کوئی کمال۔ ہاں اس
مب کے متعلق کچھ کمالات ہیں جو اس منصب پر موقوف ہیں اس لئے حدیث میں ارشاد ہے
ان بعدی نبی لکان عمر یعنی میری امت میں اگر بلحاظ کمال دیکھا جائے تو عمر میں رسالت
صلاحیت موجود ہے مگر چونکہ منصب نبوت پر تقرر کے لئے اب کوئی جگہ باقی نہیں رہی اس
ئے نبی نہیں ہیں۔ اسی طرح فرمایا۔

لو عاش ابراھیم لکان صدیقا نبیا۔ — ابراہیم (فرزند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) اگر جیتے تو صدیق نبی ہوتے۔

یعنی ان کا جوہر استعداد بھی نہایت بیش قیمت تھا انسانوں میں نبی بلکہ صدیق نبی بننے
ے لائق تھے مگر یہاں ایک اور مانع بھی پیش آگیا تھا وہ یہ کہ ان عمر وفا نہ کر سکی۔ امت میں ان
و شخصوں کے متعلق تو خود زبان نبوۃ سے تصریح آگئی کہ بلحاظ لیاقت و کمال یہ دونوں منصب
نبوۃ کے قابل تھے جنہیں سے حضرت ابراہیم کی تو عمر ہی نے وفا نہ کی۔ حضرت عمرؓ کی عمر ہوئی تو تقررِ
وت کا زمانہ نہ رہا تھا ان کے علاوہ خدا ئے تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ اس امت میں اور کتنے
نسان ایسے گذر گئے ہوں گے جو بلحاظ نفسی کمالات انبیاء سے کتنے مشابہ ہوں گے مگر عالم تقدیر
یں چونکہ دنیا ہی کا ختم کر دینا ٹھیر چکا تھا اس لئے کوئی اس منصب پر نوازا نہیں گیا اور دنیا
ی تاریخ جس طرح کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے شور مچا مچا کر رسولوں کی آمد آمد پکار
ہی تھی۔ اب یہ کہہ کر خاموش ہو گئی کہ دنیا کا آخری راہنما آچکا اب اس کے بعد کوئی رسول
نہیں ہوگا۔ بہرحال تمام رسولوں کی تاریخ سے ہمیں یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ کسی ریاضت و عبادت
کے صلہ میں رسول نہیں بنتے بلکہ عین لاعلمی کی حالت میں اچانک خدا کی طرف سے منصب رسالت
پر مامور ہو جاتے ہیں۔

O

انقلاب ایران کی حقیقت
قائد انقلاب کے عقائد و نظریات کی روشنی میں

از مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

انقلاب ایران ادھر ایک سال سے ہمارے ملک میں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ جماعت اسلامی، مسلمانوں کا جدت پسند اور عصری علوم و فنون سے وابستہ طبقہ اسے اسلامی انقلاب سمجھتا ہے۔ اور جو لوگ ان کی رائے سے اتفاق نہیں رکھتے انھیں فرسودہ خیال، قدامت پسند حالات زمانہ سے بے خبر اور اتحاد دشمن جیسے اہانت آمیز خطابات سے نوازتے ہیں یہ گروہ اپنی رائے میں اس درجہ شدت رکھتا ہے کہ قائد انقلاب " علامہ خمینی "، اور ان کے برپا کئے ہوئے اس انقلاب کے خلاف ایک حرف بھی سننا اسے گوارہ نہیں ہے۔ چنانچہ ایس، آئی، ایم کی سہ روزہ کانفرنس منعقدہ ۲۶، ۲۷، ۲۸ اکتوبر ۱۹۸۴ء میں مولانا سید سلمان حسینی استاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ نے " علامہ خمینی " اور انقلاب ایران کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے جب بعض باتیں ایسی بھی کہہ دیں جو ایس، آئی، ایم کے نظریہ کے مطابق نہیں تھیں، تو بس اتنے سے جرم پر خود کانفرنس کے داعیوں کا تیور بدل گیا اور انھوں نے اپنے مہمان خصوصی مولانا موصوف اور ان کے رفقاء کے ساتھ جس ناقابل تصور انسانیت سوز حرکت کا مظاہرہ کیا وہ اپنی نوعیت کا نہایت المناک واقعہ ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس جماعت کو اپنی رائے پر کس حد تک اصرار ہے۔ اس کے بالمقابل قدیم تعلیم یافتہ، اور مذاہب عالم پر مبصرانہ نگاہ رکھنے والے حضرات ہیں جو اس انقلاب کو اسلامی انقلاب ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں اور بڑی حد تک یہ حضرات بھی اپنی رائے میں جزم اور پختگی رکھتے ہیں۔

جماعت اسلامی اور اس کے ہم خیال گروہ کی تائید خود علامہ خمینی اور ان کے برق رفتار پریس سے بھی ہو رہی ہے۔ جو ابلاغ و ترسیل کے تمام تر ذرائع کو کام میں لاکر یہ نعرہ بلند کر رہے ہیں کہ "ثورۃ اسلامیۃ لا شیعۃ ولا سنیۃ" اور ان کا پریس مسلسل اعلان کئے جا رہا ہے کہ پوری دنیا میں یہ واحد اسلامی انقلاب ہے جو اسلام کے اقتدار اور کتاب سنت کے نفاذ کے لئے برپا کیا گیا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ملت اسلامیہ متحد ہو کر قائد انقلاب امام خمینی کی قیادت میں اسلام دشمن طاقتوں کا مقابلہ کرے، اسی کے ساتھ علامہ خمینی کے نمائندے اور پوری دنیا میں پھیلے ہوئے مملکت ایران کے سفارت خانے بھی پوری قوت سے دنیا میں یہ بات پھیلا رہے ہیں کہ ایران کا یہ انقلاب درحقیقت اسلامی انقلاب ہے، جو اس وقت اتحاد بین المسلمین کی ایک علامت ہے، اس کی تائید اور حمایت، دنیا کے تمام بیکسوں اور مظلوموں کی حمایت ہے، اسلام اور اقتدار اسلام کی حمایت ہے۔ اس لئے ہر مسلمان کا دینی اور مذہبی فریضہ ہے کہ وہ اپنے فروعی اور فقہی اختلافات سے بالاتر ہو کر وحدت کلمہ وحدت قبلہ، وحدت کتاب اور وحدت رسول کی بنیاد پر امام خمینی کے پرچم کے نیچے جمع ہو جائے۔

علامہ خمینی کی اس عمومی دعوت کے بعد ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ ہم اسے کتاب و سنت کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھیں اگر ان بلند بانگ دعوؤں کے مطابق واقعی یہ انقلاب اسلام کے معیار پر پورا اتر رہا ہے تو اس کی حمایت و نصرت اور تائید و تقویت ہمارے لئے شرعی اعتبار سے ضروری ہو جائے گی۔ اور اگر وہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا تو پھر اس کی تردید و مخالفت بھی اسی طرح لازم ہو گی اس میں کسی قسم کی مساہلت و مداہنت شرعاً درست نہ ہو گی۔ یہ تحقیق و تفتیش اور جانچ پڑتال اس وقت اور بھی ضروری ہو جاتی ہے جب ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ دعوت ایک ایسی شخصیت کی جانب سے دی جا رہی ہے جو صرف ایک مذہبی پیشوا ہی نہیں بلکہ ایک عظیم سیاسی لیڈر بھی ہے۔ کیونکہ اکثر اسلام مخالف سیاسی تحریکیں قرآن و سنت اور اتحاد بین المسلمین ہی کے پرشور نعروں کے ساتھ اٹھی ہیں اس بحث و تحقیق کے بغیر اس انقلاب کے بارے میں رد یا قبول کا کوئی بھی پہلو نہ مناسب ہے اور نہ معقول۔ اس لئے کسی فیصلہ سے پہلے اس کی واقعیت کو معلوم کر لینا از بس ضروری ہے۔

کسی دعوت و تحریک کے صحیح رخ کو جاننے اور اس کی اصل حقیقت تک پہنچنے کا سیدھا اور معقول راستہ یہ ہے کہ اس کے قائد اور رہنما کے افکار و نظریات کا جائزہ لیا جائے جس کی

قیادت اور سربراہی میں یہ تحریک پروان چڑھ رہی ہے۔ کیونکہ ہر تحریک اور ہر انقلاب کا مرکز و محور اس کے اپنے قائد کے افکار و نظریات ہی ہوتے ہیں جس کے گرد اس کا سارا نظام گردش کرتا ہے۔

"علامہ خمینی" مذہب شیعہ کے مشہور فرقہ اثنا عشریہ کے نہ صرف متبع اور پابند ہیں بلکہ اس کے زبردست عالم، مجتہد، پیشوا اور داعی و نقیب بھی ہیں۔ اور ان کی قیادت میں ایران کے اندر جو سیاسی انقلاب آیا ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں وہاں جو حکومت قائم ہوئی ہے اس کی تنظیم و تشکیل مذہب اثنا عشریہ ہی کے اصول و منہاج پر کی گئی ہے۔ چنانچہ "دستور ایران کی دفعہ ۱۲" میں صراحت کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ اس حکومت کا مذہب "الجعفری الاثناعشری" ہوگا۔ یہ دفعہ دستور کی ان اساسی و بنیادی دفعات میں سے ہے جس میں کسی قسم کا تغیر اور حذف و ترمیم نہیں ہو سکتی۔

المادة الثانية عشر: "الدين الرسمي لايران هو الاسلام والمذهب الجعفري الاثنى عشري"، وهذه المادة غير قابلة للتغيير (۱)	دفعہ ۱۲:- ایران کا دین: اسلام ہے اور مذہب جعفری اثنا عشری۔ اس دفعہ میں کبھی کوئی ترمیم نہیں ہو سکتی۔

اور حکومت کے نظام عمل کی تعیین و تحدید دستور کے دفعہ ۲ میں اس طرح کی گئی ہے

الجمهورية الاسلامية نظام على الامامة والقيادة المستمرة وان هذا النظام يقوم على اساس الكتاب وسنة المعصومين (۲)	جمہوریہ اسلامیہ (ایران) کا نظام جاری رہنے والی امامت و قیادت پر ہے جو کتاب اور ائمہ معصومین کی سنت کی بنیاد پر قائم ہے۔

اس مملکت جمہوری اسلامی کا سربراہ اور امیر کن صفات کا حامل ہوگا اس کی وضاحت دستور کے دفعہ ۵ میں ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

تكون ولاية الامر والامة في غيبة الامام المهدي عجل الله فرجه في جمهورية ايران الاسلامية للفقيه العادل التقي العارف بالعصر الخ (۳)	امام مہدی کے غیبت کے زمانہ میں جمہوریہ اسلامیہ ایران کا امیر و امام اپنے عہد کا فقیہ، عادل، پاکباز اور عارف باللہ ہوگا۔

دستور کی ان دفعات سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ علامہ خمینی کا برپا

۱، ۲، ۳ الخمینی بین التطرف والاعتدال ص ۵۵ تالیف ڈاکٹر عبداللہ محمد غریب۔

کیا ہوا انقلاب مذہب شیعہ کے فرقۂ اثنا عشریہ کی بنیادوں پر قائم ہے، یہی انکشاف خود علامہ خمینی کی تحریروں سے بھی ہوتا ہے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ لہٰذا اب ضرورت ہے کہ فرقۂ اثنا عشریہ کے عقائد واصول اور اعمال و فروع کا قرآن وسنت کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تاکہ ان کے برپا کئے ہوئے انقلاب کے بارے میں صحیح فیصلہ تک پہنچا جاسکے کہ وہ اسلامی انقلاب ہے یا غیر اسلامی۔

(۱) مسئلہ امامت شیعہ بالخصوص فرقۂ اثنا عشریہ کے مذہب کی عمارت درحقیقت عقیدہ امامت ہی کی بنیاد پر قائم ہے چنانچہ فلسفۂ تاریخ کے امام علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں۔

ومذاهبهم جميعا متفقون عليه ان الامة ليست من المصالح العامة التى تفوض الى نظر الامة ويتعين القائم بها بتعيينهم بل هو ركن الدين وقاعدة الاسلام ولا يجوز لنبى اغفاله ولا تفويضه الى الامة بل يجب عليه تعيين الامام لهو ويكون معصوما من الكبائر والصغائر وان عليا رضى الله عنه هو الذى عليه صلوات الله وسلامه (۱)	مذہب شیعہ کے تمام فرقے اس پر متفق ہیں کہ امامت مصالح عامہ میں سے نہیں ہے کہ اسے فکر ورائے پر چھوڑ دیا جائے اور امام کا تقرر ان کے مقرر کرنے سے ہو۔ بلکہ یہ دین کا رکن اور اسلام کی بنیاد ہے اور پیغمبر کے لئے نہ اس سے غفلت برتنا جائز ہے اور نہ اسے امت کے سپرد کرنا بلکہ اس پر واجب ہے کہ خود امت کے لئے امام نامزد کر جائے اور امام کبیرہ وصغیرہ گناہوں سے پاک اور معصوم

ہوگا چنانچہ حضرت علی صلوات اللہ وسلامہ کی وہ عظیم شخصیت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منصب امامت پر متعین فرمایا۔

علامہ خمینی ولایت وامامت کے سلسلہ میں خود اپنا عقیدہ بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

نحن نعتقد بالولاية و نعتقد ضرورة ان يعين النبى خليفة من بعده و قد فعل (۲)	ہم امامت کا عقیدہ رکھتے ہیں اور ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے بعد کیلئے خلیفہ متعین کریں اور آپؐ نے ایسا کیا

علامہ خمینی تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ فریضۂ رسالت کی تکمیل اور ادائے گی امام وخلیفہ کے متعین کرنے پر موقوف تھی اگر بالفرض آپؐ اپنے بعد کے لئے خلیفہ متعین نہ کر جاتے تو فریضۂ رسالت

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص ۱۶۴ ۔ (۲) الحکومۃ الاسلامیہ ص ۱۸ بحوالہ انقلاب ایران امام خمینی اور شیعیت مولفہ مولانا منظور نعمانی ۔

کی ادائیگی میں کوتاہی کے مرتکب ہوتے (نعوذ باللہ من ہذہ الصفوۃ) ملاحظہ ہو ان کی اصل عبارت

وکان تعیین خلیفۃ من بعدہ عاملا متمما ومکملا لرسالتہ (۱)

اور اپنے بعد کے لئے خلیفہ متعین کرجانا وہ عمل تھا جس سے آپ کے فریضۂ رسالت کی تکمیل ہوتی۔

ایک دوسرے موقع پر مزید وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں۔

بحیث کان یعتبر الرسول لولا تعیین الخلیفۃ من بعدہ غیر مبلغ رسالتہ (۲)

اگر رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے بعد کے لئے خلیفہ نامزد نہ کرتے تو سمجھا جاتا کہ آپ نے رسالت کا فریضہ ادا نہیں کیا۔

اور بات اسی پر ختم نہیں ہوجاتی کہ یہ ان کا اپنا عقیدہ ہے بلکہ وہ اس عقیدہ کی دوسروں تک دعوت وتبلیغ کو بھی ضروری سمجھتے ہیں چنانچہ وہ اپنے ماننے والوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ تمام لوگوں کو ولایت کی حقیقت بتادو اور یہ اعلان کردو کہ ہم ولایت وامامت کا اعتقاد رکھتے ہیں اور ہمارا یہ نظریہ ہے کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اللہ کے حکم سے اپنا خلیفہ نامزد فرمایا تھا۔

عرفوا الولایۃ للناس کما ھی قولوا لھم انا نعتقد بالولایۃ وبان الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) استخلف بامر اللہ (۳)

تم لوگوں کو امامت کی حقیقت سمجھا دو اور ان سے کہدو کہ ہم امامت پر اعتقاد رکھتے ہیں اور ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ رسولؐ نے اللہ کے حکم سے اپنا خلیفہ نامزد کیا۔

علامہ خمینی کے عقیدہ کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امر خداوندی کے مطابق اپنے بعد کے لئے امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کو لوگوں پر حاکم اور والی ہونے کی حیثیت سے نامزد فرمایا پھر امامت وولایت کا یہ منصب ایک امام سے دوسرے امام تک منتقل ہوتا رہا جس کا جس کا سلسلہ امام غائب مہدی منتظر پر جاکر ختم ہوگیا۔ علامہ خمینی لکھتے ہیں۔

قد عین من بعدہ والیا علی الناس امیر المومنین واستمر الولایۃ من

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد کے لئے امیر المومنین علیؓ کو لوگوں پر حاکم نامزد فرمایا

---

(۱) الحکومۃ الاسلامیۃ للخمینی ص ۱۹ بحوالہ سابق (۲) الحکومۃ الاسلامیۃ للخمینی ص ۲۲ بحوالہ سابق (۳) الحکومۃ الاسلامیۃ ص ۲۰ بحوالہ الخمینی بین التطرف والاعتدال۔

امام الی امام الی ان انتھی الامر الی الحجۃ القائم (۱) اور امامت کا یہ منصب ایک امام سے دوسرے تک پہنچتا رہا یہاں تک کہ یہ سلسلہ امام الحجۃ (امام غائب) پر آکر ختم ہو گیا۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ شیعوں کا یہ بنیادی اور اساسی عقیدہ ہے اور اسکی اہمیت کے پیش نظر علامہ خمینی نے بھی اپنی مشہور کتاب الحکومۃ الاسلامیہ اور دوسری تصانیف میں اس پر خاصا زور صرف کیا ہے اور مختلف اسلوب سے بار بار اس مسئلہ سے متعلق اپنے عقیدہ و نظریہ کی وضاحت کی ہے۔

عقیدۂ امامت پر ایک نظر

آئیے علامہ خمینی کے اس عقیدہ کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ ان کا یہ عقیدہ کتاب و سنت سے کس حد تک مطابقت رکھتا ہے قرآن مبین اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے جتنے اہم اور بنیادی عقائد ہیں، مثلاً توحید، رسالت، آخرت وغیرہ انھیں کتاب و سنت میں بغیر کسی پیچیدگی کے صاف صاف صریح اور واضح الفاظ میں اس قطعیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ان میں نہ کوئی اشتباہ ہے اور نہ کسی تاویل کی گنجائش۔ اس کے برخلاف مسئلہ امامت کو دیکھئے! پورے قرآن اور سارے ذخیرہ حدیث میں آپ کو ایک آیت اور ایک صحیح حدیث ایسی نہیں ملے گی جس میں وضاحت و صراحت کے ساتھ اس عقیدہ کو بیان کیا گیا ہو۔ قرآن و حدیث کی اس مسئلہ کی جانب سے یہ بے اعتنائی اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ مسئلہ امامت میں شیعی نقطۂ نظر (جس پر بقول علامہ خمینی فریضۂ رسالت کی ادائے گی کی تکمیل موقوف ہے) خود ان کا ایجاد کردہ اور گھڑا ہوا ہے جس کا دین اسلام سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہے۔

یہ نقطۂ نظر اس پہلو سے بھی قطعی غلط اور باطل ہے کہ اس عقیدہ کو تسلیم کر لینے کے بعد حضرات خلفاء ثلثہ (صدیق اکبر، فاروق اعظم، عثمان غنی رضی اللہ عنہم) وہ حیثیت جو خدا اور رسول خدا کی جناب سے انھیں عطا کی گئی بالکل مسخ ہو جاتی ہے اور یہ حضرات خلیفہ راشد کے بجائے (نعوذ باللہ) امیر غاصب اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اطاعت گذار اور فرماں بردار

---

(۱) الحکومۃ الاسلامیۃ للخمینی ص ۹۸۔

ہونے کے برعکس انتہائی مخالف اور نافرمان ٹھہرتے ہیں کہ آپؐ کے دنیا سے پردہ فرمانے ہی آپ کے نامزد خلیفۂ برحق کو پس پشت ڈال کر خود امام و خلیفہ بن بیٹھے۔ اور دیگر تمام صحابہ اور خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر بھی الزام آئے گا کہ انھوں نے متفقہ طور پر غیر مستحق لوگوں کی امامت و ریاست کو کیسے قبول کر لیا اور مدت العمر ان کی اطاعت و اعانت اور تعریف و توصیف کیسے کرتے رہے۔ پھر بات یہیں پر آکر ختم نہیں ہوگی بلکہ اس صورت میں لازمی طور پر یہ ماننا ہوگا کہ جس معلم اخلاق اور ہادیٔ اعظم کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اپنے بندوں کی ہدایت اور تعلیم و تربیت کے لئے بھیجا تھا وہ اپنی تیئیس سال کی تمام تر اور انتھک کوششوں کے باوجود چند افراد بھی ایسے تیار نہ کر سکا جو اس کے وفاشعار ہوتے اور جاری کئے ہوئے نظام کو برقرار رکھتے۔ کیا تہذیب و تمدن اور ادیان و ملل کی تاریخ میں کسی مصلح اور رہنما کی ناکامی کی ایسی مثال مل سکتی ہے۔

بات پہنچی ہے کہاں تک یہ تجھے کیا معلوم

اس مسئلہ سے متعلق اہل سنت اور جمہور مسلمین کے نظریہ کا حاصل یہ ہے کہ امام اور خلیفہ کا تقرر نہ اللہ تعالیٰ پر لازم ہے اور نہ رسول خدا نے کسی کو اپنے بعد کے لئے خلیفہ نامزد فرمایا اور نہ یہ آپ کی ذمہ داری تھی۔ بلکہ اس کا تعلق مصالح عامہ سے ہے اور خود مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی جماعت میں سے شرعی ضابطہ کے مطابق کسی شخص کو اپنا امیر و رئیس منتخب کر لیں اور شریعت کے بنائے ہوئے طریقہ کے مطابق اس کی اتباع اطاعت اور امداد و اعانت کریں چنانچہ اسی شرعی دستور کے مطابق حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت صدیق اکبر کو اپنا امام و امیر منتخب کیا اور مع حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے تمام صحابہ کرام امور شرعیہ میں ان کی اطاعت اور پیروی کو اپنے اوپر لازم سمجھتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد اسی دستور کے مطابق حضرت فاروق اعظم، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ عنہم علی الترتیب امیر و خلیفہ منتخب ہوئے یہ چاروں بزرگ خلیفہ راشد ہیں، اور ان کی خلافت خلافت راشدہ۔ فرقۂ شیعہ کے علاوہ یہی جمہور امت کا مذہب ہے۔ قرآن و حدیث اور عمل صحابہ سے اسی کی تائید و تصویب ہوتی ہے۔ تفصیل کے لئے ازالۃ الخفاء، تحفۂ اثنا عشریہ، اور امام اہل سنت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ کی اس موضوع سے متعلق کتابیں دیکھی جائیں۔

مذہب اثنا عشری میں ائمہ کا مرتبہ

شیعہ مذہب میں "ائمہ" ان محیر العقول اور ما فوق الفطرۃ ہستیوں کو کہتے ہیں۔ جن کی کائنات کے ذرے ذرے پر حکومت ہوتی ہے اور دنیا و آخرت دونوں انکے قبضے میں ہیں ان کا علم تمام چیزوں کو محیط ہوتا ہے، ماضی و مستقبل اور حاضر و غائب کی کوئی شے بھی ان سے مخفی نہیں ہوتی، ان کی موت خود ان کے اختیار اور فیصلہ کے تابع ہوتی ہے۔ وہ نہ صرف گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں بلکہ بھول، چوک سے بری اور وہم و شک سے بالاتر ہوتے ہیں۔ حضرات انبیاء (علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کی طرح فرشتے ان کے پاس وحی ربانی لے کر نازل ہوتے ہیں۔ حضرات انبیاء ہی کی طرح ان کی اطاعت بھی فرض ہوتی ہے۔ اور ان کی معرفت شرائط ایمان سے ہے (وغیرہ ذٰلک من الھفوۃ نعوذ باللہ) انبیاء و رسل سے بالاتر اور خدائی صفات کی حامل یہ شخصیتیں مذہب اثنا عشری کے اعتبار سے کل بارہ ہیں جن کے اسماء انھیں کی اصطلاح کے مطابق یہ ہیں۔

(۱) حضرت امیر المومنین امام علی مرتضیٰ علیہ السلام (۲) حضرت امام حسن علیہ السلام (۳) حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام (۴) حضرت امام زین العابدین علی علیہ السلام (۵) حضرت امام محمد باقر علیہ السلام (۶) حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام (۷) حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام (۸) حضرت امام علی رضا علیہ السلام (۹) حضرت امام محمد نقی علیہ السلام (۱۰) حضرت امام علی نقی علیہ السلام (۱۱) حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام۔
(۱۲) حضرت امام غائب حجۃ العصر محمد علیہ السلام۔ جن میں گیارہ حضرات تو دنیا میں تشریف لاکر اپنے اپنے عہد میں اللہ کی حجت قائم فرماکر دار آخرت کو سدھار گئے لیکن بارہویں امام اپنی پیدائش کے چوتھے یا پانچویں سال معجزانہ طور پر غائب ہوگئے اور اب تک زندہ ایک غار میں پوشیدہ ہیں شیعہ جن کے ظہور کے انتظار میں گھڑیاں گن رہے ہیں۔ شیعی نقطۂ نظر سے اس وقت وہی حجۃ اللہ فی الارض ہیں اور دنیا انھیں کے وجود با وجود سے قائم و برقرار ہے۔

ذیل میں ائمہ سے متعلق کتب شیعہ کے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

دنیا و آخرت ان کے زیر تصرف ہیں

محمد بن یعقوب کلینی الجامع الکافی میں امام علی رضا سے ـــــ نقل کرتے ہیں (اسلوم

ہونا چاہیے کہ الجامع الکافی کا شیعہ کے نزدیک وہی درجہ ہے جو اہل سنت والجماعت کے کے یہاں الجامع البخاری کا ہے۔

والارض کلها للامام قال الله تعالیٰ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ واهل البیت هم الذین اورثهم الله الارض وهم المتقون (۱)

تمام زمین امام کی ملک ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یقیناً زمین اللہ کی ہے اس کا وارث بناتا ہے جسے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اور انجام کار متقیوں کے لئے ہے اور اہل بیت ہی وہ بندے ہیں جنہیں اللہ نے زمین کا وارث بنایا اور یہی متقی ہیں۔

ایک دوسرے موقع پر امام جعفر صادق کا فرمان نقل کرتے ہیں۔

اما علمت ان الدنیا والاخرة للامام یضعها حیث شاء ویدفعها الی من یشاء (۲)

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ دنیا و آخرت امام کی ملکیت ہے وہ اسے جہاں چاہیں رکھیں اور جسے چاہے عطا کر دیں۔

ائمہ کو ماضی و مستقبل کا علم ہوتا ہے اور انکی موت انکے اختیار میں ہے

والائمة اذا شاءوا ان یعلم شیئاً اعلمهم الله بالد هو یعلمون متیٰ یموتون ولا یموتون الا باختیارهم وهو یعلمون علم ما کان وعلم مایکون ولا یخفیٰ علیهم شیئ (۳)

ائمہ جب کسی چیز کو جاننا چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں بتا دیتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ ان کی وفات کب ہوگی اور ان کی موت ان کے اختیار سے واقع ہوتی ہے جو کچھ ہو چکا ہے اور قیامت تک جو ہونے والا ہے سب کی انھیں خبر ہے ان پر کوئی بھی چیز پوشیدہ نہیں ہے

ائمہ گناہ اور بھول چوک سے بری ہیں

کلینی ہی امام علی رضا سے ائمہ کی صفات سے متعلق ایک طویل روایت نقل کرتے ہیں جس میں امام رضا فرماتے ہیں کہ

الامام المطهر من الذنوب والمبرأ من العیوب

امام تمام گناہوں سے پاک اور جملہ عیوب سے بری ہوتا ہے۔

---

(۱) الکافی ص ۲۸۹۔ (۲) الکافی ص ۲۵۹۔ (۳) ایضاً ص ۱۲۵ و ۱۲۶۔

اسی روایت میں آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں

فهو معصوم قد امن الخطاء والزلل والعشاء يخصه الله بذلك ليكون حجته على عباده وشاهده على خلقه (۱)

امام معصوم ہوتا ہے غلطی، بھول چوک اور لغزش سے محفوظ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے معصومیت کی خصوصیت سے اسے اس لئے نوازا ہے تاکہ وہ اللہ کے بندوں پہ اس کی طرف سے حجت ہو اور اس کی مخلوق پر اس کا شاہد و گواہ ہو۔

ائمہ پر فرشتے وحی لے کر نازل ہوتے ہیں

امام علی رضا سے ایک شخص نے رسول، نبی اور امام کے درمیان فرق معلوم کیا تو امام نے اس کے جواب میں فرمایا۔

الرسول هو الذي ينزل عليه جبريل فيراه ويسمع كلامه ويزل عليه الوحي، والنبي ربما يسمع الكلام وربما راى الشخص ولو يسمع، والامام هو الذي يسمع كلامه ولا يرى الشخص (۲)

رسول وہ ہے جس پر فرشتہ وحی لے کر نازل ہوتا ہے اور وہ فرشتہ کا کلام بھی سنتا ہے اور اس کی صورت بھی دیکھتا ہے اور نبی وہ ہے جو کبھی فرشتہ کا کلام سنتا ہے اور اس کی صورت نہیں دیکھتا اور کبھی صورت دیکھتا ہے اور کلام نہیں سنتا، اور امام وہ ہے جو صرف فرشتہ کا کلام سنتا ہے صورت نہیں دیکھتا۔

اللہ کی طرح امام کی معرفت بھی شرائط ایمان سے ہے

امام محمد باقر یا امام جعفر صادق سے یہی کلینی نقل کرتے ہیں کہ

عن احدهما انه قال لا يكون العبد مومنا حتى يعرف الله ورسوله والائمة كلهم وامام زمانه (۳)

امام باقر یا امام جعفر صادق سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ کوئی بندہ مومن نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ وہ اللہ اس کے رسول، تمام ائمہ اور خود اپنے زمانے کے امام کی معرفت حاصل نہ کرے۔

---

(۱) الکافی ص ۹۶ و ۹۷ بحوالہ الصراع بین الاسلام والوثنیہ (۲) ایضاً ص ۸۲ بحوالہ سابق۔
(۳) ایضاً ص ۱۰۵ ایران انقلاب امام خمینی و شیعیت۔

ائمہ رسول کے ہم مرتبہ ہیں اور رسولوں کی طرح ان کی اطاعت بھی فرض ہے

امام علی رضا فرماتے ہیں

والله امر بطاعتهم عن معصيتهم و هم بمنزلة رسول الله الا انهم ليسوا بانبياء ولا يحل لهم من النساء ما يحل للانبياء فاما ماخلا ذلك فهو بمنزلة رسول الله (۱)

اللہ تعالیٰ نے ائمہ کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور ان کی نافرمانی سے منع فرمایا ہے وہ رسول ہی کے درجہ میں ہیں البتہ رسول نہیں ہیں اور ان کے لئے عورتوں کی وہ تعداد جائز نہیں ہے جو انبیاء کے لئے جائز ہے اس کے علاوہ بقیہ تمام امور میں ائمہ رسول اللہ ہی کے درجہ میں ہیں۔

الکافی ہی میں امام جعفر صادق سے روایت ہے۔

عن ابی الصباح قال اشهد انی سمعت اباعبد الله يقول اشهد ان عليا امام فرض الله طاعته و الحسن امام فرض الله طاعته وان الحسين امام فرض الله طاعته وان علی بن الحسين امام فرض الله طاعته وان محمد بن علی امام فرض الله طاعته. (۲)

ابو الصباح سے روایت ہے انھوں نے کہا میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے امام جعفر صادق سے سنا وہ فرماتے تھے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ علی امام تھے اللہ نے ان کی اطاعت فرض کی ہے، حسن امام ہیں اللہ نے ان کی اطاعت فرض کی ہے. حسین امام ہیں اللہ نے ان کی اطاعت فرض کی ہے علی بن حسین امام ہیں اللہ نے ان کی اطاعت فرض کی ہے اور محمد بن علی امام ہیں اللہ نے ان کی اطاعت فرض کی ہے۔

ائمہ کے متعلق شیعی نقطۂ نظر معلوم کر لینے کے بعد آئیے اب امام خمینی قائد انقلاب کی تحریرات کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ ائمہ کے بارے میں ان کا عقیدہ و نظریہ کیا ہے۔

کائنات کا ذرہ ذرہ امام کے اقتدار کے آگے سرنگوں ہے

علامہ خمینی اپنی مشہور کتاب الحکومۃ الاسلامیہ میں ائمہ کا مرتبہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

فان للامام مقاما محمودا و درجة سامية وخلافة تكوينية تخضع لولايتها و

امام کو وہ اعلیٰ مقام اور بلند درجہ اور تکوینی حکومت حاصل ہوتی ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ان کے اقتدار و سلطنت

---

(۱) الکافی ص ۱۱۳۔ (۲) ایضا ۱۰۹ بحوالہ ایرانی انقلاب۔

سیطرتہا جمیع ذرات ھذا الکون (۱) کے آگے سرنگوں ہوتا ہے۔

ائمہ کا مرتبہ ملائکہ مقربین اور انبیاء و مرسلین سے بلند تر ہے

علامہ خمینی لکھتے ہیں کہ یہ ہمارے مذہب کا اساسی اور بنیادی عقیدہ ہے کہ ائمہ کا مقام و مرتبہ ملائکہ مقربین اور انبیاء مرسلین سے بھی بلند اور بالا تر ہے ملاحظہ ہو ذیل کی عبارت

ومن ضروریات مذھبنا ان لائمتنا مقاما لا یبلغہ ملک مقرب ولا نبی مرسل (۲)

ہمارے مذہب کے بنیادی عقائد میں سے ہے کہ ہمارے ائمہ کو وہ مقام و مرتبہ حاصل ہے جہاں تک مقرب فرشتہ اور نبی مرسل کی بھی رسائی نہیں۔

ائمہ سہو اور غفلت سے محفوظ ہیں

امام خمینی کے نزدیک ان کے ائمہ معصومین سہو وغفلت اور بھول چوک سے بھی محفوظ ہیں لکھتے ہیں۔

والائمۃ الذین لا نتصور فیھم السھو والغفلۃ (۳)

ائمہ وہ عظیم ہستیاں ہیں جنکے بارہ میں ہم بھول چوک اور غفلت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

ائمہ کی تعلیمات احکام قرآنی کی طرح واجب الاتباع ہیں

امام خمینی بھی شیعی معتقدات کی طرح ائمہ کو مفروض الطاعت سمجھتے ہیں چنانچہ اپنی اسی کتاب الحکومۃ الاسلامیہ میں تحریر کرتے ہیں۔

ان تعالیم الائمۃ کتعالیم القرآن لا تختص جیلا خاصا وانما ھی تعالیم للجمیع فی کل عصر ومصر والی یوم القیٰمۃ یجب تنفیذھا واتباعھا (۴)

ائمہ کی تعلیمات قرآنی تعلیمات ہی کی طرح ہیں وہ کسی خاص طبقہ کے ساتھ خاص نہیں ہیں بلکہ وہ ہر زمانہ اور ہر علاقہ کے لوگوں کے لئے ہیں اور تا قیامت ان کی تنفیذ اور ان کی اتباع واجب ہے۔

اگرچہ کتب شیعہ مثلاً اصول کافی، الوشیعہ، جلاء العیون، حیات القلوب، اساس الاصول وغیرہ "ائمہ" سے متعلق محیر العقول روایات سے بھری پڑی ہیں لیکن بخوف طوالت ہم اس افسانہ عجائب کو علامہ خمینی کی ایک تقریر کے اقتباس پر ختم کرتے ہیں۔ خمینی صاحب نے یہ سنسنی خیز

---

(۱) الحکومۃ الاسلامیۃ ص ۵۲ بحوالہ الخمینی بین التطرف والاعتدال۔ (۲) الحکومۃ الاسلامیۃ ص ۵۲ بحوالہ سابق۔ (۳) ایضاً ص ۹۱ بحوالہ سابق۔ (۴) ایضاً ۱۱۳ بحوالہ ایرانی انقلاب خمینی اور شیعیت

تقریر مشنل ٹیلی ویژن کے دوسرے حصہ کے افتتاح کے موقع پر کی تھی جسے ایران کے قومی اخبار ”تہران ٹائمز“ نے اپنی ۲۹ رجون ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں نقل کیا تھا اور اسی کے حوالہ سے سعودی عرب اور کویت کے روزنامہ الرای العام وغیرہ نے شائع کیا تھا۔ امام خمینی اپنی اس تقریر میں نوا سنج ہیں۔

”اب تک کے سارے رسول دنیا میں عدل و انصاف کے اصولوں کے قیام و نفاذ کے لئے آئے تھے لیکن وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔ حتیٰ کہ نبی آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو انسانیت کی اصلاح اور مساوات قائم کرنے کے لئے آئے تھے وہ بھی کامیاب نہ ہو سکے وہ واحد ہستی جو دنیا میں عدل و مساوات قائم کر سکتی ہے اور دنیا سے بد دیانتی کا خاتمہ کر سکتی ہے امام مہدی کی ہستی ہے اور وہ مہدی موعود ضرور ظاہر ہوں گے۔“

اس تقریر کو تہران ریڈیو نے بھی ۳۰ رجون ۱۹۸۰ء کو نشر کیا تھا حالانکہ یہ مہدی موعود جن کے مقابلہ میں (نعوذ باللہ) سید الانبیاء والمرسلین رحمۃ للعلمین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امام خمینی ناکام قرار دے رہے ہیں ایک افسانوی شخصیت سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتے اور ان کا وجود تاریخی دلائل سے اب تک ثابت نہیں کیا جا سکا ہے بلکہ جو بات ان کے بارے میں ثابت ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسی مفروضہ ہستی ہے جو نیست سے ہست ہوئی ہی نہیں چنانچہ امام حسن عسکری (جنھیں مہدیٔ موعود اور امام منتظر کا والد قرار دیا جاتا ہے) کے متعلق تاریخ کی یہی شہادت ہے کہ وہ لاولد فوت ہوئے جیسا کہ خود ان کے بھائی جعفر نے بادشاہ وقت کے سامنے یہ شہادت دی تھی کہ میرے بھائی حسن عسکری لاولد فوت ہوئے ہیں اور ان کی جائداد دوسروں میں تقسیم کر دی گئی ہے یہ ہے حقیقت امام منتظر اور حجۃ العصر کی جن کے متعلق یہ بلند بانگ دعوے کئے جا رہے ہیں **فیا للعجب**۔

اب ذیل کی سطور میں ائمہ سے متعلق اوپر ذکر کئے گئے شیعی عقائد کا خلاصہ نقل کیا جا رہا ہے۔

شاید آپ کے ذہن میں یہ بات کھٹکتی ہو کہ جب سرے سے امام حسن عسکری کے کوئی اولاد ہی نہیں تھی تو اثنا عشریہ کو آخر ایسی کون سی مجبوری پیش آگئی کہ انھیں خواہ مخواہ کے لئے امام حسن عسکری کا ایک فرضی بیٹا گھڑنا پڑا ، تو معلوم ہونا چاہیئے کہ اتنے بڑے تاریخی جھوٹ بولنے پر خود ان کا عقیدہ انھیں مجبور کر رہا ہے۔ چونکہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ امام حسین کے بعد سلسلۂ امامت

اماموں ہی کے اولاد سے وابستہ رہے گا۔ اس لئے جب ان کے گیارھویں امام حضرت امام حسن عسکری لاولد فوت ہوگئے تو انھیں اس عقیدہ کی بنا پر یہ مشکل پیش آگئی کہ اب بارھویں اور آخری امام کس کو قرار دیا جائے بالآخر اس مشکل کے حل کی یہ تدبیر نکالی گئی کہ مشہور کر دیا گیا کہ امام حسن عسکری کی وفات سے چار پانچ سال قبل ان کے ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جسے مصلحتاً لوگوں کی نگاہوں سے چھپا کر رکھا جاتا تھا اس لئے کوئی انھیں دیکھ نہ سکا پھر اپنے والد کی وفات سے دس دن پہلے ہی یہ غائب ہوگئے اور تقریباً ساڑھے گیارہ سو سال سے غیبوبیت ہی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ یہ ہے امام غائب موعود منتظر کی طلسماتی داستان اب آپ خود فیصلہ فرمائیں کہ حقیقت واقعہ کیا ہے!

ائمہ سے متعلق علامہ خمینی اور ان کے مذہب اثنا عشریہ کے عقائد کی بحث کے اختتام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حاصل کلام کے طور پر ان عقائد کا خلاصہ پیش کر دیا جائے تاکہ پوری بات پیش نظر رہے اور مقصد تحقیق تک پہنچنے میں آسانی ہو۔

خلاصۂ بحث

(۱) اماموں کا اقتدار کائنات کے ذرہ ذرہ پر ہے دنیا و آخرت دونوں انکے قبضۂ التصرف میں ہیں

(۲) اماموں کا علم تمام ماکان و مایکون کو محیط ہے اور کوئی ظاہر و پوشیدہ شے ان کے علم سے باہر نہیں۔

(۳) اماموں کو نہ صرف اپنی موت کا علم ہوتا ہے بلکہ ان کی موت خود ان کے اختیار میں ہوتی ہے۔

(۴) اماموں کی معرفت شرائط ایمان سے ہے

(۵) اماموں کی اطاعت خدا و رسول کی طرح فرض اور ان کی تعلیمات قرآنی تعلیم کی طرح ہمہ گیر اور واجب الاطاعت ہیں۔

(۶) امام تمام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔

(۷) امام بھول چوک اور خطا و نسیان سے بھی بری ہوتے ہیں۔

(۸) اماموں کے پاس فرشتہ وحی ربانی لے کر نازل ہوتا ہے۔

ان مذکورہ عقائد پر ایک اجمالی نظر

اب ترتیب وار ہر عقیدے پر اجمالی نظر ڈالتے چلئے تاکہ معلوم ہوجائے کہ یہ عقائد

قرآن وحدیث سے کس حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔

۱۔ اس عقیدہ کے ذریعہ درحقیقت علامہ خمینی اور ان کے اہل مذہب نے اپنے اماموں کو خدائی کے درجہ میں پہنچادیا ہے کیونکہ کائنات کے ذرہ ذرہ کا اقتدار اور دنیا و آخرت میں تصرف مطلق یہ خاص اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کوئی مخلوق بھی خواہ وہ ولی، امام، نبی اور رسول ہی کیوں نہ ہو کسی کو بھی یہ اختیار و اقتدار حاصل نہیں ہے۔ ارشاد ربانی ہے "ولہ ملک السمٰوٰت والارض" الآیۃ زمین اور آسمان کی حکومت اسی کی ہے۔ ایک دوسری جگہ ارشاد ربانی "الا لہ الخلق والامر" غور سے سن لو ساری مخلوقات اور تمام معاملات اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ ایک جگہ یوں ارشاد ہے۔ "اَللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ اے اللہ اے ملک کے مالک آپ جسے چاہتے ہیں ملک عطا کرتے ہیں اور جس سے چاہتے ہیں چھین لیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں عزت سے نوازتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ذلیل کر دیتے ہیں آپ ہی کے قبضۂ تصرف میں تمام بھلائیاں (اور برائیاں) ہیں یقیناً آپ ہر چیز پر قدرت رکھتے ہیں۔ غرضیکہ قرآن مجید میں اس قسم کی بے شمار آیتیں ہیں جن سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو تصرف مطلق حاصل ہے اور اسی کے اقتدار اور سلطنت میں پوری کائنات ہے خدائے وحدہ لاشریک لہ کی اس قدرت کاملہ اور تصرف عامہ میں نہ کوئی شریک وساجھی ہے اور نہ ہی سہیم ومساوی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیعوں نے اپنے اماموں کے بارے میں یہ عقیدہ عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث سے سرقہ کیا ہے۔

(۲) یہ بھی خالص شرکیہ عقیدہ ہے کیونکہ ماکان ومایکون کا علم سوائے ذات وحدہ لاشریک لہ کے کسی کو بھی نہیں ہے لایخفیٰ علیہ شئی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفت ہے ملاحظہ ہوں درج ذیل آیات قرآنیہ۔

(۱) وللہ غیب السمٰوٰت والارض وَالیہ یُرجع الامر کُلُّہ۔ آسمان و زمین کے کل مخفیات کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اور اسی کی طرف تمام امور لوٹتے ہیں۔

بس یہ اللہ ہی کی شان ہے کہ زمین و آسمان کی کوئی مخفی چیز بھی اس کے علم محیط سے باہر نہیں قاضی بیضاوی "وللہ غیب السمٰوٰت والارض" کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "خاصۃ

لا یخفی علیہ خافیۃ فیھما الفاظ کے فرق کے ساتھ یہی تفسیر خازن مدارک، السراج المنیر اور جامع البیان میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ (۱)

(۲) وللّٰہِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا اَمْرُ السَّاعَۃِ اِلَّا کَلَمْحِ الْبَصَرِ — صرف اللہ ہی کے علم میں آسمان و زمین کے مخفیات ہیں اور نہیں قیامت کا وقوع مگر پلک جھپکنے کی طرح ہے

امام ابو مسعود اس آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں ای وللہ خاصۃ لا لاحد غیرہ استقلالا ولا اشتراکا غیب السموٰت والارض ای الامور الغائبۃ عن علوم المخلوقین قاطبۃ (۲) یعنی خاص اللہ ہی کو ہے اس کے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں نہ مستقل طور پر اور نہ مشترک طور پر آسمان و زمین کے غیب کا علم یعنی ان امور کا علم صرف اللہ ہی کو ہے جو تمام مخلوق کے علم سے غائب ہیں۔

(۳) قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ — تو کہہ دے نہیں جانتے ہیں غیب کو جو آسمان و زمین میں ہیں سوائے اللہ کے

علامہ ابن القیم نے اس آیت کریمہ کی نہایت عمدہ تفسیر فرمائی ہے وہ لکھتے ہیں ان من فی السمٰوت والارض ھھنا ابلغ صیغ العموم ولیس المراد بھا معینا فھی فی قوۃ احد المنفی بقولک یعلم احد الغیب اللہ واتی فی ھذا بذکر السموات والارض تحقیقا لارادۃ العموم والاحاطۃ فالکلام مود معنی لا یعلم احد الغیب الا اللہ الخ (۳) یعنی من السمٰوت والارض اس جگہ عموم کا بلیغ ترین صیغہ ہے ان کا معنی متعینہ مراد نہیں ہے اس لئے یہ جملہ لا یعلم احد الغیب الا اللہ کا معنی ادا کر رہا ہے اور السمٰوات والارض کا ذکر عموم میں وسعت اور گہرائی پیدا کرنے کے لئے کیا گیا ہے اس لئے آیت شریفہ کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی غیب کو نہیں جانتا۔

ملا علی قاری شرح فقہ اکبر میں لکھتے ہیں ان الانبیاء لم یعلموا المغیبات من الاشیاء الا ما اعلمھم اللہ احیانا وذکر الحنفیۃ تصریحا بالتکفیر باعتقاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعلم الغیب لمعارضۃ قولہ تعالیٰ یعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللہ۔

---

(۱) بیضاوی ج ۱ ص ۳۳۹۔ خازن ج ۳ ص ۲۱۲۔ مدارک ج ۲ ص ۱۶۱۔ السراج المنیر ج ۲ ص ۸۵۔ جامع البیان ج ۱ ص ۱۸۷۔ (۲) ابو سعود ج ص ۳۵۷۔ (۳) بدائع الفوائد ج ۳ ص ۶۳

یقیناً حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام مخفی اشیاء کو نہیں جانتے مگر ـــــ جن کا علم کبھی کبھی اللہ تعالیٰ انھیں عطا فرما دیتا ہے اور علماء احناف نے اس شخص کی تکفیر کی صراحت کی ہے جو یہ اعتقاد رکھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غیب کو جانتے تھے۔ جب حضرات انبیاء کا معاملہ اس بارے میں یہ ہے تو پھر ائمہ را چہ رسد۔

(۴) شیعوں کا یہ عقیدہ بھی قرآن حکیم اور حدیث نبوی کے صریح خلاف ہے ملاحظہ ہو آیت کریمہ

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ۔	یقیناً اللہ کے پاس قیامت کا علم ہے اور اللہ تعالیٰ بارش برساتا ہے اور جانتا ہے کہ ماؤں کے رحم میں کیا ہے اور نہیں جانتا کوئی کہ کل کیا کرے گا اور کسی کو معلوم نہیں کہ کہاں اس کی موت واقع ہوگی بلاشبہ اللہ جاننے والا خبر رکھنے والا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مفاتیح الغیب خمس لا یعلمہن	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مفاتیح غیب پانچ ہیں جن کو سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا۔ پھر

الا اللہ ان اللہ عندہ علم الساعۃ الخ (۱) آپ نے اوپر درج کی ہوئی آخر تک آیت کریمہ تلاوت فرمائی جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان پانچ امور کا علم کسی کو نہیں ہے اور ان میں ایک موت بھی ہے۔

عقائد ۴، ۶/۵ اور ۸ کے ذریعہ شیعوں نے اپنے ائمہ کو انبیاء و رسل کے درجہ میں لاکر بیٹھا دیا ہے کیونکہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی وہ مخصوص ہستیاں ہیں جن کی معرفت ضروری ہے اور صرف وہی مفروض الطاعت ہیں گناہوں سے عصمت انہیں کے لوازم میں سے ہے وحی کا نزول انھیں کے ساتھ مختص ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جن میں تمام بنی نوع بشر سے حضرات انبیاء امتیاز رکھتے ہیں۔ یہی تمام امت کا عقیدہ ہے اور قرآن وحدیث سے یہی ثابت ہے۔ تفصیل اور دلائل کے لئے کتب عقائد کا مطالعہ کیا جائے درحقیقت فرقۂ شیعہ نے ان عقائد کے درپردہ ختم نبوت کے قطعی عقیدہ کا انکار کیا ہے اور یہ کھلا ہوا زندقہ ہے چنانچہ امام ولی اللہ محدث دہلوی۔ کافر، منافق اور زندیق میں باہم فرق کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

---

(۱) الجامع الصحیح للبخاری

ان المخالف للدين الحق ان لم يعترف به ولم يذعن له لا ظاهرا ولا باطنا فهو كافر وان اعترف بلسانه وقلبه على الكفر فهو المنافق وان اعترف به ظاهرا لكن يفسر بعض ما ثبت من الدين ضرورة بخلاف ما فسره الصحابة والتابعون واجتمعت عليه الامة فهو الزنديق كما اذا اعترف بان القرآن حق وما فيه من ذكر الجنة والنار حق والمراد بالجنة الابتهاج الذي يحصل بسبب الملكات المحمودة والمراد بالنار هي الندامة التي تحصل بسبب الملكات المذمومة وليس في الخارج جنة ولا نار فهو الزنديق وكذلك من قال الشيخين ابي بكر وعمر مثلا ليسا من اهل الجنة مع تواتر الحديث في بشارتهما او قال ان النبي صلى الله عليه وسلم خاتم النبوة ولكن معنى هذا الكلام انه لا يجوز ان يسمى بعده احد نبيا واما معنى النبوة وهو كون الانسان مبعوثا من الله تعالى الى الخلق مفترض الطاعة معصوما من الذنوب فهو موجود في الائمة بعده فذلك هو الزنديق وقد اتفق جماهير المتاخرين

دین حق کا مخالف اگر دین کا معترف نہیں اور نہ ظاہراً و باطناً اس پر یقین رکھتا ہے تو وہ کافر ہے۔ اور اگر زبان سے تو اقرار کرے لیکن اس کا دل منکر ہو تو وہ منافق ہے اور اگر ظاہری طور پر دین کا اقرار و اعتراف کرتا ہے لیکن ضروریات دین کی ایسی تفسیر کرتا ہے جو صحابہ کرام تابعین اور اجماع امت کی تفسیر کے خلاف ہے تو وہ زندیق ہے مثلاً معترف ہے کہ قرآن برحق ہے اور اس میں مذکور جنت و جہنم برحق ہیں لیکن جنت اس مسرت اور خوشی کا نام ہے جو اخلاق حسنہ کے سبب حاصل ہوتی ہے اور جہنم وہ ندامت اور شرمندگی ہے جو بری عادتوں کی بنا پر حاصل ہوتی ہے خارج میں جنت و جہنم کا وجود نہیں ہے تو اس تفسیر کا کرنے والا زندیق ہوگا اسی طرح اگر کوئی کہے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ جنتی نہیں ہیں. باوجودیکہ ان دونوں حضرات کے جنتی ہونے کی بشارت میں احادیث حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں یا اقرار کرے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے بعد کسی کو نبی کہنا جائز نہیں ہے البتہ حقیقت نبوت یعنی کسی انسان کا اللہ کی جانب سے مخلوق کی طرف بھیجا جانا، مفترض الطاعۃ ہونا، گناہوں سے معصوم ہونا تو یہ صفات و خصوصیات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اماموں کے اندر موجود ہیں تو یہ کہنے والا زندیق ہوگا اور متاخرین علماء احناف و شوافع نے باتفاق اس طرح کے عقائد رکھنے والے کے قتل کا فتویٰ دیا ہے۔

من الحنفية والشافعية على قتل من يجري هذا المجرى (المسوى ج ۲ ص ۱۳۰ مطبوعہ کتب خانہ رحیمیہ دہلی)

(۷) سہو اور نسیان سے تو حضرات انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام بھی محفوظ نہیں ہیں چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ونسی آدم ولم نجد لہ عزما الآیۃ" اور آدم بھول گئے اور ہم نے ان کے اندر عزم نہیں پایا۔ اسی طرح اور بھی حضرات انبیاء کے سہو ونسیان کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے۔ حضرت خاتم النبیین نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ نماز پڑھا رہے تھے چار رکعت کی نماز تھی لیکن آپ نے بھول کر دو ہی رکعت پر سلام پھیر دیا اس پر ایک صحابی ذوالیدین نے کھڑے ہو کر عرض کیا "اقصرت الصلوٰۃ ام نسیت" کیا نماز میں کمی کر دی گئی یا آپ بھول گئے؟ آپ نے فرمایا نہ کم کی گئی اور نہ میں بھولا اس پر دیگر حضرات نے ذوالیدین کی تصدیق کی پوری حدیث کتب صحاح میں دیکھی جا سکتی ہے ان آیات واحادیث سے صاف طور پر عیاں ہے کہ سہو ونسیان سے حضرات انبیاء بری نہیں ہیں پھر اماموں کو اس سے بری بتانا یہ خالص افترا ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں پیش کیا جا سکتا۔ درحقیقت سہو ونسیان سے بری ہونا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جس میں کوئی مخلوق اللہ کا شریک نہیں اس لئے ان کا یہ عقیدہ بھی دیگر بہت سے عقیدوں کی طرح شرکیہ ہے۔ نعوذ باللہ منہ

عربوں کا عطیہ

علم نباتات کا ارتقا اسپین میں

جناب مولوی محمد یوسف صاحب لکچرار شعبۂ عربی علی گڑھ یونیورسٹی علی گڑھ

لوگوں میں یہ غلط فہمی ہے کہ عربوں نے ہر طرح کی سائنس کو یونان سے نقل کیا ہے۔

ولیم ادس لیٹر جو ایک مشہور ترین ہستی ہے، اس پر رد کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ عربوں نے صرف یونان کے لوگوں سے اپنے چراغ کو روشن کیا ہے۔ لیکن اس میدان میں اس قدر ترقی حاصل کی کہ یونان کے علماء نے آج تک نہ دیکھی ہوگی۔ اور یہ ترقی صرف ان کی اپنی محنت اور مشقت اور مشاہدوں پر منحصر تھی۔ حالانکہ عباسی دور میں بھی   کے میدان میں کافی کام ہوا ہے۔

اندلس میں علوم عرب کی روشنی نے یورپ کو جگمگایا اور اہل یورپ کی عقلوں سے تاریکیوں کو دور کیا۔ کیونکہ انھیں یونانی حکمت کا اس وقت تک پتہ نہیں چلا تھا جب تک کہ انھوں نے عربوں کی کتابوں میں ان کے تراجم نہ پڑھے۔ جیسا کہ خود اہل یورپ کو اعتراف ہے۔ عربوں نے ہی یونیورسٹیز کا نظام بنایا۔ اندلس کے ہر شہر میں ایک جامعہ تھی فن طب کے چار مشہور جامعات قرطبہ، اشبیلیہ، طلیطلہ اور مرسیہ میں تھیں جن میں تمام مذاہب کے اساتذہ اور طلبہ جمع رہا کرتے تھے۔

اندلسی اطباء میں محمد بن اسماعیل، محمد بن الحسن متوفی ۳۲۲ھ طب اور منطق میں ماہر تھے عمر بن عبد الرحمٰن قرطبی کرمانی عبد الرحمٰن بن احمد طب اور شناخت ادویہ میں ماہر تھے، جالینوس ارسطو کی کتابوں کا درس دیا کرتا تھا۔ اس نے دواؤں کی تحقیق میں ایک بے نظیر کتاب لکھی ہے۔ ابن خلدون، ابن اسمح، ابوالقاسم خلف بن عباس زہراوی متوفی ۴۰۵ھ نے فن طب میں متعدد کتابیں لکھیں۔ یہ اتنا بڑا حکیم تھا کہ اس نے ہزاروں سرجن تیار کر دیئے۔ اس نے اپنی تصنیف "التصریف لمن عجز عن التالیف" کے آخری باب میں اپنے دور کے علم جراحی کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس میں مختلف اقسام کی جراحی اور آپریشن وغیرہ کے طریقے بتائے ہیں۔

اور صدیوں تک اس کے مطابق عمل ہوتا رہا ہے۔ اس میں سرجری کے متعلق آلات کی تصویریں بھی ہیں۔

ابومروان عبدالملک ابن ابی العلا معروف بابن زہر اشبیلی متوفی ۱۱۶۲ء فن طب میں زہراوی کے ہم پلہ تھا۔ وہ عبدالمومن کا وزیر اور طبیب تھا۔ اس کے معاصر اطبا، فن طب کے متعلق کاموں میں مشغول تھے مگر اس نے اپنے آپ کو "علم الادویہ" میں محدود کر لیا تھا۔ اس کی فن طب پر چھ اہم تصانیف میں تین بطور خاص عظمت و اہمیت کی حامل ہیں اور ان میں سب سے زیادہ اہم "التفسیر فی المداوۃ والتدبیر" ہے۔ جو اس کے دوست و مداح ابن الرشد کی درخواست پر "کلیات" کے مقابلہ میں لکھی گئی ہے۔ "التفسیر من کلیات" کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہے۔ اس میں بعض مخصوص موضوعات پر بڑی اچھی بحث کی گئی ہے۔ بلا خوف و تردد اسلام میں الرازی کے بعد ابن زہرا سب سے بڑا طبیب تھا۔ جس نے ہڈیوں کے درد کی تحقیق کی اور اس کے علاج بتائے ہیں البتہ جدید تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ احمد الطبری نے اپنی تصنیف "المعالجہ" میں اس سے پہلے ان مباحث پر بحث کی ہے۔

ابومروان کی اولاد میں چھ پشتوں تک اطبا پیدا ہوتے رہے ابوبکر بن ابومروان متوفی ۱۱۹۸ء فاضل طبیب تھا۔ جو لسانی علاج کا بھی ماہر تھا۔ متعدد عمدہ جو شیلے موشحات اس کی طرف منسوب ہیں موحد بن یوسف کو یعقوب بن منصور نے مراکش میں اپنا طبیب خاص مقرر کیا تھا۔ ابن زہر کے اجداد میں ٹھیک اس کا ہم نام ابومروان بن عبدالملک نہ صرف اسپین بلکہ بغداد اور قاہرہ میں مطب کرتا تھا۔ سعید بن عبدالرحمن بن عبد ربہ لائق طبیب اور اعلیٰ شاعر تھا طب میں اس کا ایک طویل ہے۔ احمد بن یوسف اور عزیز بن یوسف نے مشرق کا سفر کیا خلیفہ الحکم نے دونوں کو اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا۔ احمد امراض چشم میں ماہر تھا۔

ابن باجہ جو بہت بڑا فلسفی ہوا ہے۔ اس نے بھی اس میدان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور ادویات کی سائنس کو ترقی دی ہے حالانکہ اس کی فن طب میں کوئی خاص شہرت نہیں ہے وہ صرف ایک فلسفی کے ناتے سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ اور عام طور سے ابن الصائغ کے نام سے۔ اس نے بھی ابوبکر بن ابراہیم جو غرناطہ کا حاکم تھا اس کے وزیر کی حیثیت سے اہم خدمات انجام دی ہیں اس کی مشہور ترین کتاب جو ادویات پر لکھی ہے، "المجموعہ فی الطب" کے نام سے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ جب جوانی کی حالت میں تھا اسے زہر دے دیا گیا تھا۔

کیونکہ وہ اپنے فلسفہ میں بہت زیادہ آزاد خیال تھا۔ اس بات کا سہرا اس کے سر ہے کہ اس کے تلامذہ کی فہرست میں ابن رشد اور ابن طفیل جیسی نامور اور عبقری شخصیتیں بھی شامل ہیں یہ وہی ابن رشد ہے جس نے "الکلیات فی الطب" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ اس کا ہم عصر ابن باجہ، وہ سلطان ابی یوسف کا درباری فزیشن تھا۔ سلطان اس کو زیادہ تر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اور اس سے اپنے کاموں میں مشورے کرتا تھا، اس نے ادویات پر ایک کتاب لکھی ہے۔ جس نے علماء و فضلائے طب کو علمی و عملی اعتبار سے عروج بخشا اور اپنے علم و حکمت کے چراغ سے ساری دنیا کو منور کر دیا اور اسکا سب سے بڑا سبب کہ جس سے طب کی ارتقا ہوئی یہ ہے کہ ملک اسپین میں فن طب کے ارتقاء میں وہاں کے ارباب فن کی خصوصی توجہ کے ساتھ اسپین کے حالے وتوع کا بھی خاصا دخل ہے۔ اسپین کے علماء نے علم و فن کی جستجو میں دور دراز کے سفر طے کئے اور اس طرح اپنی معلومات میں خاصہ اضافہ کیا اور ترقی کی نئی نئی راہیں نکالیں۔ محمد بن عبدان مصر پہونچا جہاں اسے فسطاط کے بڑے ہوسٹل کا انچارج بنایا گیا اس کے بعد طب کی حصول کے لئے بغداد پہونچا اور دس سال تک علم و فن کی تحصیل کرتا رہا۔

علماء کے علاوہ یہاں کے امراء اور حکام بھی علم و حکمت کی ترقی میں بھرپور دلچسپی لیتے تھے جس کی وجہ سے اسپین میں بہترین کتابوں کا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا خاص طور پر قرطبہ تو گویا کتابوں اور کتبخانوں کا شہر معلوم ہوتا تھا

عرب اور خصوصاً اسپین کے علماء نے صرف یونانی علوم اور یونانی علماء کی دریافت و ایجادات پر اکتفاء نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے اس فن میں نئی نئی ایجادیں کیں اور انھوں نے اس فن میں اتنا کمال پیدا کر لیا تھا کہ انھیں دوسرے ملک کے اطباء اور ان کی کتابوں کی ضرورت نہ رہی۔ بلا خوف و شک و شبہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ علم طب جس کی بنیاد یونان میں پڑی تھی اسپین میں اسے عروج کمال تک پہونچا دیا گیا۔

مورخ لوکارک لکھتے ہیں کہ بارہویں و تیرہویں صدی میں اسپین کے علوم و افکار کا مغربی دنیا پر خاصہ اثر پڑا۔ جس کی وجہ سے بیرونی ملکوں کے طلبہ حصول علم کے لئے اسپین آنے لگے تھے۔ اور یہاں آکر اپنی علمی پیاس بجھاتے تھے ان کو اسپین کے عربی خزانہ میں لاتعداد کتابیں ملیں جنمیں قدیم فلسفہ کی وہ کتابیں بھی تھیں جن سے یہ لوگ ابھی تک ناآشنا تھے جالینوس اور حکمائے عرب مثلاً رازی، ابو القاسم، ابن سینا اور ابن زہر کی کتابیں ان کو ملیں۔ اکثر ان کی

ترجمہ کردہ کتابیں طب کے موضوع سے متعلق تھیں۔ اس مرکز علمی کے ذریعہ اس قدر کتابیں منظر عام پر آئیں کہ انسان تعجب میں پڑ جاتا ہے۔ بعض معاصرین کا خیال ہے کہ عرب اور اسپین کے علماء یونانیوں کے محض مقلد تھے لیکن یہ کہنا کسی طریقہ سے بھی صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ عربوں نے صرف ان کے متراجم کا مطالعہ کیا ہے اور یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ بلکہ بقول فیلسوف "اہل عرب نے صرف پچھلے علوم و معارف کی حفاظت نہیں کی، بلکہ اس میں بے پناہ اضافہ بھی کیا ہے"

چنانچہ تاریخ شاید ہے کہ اسپین کے اطباء نے بہت سے نئے علاج کے طریقے ایجاد کئے جس کا یونان میں نام و نشان تک نہیں ملتا جیسے ٹانکے لگانے کا علاج۔ پتھری کو بغیر آپریشن کے نکالے جانے کا علاج، اور خون کو ٹھنڈے پانی سے روکنے کا علاج، اور زخم کو آگ سے جلا کر ٹھیک کرنے کا علاج۔ اور مریض کو عمل جراحی کی تکلیف سے بچانے کی خاطر کوئی خاص دوا کی ایجاد وغیرہ۔ اسی طرح ان لوگوں نے نباتات اور معدنیات کے ذریعہ علاج کرنے کے طریقے بھی ایجاد کئے اور ان کے کہنے کے مطابق قرطبہ، اشبیلیہ اور دوسرے مقامات پر ایسے ایسے پودے اور درخت لگانے کا انتظام کیا گیا جن کی پتیاں، کھال، شاخیں اور جڑیں متعدد بیماریوں کے علاج میں کام آتی تھیں۔

علم نباتات علم نجوم اور علم ریاضی کی مانند مسلمانوں نے علم نباتات کو فروغ دے کر اس فن کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ یہ تنہا مسلمانوں ہی کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے مثلاً "پام" اور ریشہ دار درختوں اور پودوں کے صحیح مشاہدات اور تجربات کے ذریعہ جنسی اختلافات کی وضاحت کی۔ انھوں نے اپنی تحقیقات اور مشاہدات کی بنیاد پر یہ متعین کیا کہ فلاں پودے قلم سے لگتے ہیں۔ اور فلاں پودے بیج سے اور فلاں فلاں خود رو ہیں۔ قرطبی طبیب الخلیقی ابوجعفر احمد بن محمد متوفی ۱۱۶۵ء نے اسپین اور افریقہ سے پودوں کو جمع کیا اور ہر ایک کا عربی، لاطینی وغیرہ زبانوں میں نام مقرر کیا۔

بارہویں صدی عیسوی میں ابوزکریا یحیی ابن محمد بن العوام نے فن زراعت سے متعلق ایک کتاب "الفلاح" نامی تحریر کی جو عہد اسلامی کے قرون وسطی کی سب سے اہم تصنیف مانی جاتی ہے۔ یہ کتاب جزوی طور پر ابتدائی یونانی عربی سے ماخوذ ہے۔ اور جزوی طور پر اسپین میں مسلم پیوند کاروں کے تجربات پر مشتمل ہے اسی کتاب میں ۵۸۰ پودوں

کا حال درج ہے اور پچاس سے زائد درختوں کی کاشت سے متعلق تشریحات درج ہیں۔ اس میں پیوند کاری کے تجربات، زمین کی اقسام و صلاحیتیں اور کھاد کی تفصیلات، درختوں اور پھلوں کی بیماریوں کی علامات اور ان کے علاج بتائے گئے ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ یہ کتاب اتنی اہم ہوتے ہوئے علی ابن خلکان، یاقوت اور حاجی خلیفہ کے علم میں نہ آسکی۔

ابن البیطار نہ صرف اسپین بلکہ دنیا کا سب سے بڑا ماہر نباتات تھا۔ اس نے اسپین اور تمام افریقہ کے علاوہ مصر اور شام کا سفر کیا۔ اور بعد ازاں بحیثیت ایک ماہر نباتات کے الملک الکامل ایوبی کی ملازمت کرلی۔ اس نے مصر سے شام ۶۴۶ھ میں دمشق میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے دو تصنیفیں "المغنی فی الادویۃ المفرد‌ہ اور الجامع فی الادویۃ المفردہ، اپنی قلمی یادگاریں چھوڑیں۔ دونوں کتابوں کو اس نے اپنے مربی صالح ایوبی کے نام سے منسوب کیا ہے ان دونوں کتابوں میں جانوروں اور نباتات، اور مادی اشیاء کے ذریعہ انسانوں کے علاج کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ مصنف نے یونانی اور عربی مواد کے علاوہ اپنے ذاتی تجربات اور تحقیقات کا اس میں اضافہ کیا ہے قرون وسطی میں یہ اپنی قسم کی سب سے اعلیٰ کتاب تھی۔ اس میں تقریباً دو سو پودوں کو شامل کرکے تین سو نئی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اس کتاب میں ایک سو پچاس مصنفین کے اقتباسات درج ہیں۔ جن میں پچیس یونانی ہیں۔

بہر حال ان تمام چیزوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ علم نباتات کی ارتقاء اور اس کی نشوونما اسپین کے اطبار کی محنت و مشقت وجد وجہد اور مشاہدات کا نتیجہ ہے۔

ثقافت کا مفہوم

مولانا عتیق اللہ قاسمی

عربوں نے لفظ ثقافت کے سلسلے میں مختلف معنی کی نشان دہی کی ہے، کبھی وہ اس لفظ سے تقویم و تہذیب کے معنی مراد لیتے ہیں اور کبھی زیرکی ہوشمندی اور دانشمندی کے انگریزی میں لفظ (Agricalture) کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جبکہ زمین زراعت کے لئے ہموار کردی جائے، اسی طرح لفظ ثقافت لاطینی زبان میں عربی کے ہم معنی قرار دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ لفظ Culture Aniwi کے معنی تہذیب روحانی اور تہذیب ربانی کے ہیں اور عبادت کے معنی بھی، مؤخر الذکر کا مفہوم یہ ہے کہ عبادت اس طرح کی جائے جس سے نفس انسانی میں شائستگی اور نکھار پیدا ہو۔

رومانی دور سے ثقافت کا علوم انسانیہ سے گہرا ربط رہا ہے، علوم انسانیہ وہ ذاتی علوم ہیں جس میں ہر قوم ایک دوسرے سے ممتاز نظر آتی ہے خواہ وہ دینی علوم میں ہوں یا زبان و ادب کے میدان میں علوم انسانیہ میں فلسفہ نیز وہ علوم جو نہ تو عملی ہیں اور نہ طبعی یہ بھی داخل ہیں۔

آگے چل کر یورپ کے ترقی یافتہ دور میں لفظ ثقافت کا اطلاق فنون و آداب پر بھی ہونے لگا، اس سلسلے میں مشہور مؤرخ ابن خلدون کی رائے قابل ذکر ہے لکھتے ہیں کہ ثقافت دراصل عمران (آبادی) کے مدمقابل بولا جاتا ہے نتیجے کے طور پر ثقافت کا اعلیٰ درجہ دراصل یہی حضارت ہے اس لحاظ سے ثقافت اور حضارت میں ایک گونہ کا فرق باقی رہ جاتا ہے۔

اسی طرح مصنف "لوگ" لکھتے ہیں کہ ثقافت دراصل عقل انسانی کو جلا بخشنے کا نام ہے، لوگ کے ساتھ ثقافت کے اس مفہوم میں مسٹر ماتیو ارمولا بھی شامل ہیں، انھوں نے اپنی کتاب (الثقافۃ والفوضیٰ) میں ثقافت کے معنی کی وضاحت اس طور پر کی ہے کہ

"فکر انسانی کے آخری مرحلہ تک ادراک کرنے کی سعی جس سے کہ انسانی فلاح وبہبود حاصل ہو ثقافت ہے۔ ارمولا فرید یہ لکھتے ہیں کہ انسان جس اصول و نظریے کے تحت اپنے مقصد کے حصول میں سعی کرے وہ بھی دین ہے۔ یہاں تک متعدد دانشوروں کی رائے لفظ ثقافت کی تعریف کے سلسلے میں آپ کے سامنے آئی۔ مؤخر الذکر تعریف کے سلسلے میں ڈاکٹر معبد الحلیم عویس کی رائے یہ ہے کہ "البتہ انسانی ذہن و دماغ اور اس کے اسلوب زندگی میں خواہ کسی بھی نوعیت سے اس میں ارتقاء ہو عین ثقافت ہے چاہے یہ ترقی علوم عملیہ کے ذریعہ حاصل ہوں یا علوم نظریہ سے"۔ لیکن ڈاکٹر صاحب آگے چل کر یہ لکھتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام محض چند ایسے اصول کا نام نہیں جس سے کہ صرف کمال انسانی میں تقویت اور مدد ملے بلکہ ہمارے نقطۂ نظر سے اور مسلم حقیقت ہے کہ اسلام ہی ایک ایسا سیدھا اور آسان راستہ ہے جس پر انسان چل کر اوج کمال انسانی تک سہولت پہونچ سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب مزید یہ لکھتے ہیں کہ "بہرحال ان تمام مختلف تعریفوں کے باوجود ہمیں ثقافت کے اس اہم اور بڑے مقصد نیز اس کو علوم انسانیہ کی اصطلاح میں منحصر کردے جانے کے درمیان کوئی تعارض نظر نہیں آتا کیونکہ جہاں تک علوم انسانیہ کا تعلق ہے تو وہ بنسبت جوہری پہلو کے بہرحال انسانی تہذیب وتمدن اور اس کی ترقی میں زیادہ کارآمد اور مؤثر ہے اور یہی صورت حال علوم تطبیقیہ میں بھی پائی جاتی ہیں اس لحاظ سے انسانی علوم کے ماہرین جو یہ سمجھتے ہیں کہ ثقافت۔ اپنے اہم رکن اور جزء کے مختلف جماعتوں تنظیموں اور فہم انسانی کے سلسلے میں کسی بھی معاشرہ میں اسلوب زندگی اور طریقہ زندگی کا اچھا نمونہ پیش کرے ثقافت ہے تو یہ صحیح ہے کیونکہ اس اعتبار سے انسانی علوم کے ماہرین کی رائے سے سوشل اور معاشرتی ماہرین کی رائے بھی آپس میں ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتی، اس لئے کہ وہ ثقافت سے ایسے طریقہائے زندگی مراد لیتے ہیں جو انسان کے گذشتہ کردار میں برابر تغیر پذیر ہوتا رہا ہو اور یہ بات بھی ثقافت کی کسی اور تعریف کے خلاف نہیں پڑتی بلکہ اس سے تو اور ثقافت کی مختلف تعریفیں آپس میں ایک دوسرے سے مکمل ہوتی ہیں۔

خلاصہ کلام ثقافت کی ان مذکورہ بالا متضاد تعریفوں میں ہمیں کوئی ادنیٰ تعارض نظر نہیں آتا کیونکہ یہ ساری تعریفیں ہمارے نزدیک معتبر اور انسانی ترقی کا مظہر نیز اس کے اونچے معیار کی دلیل ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ ہر وہ چیز جو انسانی ترقی میں کارآمد ثابت ہوں اسے ثقافت حضارت مدنیت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اس کے برخلاف ہر وہ چیزیں جو اس میں رکاوٹ پیدا کرے وہ سراسر جہالت [illegible]

دوسری قسط

منطق و فلسفہ ایک تحقیقی و علمی جائزہ

مولانا محمد اطہر حسین قاسمی بستوی

اہل یونان اور بت پرستی

مولانا علی میاں لکھتے ہیں۔

"یونانیوں کا فلسفہ، ان کی شاعری حتی کہ دین سب ان کی مادی روح کی غمازی کرتے ہیں، انھوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی قدرت کا تصور مختلف دیوتاؤں کی شکل کے بغیر نہ کیا، انھوں نے ان صفات کے بت تراشے اور ان کے لئے معبد تعمیر کئے تاکہ محسوس طریقے پر ان سے تعلق رکھیں، ان کے یہاں ایک روزی کا دیوتا تھا، ایک رحمت کا اور ایک قہر و عذاب کا پھر ان کی طرف مادی جسم کے تمام خصوصیات اور متعلقات منسوب کئے اور ان کے گرد قصے کہانیوں کا جال پھیلا دیا انھوں نے معانی مجردہ کو بھی اجسام و اشکال کی صورت میں پیش کیا چنانچہ ان کے نزدیک ایک محبت کا دیوتا تھا اور ایک حسن کا، ارسطو کے فلسفہ میں عقول عشرہ اور افلاک تسعہ کا جو شجرہ ملتا ہے وہ بھی اسی مادی عقلیت کا کرشمہ ہے جس کے اثر سے یونانی فطرت کبھی آزاد نہ ہونے پائی، مغربی علماء نے بھی یونانی تہذیب میں مادیت کے غلبہ کو تسلیم کیا ہے اور اپنی تصنیفات اور علمی مباحث میں اس کی طرف متوجہ کیا ہے، چند سال پہلے ڈاکٹر ہاس نے جنیوا میں "یورپی تمدن کیا ہے" کے عنوان سے تین لکچر دیئے تھے ان کا ایک اقتباس خالدہ ادیب خانم کے توسط سے پیش کیا جاتا ہے۔

"موجودہ مغربی تمدن کا مرکز قدیم یونانی تمدن تھا، اس کا اصل اصول انسان کی تمام قوتوں کا ہم آہنگ نشو و نما اور سب سے بڑا معیار خوبصورت اور سڈول جسم سمجھا جاتا تھا، ظاہر ہے کہ اس میں زیادہ زور محسوسات پر ہے، جسمانی تربیت، ورزشی کھیلوں اور رقص وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل تھی، ذہنی تعلیم جو شاعری موسیقی ڈرامہ، فلسفہ سائنس وغیرہ پر مشتمل تھی ایک خاص حد سے

آگے نہیں بڑھنے پاتی تھی تاکہ ذہن کی ترقی سے جسم کو نقصان نہ پہونچنے پائے یونان کے مذہب میں نہ روحانیت کا عنصر ہے نہ باطنیت کا نہ علم دین ہے نہ پیشوایان دین کا طبقہ،، (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ص ۲۳۴)

اہل یونان اور شہوت پرستی

دنیوی زندگی کی انتہائی شوق و غلو، اس کی قدر و قیمت میں فرط محبت، مجسموں اور تصاویر کا شغف سرود و موسیقی میں انہماک، فنون لطیفہ کی قدردانی اور غیر محدود شخصی آزادی یونانیوں کے نمایاں کردار و اوصاف تھے، ان صفات کا ان کے اخلاق و معاشرت پر برا اثر پڑا، اخلاقی ابتری اور ہر نظام کے خلاف بغاوت ان کا روزمرہ کا فیشن بن گیا، خواہشات نفسانی کی پیروی، زندگی سے زیادہ سے زیادہ تمتع اور لطف اندوزی ان کے نزدیک روشن خیالی اور آزادی کا نشان سمجھا جانے لگا، سقراط ایک جمہوری نوجوان کی سیرت اور طرز زندگی اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس صدی کے روشن خیال اور زندہ دل نوجوان کا سراپا اس سے ذرا بھی مختلف نہیں معلوم ہوتا۔

،، اگر اس سے کہا جائے کہ انسان کے سارے شوق اور خواہشات یکساں قابل احترام اور تعمیل کے لائق نہیں، بعض خواہشات پسندیدہ اور لائق احترام ہیں اور ان کی تکمیل و تعمیل میں کوئی مضائقہ نہیں اور بعض ناروا اور ناپسندیدہ ان سے اجتناب ہی بہتر ہے اور ان پر پابندی اور بندش عائد کرنا ضروری ہے تو وہ شخص اس صحیح قانون کو قبول نہیں کرتا اور اس کے سننے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا جب اس کے سامنے یہ معقول باتیں پیش کی جاتی ہیں تو وہ تمسخر کے ساتھ اپنا سر ہلاتا ہے اور بڑے زور کے ساتھ تقریر کرتا ہے کہ انسان کی تمام خواہشات اور اس کے سارے شوق یکساں قابل احترام ہیں، اسی کے مطابق وہ اپنی زندگی گذارتا ہے اور اپنے تمام خواہشات نفس کی تسکین اور اپنے ہر شوق کی تکمیل کرتا رہتا ہے اور جس وقت اس کا جس بات کا جی چاہتا ہے کر گذرتا ہے، کبھی وہ مدہوش و بدمست نغمہ و سرود میں مشغول ملے گا۔ اور کبھی اس کو خیال آجائے گا تو برت رکھ کر صرف پانی پینے پر اکتفا کرے گا کبھی فوجی تربیت اور قواعد سیکھتا ہوا نظر آئے گا کبھی بالکل بیکار اور سست

دکھائی دے گا اور ہر چیز کو بالائے طاق رکھ دے گا کبھی فلسفیانہ زندگی بسر کرنے لگے گا دوسرے وقت میں سیاسی زندگی میں شریک ہوجائے گا اور وقت کے تقاضے کے مطابق تقریر کرتا ہوا نظر آئے گا کبھی فوجی لوگوں کی تعریف کرنے لگے گا کبھی کامیاب تاجر پر رشک کر کے تجارت شروع کر دے گا غرض اس کی زندگی کا کوئی نظام اور ضابطہ نہیں، لطف یہ ہے کہ وہ اس زندگی کو بہت پرلطف اور خوشگوار اور آزاد سمجھتا ہے اور اخیر تک اسی طرز پر زندگی گذارتا ہے (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ص۲۲۲)

علامہ سید ابوالاعلیٰ مودودی یونانیوں کی شہوت پرستی کا حال بیان کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم اپنے زمانہ میں سب سے زیادہ عیاش، آوارہ، شہوت پرست اور فحاش گذری ہے، علامہ لکھتے ہیں۔

"یونانیوں پر نفس پرستی اور شہوانیت کا بے حد غلبہ تھا، رنڈی کا کوٹھا یونانی سوسائٹی کے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ طبقوں تک ہر ایک کا مرکز و مرجع بنا ہوا تھا، فلاسفہ، شعراء، مؤرخین، اہل ادب اور ماہرین فنون غرض تمام سیارے اسی آفتاب کے گرد گھومتے تھے، وہ نہ صرف علم و ادب کی محفلوں کی صدر نشین تھی بلکہ بڑے بڑے سیاسی معاملات بھی اسی کے حضور میں طے ہوتے تھے، قوم کی زندگی و موت کا فیصلہ جن مسائل کے ساتھ وابستہ تھا ان میں اس عورت کی رائے وقیع سمجھی جاتی تھی جس کی دو راتیں بھی وفاداری میں کسی ایک شخص کے ساتھ بسر نہ ہوتی تھیں، ان کے ذہن سے یہ تصور ہی محو ہوگیا تھا کہ شہوت پرستی بھی کوئی اخلاقی عیب ہے، ان کا معیارِ اخلاق اتنا بدل گیا تھا کہ بڑے بڑے فلاسفہ اور معلمین اخلاق بھی زنا اور فحش کاری میں کوئی قباحت اور کوئی قابلِ ملامت چیز نہ پاتے تھے، عام طور پر نکاح کے بغیر عورت اور مرد کا تعلق بالکل معقول سمجھا جاتا تھا جس کو کسی سے چھپانے کی ضرورت نہ تھی، آخر کار ان کے مذہب نے بھی ان کی حیوانی خواہشات کے آگے سپر ڈال دی۔

یونان میں جب کام دیوی کی پرستش شروع ہوئی تو قحبہ خانہ عبادت گاہ میں تبدیل ہوگیا، فاحشہ عورتیں دیوداسیاں بن گئیں اور زنا ترقی کر کے ایک مقدس مذہبی فعل

کے مرتبے تک پہونچ گیا، اسی شہوت پرستی کا ایک دوسرا مظہر تھا کو یونانی قوم میں عمل قوم لوط ایک وبا کی طرح پھیلا اور مذہب و اخلاقیات نے اس کا خیر مقدم کیا، آرٹ کے ماہروں نے اس جذبہ کو مجسموں میں نمایاں کیا، معلمین اخلاق نے اس کو دو شخصوں کے درمیان دوستی کا مضبوط رشتہ قرار دیا، سب سے پہلے دو یونانی انسان جو اس قدر کے مستحق سمجھے گئے کہ ان کے اہل وطن ان کے مجسمے بنا کر ان کی یاد تازہ رکھیں وہ ہرموڈیس اور آرسٹوگیٹن تھے جن کے درمیان غیر فطری محبت کا تعلق تھا، تاریخ کی شہادت تو یہی ہے کہ اس دور کے بعد یونانی قوم کو زندگی کا کوئی دوسرا دور پھر نصیب نہیں ہوا۔ (پردہ ص۱۳)

اہل یونان اور رقص و سرود

متعدد مغربی علماء نے یونانیوں کی دینی کمزوری اور اس کی بے اثری، خشیت و خوف اور مذہبی اعمال و رسوم میں سنجیدگی کی کمی اور کھیلوں اور تفریحات کی کثرت کا ذکر کیا ہے، تاریخ اخلاق یورپ کا مصنف لیکی، لکھتا ہے کہ یونانی تحریک تمام تر عقلی اور دماغی تھی بخلاف اس کے مصری تحریک یکسر روحانی اور باطنی تھی، وہ رومی مصنف اپولیس کا قول نقل کرتا ہے کہ مصری دیوتاؤں کی عزت آہ و زاری سے تھی اور یونانی دیوتاؤں کی رقص و سرود سے، پھر خود کہتا ہے کہ:۔

"اس میں شبہ نہیں کہ اس مقولہ کے آخری جزء کی تصدیق تاریخ یونان میں قدم قدم پر ہوتی ہے، درحقیقت کسی مذہب کے مراسم میں جشن، کھیل، تماشوں کی اتنی آمیزش نہیں پائی جاتی تھی جتنی اس میں اور نہ کسی مذہب میں خوف و دہشت کا عنصر اس قدر قلیل پایا جاتا ہے جتنا اس میں، اس میں خدا کا تقدس تو بس اسی درجہ کا تھا جتنا کسی بزرگ شخص کا ہوتا ہے اور اسے چند معمولی مراسم کے ساتھ یاد کر لینا اس کی عظمت و تمجید کے لئے کافی تھا" (تاریخ اخلاق یورپ ص۱۹۵)

اہل یونان اور حب الوطنی

مغربی فطرت اور مزاج کا ایک خاصہ وطن پرستی ہے، اہل یونان وطنیت پر مستحکم ایمان رکھتے تھے، اور ان میں وطنیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، جہانیت یا آفاقیت جس کے متعلق سقراط اور حکماء اشراق نے اظہار خیال کیا ہے کوئی مقبول خیال اور مذہب نہیں تھا اور یونان میں اس کے حامی نہیں تھے جیسا کہ مشہور مغربی مؤرخ لیکی لکھتا ہے:۔

" ارسطو کا سارا نظام اخلاق یونانی اور غیر یونانی کی تفریق پر مبنی ہے، اجماع حکماء سے فضائل اخلاق کی جو فہرست تیار کی گئی تھی اس کا عنوان اولیں حب الوطنی تھا، ارسطو اس حد تک پہونچ گیا تھا کہ اس کا کہنا تھا کہ یونانیوں کے لئے غیر ملکیوں کے ساتھ وہی برتاؤ واجب ہے جو وہ حیوانات کے ساتھ کرتے ہیں، اس طرز خیال کا یونانی حلقوں میں اتنا اثر اور غلبہ ہو گیا تھا کہ جب ایک فلاسفر نے یہ کہا کہ میری ہمدردیوں کا حلقہ صرف میرے ذاتی وطن تک محدود نہیں بلکہ سارے یونان پر محیط ہے تو لوگ نہایت حیرت و استعجاب سے اسکی طرف دیکھنے لگے" (تاریخ اخلاق یورپ ص۱۸۶)

اہل یونان کی گمراہی اور اس کے اسباب

یونانیوں کی مادہ پرست اور خوگر محسوسات فطرت اور ان کا فلسفۂ الٰہیات اور ان کے عقائد کچھ ایسے واقع ہوئے تھے کہ ان میں خشوع و خضوع اور انابت و رجوع الی اللہ کی کیفیت پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی، ذات باری تعالیٰ کے تمام صفات، ہر قسم کے اختیار، فعل و تصرف اور خلق و امر کی نفی کرنے اور اس کو بالکل بے صفت اور معطل قرار دینے اور اس کائنات کی پیدائش و انتظام کو اپنے خود تراشیدہ اور مفروضہ عقل فعال کی طرف منسوب اور اس سے وابستہ کرنے کا طبعی اور منطقی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ زندگی میں خدا کی ضرورت اور اس سے کوئی تعلق و دلچسپی باقی نہ رہ جائے نہ اس سے کوئی امید ہو اور نہ اس کا کوئی خوف نہ دل میں اس کی ہیبت ہو اور نہ محبت اور نہ ضرورت کے وقت اس سے دعا ہو اور نہ التجا اس لئے کہ وہ اس فلسفہ کے مطابق ایک بالکل معزول و معطل ہستی ہے جس کو عالم میں تصرف کرنے کا نہ کوئی اختیار ہے نہ طاقت وہ عقل اول کو پیدا کر کے عالم سے بالکل بے تعلق اور کنارہ کش ہو گیا اس لئے اس عقیدہ کے ماننے والوں کی زندگی عملاً ایسی گذرتی ہے اور گذرنی چاہئے کہ گویا خدا نہیں اور منکرین خدا کی زندگی سے سوائے اس تاریخی بیان کے کہ خدا نے عقل اول کو پیدا کیا ہے اور کسی حیثیت سے ممتاز نہیں، پس جب ہم یہ سنتے ہیں کہ یونانیوں میں خشوع و خضوع کی کمی تھی اور انکی عبادات اور مذہبی اعمال ایک قالب بے روح سے زیادہ نہیں تھے اور یہ کہ وہ خدا کی بزرگوں سے زیادہ تعظیم نہیں کرتے تھے تو ہم کو ذرا بھی تعجب نہیں ہونا چاہیئے اس لئے کہ تاریخ میں آدمی سینکڑوں صناعوں اور موجدوں کا تذکرہ پڑھتا ہے لیکن کبھی ان کی طرف سے اس کے دل میں خشوع و خضوع اور ان سے بندگی کا ربط نہیں پیدا ہوتا، بندگی کا تعلق تو اس وقت پیدا ہوتا۔ جب خدا کو اس کائنات میں متصرف اور کارفرما اور اپنا

اس کو محتاج سمجھتے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی یونانیوں کی گمراہی کا ایک اور سبب بیان فرماتے ہیں جسے بلفظہٖ پیش خدمت کیا جاتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں۔

"فلاسفہ کی بے راہ روی اور گمراہی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے باری تعالیٰ سے صفات کی نفی کرنے میں جس مبالغہ اور اہتمام سے کام لیا ہے اس نے خدا کے وجود کو محض ایک ذہنی تصور اور ایک مفلوج و مجہول و مجبور ہستی بنا کر رکھ دیا ہے اس کا نتیجہ ہے ان ہیں اور ان تمام حلقوں میں جو یونانی فلسفہ کے زیر اثر رہے ہیں خدا سے کوئی حقیقی زندہ اور عملی تعلق نہیں رہا ہے اس لئے کہ اس حقیقی اور عملی اور قلبی و جذباتی تعلق کیلئے اسماء و صفات و افعال کی ضرورت تھی اور فلاسفہ کو ان کی نفی پر اصرار ہے، دنیا کی پوری عقلی تاریخ میں کبھی انسان کو کسی ایسی ہستی سے قلبی تعلق اور وابستگی نہیں رہی ہے جس کی صفت و فعل کا اس کو کوئی علم نہ ہو، محبت و خوف اور امید و رجا اور طلب و سوال سب کے لئے صفات کی ضرورت ہے اور وہ فلسفۂ یونان میں بالکل منفی ہیں اس لئے مؤرخین اخلاق و ادیان کا بیان ہے کہ اہل یونان کا تعلق نہ صرف خدا کے ساتھ بلکہ مذہب کے ساتھ بالکل سطحی اور برائے نام تھا، امام ابن تیمیہؒ نے ایک جگہ پر صحیح لکھا ہے کہ لاکھوں نفی ایک اثبات کے قائم مقام نہیں ہو سکتے، واقعہ یہ ہے کہ نفی محض پر کسی مذہب اور زندگی کی عمارت کھڑی نہیں ہو سکتی اور غالباً مغرب میں فلسفۂ یونان اور مشرق میں بودھ مذھب اسی وجہ سے ایک ایسی انسانی سوسائٹی کے پیدا کرنے میں ناکام رہے جس کی عمارت خدا کے تصور اور عقیدہ پر قائم ہو اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ان دونوں فلسفہ کے حلقۂ اثر میں ایک طرف بت پرستی اور دوسری طرف الحاد و انکارِ خدا کا رجحان بہت جلدی دبے پاؤں چلا آیا اس لئے کہ عوام (جن کی فطرت میں عبادت اور خدا پرستی کے جذبات ودیعت ہوتے ہیں) کی تشفی ایسے فلسفہ سے نہیں ہو سکتی جس میں سارا زور دماغی ورزش اور فلسفیانہ تصورات پر قائم ہو اور قلب و دماغ کے لئے معرفت و محبت کی کوئی غذا فراہم نہ کی جائے،، (تاریخ دعوت و عزیمت جلد دوم ص ۲۶۵)

لسان العصر اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے خوب کہا ہے ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

فہرست مطبوعات شعبۂ نشر و اشاعت دارالعلوم دیوبند (یوپی)

نمبر	نام کتاب	قیمت	نمبر	نام کتاب	قیمت
۱	فتاوی دارالعلوم اول	۲۹/..	۲۱	الاشباہ والنظائر	۳۶/..
۲	" " دوم	۲۰/..	۲۲	حسامی	۳۲/..
۳	" " سوم	۳۰/..	۲۳	انوار المصابیح	۴۶/..
۴	" " چہارم	۳۷/..	۲۴	مخطوطات اول	۲۱/..
۵	" " پنجم	۳۶/..	۲۵	" دوم	۲۴/..
۶	" " ششم	۴۴/..	۲۶	مشکوۃ الآثار	۱۶/..
۷	" " ہفتم	۴۰/..	۲۷	الفیۃ الحدیث	۱۴/۵۰
۸	" " ہشتم	۳۴/..	۲۸	ملاحسن	۱۶/..
۹	" " نہم	۳۷/..	۲۹	دیوان متنبی	۱۵/..
۱۰	" " دہم	۲۶/..	۳۰	تاریخ اسلام کے ناقابل فراموش واقعات	۳۲/..
۱۱	" " یازدہم	۱۲/..	۳۱	مقدمہ ابن الصلاح	۱۳/..
۱۲	" " دوازدہم	۳۵/..	۳۲	عقیدۃ الطحاوی	۱۲/۵۰
	میزان	۳۸۰/..	۳۳	براہین قاسمیہ	۱۲/..
۱۳	سوانح حیات قاسمی اول	۴۴/..	۳۴	جائزہ تراجم قرآنی	۱۴/..
۱۴	" " دوم	۳۹/..	۳۵	قبلہ نما	۳۰/..
۱۵	" " سوم	۱۵/..	۳۶	مدارج سلوک	۲۰/..
۱۶	تاریخ دارالعلوم اردو اول	۵۰/..	۳۷	مصابیح التراویح	۹/..
۱۷	" " دوم	۵۰/..	۳۸	انتصار الاسلام	۱۱/..
۱۸	" انگریزی اول	۱۳۵/..	۳۹	نفحۃ الادب	۷/۵۰
۱۹	" " دوم	۱۲۵/..	۴۰	تفسیر مدارک التنزیل	۸/..
۲۰	مقامات حریری	۳۲/..	۴۱	دینی دعوت کے قرآنی اصول	۲/..

نوٹ: ہر قسم کی درسیات غیر درسیات، دینی، علمی، اصلاحی، تاریخی کتب ملنے کا پتہ

مکتبہ دارالعلوم دیوبند (یوپی)

جلد ۶۷ — مارچ ۱۹۸۵ء مطابق جمادی الثانی ۱۴۰۵ھ — شمارہ ۶

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند
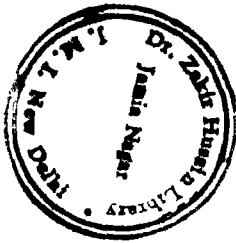
مدیر مسئول

مولانا ریاست علی بجنوری

مدیر تحریر

مولانا حبیب الرحمن قاسمی

قیمت فی پرچہ ۲/۵ سالانہ ۲۵/-

سالانہ بدل اشتراک بیرون ممالک سے — سعودی عرب، کویت، ابوظبی ایر میل ۱۱۵/- جنوبی و مشرقی افریقہ، و برطانیہ ۱۲۵/-
امریکہ کناڈا وغیرہ بذریعہ ایر میل ۱۴۵/- پاکستان بذریعہ ایر میل ۵۰/- بنگلہ دیش ۲۵/-

فہرست مضامین

ہندوستانی اور پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

(۱) ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ فرمائیں۔

(۲) پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ ۔/۵۴ روپے مولانا عبدالستار صاحب مقام کرم علی والہ تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان (پاکستان) کو بھیج دیں اور انہیں لکھیں کہ اس چندہ کو رسالہ دارالعلوم کے حساب میں جمع کر لیں۔

(۳) خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں۔ خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

مدیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمن قاسمی

سلطنت مغلیہ کا سقوط صرف حکومت واقتدار کا سقوط نہیں تھا بلکہ اس کے اثرات بہت دوررس تھے جسکی زد سے اسلامی عقائد و اعمال اور تہذیب و معاشرت کی مستحکم عمارت اپنی جگہ سے سسکنے لگی تھی. اس لئے اس عہد کے علمارِ حق اور بزرگان دین ہاتھوں میں تلوار لیکر اپنی اپنی خلوت گاہوں سے نکل پڑے. لیکن دلی میں مجاہدین آزادی کی شکست کے بعد انھیں یہ اندازہ ہوگیا کہ اتنی بڑی حکومت کا مقابلہ طاقت سے نہیں کیا جاسکتا تو انہوں نے اپنی جدوجہد کا رخ حرب و ضرب کے بجائے اسلامی علوم و ثقافت کی ترویج واشاعت کیجانب موڑ دیا. اور دینی درسگاہوں کا ایک مربوط سلسلہ پورے ملک میں قائم کر کے انہیں چھاونیوں سے اپنا جہاد جاری رکھا. ان اسلامی قلعوں سے انہوں نے اسلام کے ترجمان پیدا کئے ایمان و اخلاص کے نمونے تیار کئے ایثار و قربانی کے نادرۂ روزگار افراد فراہم کئے اور زبان و قلم سے تجدید و احیارِ دین کی ایسی ہمہ گیر خدمات انجام دیں کہ گذشتہ قریب کی صدیوں میں اسلام کیلحاظ سے اتنی شاندار خدمات کی نظیر نہیں ملتی اس طرح بزرگوں کے یہ قائم کئے ہوئے ادارے ایک اصلاحی تحریک بن گئے جنہوں نے اسلام کے خلاف اٹھنے والے ہر فتنے کا بروقت مقابلہ کر کے انہیں پسپا ہونے پر مجبور کردیا لیکن جوں جوں بزرگوں کے زمانہ سے بعد بڑھتا گیا ان کے اندر اضمحلال اور ضعف آتا گیا اور بالآخر حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ یہ اسلامی ادارے باہمی تشتت وانتشار میں مبتلا ہوگئے جسکی بنا پر نہ صرف یہ ہوا کہ ان کے محاسن و برکات میں کمی پیدا ہوگئی بلکہ یہ اندرونی و بیرونی مشکلات و خطرات کے بھی شکار ہوگئے اور آئے دن ان میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے جس سے یہ خطرہ ہونے

رگا ہے کہ کہیں یہ اسلامی تہذیب و ثقافت کے امین و محافظ ادارے خود اپنا وجود ہی کھو بیٹھیں ان حالات سے اسلامی علوم و فنون کے خدام، اسلامی اقدار سے دلچسپی رکھنے والے رہنمایان قوم اور ملت اسلامیہ کے بہی خواہاں بیحد متفکر اور مضطرب ہیں چنانچہ گذشتہ سال ماہ اپریل میں ملی و تعلیمی کانفرنس دہلی کے موقع پر . . . . جسمیں تقریباً پورے ملک کے منتخب افراد اکھٹا تھے سب سے زیادہ گفتگو اور غور و فکر اسی موضوع پر ہوا اور باتفاق یہ طے پایا کہ مدارس اسلامیہ کا ایک وفاق قائم کیا جائے اور متحد و منظم ہوکر اصلاح حال کی کوشش کی جائے اس تجویز کے نتیجہ میں ایک کمیٹی کی تشکیل ہوئی جسے مکلف کیا گیا کہ وہ وفاق کا ایک دستور مرتب کرے اور پھر اسی دستور کی روشنی میں وفاق مدارس کا قیام عمل میں لایا جائے کمیٹی یہ کانفرس کی تجویز کے مطابق دستور مرتب کرکے ملک کے مدارس کا ۱۵ اور ۱۶ مارچ مطابق ۲۲، ۲۳ رجمادی الاولیٰ بروز جمعرات وجمعہ دیوبند میں ایک اجتماع کر رہی ہے جسکے داعیان میں عصر حاضر کے نامور محدث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی . دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب، جمعیۃ العلماء ہند کے صدر حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب اور دارالعلوم دیوبند کے معاون مہتمم و ناظم تعلیمات حضرت مولانا وحید الزماں صاحب قاسمی کیرانوی شامل ہیں اور یہ اس اجتماع کے لئے نیک فال اور بہتر علامت ہے بلکہ اگر اہل مدارس غور فرمائیں تو ان کے لئے نشاۃ ثانیہ کا سنہرا موقع ہے یہاں انہیں طے کرنا ہے کہ

(۱) نصاب تعلیم کو زیادہ سے زیادہ مفید اور بارآور کس طرح بنایا جائے۔

(۲) ملک کے جملہ تعلیمی اداروں کا معیار تعلیم یکساں اور بلند کس طرح ہو۔

(۳) اصول تربیت کو کس طرح سے عام اور مؤثر کیا جائے۔

(۴) اسلامی عقائد و اعمال کی ترویج اور دینی و اخلاقی اقدار کی ترقی واشاعت کیلئے ہم اپنی ذمہ داریاں کس طرح پوری کریں یہ چاروں امور وقت کا تقاضہ، تعلیم کی ضرورت اسلام کے احیاء اور تہذیب و ثقافت کی بنیاد ہیں. اس لئے اگر ہم غور و فکر کرکے اطمینان قلب کے ساتھ ان کو بروئے کار لانے کے لئے آمادہ ہوجائیں تو تھوڑی سی توجہ سے (۱) تمام اداروں کے لئے یکساں نصاب تعلیم اور نظام تربیت رائج کر سکتے ہیں پھر اس کے بعد

بڑی آسانی سے جملہ مدارس کا وفاق قائم کر کے ان کے اجتماعی امتحانات کے ذریعہ سارے مدارس کا معیار تعلیم یکساں اور بلند بنا سکتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے مدارس بلکہ تعلیمی تحریک کو توانائی عطا کریں گی اور ان میں جوشِ عمل پیدا کریں گی جو ہماری تعلیم کو جمود سے نکال کر فعال و متحرک بنا دے گا اور ہمیں ایک نئی زندگی سے ہمکنار کر دے گا۔

اس لئے ہماری تمام ارباب اہتمام، نظمائے تعلیم، اور تعلیمی اداروں کے ذمہ داروں سے مخلصانہ گذارش ہے کہ وہ وقت کی رفتار کو چشم بصیرت سے دیکھیں اور زمانہ کی پکار کو گوشِ دل سے سنیں اور اس اجتماعی طاقت اور مشترکہ جدوجہد سے ایک طرف اپنے اندر کی اصلاح کریں اور اپنی منتشر قوتوں کو مرکزیت عطا کریں اور دوسری طرف حکمراں طبقے پر واضح کر دیں کہ ہم حکومت کی کسی امداد کے بغیر اپنا نظام تعلیم بہتر سے بہتر جاری رکھنے کی ہمت و صلاحیت رکھتے ہیں اس لئے ہمارے تعلیمی نظام میں انتشار کمزوری یا توڑ پھوڑ پیدا کر کے ہمیں بیجان نہیں بنایا جا سکتا۔

اسطرح آپ کا وفاق اک مؤثر اقدام۔ ایک طاقتور پلیٹ فارم ایک مضبوط حصار بن کر اسلامی علوم و فنون اور دینی تہذیب و معاشرت کو زمانے میں نہ صرف زندہ رکھ سکتا ہے بلکہ اسے دوسروں کیلئے باعث خیر و برکت بھی بنا سکتا ہے۔ خدا آپ کی مدد فرمائے، حوصلہ بخشے اور آپ کی جد وجہد کو قبول فرمائے۔ آمین۔

فضلا دارالعلوم توجہ فرمائیں

"تذکرہ فضلاء دارالعلوم" کے عنوان سے دارالعلوم اپنے فضلاء کے حالات و خدمات کا تعارف مرتب کر رہا ہے اس سلسلہ میں ابناء دارالعلوم سے گذارش ہے کہ وہ درج ذیل معلومات فراہم کر کے ہمارا تعاون فرمائیں۔ (۱) نام مع مختصر شجرہ نسب (۲) تاریخ پیدائش اور جائے اقامت ضلع صوبہ اور ملک کی وضاحت کے ساتھ (۳) درسگاہوں اور استفادہ کی تفصیل (۴) دارالعلوم میں داخلہ اور فراغت کی تاریخ دارالعلوم کے اساتذہ جن سے آپ نے استفادہ کیا ہے انکی تفصیل (۵) علمی، دینی، تبلیغی اور سماجی خدمات کا جامع تعارف (۶) مطبوعہ تصانیف کی دو جلدیں ارسال فرمائیں (۷) غیر مطبوعہ تصانیف کی فوٹو کاپی (۸) اگر تصانیف کسی مجبوری سے ارسال نہیں کی جا سکتیں تو ان کا تعارف جسمیں موضوع کی تصریح، صفحات کی تعداد سن طباعت اور کتاب کی خصوصیت کا تذکرہ ضرور کیا جائے (۹) آپکے علم میں جو فضلاء وفات پا چکے ہیں اور انکے حالات کو جانتے ہیں یا آپ کو معلومات ہو تو براہ کرم انکے حالات سے بھی مطلع فرمائیں۔

خط وکتابت کا پتہ

دفتر رسالہ دارالعلوم، دارالعلوم دیوبند (یوپی)

صوفیاء کرام اور سماع

(از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ)

گانے بجانے کے سلسلے میں صوفیاء کرام کا صحیح مسلک عام طور پر لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے اس لئے ذیل میں اس کی تفصیل ذکر کیجاتی ہے۔

امام سہروردی نے، جو کبار شافعیہ میں سے ہیں، اور صوفیاء کے ایک مکتب فکر کے بانی ہیں، اپنی کتاب "عوارف المعارف" میں دو باب مسئلہ غناء پر بھی باندھے ہیں، پہلے باب میں انہوں نے غناء کی گنجائش اور جواز سے بحث کی ہے اور دوسرے باب میں حرمت و ممانعت بیان کی ہے اس پوری بحث میں فقہاء کے اس مسلک سے سر مو تجاوز نہیں کیا ہے کہ غناء چند شرائط کے ساتھ جائز ہے جن میں سے اگر کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو غنا حرام ہے چنانچہ وہ دوسرے باب میں لکھتے ہیں:-

"ہم سماع کے صحیح ہونے کی صورت اور جس حد تک اہل صدق کے لئے سماع مناسب ہے، بتا چکے، اب چونکہ سماع کی راہ سے فتنہ عام ہے اور لوگوں میں صالحیت جاتی رہی ہے۔ اور اس راہ میں وقت برباد ہوتا ہے، عبادات کی لذت کم ہو جاتی ہے۔ اجتماعات کی چاٹ لگ جاتی ہے، نفسانی خواہشات کی تسکین اور ناچنے گانے والوں سے لطف اندوز ہونے کیلئے سماع کی محفلیں منعقد کرنے کا شوق بار بار پیدا ہوتا ہے، حالانکہ یہ بات مخفی نہیں کہ اس قسم کے اجتماعات صوفیاء کے یہاں ناجائز اور مردود ہیں، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ

عارف متمکن کے سوا کسی اور کے لئے سماع صحیح نہیں، اور مرید مبتدی کے لئے سماع جائز ہی نہیں[۱]۔"

غالباً اسی قول کے پیش نظر حضرت امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی جب ان سے سماع کے بارے میں پوچھا گیا تو یہی جواب دیا کہ:۔

"منتہی را باو حاجت نیست و مبتدی را مضر است"

منتہی کو اس کی ضرورت نہیں، اور مبتدی کے لئے نقصان دہ ہے۔

امام سہروردی آگے لکھتے ہیں:

حضرت جنید بغدادیؒ کا قول ہے کہ "جب تم کسی مرید کو سماع کی اجازت مانگتے دیکھو تو سمجھ لو کہ اس میں ابھی کچھ ناکارگی باقی ہے" کہا جاتا ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ نے سماع ترک کر دیا تھا (اور اپنے مریدوں کو بھی اس سے روک دیا تھا) ان سے کہا گیا کہ "آپ تو خود سماع سنا کرتے تھے؟" فرمایا "کن کے ساتھ؟" عرض کیا گیا "خود اپنے لئے سنا کرتے تھے؟" فرمایا "کن لوگوں سے سنا کرتا تھا؟"

وجہ یہ تھی کہ وہ حضرات ایسے ہم نشینوں کے ساتھ سماع فرماتے جو سماع کے اہل ہوتے تھے، اور ایسے لوگوں سے سماع سنتے تھے جو گانے کے اہل ہوتے تھے۔ اسی لئے جب حضرت جنید بغدادیؒ کو ہم مزاج ساتھی نہیں ملے تو انہوں نے سماع ترک کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ بزرگان دین نے جب کبھی بھی سماع کو اختیار فرمایا ہمیشہ کچھ حدود و قیود اور شرائط وآداب کا لحاظ رکھا اس کے ذریعہ وہ آخرت کی فکر، جنت کی رغبت اور دوزخ کا خوف پیدا کرتے (دین و شریعت پر عمل کرنے کا) جذبہ اور طلب بڑھاتے اور اپنی (دینی اور اخلاقی) حالت کو بہتر

---

[۱] عوارف المعارف الباب الثالث والعشرون فی القول فی السماع رداً وانکاراً ص ۱۸۷۔

بناتے تھے۔

علاوہ ازیں سماع سے وہ حضرات بعض بعض اوقات ہی شغل فرماتے تھے اُسے اپنا مشغلہ اور عادت نہیں بناتے تھے کہ عبادات اور اعمال میں حرج پڑنے لگے[۱]

آگے لکھتے ہیں:

"علماء شافعیہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ غیر محرم عورت سے خواہ وہ باندی ہو یا آزاد پردے میں ہو یا سامنے، سماع جائز نہیں۔

امام مالکؒ کے یہاں یہ مسئلہ ہے کہ" اگر کسی نے باندی خریدی اور بعد میں پتہ چلا کہ وہ مغنیہ ہے تو خریدار کو اختیار ہے کہ اس عیب کی بنا پر باندی واپس کردے" یہی رائے تمام اہل مدینہ کی ہے اور یہی امام ابو حنیفہؒ کا بھی مسلک ہے"

گانا سننا گناہ ہے اور سوائے چند فقہاء کے سب اسے ناجائز کہتے ہیں اور جو اُسے جائز کہتے ہیں وہ بھی مسجد اور دوسرے مقدس مقامات پر اسکی اجازت نہیں دیتے"[۲]

امام موصوف نے اس کے بعد غناء کی کراہت و تحریم پر قرآن و حدیث سے دلائل پیش کئے ہیں، پھر لکھتے ہیں:

(مشہور صوفی اور ولی اللہ) حضرت فضیل بن عیاض کا قول ہے" گانا زنا کا افسوں ہے"

اگر کوئی شخص انصاف سے کام لے، اور ہمارے زمانے میں سماع کی محفلوں پر غور کرے اور مغنی کا دف اور مطرب کا شبابہ لیکر بیٹھنے والے کو دیکھے پھر سوچے کہ آیا اس قسم کا اجتماع کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں

---

[۱] عوارف المعارف ص ۱۸۸ [۲] ایضاً

کبھی ہوا تھا؟ کبھی صحابہ رض نے بھی قوال اور مغنی کو بلایا تھا۔؟ کبھی وہ حضرات بھی کسی مغنی کے گرد اس طرح پروانے بن کر بیٹھے تھے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ جواب انکار ہی میں ہوگا۔ تو پھر اگر سماع میں ذرا بھی نفع ہوتا اور اس سے کچھ بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا تو یہ حضرات اسے اس طرح بغیر مس کئے مہمل نہ چھوڑ دیتے۔

جو شخص یہ کہے کہ سماع کوئی نیکی اور فضیلت کا کام ہے جس کے لئے دوڑ دھوپ کیجائے اور محفلیں جمائی جائیں۔ اس میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رض اور تابعین عظام رح کے حالات سمجھنے کا بالکل بھی ذوق نہیں۔

بعض متاخرین نے استحسان کا سہارا لے کر سماع کی کچھ گنجائش نکالی ہے مگر افسوس! اکثر لوگ اس میں غلطی کر جاتے ہیں۔[۵]

آگے لکھتے ہیں:

"جس وقت محفل سماع میں مغنی بے ریش لڑکا ہو، تو فتنہ متوجہ ہوتا ہے، تمام خدا ترس لوگوں کے نزدیک یہ سماع قطعاً حرام ہے۔ حضرت بقیہ بن ولید رح کہتے ہیں کہ "اسلاف بے داڑھی کے حسین لڑکے پر نظر ڈالنے کو مکروہ سمجھتے تھے" حضرت عطاء کا قول ہے جس نظر میں بھی نفسانی خواہش ہوا میں کوئی بھلائی نہیں۔ حسن تابعی فرمایا کرتے تھے کہ "میں کسی تائب نوجوان کیلئے خوفناک درندے کو اتنا خطرناک اور مہلک نہیں سمجھتا تھا کہ ایک بے ریش لڑکے سے اسکی مجالست کو"

خلاصہ یہ کہ جماعت صوفیاء کے لئے اب صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے وہ یہ کہ اس قسم کی محفلوں سے پرہیز کریں۔ اور مواضع تہمت سے بچیں، کیونکہ تصوف تو سراپا صدق وحقیقت ہے۔ اسے ہرگز ہزل واستہزاء سے نہ ملائیں۔

(عوارف المعارف بہامش الاحیاء ج ۲ ص ۲۲۱)

---

۵ عوارف المعارف ص ۱۸۹

علامہ ابن حجرؒ "کف الرعاع" میں لکھتے ہیں :-

"قرطبیؒ نے امام طرطوسیؒ سے نقل کیا ہے کہ ان سے بعض لوگوں کے بارے میں پوچھا گیا، جو ایک جگہ بیٹھ کر پہلے قرآن کریم کی کچھ تلاوت کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک شخص اٹھ کر اشعار گاتا ہے پھر سب مست ہو کر رقص کرتے ہیں، اور دف اور شبابہ بجاتے ہیں (اس طرح قرآن خوانی کی مجلس رقص وسرود کی محفل بن کر رہ جاتی ہے) کیا ایسے لوگوں کے ساتھ شریک ہونا جائز ہے؟

آپ نے جواب دیا کہ : اکابرین صوفیاء کے نزدیک ایسا کرنا غلط کاری اور گمراہی ہے۔ اسلام تو نام ہے صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا[1]

آگے (یہ لکھنے کے بعد کہ رقص وسرود تو دراصل سامری کی ایجاد ہے۔ نیز صحابہ کرامؓ کی محفلیں تو اس قدر پروقار ہوتی تھیں کہ جب وہ بیٹھتے تو اتنے سکون سے بیٹھتے تھے کہ گویا ان کے سروں پر پرندے ہیں۔ جو ذرا حرکت سے اڑ جائیں گے) لکھتے ہیں :-

"جو شخص بھی خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کیلئے ہرگز جائز نہیں کہ ایسے لوگوں کے ساتھ شریک ہو اور ان کی اس ناجائز کام میں معاونت کرے۔ یہی ائمہ اربعہ اور دوسرے مجتہدین کا مذہب ہے۔

بعض لوگ مشائخ کی حکایات اور ان کے افعال سے رقص وسرود کی اباحت پر استدلال کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم بھی وجد میں آکر معمولی درجہ میں ہاتھ پیر ہلانے کے جواز کے منکر نہیں صرف بھڑے اور چھچھورے پن کو ناجائز کہتے ہیں، آخر یہ کہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ مشائخ کرامؒ (رقاصاؤں کی طرح) ناچتے لہراتے اور بل کھاتے تھے؟

چلئے! اگر مان لیں کہ انہوں نے رقص کیا ہے تو بتایئے کہ آخر کہاں سے معلوم ہوا کہ

---

[1] کف الرعاع بہامش الزواجر ۱ص ۵۱۔ مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد اور اصول دو چیزیں ہیں، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ، اور یہ رقص وسرود کی محفلیں کتاب وسنت سے کہیں ثابت نہیں۔

(دل نرما دیے اور ایمان اور آخرت کی فکر پیدا کرنے والے اشعار سنکر) وہ حضرات اس وقت اپنے آپے میں ہوتے تھے اور وجد انہیں مجبور اور بے اختیار نہیں کر دیتا تھا؟

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم ان حکایتوں اور قصوں کو صحیح نہیں مانتے جن میں رقص و سرود کی نسبت ان بزرگوں کی طرف کی گئی ہے بہت ممکن ہے کہ جسطرح زندیقوں نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم تک کو نہ چھوڑا اور لاتعداد من گھڑت باتیں اور احادیث ان کی طرف منسوب کر دیں۔ اسی طرح انھوں نے یہ حکایات اور قصص بھی اپنی طرف سے گھڑ کر ان بزرگوں کی طرف منسوب کر دیئے ہوں۔

اگر بفرض محال ان حکایات کو صحیح مان لیں اور تسلیم کرلیں کہ ان حضرات نے یہ حرکات اپنے قصد و اختیار سے کی تھیں تو بھی ہمارے لئے سند صرف حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد صحابہ کرام اور ائمہ مہتدین کا عمل ہے اور ہم تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ ان کا عمل ہرگز یہ نہ تھا۔[۱]

آگے لکھتے ہیں:

کتنی پیاری بات ہے جو امام العارفین۔ قدوۃ العلماء ابو علی رودباری نے کہی ہے ان سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص آلات موسیقی سے لطف اندوز ہوتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ "ایسا کرنا میرے لئے حلال ہے۔ کیونکہ میں اتنا پہنچا ہوا ہوں کہ احوال کا اختلاف مجھ پر اثر انداز نہیں ہوتا" آپ نے جواب دیا۔ "ہاں وہ پہنچا ہوا ہے لیکن کہاں؟ جہنم میں[۲]!

پھر آگے چل کر مزید لکھتے ہیں کہ:

"مین کے بعض ائمہ فرماتے ہیں" جہاں تک ہمارے زمانے میں رائج سماع کا سوال ہے۔ سو وہ بلاشبہ حرام ہے کیونکہ اس میں منکرات ہوتے ہیں۔ عورتوں مردوں کا آزادانہ خلا ملا ہوتا ہے اور عوام اس کی وجہ سے ان گنت لغویات میں مبتلا ہوتے ہیں

[۱] کف الرعاع ج ۱ ص ۵۱، ۵۲ [۲] کف الرعاع ج ۱ ص ۵۳

ہیں ۔ لہٰذا حاکم (کے فرائض میں شامل ہے اور اس) پر واجب ہے کہ لوگوں کو سماع سے روکے"۔ (کف الرعاع ملخصًا علی ہامش الزواجر ج ۲ ص ۶۰)

صاحب "اقتباس الانوار" نے حضرت بختیار کاکی کا تذکرہ کرتے ہوئے، "سر الاقطاب" سے ایک قول نقل کیا ہے جس کی نسبت قاضی حمید الدین[1] ناگوری کی طرف کی گئی ہے۔ پھر اس قول کی نسبت پر جرح کی ہے۔ لیکن وہ قول دین و شریعت کے قوانین کے عین مطابق ہے۔ اس لئے بجائے خود قابل قبول ہے ہم ذیل میں "اقتباس الانوار" کی اصل عبارت مع اس قول کے نقل کرتے ہیں۔

"(مجلس میں) قاضی حمید الدین بھی موجود تھے۔ کہنے لگے میں۔ حمید الدین۔ سماع سنتا ہوں، اور علماء کے قول کے بموجب اسے حلال کہتا ہوں۔ کیونکہ میں مریض ہوں اور درد دل میں مبتلا ہوں، جس کا علاج صرف سماع ہی ہے حضرت امام ابو حنیفہ نے ایسے مریض کا علاج شراب سے کرنا جائز قرار دیا ہے جس کے مرض کا علاج کسی دوسری دوا سے نہ ہو سکے نیز اطباء کا بھی اتفاق ہو کہ مریض اس دوا سے صحت مند ہو جائے گا" اسی بنیاد پر کہ میرے درد لادوا کا علاج صرف سماع ہے سماع کا سننا میرے لئے جائز ہے۔ جب کہ تمہارے لئے حرام ہے۔[2]

علامہ سجزی نے اپنی کتاب "فوائد الفواد" میں حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات میں لکھا ہے کہ:-

"۸ شوال ۷۱۹ھ کی تاریخ تھی، حضرت نظام الدین اولیاء کی مجلس ہو رہی تھی، اور سماع کا مسئلہ زیر گفتگو تھا۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے حضرت سے عرض کیا "آپ کیلئے تو جب چاہیں سماع مباح ہو جائے، اس لئے کہ یہ آپ کے لئے بالکلیہ) حلال ہے" حضرت نے فرمایا "نہیں، جو چیز حرام ہوتی ہے وہ کسی ایک کیلئے بھی حلال نہیں ہوتی

---

[1] شیخ رکن بن حسام ناگوری نے اپنے "فتاویٰ حمادیہ" میں ان کا نام حماد الدین نقل کیا ہے واللہ اعلم (مصنف) [2] السنۃ الجلیۃ ص

اور جو چیز حلال ہوتی ہے وہ کسی شخص کے کہنے سے حرام نہیں ہو جاتی، بلکہ دراصل تحقیق یہ ہے کہ سماع ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے چنانچہ امام شافعیؒ نے دف کے ساتھ سماع کو جائز قرار دیا ہے جب کہ ہمارے مشائخ حنفیہؒ نے اسکی بھی اجازت نہیں دی، اور ضابطہ یہ ہے کہ قضا اور حکم حاکم سے، مسائل مجتہد فیہ میں موجود اختلاف رفع ہو جاتا ہے اور اس صورت میں حاکم خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو اسی کی بات مانی جائے گی[1]"

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ "اخبار الاخیار" میں حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی کا تذکرہ کرتے ہوئے جو کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے سب سے بڑے خلیفہ ہیں. لکھتے ہیں.

"منقول ہے کہ ایک دن حضرت نظام الدین اولیاء کے کچھ مریدین نے ایک مجلس منعقد کی، اور عورتوں کے دف سے گانا سننے لگے. شیخ نصیرالدین محمودؒ بھی اسی مجلس میں موجود تھے، آپ نے جب یہ ماجرا دیکھا تو اُٹھ کر مجلس سے باہر جانے لگے، مگر آپ کے ساتھی وہیں بیٹھے رہے، آپ نے فرمایا" یہ خلاف سنت فعل ہے" ان لوگوں نے جواب دیا. کیا آپ سماع کا انکار کرتے ہیں اور اپنے پیر کے راستے کو چھوڑتے ہیں؟" شیخ نے جواب دیا. کسی کا عمل حجت نہیں (چنانچہ اگر میرے پیر سماع کرتے ہوں تو کیا کریں. ان کا سماع زمانا حلت سماع کیلئے دلیل نہیں کیونکہ) حجت صرف کتاب وسنت ہی ہیں"

بعض غرض مندوں نے یہ بات حضرت نظام الدین اولیار تک پہنچادی کہ شیخ محمود تو ایسا ایسا کہہ رہے تھے. حضرت نظام الدین اولیار جو شیخ محمود کے خلوص وصدق سے بخوبی واقف تھے. جواب دیا "محمود ٹھیک کہتے ہیں. حق بات وہی ہے. جو انہوں نے کہی."

"سیر الاولیا" میں لکھا ہے. کہ حضرت نظام الدین اولیار کی مجلس میں نہ باجے بجتے، نہ تالی پیٹی جاتی، بلکہ اگر کوئی مرید باجے تاشے قسم کی کوئی چیز سننے کے لئے بھی جاتا، تو آپ

---

[1] السنۃ الجلیہ ص ۲۸، ۲۹ و فوائد الفواد ص ۲۲۳، ۲۲۴

اُسے منع کر دیتے اور فرماتے "یہ اچھا نہیں کیا"

"خیرالمجالس" میں ہے کہ "شیخ نصیرالدین محمود" کی خدمت میں ایک عزیز آیا اور کہنے لگا۔ "بتائیے! یہ کہاں سے جائز ہے کہ محفل میں باجے دف۔ نای اور رباب وغیرہ ہوں۔ اور صوفیاء رقص کریں؟" شیخ نے جواب دیا کہ "باجے بالاجماع ناجائز ہیں (دیکھو) اگر سلوک کے کسی ایک طریق کو چھوڑ دو گے (اور دوسرا اختیار کر لو گے) تو کم از کم شریعت میں تو رہو گے اور اگر شریعت کو چھوڑ دو گے تو کہاں جاؤ گے؟ اور پھر اختلاف تو صرف سماع کے بارے میں ہے کہ بعض علماء کے نزدیک سماع چند شرائط کے ساتھ اہل حضرات کے لئے مباح ہے۔ جہاں تک باجوں کا تعلق ہے، وہ تو بالاجماع حرام ہے"[1]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے "فرع الاسماع" میں لکھا ہے کہ:

"شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی کے مریدین کہتے ہیں کہ "ہمارے شیخ کا فرمان ہے کہ جو شخص راگ باجوں کے ساتھ سنے وہ ہماری بیعت و ارادت سے نکل گیا"[2]

شیخ علی بن محمد جاندار نے، جو حضرت نظام الاولیاء کے خلفاء میں سے ہیں "درر نظامیہ" میں لکھا ہے:

شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کہتے ہیں کہ سماع کی چار قسمیں ہیں، حلال، حرام، مکروہ، اور مباح۔ انہیں سے مباح کیلئے کچھ شرطیں ہیں۔

(۱) مغنی مرد کامل ہو نہ امرد ہو نہ عورت۔

(۲) سامع اللہ والا ہو، نفس پرست نہ ہو۔

(۳) مضمون فحش اور ناجائز نہ ہو۔

(۴) سماع کے ساتھ آلات موسیقی اور باجے نہ ہوں[3] "

"اقتباس الانوار" سے لیکر یہاں تک تمام تر عبارات مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب

---

[1] السنۃ الجلیہ ص ۵۵، ۶ و اخبار الاخیار ص ۸۰ [2] السنۃ الجلیہ ص ۷، ۵ و فرع الاسماع ص ۳۹۔
[3] السنۃ الجلیہ ص ۵۸۔

"السنۃ الجلیۃ فی الچشتیۃ العلیۃ" کے مختلف مقامات سے نقل کی گئی ہیں۔

یہ ہیں سماع سے متعلق بزرگانِ دین کے اقوال جنہیں بڑی عرق ریزی اور محنت سے جمع کیا گیا ہے تاکہ قارئین کے سامنے اس مسئلہ سے متعلق حضرات صوفیاء کے مسلک کے تمام پہلو واضح ہوجائیں چنانچہ اب اللہ کے فضل وکرم سے مسئلہ کی حقیقت تک پہنچنا آسان ہوگیا ہے۔

فالحمد للہ علیٰ ذالک

بیان ملکیت متعلق ماہنامہ "دارالعلوم" بابت رجسٹریشن ایکٹ فارم ۴ رول ۸

نام ———— رسالہ دارالعلوم

وقفہ اشاعت ———— ماہانہ

پرنٹر پبلشر ———— مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب

قومیت ———— ہندوستانی

پتہ ———— دارالعلوم دیوبند

ایڈیٹر ———— مولانا ریاست علی صاحب

قومیت ———— ہندوستانی

پتہ ———— دارالعلوم دیوبند

مالک ———— دارالعلوم دیوبند

میں تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کے مطابق درست ہیں۔

(مولانا) مرغوب الرحمٰن (صاحب)

فقہ اسلامی اور جدید مسائل کا حل

مولوی عزیز اللہ اعظمی۔ فاضل دارالعلوم دیوبند

ایک زندہ و جاوید اور دائمی شریعت کے لئے ضروری ہے کہ اس رواں دواں دنیا میں ہر گھڑی پیدا ہونے والے نئے نئے مسائل کا حل اس کے پاس صحیح حل موجود ہو۔ اور اس کے دامن میں پناہ لینے والوں کی ہر قسم کی ضروریات کا سامان فراہم ہو۔ شریعت اسلامیہ ایک ایسی ہی شریعت ہے جس کے پاس قیامت تک پیدا ہونے والے نئے نئے مسائل کا حقیقی حل موجود ہے اور اس کے دامن میں پناہ لینے والوں کی ہر قسم کی ضروریات اور اس کے روحانی وجسمانی امراض کا درماں موجود ہے اسکی بنیاد ایسے مستحکم اصول و قواعد پر قائم ہے جسکی روشنی میں ہم ہر زمانہ میں پیدا ہونے والے جدید اور نت نئے مسائل کا صحیح حل تلاش کر سکتے ہیں۔

شریعت اسلامی کے ماخذ و مصادر

قرآن کریم اور سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ اجماع اور قیاس احکام شرعیہ کے بنیادی ماخذ اور اصل الاصول ہیں اور جمہور علماء نے انہیں چار چیزوں کو احکام شرعیہ کا اصل منبع اور سرچشمہ قرار دیا ہے اور انہیں اصول اربعہ کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ ورسولہ ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الآخر ذالک خیرو	اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی اور اپنے امراء کی اور جب تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو تو معاملہ کو اللہ اور اس کے رسول کے پاس لے جاؤ اگر تم اللہ اور یوم آخرت

احسن تاویلاً (سورۂ نساء پ۵) پر ایمان رکھتے ہو اور یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

بعض علماء نے ان چاروں بنیادی اصولوں کے علاوہ کچھ اور اصولوں کو بھی شرعی ماخذ قرار دیکر ان کی بنیادوں پر فقہی احکام کا استنباط کیا ہے مگر وہ اصول ایسے ہیں جن کے حجت اور قابل استدلال ہونے میں علماء کا باہمی اختلاف ہے نیز ان کے مفہوم کی تحدید اور ان کے دائرۂ عمل کی وسعت میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے بہرحال ایسے اصولوں کو فقہی اصطلاح میں استدلال کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور اس کے ماتحت یہ دلائل آتے ہیں:۔

(۱) قول صحابیؓ (۳) مصالح مرسلہ (۵) استصحاب

(۲) استحسان (۴) عرف وعادت (۶) اسلاف کے قوانین

اسلامی قانون سازی کے بنیادی اصول

یہ وہ بنیادی اصول ہیں جو اسلامی قانون سازی اور اسلامی احکام کے استنباط میں علماء کیلئے رہنمائی کا کام دیتے ہیں اور انہیں بنیادوں پر ہر زمانہ کے علماء اپنے زمانہ میں جدید حالات و ضروریات کے مطابق ایسے احکام و قوانین مستنبط کرتے چلے آئے ہیں جن کے بارے میں قرآن وسنت میں واضح احکام موجود نہیں تھے۔ کیونکہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں نئے نئے مسائل اور واقعات اس قدر رونما ہوتے ہیں کہ ان کا پہلے سے احاطہ نہیں کیا جا سکتا ایسے نئے واقعات بیشمار ہیں اور ہر وقت نئی شکل وصورت میں پیش آتے رہتے تھے بلکہ ماحول اور قوموں کے اختلاف کی وجہ سے ان کے احکام کی نوعیت کبھی بدلتی رہتی ہے لہٰذا انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے اور خدا کی طرف سے یہ بڑا احسان ہے کہ ان میں سے بہت سے مسائل واحکام کو اس وقت کے مجتہدین علماء کے اجتہاد وتحقیق پر چھوڑ دیا تاکہ وہ قرآن وسنت کے بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھکر وقتی حالات کے مطابق ایسے نئے نئے مسائل کا استنباط کرسکیں جنکی بنیاد قرآن وسنت کے اصولوں پر رکھی گئی ہے ایسے اہم مقاصد جنہیں قرآن وسنت اسلامی قانون سازی کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں مندرجہ ذیل اصولوں پر مبنی ہیں۔

۱۔۔۔ مکمل حق وانصاف کا تلاش کرنا۔

۲ ۔۔۔ ہر کام میں آسانی کو ملحوظ رکھا جائے اور دقت کو دور کیا جائے۔

۳ــــ عرف کی اس کی شرط کے مطابق پابندی کیجائے۔

۴ــــ ہر کام کی مصلحت کو پیش نظر رکھا جائے اور اسکی خرابیوں کو دور کیا جائے۔

۵ــــ نہ خود کسی کو نقصان پہونچے اور نہ دوسروں کو نقصان پہونچایا جائے۔

۶ــــ ضرورت ممنوعات کو جائز کر دیتی ہے۔

۷ــــ ضرورت کے موقع پر صرف ضرورت کی حد تک کام کیا جائے۔

۸ــــ شرعی حدود شک و شبہ سے ساقط ہو جاتی ہیں۔

۹ــــ معاملات میں خوبیوں کو اختیار کیا جائے اور برائیوں سے پرہیز کیا جائے۔

۱۰ــــ حقوق و فرائض و احکام میں مساوات کو اختیار کرنا بجز اس صورت کے جب عام مصلحت، ضرورت یا فطرت عدم مساوات کا تقاضا کرے۔

اب ہم ذیل میں مذکورہ بالا اصول اربعہ قرآن کریم۔ سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ و التسلیم، اجماع اور قیاس کی اہمیت اور شریعت اسلامیہ میں ان کا مقام اور استنباط احکام و مسائل کے بارے میں ان کے ماخذ اشتقاق ہونے پر بحث کریں گے اور ہر ایک کی تعریف بھی بیان کریں گے علی ہذا استحسان، مصالح مرسلہ، عرف و عادت، استصحاب وغیرہ کے متعلق ائمہ مجتہدین کی رائیں پیش کریں گے تاکہ قارئین کرام کو بصیرت تامہ حاصل ہو اور یہ امر بخوبی واضح ہو جائے کہ دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کے پاس ایسے مستحکم اور ٹھوس اصول و قواعد ہیں جنکی روشنی میں ہر زمانہ میں رونما ہونے والے پیچیدہ سے پیچیدہ اور جدید سے جدید مسائل کا حل پیش کیا جا سکتا ہے خواہ وہ مسائل حکومت و سلطنت سے متعلق ہوں یا سیاست سے۔ اقتصادیات کے ہوں یا معاملات کے۔ اجتماعی ہوں یا انفرادی۔

قرآن کریم کی اہمیت و ضرورت

قرآن کریم ہی شریعت اسلامیہ کا مصدر اول ہے یہ دین کا اصل سرچشمہ اور اس کے اصول و فروع کا ماخذ اشتقاق ہے اس لحاظ سے یہ شریعت کا ضابطہ اور اس کے احکام کا جامع ہے حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

جس نے قرآن کو اپنے سینہ میں جمع کیا اسنے عظیم ذمہ داری کا بار اٹھایا اس کے دونوں پہلو

اسرار نبوت پر حاوی ہیں...... ۱۶

ابن حزم ظاہری فرماتے ہیں:

"جملہ فقہی مسائل کی اصل قرآن میں موجود ہے سنت نبوی صرف اس کا اعلان کرتی ہے جیساکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

ما فرطنا فی الکتاب من شئی (پ۔ ۳۸) یعنی ہم نے قرآن میں کسی چیز کا ذکر باقی نہیں چھوڑا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں۔

من قرا القرآن فلیس فوقہ احد قرآن پڑھنے والے سے بہتر اور کوئی نہیں

(۱) قرآن شریعت اسلامی کا پہلا ماخذ

تمام علماء اسلام کا اسپر اتفاق ہے کہ قرآن ہی تمام احکام شرعیہ کا پہلا ماخذ ہے بلکہ بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ صرف قرآن ہی اصل ماخذ ہے اس کے علاوہ کوئی چیز شرعی ماخذ اور سرچشمہ نہیں بن سکتی ہے بلکہ دوسرے اصول صرف اسی کی تشریح اور وضاحت کرتے ہیں یا ان کے بنیادی اصولوں سے فروعی احکام کا استنباط کرتے ہیں اور اس مقصد کیلئے وہ اپنا بنیادی تصور قرآن ہی سے حاصل کرتے ہیں لہٰذا اگر کسی کو کوئی شرعی حکم معلوم کرنے کی ضرورت ہو تو ایک عالم کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس کا بنیادی اصول صرف قرآن میں تلاش کرے ان علماء کا خیال یہ ہے کہ سنت نبوی، قیاس وغیرہ کی بنیادوں پر جو صریح احکام پائے جاتے ہیں ان کے بنیادی اصول یا انکی روح کیطرف قرآن کریم ضرور اشارہ کرتا ہے اسلامی قوانین کیلئے قرآن کریم کو اصل ماخذ قرار دینے کیلئے کسی مذہبی ثبوت یا دلیل کی حاجت نہیں ہے چنانچہ امام شاطبیؒ نے اپنی کتاب الموافقات میں تحریر کیا ہے کہ" تمام مسلمان اسے تسلیم کرتے ہیں۔

(۲) قرآنی احکام کا نفاذ

قرآن کریم میں جتنے احکام بیان کئے گئے ہیں سب کا ماننا لازمی قرار دیا گیا ہے اور اسمیں جو شرعی احکام مذکور ہیں انہیں نافذ کرنے پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے ہیں تو گویا ہم خداوند کریم سے جنگ کرتے ہیں۔ اس نے ہماری بھلائی اور کامیابی کے واسطے نیز ہماری خرابیوں کو دور کرنے کیلئے جو قوانین بنائے ہیں اسکی ہم مخالفت کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی صادق

آسے گا۔

ومن لم یحکم بما انزل اللّٰہ فاولٰئک ھم الکافرون (سورہ مائدہ پ ۶) جنہوں نے اللہ کے نازل کردہ احکام کیمطابق فیصلہ نہیں کیا وہ لوگ کافر ہیں

یہ حقیقت ہے کہ قرآن میں شریعت کا ذکر اجمال کے ساتھ ہے جو محتاج تفصیل ہے اور بیشتر مواقع میں اسکی تشریح و توضیح کی ضرورت پڑتی ہے لہٰذا قرآن سے استنباط احکام و مسائل کیلئے سنت نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کی دست گیری ناگزیر ہے۔ جیساکہ خود اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا:

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیہم (سورۃ النحل) یعنی قرآن ہم نے آپکی طرف اسلئے اتارا ہے کہ آپ اسکی لوگوں کے سامنے خوب وضاحت کردیں۔

یہاں پر یہ امر بھی واضح رہنا چاہیئے کہ قرآن تشریع احکام کے سلسلے میں جزئی مسائل و واقعات سے تعرض نہیں کرتا ہے بلکہ بنیادی اصول وقواعد کلیہ اور مذہبی مبادیات کو پیش کرتا ہے تاکہ … مجتہدین علماء ہر زمانہ اور ہر نسل میں ان بنیادی اصولوں کی طرف رجوع کرسکیں اور ہر زمانہ کے مناسب حالات ان سے مسائل کا استنباط کرسکیں۔

حدیث نبوی قرآن کی شارح ہے

اوپر بیان کیا گیا ہے کہ قرآن کی بعض آیات جنکا تعلق احکام سے ہے مجمل ہونیکی وجہ سے تفصیل کی محتاج ہیں اسیطرح بعض میں خفا اور بعض میں اطلاق ہے سنت نبوی صلے اللہ علیہ وسلم اس اجمال کی تفصیل خفا کی توضیح وتشریح کرتی ہے اور مطلق کو مقید کرتی ہے گویا حدیث نبوی قرآن کی شارح ہوئی۔

حدیث نبوی شریعت اسلامی کا دوسرا ماخذ (۲)

قرآن کریم کے بعد سنت نبوی صلے اللہ علیہ وسلم شریعت اسلامیہ کا دوسرا سب سے بڑا ماخذ ہے علامہ شاطبی الموافقات میں لکھتے ہیں:-

" قرآن سے استنباط مسائل کرتے وقت اسکی شارح حدیث سے صرف نظر کرکے صرف قرآن ہی تک نہیں محدود رہنا چاہیئے کیونکہ قرآن ایک ضابطۂ کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں اصولی مسائل کا ذکر ہے۔ جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ لہٰذا ان اصولی مسائل کی تشریح

کیلئے حدیث نبوی کی طرف رجوع کرنا ازبس ضروری ہے (الموافقات ص ۳۴)

سنت کی تعریف

(۱) لفظ السنۃ شامل لقول الرسول ؐ وفعلہ علیہ السلام و منطق علی طریقۃ الرسول والصحابۃ

(کشف الاسرار لعبدالعزیز الحنفی ص ۲۵۹/۳۶)

(۲) السنۃ ما ورد عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم من قول غیر القرآن او فعل او تقریر

(قواعد الاصول لصفی الدین الحنبلی ص ۹۱)

(۳) السنۃ ھی قول الرسول ؐ و فعلہ (منہاج للبیضاوی الشافعی ص ۱۶)

(۴) اما السنۃ فتطلق علی الاکثر ما اضیف الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من قول او فعل او تقریر فھی مرادفۃ للحدیث عند علماء الاصول۔

(توجیہ النظر للعلامہ الجزائری ص ۳)

مذکورہ بالا عبارتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ سنت نام ہے حضور پاک صلے اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل اور تقریر کا سنت و حدیث مرادف اور ہم معنی لفظ ہیں ایک کا دوسری کی جگہ استعمال ہوتا ہے البتہ کبھی کبھی قرائن کی وجہ سے دونوں کے معنی میں فرق بھی ہو جاتا ہے۔

حدیث نبوی ؐ سے صرف نظر ممکن نہیں

یہ صحیح ہے کہ اسلامی قانون سازی میں قرآن کریم مصدر اول کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ سنت نبوی ؐ قرآن کی شارح اور مبین ہے اور قرآن کے بعد شریعت کا دوسرا بڑا ماخذ ہے اس لئے ایک مجتہد کیلئے مسائل کی تخریج و استنباط میں سنت نبوی ؐ سے صرف نظر کرنا کسی حال میں جائز نہیں ہے بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ پیش آمدہ مسائل میں سب سے پہلے قرآن کریم کی طرف رجوع کرے اور اس میں اسکا حل تلاش کرے اگر قرآن کے اندر اس کا جواب نہ ملے تو احادیث نبوی ؐ کا مطالعہ کرے اور اس میں حل تلاش کرے۔

اس سلسلے میں حضرت معاذ بن جبل رضؓ کی حدیث ہمارے لئے نمونہ ہے۔

عن معاذ بن جبل رضؓ ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لما بعثہ الی الیمن قال	جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن روانہ فرمایا تو اس موقع پر ان کو

کیف تقضی اذا عرض لک قضاء قال اقضی بکتاب اللہ قال فان لم تجد فی کتاب اللہ قال فبسنۃ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال فان لم تجد فی سنۃ رسول اللہ قال اجتھد (ای ولا آلو قال فضرب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم علی صدرہ وقال الحمد للہ الذی وفق رسول اللہ لما یرضی بہ رسول اللہ

رواہ الترمذی (مشکوٰۃ ص۳۲۵)

..... سے دریافت فرمایا کہ "تم پیش آمدہ مسئلہ میں کیونکر فیصلہ کروگے معاذ بن جبلؓ نے عرض کیا اللہ کی کتاب سے۔ آپؐ نے فرمایا اگر مطلوبہ مسئلہ قرآن میں نہ ملا۔ عرض کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ فرمایا اگر وہاں بھی وہ مسئلہ نہ ملا۔ تو معاذ بن جبلؓ نے عرض کیا اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور پوری کوشش کروں گا...... الخ

※ ※ ※

اجماع شریعت اسلامی کا تیسرا اصل لاصول (۳)

قرآن کریم ۔ سنت نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد اجماع فقہ اسلامی کا تیسرا بڑا ماخذ ہے۔

اجماع کی تعریف

کسی زمانہ میں امت اسلامیہ کے فقہاء مجتہدین کا کسی شرعی حکم پر جمع ہونا اجماع کہلاتا ہے یہ اجماع کی صحیح ترین تعریف ہے جمہور علماء اصول کے نزدیک یہی تعریف پسندیدہ ہے امام شافعیؒ نے الرسالہ میں یہی تعریف ذکر کی ہے حضرت امام شافعیؒ اولین شخص تھے جنہوں نے اس کی تعریف لکھی اس کا حجت ہونا واضح کیا اور اسے فقہ اسلامی میں معتبر سمجھا۔

اجماع کی اساس

اجماع کے دین میں حجت ہونیکی اساس تین چیزیں ہیں :-

(۱) اول وہ احادیث جن سے اجماع کی حجت ثابت ہوتی ہے جیسے حدیث نبویؐ

(الف) لا تجتمع امتی علی ضلالۃ میری امت گمراہی پر مجتمع نہیں ہوگی۔

(ارشاد الفحول ص۷۴)

※ ※ ※

اور وہ حدیث جو حضرت امام شافعیؒ حضرت ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا آپؐ فرماتے تھے: (من الامن سرہ بحبحة الجنة فلیلزم الجماعة فان الشیطان مع الفذ وھو من الاثنین ابعد" (الرسالہ صفحہ ۴۷۴)

جو جنت کے وسط میں جانا پسند کرے وہ جماعت سے وابستہ رہے کیونکہ شیطان اکیلے آدمی کے ساتھ ہوتا ہے اور دو سے بہت دور ہوتا ہے۔

÷ ÷ ÷

(۲) دوسری اساس یہ ہے کہ صحابہ کرام پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کرتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ عام سیاسی امور میں صحابہ کرام کو جمع کرکے ان سے مشورہ طلب کرتے اور باہم تبادلۂ افکار کرتے جب ایک بات پر متفق ہوجاتے تو اسے اپنی سیاست کو مبنی قرار دیتے اگر اختلاف خیال رونما ہوتا تو بحث وتمحیص کے بعد جماعت علماء سے اتفاق کرتے چنانچہ سواد عراق کے بارے میں یونہی ہوا۔

(۳) اجماع کی تیسری اساس یہ ہے کہ دور اجتہاد میں ہر امام کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ ان سے کوئی ایسا شاذ قول صادر نہ ہو جو ان کے یہاں کے فقہاء کے خلاف ہوتا تاکہ اس کے منہاج فکر تک کو اجنبی نہ سمجھا جائے حضرت امام ابو حنیفہؒ فقہاء کوفہ کے اجماع کا سختی سے اتباع کرتے تھے حضرت امام مالکؒ اہل مدینہ کے اجماع کو حدیث آحاد پر ترجیح دیتے تھے اس طرح اجماع امت کا یہ نظریہ ایک حجت کی شکل اختیار کرگیا جسکی خلاف ورزی درست نہیں سمجھی جاتی تھی۔ یہ ہیں وہ بنیادی وجوہ جن کی وجہ سے اجماع فقہ اسلامی میں حجت شرعی متصور ہوتا ہے۔

اجماع کی حجت اور اسکی شرائط

اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابہ کرام کا اجماع متفقہ طور پر دلیل شرعی ہے لیکن سوال اس میں ہے کہ کیا دور صحابہ کے بعد تابعین وتبع تابعین کا اجماع اسی طرح بعد کے علماء کا اجماع معتبر ہے یا نہیں۔ علماء اصول کی تصریحات اور اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی زمانہ کے علماء کسی امر شرعی پر مجتمع ہوجائیں تو یہ اجماع چند شرائط کے ساتھ معتبر ہوگا۔

(۱) اجماع منعقد کرنے والے اس کے اہل ہوں۔ بدکردار اور اصحاب بدعت نہ ہوں کیونکہ بدکردار لوگ عزت ووقار کے حامل نہیں ہوتے اور اجماع میں داخل حضرات کی رائے کو اس لئے معتبر سمجھا جاتا ہے کہ اس میں انکی عزت افزائی اور اس بات کی شہادت دینا ہے کہ وہ لوگ اچھے ہیں۔

(۲) اگر یہ اجماع شریعت اسلامیہ کے وہ مسائل جو عام لوگوں کے لئے ہوتے ہیں اور جن میں

فکر و نظر کی ضرورت نہیں ہوتی) کے بجائے ان مسائل میں ہو جن میں نظر و اجتہاد کی ضرورت ہوتی ہے تو اس اجماع میں شریک ہونے والے حضرات کا مجتہد ہونا شرط ہے لہٰذا اگر بعض عوام اس کے خلاف ہوں تو ان کا اختلاف ناقابل التفات ہوگا اور اس اختلاف کے ہوتے ہوئے بھی اجماع منعقد ہو جائے گا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اجماع شریعت اسلامیہ کا تیسرا بڑا ماخذ ہے اور قیاس پر مقدم ہے اجماع کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب کوئی جدید اہم اور نیا مسئلہ پیش آئے اور قرآن وسنت اور کتب فقہ و فتاویٰ میں موجود نہ ہو اور نہ ہی اسکی نظیر موجود ہو اور امت اسلامیہ سخت پریشانی میں مبتلا ہو تو اس زمانے کے باکمال علماء پیش آمدہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے کسی امر شرعی پر مجتمع ہو جائیں تو وہ امر شرعی قابل عمل ہوگا۔

"قیاس" شریعت اسلامی کا چوتھا (۴) اصل الاصول

تخریج احکام اور استنباط مسائل کیلئے فقہ اسلامی کا چوتھا اصل الاصول قیاس ہے جب پیش آمدہ مسئلہ کا جواب قرآن وسنت اور اجماع میں نہ ملے تو ایک مجتہد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ درپیش مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور و فکر کرے۔ شریعت میں اس جیسے مسئلہ کی کوئی نظیر موجود ہو تو قیاس کی بیان کردہ شرائط کی حد میں رہ کر غیر منصوص مسئلہ کو منصوص مسئلہ پر قیاس کرے۔

قیاس کی تعریف

کتاب یا سنت یا اجماع میں مذکور کسی منصوص حکم کے ساتھ اشتراک علت کی بناء پر ایک غیر منصوص مسئلے کو اس پر قیاس کر لیا جائے تو اصطلاح فقہ میں اس کو قیاس کہتے ہیں۔

قیاس کی ضرورت

جیسے جیسے زمانہ گزرتا ہے نت نئے مسائل اور جدید سے جدید واقعات پیش آتے ہیں اور امت اسلامیہ ان سے دوچار ہوتی ہے اور ان پیش آمدہ مسائل وواقعات کا حل تلاش کرتی ہے لیکن قرآن وسنت کے اندر ان کا صراحۃً ذکر نہیں ہوتا ایسی صورت میں ایک فقیہ پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ قرآن وحدیث کا بنظر غائر مطالعہ کرے اگر پیش آمدہ مسئلے کی کوئی نظیر مل جائے تو مسئلہ کے مالہ وما علیہ اور اسکی

علت پر غور و خوض کرے اگر منصوص مسئلہ کی علت میں تعمیم ہو تو غیر منصوص مسئلہ کو اشتراک علت کی بنا پر اس پر قیاس کر کے منصوص مسئلہ کا حکم لگا دے۔ شریعت مطہرہ کا یہ وہ بنیادی اصول ہے جس کے ذریعہ ہر زمانہ میں پیدا ہونے والے مسائل و واقعات کا حل پیش کیا جا سکتا ہے۔

معلل و غیر معلل احکام

قیاس جس اساس پر قائم ہے وہ یہ ہے کہ شارع علیہ السلام کے احکام دنیا و آخرت کی فلاح و بہبود کیلئے وارد ہوئے ہیں لہٰذا یہ احکام ایسی حکمتوں اور فوائد پر مشتمل ہیں جن میں لامحالہ لوگوں کی مصلحت پائی جاتی ہے لہٰذا اسلام کے جملہ اوامر و نواہی اور مباحات و مکروہات میں حکم شرعی کا اصل سبب وہ اوصاف ہیں جو ان احکام کے مقتضی ہیں انہیں احکام کے پیش نظر اللہ تعالےٰ نے یہ احکام مشروع فرمائے جنکے عائد کرنے میں معاذ اللہ وہ مجبور نہ تھا نہ اس پر لازم و ضروری تھا۔ بلکہ عین فضل ربانی اور اس کا فضل و انعام ہے کہ اس نے ایسے احکام مقرر کیے ہیں جن میں بندوں کی خیر و فلاح مضمر ہے جن میں دینوی و اخروی فوائد ہیں چنانچہ حضرت امام ابو حنیفہ رحاس روشنی میں کتاب و سنت، اجماع اور مسائل و فتاویٰ کو سمجھتے اور ان میں غور و فکر کرتے تھے لیکن جو احکام شرعیہ عبادات پر مشتمل ہیں ان کے اوصاف سے مشروعیت کی علتوں کا سمجھنا فہم انسانی سے باہر ہے جو مناط احکام بن سکیں اسی بناء پر جیسا کہ علماء اصول فقہ نے بیان کیا ہے امام ابوحنیفہ رہ نصوص کو دو قسم پر منقسم کرتے ہیں۔

۱۔ پہلی قسم نصوص تعبدیہ ہیں جن کے علل سے بحث نہیں کیجا سکتی مثلاً وہ آیات و احادیث جو تیمم و مناسک جیسے مسائل پر مشتمل ہیں۔ یعنی وہ احکام۔ جو عبادات الٰہی اور تقربات ربانی کے لئے مشروع ہیں۔ جن سے اللہ تعالےٰ کی سلطانی و برتری کا پتہ چلتا ہے اس قسم کے نصوص میں قیاس کی گنجائش نہیں اس لئے کہ یہ غیر معلل ہیں ان میں سرے سے یہ بحث نہیں کیجا سکتی کہ یہ کن اوصاف کی بناء پر مشروع ہوئے اگرچہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ جملہ احکام انسانی مصالح کے پیش نظر مشروع ہوئے ہیں کیونکہ اللہ کی شریعت میں کوئی حکم بلا مصلحت نہیں ہے۔

۲۔ نصوص کی دوسری قسم وہ ہے کہ جن میں ان اوصاف و علل سے بحث کیجاتی ہے اور ان علتوں کی اساس پر قیاس جاری کیا جاتا ہے یہی وہ نصوص جن کے مقاصد و نتائج اور اسباب

وعلل کو جاننا ضروری ہی نہیں بلکہ فرض ہے بغیر اس کے جانے ہوئے فقیہ درپیش مسئلہ کا صحیح حل نہیں تلاش کر سکتا۔

علت کا کیونکر پتہ لگایا جائے

علت قیاس کا رکن رکین ہے اور یہ معلوم ہے کہ علت ہی وہ امتیازی وصف ہوتا ہے جس کے متعلق ایک شرعی دلیل یہ شہادت دیتی ہے کہ حکم کا تعلق صرف اسی سے ہے یعنی حکم کا مدار وہی ہے لہٰذا جہاں یہ وصف پایا جائے گا۔ وہاں حکم بھی پایا جائے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب اصل (مقیس علیہ) میں متعدد اوصاف پائے جاتے ہوں تو معلوم کرنا چاہیئے کہ ان اوصاف میں علت قرار دینے کی صلاحیت کس وصف میں ہے جس کے پہچاننے کے دو طریقے ہیں۔

۱۔ شارع علیہ السلام نے صراحۃً علت کی نشاندہی کی ہو یا کسی زمانہ میں مجتہدین کا اجماع منعقد ہوا ہو کہ فلاں وصف علت کی حیثیت رکھتا ہے نص سے علت قرار دینے کی مثال حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے جو آپؐ نے قربانی کے گوشت کی ذخیرہ اندوزی سے منع کرتے ہوئے فرمایا:

كنتُ نهيتكم عن ادخار لحوم الاضاحي لاجل الدافة۔ | میں قربانی کے گوشت کی ذخیرہ اندوزی سے اس لئے منع کرتا تھا کہ اہل مدینہ کے یہاں مسلمانوں کا ایک قافلہ فروکش تھا۔

(۲) علت کے معلوم کرنے کا دوسرا طریقہ استنباط ہے یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ کتاب وسنت میں کوئی نص نہ پائی جائے اور نہ ہی صحابی کا قول موجود ہو نہ اجماع۔ ایسی صورت میں علت کے پہچاننے کا طریقہ یہ ہوگا کہ مصادر شرعیہ اس وصف کے متعلق شہادت دیتے ہوں کہ وہ مناطِ حکم علت ہے یعنی حکم کا اسی پر مدار ہے۔

باقی آئندہ

حبیب الرحمٰن قاسمی قسط ۲

انقلاب ایران کی حقیقت

قائد انقلاب کے عقائد ونظریات، نذیات کی روشنی میں

(۲) قرآن عزیز اور شیعہ

جس طرح فرقہ شیعہ مسئلہ امامت اور ائمہ کی تعیین و تحدید نیز ان کے مقام و مرتبہ اور صفات و لوازمات کے بارے میں جادۂ مستقیم سے منحرف اور جمہور روایات سے بالکل مختلف ہے اسی طرح وہ قرآن عزیز کے متعلق بھی اجماع امت اور قرآن وحدیث کی روشن اور سیدھی شاہراہ کو چھوڑ کر ایسی راہ پر لگ گیا ہے جس نے اسے ظلمت و ضلالت کی آخری منزل پر پہنچا دیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حزم اپنی مشہور کتاب "الملل والنحل" میں لکھتے ہیں۔

ومن قول الامامية كلها قديما وحديثا ان القرآن مبدل زيد فيه ماليس منه ونقص منه كثير وبدل منه كثير۔ (۱)

امامیہ قدیم وجدید سب اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن میں تبدیلی کر دی گئی ہے جو باتیں قرآن میں نہیں تھیں اس میں بڑھا دی گئی ہیں اور کمی اور تبدیلی تو بہت کی گئی ہے۔

اس کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں " والقول بان بين اللوحين تبديلا كفر صريح وتكذيب لرسول الله " موجودہ قرآن کو محرف اور مبدل کہنا کھلا ہوا کفر اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ہے۔

اگرچہ آج کل کے شیعہ ازراہ تقیہ تحریف قرآن کا انکار کرتے ہیں لیکن علامہ ابن حزم نے جو بات

---

(۱) الملل والنحل ص۔

لکھی ہے صحیح وہی ہے جیساکہ خود شیعی علمار کی تصریحات اس کی شاہد ہیں جن کا بیان بطور نمونہ آئندہ سطور میں آرہا ہے۔ علاوہ ازیں فرقۂ شیعہ کے لئے اس عقیدہ تحریف کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے مذہب میں مسئلہ امامت دین اسلام کا اہم ترین رکن ہے۔ امام کلینی امام باقر سے روایت کرتے ہیں۔

عن ابی جعفر علیہ السلام قال بنی الاسلام علیٰ خمس الصلوٰۃ والزکوٰۃ والصوم والحج والولایۃ ولم ینادبشئ مانودی بالولایۃ[1]

امام باقر سے روایت ہے انہوں نے فرمایا اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر قائم ہے، نماز زکوٰۃ، روزہ، حج اور امامت اور ان ارکان میں سے کسی کا اتنی اہمیت کے ساتھ اعلان نہیں کیا گیا جس اہمیت کے ساتھ مسئلہ امامت کا اعلان کیا گیا ہے۔

اسی ارکانی میں یہ بھی ہے

عن ابی الحسن علیہ السلام قال ولایۃ علی مکتوبۃ فی جمیع صحف الانبیاء ولن یبعث اللہ رسولا الا بنبوۃ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ ووصیۃ علی علیہ السلام[2]

امام ابوالحسن موسیٰ کاظم سے روایت ہے انہوں نے فرمایا علی کی امامت تمام انبیار کے صحیفوں میں لکھی ہوتی ہے اور اللہ نے جو بھی رسول دنیا میں بھیجا اسے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور علی کی وصیت وامامت کی تعلیم کے ساتھ بھیجا۔

ان روایتوں کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہونا لازمی ہے کہ جب مسئلہ امامت اسلام کا اہم ترین رکن ہے اور تمام انبیار کے صحیفوں میں اس کا ذکر ہے اور ہر نبی کو اسکی تعلیم دی گئی ہے تو پھر قرآن میں صراحت کے ساتھ اس کا ذکر کیوں نہیں ہے جب کہ اسلام کے بقیہ چاروں ارکان کا ذکر پوری وضاحت کے ساتھ بار بار کیا گیا ہے۔ اس سوال کا حل ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے کہ وہ یہ دعویٰ کریں کہ قرآن میں حضرت علی اور دیگر ائمہ کا ذکر تھا مگر مخالفین نے اسے

---

[1] اصول کافی ص ۳۶۸ بحوالہ ایرانی انقلاب ـ [2] ایضاً ص ۲۷۶۔

حذف کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ فرقۂ شیعہ کے جمہور علماء خواہ وہ متقدمین کی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں یا متأخرین کے گروہ سے ہوں سب ہی تحریف قرآن کے عقیدہ پر متفق ہیں۔ فرقۂ اثناعشریہ کے العالم الکبیر المحدث، المجتہد العلامۃ حسین بن محمد تقی نوری طبرسی المتوفی ۱۳۲۰ھ نے اپنی مایۂ ناز تصنیف " فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الارباب" میں اپنے متقدمین اکابر علماء و محدثین کی ایک ایسی فہرست درج کی ہے جو سب کے سب تحریف قرآن کے قائل ہیں آپ بھی ملاحظہ فرمائیں (۱) الثقۃ الجلیل محمد بن الحسن الصفار (مصنف کتاب البصائر) (۲) الثقۃ محمد بن ابراہیم النعمانی تلمیذ کلینی (مصنف کتاب الغیبۃ) (۳) الثقۃ الجلیل سعد بن عبداللہ القمی (جنہوں نے اپنی کتاب ناسخ و منسوخ میں تحریف قرآن کا ایک مستقل باب قائم کیا ہے) (۴) السید علی بن احمد الکوفی (مصنف کتاب بدع المحدثہ) (۵) اجلۃ المفسرین الشیخ الجلیل محمد بن مسعود العیاشی (مصنف تفسیر عیاشی (۶) الشیخ زات بن ابراہیم الکوفی (۷) الثقۃ محمد بن العباس الماہیار (۸) شیخ المتکلمین متقدم النوبختیین ابوسہل اسماعیل بن علی بن اسحاق بن سہل بن نوبخت... (مصنف کتب کثیرہ) (۹) اسحاق الکاتب (جنہوں نے امام مہدی کی زیارت کی ہے) (۱۰) انیس الطائفۃ ابوالقاسم حسین بن روح نوبختی (جو شیعوں اور امام غائب کے درمیان غیبت صغریٰ کے زمانہ میں تیسرے سفیر تھے) (۱۱) العالم الفاضل المتکلم حاجب بن لمیث بن سراج (۱۲) الشیخ الجلیل الثقۃ الاقدم فضل بن شاذان (۱۳) الشیخ الجلیل محمد بن حسن الشیبانی (مصنف تفسیر نہج البیان) (۱۴) الشیخ الثقۃ احمد بن محمد بن خالد (مصنف کتاب المحاسن) محقق طوسی نے الفہرست میں اور نجاشی نے اپنی کتاب اسماء الرجال میں انکی ایک تصنیف کتاب التحریف کا تذکرہ کیا ہے (۱۵) الشیخ محمد بن حامد (۱۶) الشیخ الثقۃ علی بن الحسن بن فضال (۱۷) محمد بن الحسن الصیرفی (۱۸) احمد بن محمد السیار (۱۹) الشیخ حسن بن سلیمان الحلی تلمیذ الشہید (۲۰) الثقۃ الجلیل محمد بن عباس بن علی بن مروان ہیار (۲۱) ابوالطاہر عبدالواحد بن عمر القمی (۲۲) محمد بن علی بن شہرآشوب (۲۳) الشیخ احمد بن ابی طالب طبرسی (جنہوں نے تحریف قرآن سے متعلق دس حدیثوں سے زیادہ روایت کی (۲۴) مولیٰ محمد بن صالح (۲۵) الفاضل السید علی خان، (۲۶) مولیٰ محمد مہدی نراقی الاستاذ الاکبر البہبہانی (۲۷) محقق کاظمی الشیخ ابوالحسن الشریف (۲۸) شیخ علی بن محمد المقابی (۲۹) السید

الجلیل علی طاؤس (۳۰) الشیخ الاعظم محمد بن نعمان المفید۔ یہ ہیں فرقہ شیعہ کے وہ اکابر علماء اور محدثین و مفسرین جو علامہ نوری طبرسی کی تحقیق کے مطابق تحریف کے قائل ہیں۔

اس طویل فہرست کے پیش کرنے کے بعد علامہ نوری لکھتے ہیں یہ صرف انہیں مذکورہ علماء کا مذہب نہیں ہے بلکہ

وهو مذهب جمهور المحدثين الذين عثرنا على كلماتهم۔

یہی ان تمام جمہور محدثین کا مذہب ہے جن کے اقوال پر ہمیں واقفیت ہو سکی ہے۔

پھر مزید لکھتے ہیں:

ومن جميع ما ذكرنا ونقلنا بتتبعي القاصر يمكن دعوى الشهرة العظيمة بين المتقدمين وانحصار المخالفين فيهم باشخاص معينين ياتي ذكرهم ــــ قال السيد المحدث الجزائري في الانوار ما معناه ان الاصحاب قد اطبقوا على صحة الاخبار المستفيضة بل المتواترة الدالة بصريحها على وقوع التحريف في القرآن كلاما ومادة واعرابا والتصديق بها نعم خالف فيها المرتضى والصدوق والشيخ الطبرسي۔[1]

ہم نے اپنی محدود تلاش و جستجو کی بنیاد پر تحریف قرآن کے بارہ میں شیعہ اکابر علماء کے جو اقوال نقل کئے ہیں۔ ان کی بنیاد پر دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے علماء متقدمین کا عام طور پر یہی مذہب رہا ہے اور اس کے خلاف رائے رکھنے والے بس چند متعین اشخاص تھے جن کا ذکر آرہا ہے۔

ــــ پھر سید نعمت اللہ الجزائری کی کتاب الانوار النعمانیہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ محدث الجزائری نے لکھا ہے کہ

ہمارے اصحاب کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ مشہور بلکہ متواتر روایتیں جو صراحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ قرآن میں تحریف ہوئی ہے اسکی عبارت میں بھی اور اس کے الفاظ و اعراب میں بھی وہ

---

[1] فصل الخطاب ص۳۰۔

وہ روایات سب صحیح ہیں اور ان روایات کی تصدیق (یعنی ان کے مطابق عقیدہ رکھنے) میں بھی ہمارے اصحاب کے درمیان اتفاق ہے ہاں اس بارہ میں صرف شریف مرتضیٰ اور شیخ صدوق اور شیخ طبرسی نے اختلاف کیا ہے۔ علامہ طبرسی

تحریف قرآن کے اثبات پر بارہویں دلیل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الدلیل الثانی عشر الاخبار الواردة فی الموارد المخصوصة من القرآن الدالة علی تغییر لبعض الکلمات والآیات والسور باحدی الصور المتقدمة وھی کثیرة جداً حتی قال السید نعمة اللہ الجزائری فی بعض مؤلفاته کما حکی عنه ان الاخبار الدالة علی ذالک تزید علی الفی حدیث وادعی استفاضتها جماعة کالمفید والمحقق الداماد والعلامة المجلسی بل الشیخ ایضا صرح فی التبیان بکثرتها بل ادعی تواترها جماعة یاتی ذکرهم[1]

بارہویں دلیل وہ روایتیں ہیں جو قرآن کے خاص خاص مقامات کے بارہ میں آئی ہیں جو بتاتی ہیں کہ قرآن کے بعض کلمات بعض آیات اور بعض سورتوں میں مذکورہ بالا صورتوں میں سے کسی ایک صورت کی تبدیلی کی گئی ہے اور یہ روایتیں بہت زیادہ ہیں حتی کہ سید نعمت اللہ جزائری نے اپنی بعض تصانیف میں لکھا ہے جیسا کہ ان سے نقل کیا گیا ہے کہ قرآن میں تحریف پر دلالت کرنے والی ائمہ کی روائتیں دو ہزار سے زائد ہیں اور علماء کی ایک جماعت مثلاً شیخ مفید، محقق داماد اور علامہ باقر مجلسی نے ان حدیثوں کے مشہور ہونے کا دعویٰ کیا ہے

اور شیخ طوسی نے بھی اپنی کتاب التبیان میں بصراحت لکھا ہے کہ یہ روایتیں بہت زیادہ ہیں بلکہ ہمارے علماء کی ایک جماعت نے جنکا ذکر آئندہ آرہا ہے ان روایات کے متواتر ہونے کا دعویٰ کیا ہے

بعد میں حسب وعدہ ان علماء کو نام بنام شمار کر کے بتایا ہے کہ یہ حضرات تحریف قرآن سے متعلق وارد روایتوں کو متواتر کہتے ہیں۔ یہ کل چار علماء ہیں (۱) المولی محمد صالح (انہوں نے شرح کافی میں اسکی تصریح کی ہے) (۲) الفاضل قاضی القضاۃ علی بن عبدالعالی (ان کے بارے میں سید نے

---

[1] فصل الخطاب ص ۲۲۷۔

شرح وافیہ میں لکھا ہے کہ یہ بھی ان روایات کو متواتر کہتے ہیں) (۳) الشیخ المحدث الجلیل ابوالحسن الشریف (انھوں نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں یہ دعویٰ کیا ہے) (۴) العلامہ مجلسی دیہ اپنی مشہور تصنیف مرآۃ العقول میں یوں رقم طراز ہیں

عندی ان الاخبار فی ھٰذا الباب متواترۃ معنیً وطرح جمیعھا یوجب رفع الاعتماد من الاخبار رأسا بل ظنی ان الاخبار فی ھٰذا الباب لا یقصر عن اخبار الامامۃ فکیف یثبتونھا بالخبر[1]

میرے نزدیک تحریف قرآن کی روایتیں متواتر ہیں اور ان سب روایات کو ترک کر دینے سے پورے فن حدیث کا اعتبار ختم ہو جائیگا بلکہ میری رائے تو یہ ہے کہ تحریف قرآن کی روایتیں مسئلہ امامت کی روایات سے کم نہیں ہیں لہٰذا اگر تحریف قرآن کی روایتوں کا اعتبار نہ ہو تو پھر مسئلہ امامت بھی روایتوں سے ثابت نہ ہو سکے گا۔

علامہ نوری طبرسی کے علاوہ علامہ محسن کاشی مصنف تفسیر صافی، دور آخر کے مجتہد اعظم آیۃ اللہ فی العالم و لدار علی مصنف عماد الاسلام، امام الشیعہ الشیخ حامد حسین مصنف استقصار الافحام وغیرہ علمار شیعہ نے بھی بڑی شد و مد کے ساتھ تحریف قرآن پر دلائل قائم کئے ہیں۔

اس سلسلہ کی چند روایتیں آپ بھی ملاحظہ کرتے چلیں۔ اصول کافی کے باب النوادر میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے۔

(۱) ان القرآن الذی جاء بہ جبریل علیہ السلام الی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ سبعۃ عشر الف آیۃ[2]

یہ یقینی بات ہے کہ جو قرآن جبریل علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر لے کر آئے تھے اس میں سترہ ہزار (۱۷۰۰۰) آیتیں تھیں۔

موجودہ قرآن میں باختلاف روایات کل چھ ہزار چھ سو سولہ (۶۶۱۶) آتیں ہیں لہٰذا اس روایت کے اعتبار سے قرآن کا تقریباً دو تہائی حصہ نکال دیا گیا ہے۔ استغفراللہ

(۲) اصول کافی ہی میں امام باقر سے یہ روایت نقل کی گئی ہے۔

---

[1] ایضاً ص ۲۲۸ ؛ [2] اصول کافی ص ۶۷۱ ؛

ما ادعی احد من الناس انہ جمع القرآن کلہ کما انزل الا کذاب وما جمعہ وحفظہ کما نزل اللہ الا علی بن ابی طالب والائمۃ من بعدہ[1]

صرف جھوٹا شخص ہی یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس کے پاس بعینہ مکمل قرآن ہے اللہ تعالےٰ کی تنزیل کے مطابق صرف علی بن ابی طالب نے اور ان کے بعد ائمہ نے قرآن کو جمع اور محفوظ کیا ہے اور بس

(۳) اصول کافی کی یہ روایت ملاحظہ فرمائیں۔

قراء رجل عند ابی عبد اللہ علیہ السلام "قُلْ اِعْمَلُوْا فَسَیَرَی اللّٰہُ عَمَلَکُمْ وَرَسُوْلُہٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ" فقال لیس ھکذا ھی انما ھی والماموںن فنحن الماموںن[2]

ایک شخص نے امام جعفر صادق کے سامنے یہ آیت پڑھی قل اعملوا الخ اے نبی کہو کہ تم لوگ عمل کرو تمہارا عمل اللہ دیکھے گا۔ اور اس کا رسول اور ایمان والے تو امام نے فرمایا یہ آیت اس طرح نہیں ہے بلکہ یوں ہے والماموںن یعنی ماموںن لوگ دیکھیں گے اور ماموںن ہم بارہ ائمہ ہیں۔

کتاب احتجاج مصنفہ شیخ احمد بن ابی طالب طبرسی میں حضرت علیؓ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے۔

(۴) انھم اثبتوا فی الکتاب ما لم یقلہ اللہ لیلبسوا علی الخلیقۃ[3]

ان منافقین نے قرآن میں وہ باتیں بڑھادیں جو اللہ تعالےٰ نے فرمائی نہیں تھیں تاکہ مخلوق کو فریب دیں۔

بطور نمونہ کے یہ چار روایتیں مذہب شیعہ کی معتبر ترین کتابوں سے نقل کی گئی ہیں جن سے

---

[1] ایضاً ص ۱۳۹ [2] اصول کافی ص ۲۶۸۔ [3] کتاب الاحتجاج یہ شیعوں کی نہایت معتبر کتاب ہے، اس کے مصنف نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ حسن عسکری کے علاوہ دیگر ائمہ کے جس قدر اقوال اس کتاب میں نقل کئے گئے ہیں، ان پر اجماع ہے اسی کتاب میں ایک طویل روایت ہے جو صفحہ ۱۱۹ سے شروع ہوکر صفحہ ۱۳۳ پر ختم ہوتی ہے اسی روایت کا یہ ایک ٹکڑا ہے۔

صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ شیعوں کے نزدیک قرآن میں تینوں طرح کی تبدیلیاں کی گئی ہیں یعنی کمی، زیادتی اور تبدیلی تینوں طرح کی تحریف ہوئی ہے۔

اس ساری کاوش کا مقصد یہ ہے کہ یہ بات مدلل طور پر واضح ہو جائے کہ فرقہ اثنا عشریہ تحریف قرآن کا قائل ہے اور ان کے جمہور علماء کا یہی مذہب ہے جیسا کہ خود انکی کتابوں سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اس لئے آجکل کے سیاسی شیعوں کا اپنے اس باطل اور کفریہ عقیدے کو تقیہ کے غلاف کے اندر چھپانا ایک ایسی کوشش ہے جسکا کوئی فائدہ نہیں۔

تحریف قرآن کے سلسلہ میں علامہ خمینی کا رویہ

علامہ خمینی جیسا کہ معلوم ہے مذہب اثنا عشری کے بلند پایہ عالم، مجتہد اور امام ہیں اس لئے قرآن مجید کے بارے میں جو نظریہ فرقۂ اثنا عشریہ کا ہے لازمی طور پر اسی کے پابند علامہ خمینی بھی ہوں گے۔ لیکن وہ ایک مذہبی پیشوا ہونے کے ساتھ زبردست سیاسی لیڈر اور رہنما بھی ہیں اس لئے وہ تحریف قرآن کے مسئلہ پر کھل کر اظہار خیال کرنے سے گریز کرتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تقیہ کی زبان میں اپنے مذہبی عقیدہ کے برخلاف قرآن مجید کی حقانیت کا بھی اعلان کر دیتے ہیں کیونکہ یہ مسئلہ ایسا نازک ہے کہ اس کے اظہار کے بعد وہ مسلمانوں کی ہمدردیاں اپنے ساتھ باقی نہیں رکھ سکتے حالانکہ اسکی انھیں ہر وقت مزید ضرورت ہے۔ اس لئے اس مسئلہ پر ان کے کسی صریح قول کو اس وقت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ولعل الله یحدث بعد ذالک امرا۔ البتہ انکی بعض عبارتوں سے تحریف قرآن کی جانب واضح اشارہ ملتا ہے لیکن اس اشارہ کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ جن کی قرآن سے متعلق روایات شیعہ پر پوری نظر ہو۔ علاوہ ازیں بعض دوسرے قرائن سے بھی پتہ چلتا ہے کہ علامہ خمینی اس مسئلہ میں اپنے ہم مذہب جماعت کے ساتھ ہیں۔ ذیل میں ان چند قرائن اور عبارت کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جن سے مسئلہ تحریف قرآن میں علامہ خمینی کے نظریہ پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) علامہ خمینی نے اپنی تصانیف مثلاً تحریر الوسیلہ، الحکومۃ الاسلامیہ، جہاد اکبر وغیرہ میں بطور خاص ان کتابوں کو ماخذ بنایا ہے جن کے مصنفین نہ صرف تحریف قرآن کے قائل ہیں بلکہ اس نظریہ کیلئے دلائل کی قوت فراہم کرنے کی خدمت بھی انجام دی ہے مثلاً مستدرک الوسائل مصنفہ

علامہ نوری طبرسی۔ یہ شیعوں کے دیہی مجتہد اعظم اور محدث ہیں جنہوں نے "فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الارباب کے نام سے وہ معرکۃ الآراء کتاب تصنیف کی ہے جس نے انہیں شیعی دنیا میں بقائے دوام کے درجہ عالی پر پہنچا دیا ہے۔ اس کتاب کا حوالہ متعدد بار آچکا ہے (۲) الجامع الکافی۔ تالیف علامہ کلینی۔ انھوں نے اپنی اس کتاب میں ایک مستقل باب "باب فیہ نکت و نتف من التنزیل فی الولایۃ قائم کیا ہے یعنی یہ باب اس بیان میں ہے کہ قرآن میں امامت سے متعلق آیات میں کانٹ چھانٹ کی گئی ہے۔ (۳) الوسائل مؤلفہ امام العاملی یہ بھی تحریف قرآن کے قائل ہیں جیساکہ تفسیر القمی کے مقدمہ ص ۲۴ پر سید طیب مولوی نے اسکی تصریح کی ہے (۴) کتاب الاحتجاج از علامہ احمد طبرسی یہ تو اس مسئلہ میں انتہائی غلو رکھتے ہیں یہ سب وہ کتابیں ہیں جن سے علامہ خمینی اپنی تصانیف میں استفادہ کرتے ہیں اور ان کے مصنفین کا نام انتہائی تعظیم سے لیتے اور ان کی بارگاہ میں صلاۃ و رحمت کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔ کیا یہ جذبۂ عقیدت و عظمت اور ان کے حق میں یہ دعائیہ کلمات اتحاد مذہب و مسلک کے بغیر زبان و قلم سے نکل سکتے ہیں اپنے ان علماء کے ساتھ علامہ خمینی کا یہ عقیدت مندانہ طرز عمل زبان خاموش سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ ان کے ہر قول و عمل سے نہ صرف متفق ہیں بلکہ ان کے نزدیک یہ حضرات استناد کا درجہ رکھتے ہیں اس بنیاد پر بلا خوف و تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان علماء کی طرح علامہ خمینی بھی تحریف قرآن کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

(۲) ہندوستان کے ایک شیعہ عالم نے "تحفۃ العوام" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب شیعوں کی دیگر تالیفات کی طرح الف لیلوی داستانوں سے پر ہے اس کتاب کی توثیق و تصدیق عصر حاضر کے زعماء شیعہ کے پانچ آیات اللہ نے کی ہے جن کے اسماء یہ ہیں (۱) آیت اللہ العظمیٰ محسن حکیم طباطبائی مجتہد اعظم نجف اشرف (۲) آیت اللہ العظمیٰ ابوالقاسم خوئی نجف اشرف (۳) آیت اللہ العظمیٰ روح اللہ خمینی (۴) آیت اللہ العظمیٰ محمود الحسینی الشاہرودی (۵) آیت اللہ العظمیٰ محمد کاظم شریعت مداری۔ ان پانچ آیت اللہ کے علاوہ چھٹے مصدق سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی مجتہد لکھنؤ ہیں۔ اس کتاب کے صفحہ ۲۲۴ پر ایک دعا لکھی ہوئی ہے جسے لکھتے ہوئے قلم کانپ رہا ہے۔ بربنائے ضرورت تحقیق "نقل کفر کفر نباشد" کو پیش نظر رکھتے ہوئے دل پر

جبر کر کے لکھ رہا ہوں۔ دعا کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں۔

بسم الله الرحمن الرحيم اللهم العن صنمي قريش وجبتيهما و طاغوتيهما وافكيهما وابنتيهما الذين خالفا امرك وانكرا وحيك وعصيا رسولك وقلبا دينك وحرفا كتابك۔

بسم اللہ الخ اے اللہ لعنت بھیج قریش کے دونوں بتوں، شیطانوں، سرکشوں اور افترا پردازوں اور ان دونوں کی دونوں بیٹیوں پر جنہوں نے آپ کے حکم کی مخالفت کی، آپ کی وحی کا انکار کیا۔ آپ کے رسول کی نافرمانی کی، آپ کے دین کو بدل دیا اور آپ کی کتاب قرآن میں تحریف کر دی۔

(نعوذ باللہ و استغفر اللہ)

آپ جانتے ہیں کہ قریش کے یہ دونوں، صنم، جبت، طاغوت، افّاک، اور ان دونوں کی دو بیٹیاں کون ہیں، ان میں اوّل یار غار رسول ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، جنہیں قرآن اتقی (سب سے بڑے متقی) اور نبیؐ صادق و مصدوق افضل الناس بعد الانبیاء (حضرات انبیاء کے علاوہ تمام بنی آدم سے بزرگ) فرماتے ہیں اور دوسرے حضرت فاروق اعظم عمر رضی اللہ عنہ ہیں، جنکے متعلق خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے " لو کان بعدی نبی لکان عمرؓ " اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔ اور ان دونوں حضرات کی دونوں بیٹیوں میں ایک ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جنتی عورتوں کی سردار اور دوسری ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا ہیں، یہ ہیں شیعوں کے نزدیک نعوذ باللہ، بت، شیطان، سرکش اللہ اور اس کے رسول کے نافرمان دین اسلام کو بدل دینے اور قرآن کریم میں تحریف کر دینے والے جس کتاب میں یہ کفریہ دعا لکھی ہوئی ہے علامہ خمینی اسکی تصدیق و توثیق کر کے اپنے معتقدین کو ترغیب دیتے ہیں کہ اس سے استفادہ کیا جائے کیا یہ تائید و توثیق اس بات کا کھلا ثبوت نہیں ہے کہ خمینی صاحب بھی اسی عقیدے کے پابند ہیں۔ ورنہ اسکی توثیق کے بجائے تکذیب و تضلیل کرتے۔ ممکن ہے کہ آپ کے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہو کہ اس عبارت میں تو حضرت صدیق اکبر اور فاروق اعظم کا نام ذکر نہیں کیا گیا ہے پھر صنما قریش سے

ان دونوں بزرگوں کو کیسے سمجھ لیا گیا؟ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ اگر آپ کے پیش نظر ان ہر دو خلفاء راشدین کے بارے میں شیعوں کی روایتیں ہوں تو یہ اشکال کبھی پیدا نہ ہوگا تفصیل شیعہ اور صحابۂ کرام کے عنوان سے آئندہ سطور میں آرہی ہے جس سے یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی۔

ان دو واضح قرآن کے بعد خمینی صاحب کی ایک عبارت بھی ملاحظہ کرتے چلئے۔ اپنی کتاب تحریر الوسیلہ کے صفحہ ۱۵۲ ج ۱ پر مسجد سے متعلق احکامات کے ضمن میں لکھتے ہیں " ویکرہ تعطیل المسجد وقد ورد انہ الثلاثۃ الذین یشکون الی اللہ عزوجل" مسجد کا معطل کرنا مکروہ ہے اور روایت میں آیا ہے کہ مسجد بھی ان تین میں سے ایک ہے جو اللہ تعالیٰ کے حضور شکایت کریں گے۔ علامہ خمینی نے "وقد ورد انہ من الثلاثۃ" سے مسئلہ تحریف قرآن کی جانب اشارہ کیا ہے مگر اس انداز سے کہ جو لوگ مذہب شیعہ اور انکی مرویات سے واقفیت رکھتے ہیں۔ وہی اسے سمجھ سکیں گے۔ انہوں نے " قد ورد " سے جس روایت کی جانب اشارہ کیا ہے وہ مذہب شیعہ کی مشہور کتاب الخصال مصنفہ الشیخ الصدوق ابن بابویہ کی جلد ا صفحہ ۱۷۴ و ۱۷۵ میں ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔

> یجیٔ یوم القیامۃ ثلاثۃ یشکون الی اللہ عزوجل المصحف والمسجد والعترۃ یقول المصحف یارب حرقونی ومزقونی الخ
>
> قیامت کے دن قرآن، مسجد، اور اہل بیت رسول اللہ کے دربار میں حاضر ہوکر اپنی شکایت پیش کریں گے قرآن کریم عرض کرے گا اے میرے رب مجھ لوگوں (یعنی ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم) نے جلایا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

اس روایت میں اجمال و اختصار کے ساتھ شیعوں کے اس اعتقاد کی ترجمانی کی گئی جو وہ صحابۂ کرام کے بارے میں رکھتے ہیں کہ انہوں نے قرآن کی تحریف کرکے ان آیات کو اس میں سے نکال دیا جو فضائل امیر المؤمنین یا اہل بیت میں نازل ہوئی تھیں یا جن میں لوگوں کو اہل بیت کی اعانت و اتباع کی ترغیب دلائی گئی تھی اور سب پر ان کی اطاعت کو واجب قرار دیا گیا تھا۔ اور کہتے ہیں کہ تمام صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت کے خلاف اتفاق کرکے

اہل بیت کا حق غصب کیا اور ان پر ظلم و تشدد ڈھایا: (العیاذ باللہ)

قرآن ہر قسم کی ترمیم و تحریف سے پاک ہے

شیعوں کا یہ عقیدہ تحریف قرآن عقیدۂ امامت سے بھی بدتر ہے لیکن حقیقت میں اسی عقیدہ کا لازمی نتیجہ ہے جیسا کہ اسکی جانب پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے ان کے اس عقیدے کا بطلان اس درجہ واضح ہے کہ مسلمان تو مسلمان آج تک کسی بدسے بدتر مخالف اسلام کو بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ یہ آن مقدس جو مسلمانوں کے پاس ہے وہ اصلی نہیں ہے بلکہ اس میں حذف و اضافہ اور تغیر و تبدل کردیا گیا ہے۔ لیکن شیعہ اسلام کا نام لے کر اسلام دشمنی میں یہ قبیح حرکت کررہے ہیں "قاتلھم اللہ انی یؤفکون"

ذیل میں اختصار کے ساتھ ان کے اس خرافی عقیدے کے باطل اور غلط ہونے کے دلائل پیش کئے جارہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ — ہم نے ہی نازل کیا ہے قرآن کو اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

مفسر قرآن علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کریمہ کے فوائد میں لکھتے ہیں "یاد رکھو اس قرآن کے اتارنے والے ہم ہیں اور ہم ہی نے اسکی ہر قسم کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے جس شان اور ہیئت سے وہ اترا ہے بدون ایک شوشہ یا زبر زیر کی تبدیلی کے چار دانگ عالم میں پہنچ کر رہے گا اور قیامت تک ہر طرح کی تحریف لفظی و معنوی سے محفوظ و مصئون رکھا جائیگا۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں حفاظت قرآن کے متعلق یہ عظیم الشان وعدۂ الٰہی ایسی صفائی اور حیرت انگیز طریقہ سے پورا ہو کر رہا جسے دیکھ کر بڑے بڑے متکبر و مغرور مخالفوں کے سر نیچے ہو گئے۔ "میور" بارہویں صدی ہجری کا (مشہور عیسائی مصنف) کہتا ہے جہاں تک ہماری معلومات ہے دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو قرآن کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو"

ایک اور یورپین محقق لکھتا ہے کہ ہم ایسے ہی یقین سے قرآن کو بعینہٖ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم)

کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سمجھتے ہیں۔ جیسے مسلمان اسے خدا کا کلام سمجھتے ہیں الخ[1]

علامہ سید محمود الوسی بغدادی اس آیت پاک کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ای من کل ما یقدح فیه کالتحریف والزیادة والنقصان وغیر ذالك حتی ان الشیخ المهیب لو غیر نقطة یرد علیه الصبیان ...... وجوز غیر واحد ان یراد حفظه بالاعجاز فی کل وقت کما یدل علیه الجملة الاسمیة من کل زیادة ونقصان وتحریف وتبدیل ولم یحفظ سبحانه تعالیٰ کتابا من الکتب بل استحفظها جل وعلا الربانیین والاحبار فوقع فیها ما وقع و تولیٰ حفظ القرآن بنفسه سبحانه فلم یزل محفوظا اولا وآخرا۔[2]	یعنی اللہ تعالیٰ قرآن کی حفاظت فرماتے ہیں ہر اس چیز سے جو اسے عیب دار بنادے جیسے تحریف، زیادتی، کمی وغیرہ حتیٰ کہ اگر کوئی شیخ مجرم قرآن کے ایک نقطہ میں تغیر کر دے تو ایک .... تو مکتب کا ایک بچہ اسے ٹوک دے گا (چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں) بہت سے مفسرین کی رائے ہے کہ یہ حفاظت معجزانہ طور پر ہمیشہ کیلئے ہے جیسا کہ جملہ اسمیہ اس استمرار پر دلالت کر رہا ہے، اور یہ حفاظت ہر قسم کی زیادتی، کمی، تحریف اور تبدیلی سے ہے اللہ تعالیٰ نے کسی بھی کتاب کی خود حفاظت نہیں فرمائی بلکہ اسکی حفاظت کا حکم علماء اور احبار کو دیا تو اس میں وہ سب کچھ پیش آیا

جو معلوم ہے لیکن قرآن مجید کی حفاظت کی ذمہ داری خود باری تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لی اسی لئے وہ ابتدائے نزول سے آخر تک ہمیشہ محفوظا مصؤن رہے گا۔

قدرے الفاظ کے فرق کے ساتھ یہی تفسیر قاضی ثناء اللہ پانی پتی صاحب مظہری نے بھی کی ہے[3]

(۲) وَلَا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ	اس کے پاس باطل کسی سمت سے بھی نہیں

---

[1] فوائد عثمانی ص ۹۳۳، ۳۴۰ (۲) روح المعانی ج ۱۴ ص ۱۶

[3] تفسیر مظہری ج ۵ ص ۲۹۳

يَدَيْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ۔ — آ سکتا اتارا ہوا ہے حکیم حمید کی طرف سے

امام زجاج اس آیت پاک کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

معناه انه محفوظ من ان ينقص منه فياتيه الباطل من بين يديه او يزاد فيه فياتيه الباطل من خلفه [۱]

اس آیت کریمہ کا معنیٰ یہ ہے کہ قرآن محفوظ ہے اس بات سے کہ اس میں کمی کیجائے کہ باطل سامنے سے آئے یا زیادتی کیجائے کہ باطل پیچھے سے آئے۔

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

صفة اخرى للكتاب ومن بين يديه ولا من خلفه كنايه عن جميع جهاته كالصباح والمسا. كنايةعن الزمان كله اى لا يتطرق الباطل من جميع جهاته

(۲) لا ياتيه الباطل الخ یہ کتاب کی صفت ثانی ہے اور من يديه ولا من خلفه یعنی اس کے آگے سے نہ اس کے پیچھے سے بطور کنایہ کے تمام جہتیں مراد ہیں۔ جیسے الصباوالمسا، بول کر پورا وقت مراد لیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن میں باطل کسی سمت سے بھی داخل نہیں ہو سکتا یہی تفسیر مدارک التنزیل اور تفسیر کبیر میں بھی ہے۔[۲]

ان دونوں آیات قرآنیہ اور انکی تفسیروں سے کھل کر یہ بات سامنے آگئی کہ قرآن کریم اپنے ابتداء نزول سے آج تک اپنی تنزیلی حالت میں چلا آرہا ہے اور ہر قسم کی تحریف و تبدیل سے پاک اور بری ہے کیوں کہ اللہ تعالےٰ خود اس کتاب مقدس کی حفاظت و صیانت کر رہا ہے اور جس چیز کی حفاظت اللہ سبحانہ تعالےٰ خود فرمائیں۔ کسے طاقت وقدرت ہے کہ اسی میں تحریف و ترمیم کر دے۔ چنانچہ ایک مرتبہ مشہور ظالم حکمراں حجاج نے حضرت عبداللہ بن زبیر پر یہ الزام تراشی کرتے ہوئے کہا۔

ابن الزبير مبدل كلام الله فقام ابن عمر فقال كذب لم يكن ابن الزبير

---

[۱] المظہری ج ۸ ص ۳۰۱۔ [۲] مدارک ج ۴ ص ۳۷ و تفسیر کبیر ج ۵ ص ۲۵۷۔

یستطیع ان یبدل کلام اللہ ولا انت[1]

ابن زبیر نے قرآن میں تبدیلی کردی یہ سنتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عمر کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ قرآن میں تبدیلی کرنے کی نہ ابن زبیر میں طاقت تھی اور نہ تجھ میں ہے۔

(۳) ان دلائل سے قطع نظر اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ اسلامی دنیا میں جسقدر حفاظ و قاری ہیں وہ سب کے سب اسی قرآن محکم اور کتاب مقدس کی سماعت کو مختلف واسطوں سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے ہیں اور ہر حافظ کی سند کا آخری شخص اسی قرآن کو بلا کسی تغییر و تبدل اور کمی و بیشی کے اپنی سماعت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتا ہے تو جب دنیا کے تمام حفاظ اسی موجودہ قرآن کی سند کو بعینہ اسی ترتیب و الفاظ سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے ہیں اور پھر یہ سلسلے اور سندیں اس کثرت سے ہیں کہ تواتر کی حدود سے بھی بہت زیادہ آگے بڑھ گئے ہیں تو بدیہی طور پر یہ تواتر اسی امر پر قطعی حجت اور یقینی شہادت ہے کہ یہ قرآن بعینہ وہی ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اور آپ نے صحابہ کو اسی کی تعلیم دی تھی اور اپنے بعد اسی کو چھوڑا تھا۔ لہٰذا علم ویقین کی یہ عمارت جو تواتر کے بلند پہاڑ کی مضبوط چٹان پر قائم ہے اس سے وہ آبگینہ جسکا خمیر خود ساختہ اور فرضی اماموں کے جعلی اقوال سے ہے ٹکرائے تو بجز اس کے کہ خود پاش پاش ہوجائے اس مستحکم عمارت کو کسی قسم کا صدمہ نہیں پہنچا سکتا۔ یہ تواتر کی روشنی ایسی صاف، لطیف اور تیز ہے کہ اس کے مقابلے میں شیعوں کے روایتوں کے بے نور چراغ تقیہ کی چادر اوڑھ کر نظروں سے اس طرح روپوش ہوگئے ہیں کہ عصر حاضر کے شیعوں اور ان کے مجتہدوں کو اس چادر کو ان کے تاریک چہرے سے اٹھانے کی ہمت و جرأت نہیں ہو رہی ہے بالکل سچ ہے دروغ را فروغ نیست۔

باقی آئندہ

---

[1] تذکرۃ الحفاظ امام ذہبی ج ۲ ص ۴۲۔

تیسری قسط

منطق و فلسفہ ایک تحقیقی جائزہ

مولانا محمد اطہر حسین قاسمی بستوی

یونان یونان ارض روم کے چند اراکن کا مجموعہ ہے جس میں بہت سی بستیاں اور شہر شامل ہیں، حکمائے یونان کا منشاء و ماویٰ یہی سرزمین ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں جو چیز یاد کرلی جاتی تھی وہ کبھی فراموش نہ ہوتی تھی، سقراط، بقراط، افلاطون، ارسطاطالیس، بطلیموس، بلیناس، صاحب طلسمات اور حکیم جالینوس وغیرہ اسی زمین کی پیداوار ہیں۔ یونان زمین کے شمالی مغربی ربع میں واقع ہے، اس کے جنوب میں بحیرۂ روم، حدود شام اور حدود حربی واقع ہیں۔ شمال میں بلاد لان اور دیگر ممالک ہیں، مغرب میں بلادِ المانی (جرمنی) مشرق میں آرمینیا کی سرحدیں ہیں، یونان کی زبان اغریقیہ کہلاتی ہے جو دنیا کی وسیع ترین زبان تھی، اہلِ یونان ان آٹھ اقوام میں سے ہیں جن کی علمی خدمات کو زمانہ فراموش نہیں کرسکتا، وہ اقوام یہ ہیں، ہندوستانی، ایرانی، کلدانی، ... نی، رومی، مصری، عربی عبرانی، دنیا کی باقی قوموں کا بجز کھانے پینے اور شادی بیاہ کے کوئی اور کام نہیں تھا۔ (تاریخ الحکماء صفحہ)

فلسفہ کا مروج اول تاریخ خلاصۂ یونان میں لکھا ہے کہ یونان میں سب سے پہلے جس نے فلسفہ کو ظاہر کیا وہ انکسفوراس تھا جو اپنی تمام خواہشیں، مال وزر، زمین و جائداد وغیرہ کو چھوڑ کر تحصیل فلسفہ میں مشغول ہوگیا تھا اور مدتوں سیاحت کرکے مختلف مقامات سے یہ علم حاصل کیا، کسی نے اس سے پوچھا کہ تمہیں وطن سے محبت نہیں ہے؟ اس نے آسمان کیطرف اشارہ کرکے کہا کہ میں اس وطن کو دوست

رکھتا ہوں، اسی کا قصہ ہے کہ ایک بار برقلیس کے مکتب میں ایک بکری لائی گئی جس کے وسط پیشانی میں ایک ہی سینگ تھی۔ ایک منجم جس کا نام ملیون تھا اس نے کہا کہ اثینا (ایک شہر کا نام ہے) میں لوگوں کے دو فرقے ہو گئے ہیں قریب ہے کہ وہ ملکر ایک ہو جائیں، انکسفوراس نے کہا کہ یہ امر خلقی ہے کسی بات پر دلالت نہیں کرتا بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ اس کا دماغ کھوپڑی میں بھرا ہوا نہیں ہے۔ پھر اس کے سر کی پوری، تشریح کی، لوگوں نے اس کو ذبح کر کے دیکھا تو اس کے قول کیمطابق پایا مگر منجم کی بات بھی صحیح نکلی کہ تھوڑی ہی مدت میں دونوں فرقے ایک ہو گئے۔ چونکہ یہ حکیم جاہلیت کے بتوں پر طعن وتشنیع کیا کرتا تھا اس لئے آخر میں لوگ اس سے ناراض ہو گئے، اس کا ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ آفتاب لوہے کا ٹکڑا ہے قابل پرستش نہیں۔

(ظفر المحصلین باحوال المصنفین ص۳۴۴)

اسمائے ناقلین ومترجمین

روم سے آئی ہوئی کتابیں، بیت الحکمت (جو ہارون الرشید کا قائم کردہ ادارہ اور علمی کتابوں کا مرکز تھا) میں داخل کی گئیں۔ ان میں بقراط، ارسطا طالیس، اقلیدس، جالینوس اور بطلیموس وغیرہ کی کتابیں شامل تھیں، مامون نے فیلسوف عرب یعقوب بن اسحٰق کندی کو ارسطو کی کتابوں کے ترجمہ پر مامور کیا اور بیت الحکمت کا مہتمم بھی بنادیا۔ نیز حجاج بن البطر یوحنا۔ ابن البطریق اور سلما صاحب بیت الحکمت کو روم روانہ کیا تاکہ وہ فلسفہ کی کتابیں اپنی پسند کی انتخاب کر کے لادیں اور ترجمہ کریں۔ ارمینیا، مصر، شام، ہپیرس وغیرہ مقامات پر لاکھوں روپیہ دے کر قاصد بھیجے، فلسفی قسیطا بن لوقا کو روم سے بلا کر بیت الحکمت میں ترجمہ کیلئے مقرر کیا، سہل بن ہارون کو جو ایک فارسی النسل حکیم تھا مجوسیوں کی کتابوں کے ترجمہ کی خدمت سپرد کی۔ اس طرح معقولات کا بازار گرم ہوا اور مسلمانوں نے ان سے اپنی رغبت ودلچسپی کا اظہار کیا۔

(تاریخ ملت ج ۵ ص۳۸۱)

نقل کتب و تراجم کے سلسلہ میں جن حضرات نے نمایاں حصہ لیا ان کے اسماء یہ ہیں البطریق، ابن یحییٰ الحجاج بن البطر، ابن ناعمہ عبدالمسیح حمصی، سلام الابرش، ہلال بن ابی ہلال حمصی، ابن لوی، ابو نوح بن الصلت، ابن رابط، عیسیٰ بن نوح، قسطان بن لوقا بعلبکی حنین بن اسحٰق، ثابت بن قرۃ ابراہیم بن الصلت، یحییٰ بن عدی۔ عبداللہ بن المقفع، موسیٰ بن خالد، حسن بن سہل۔ ابن وخشیہ ابوالفرج، ابوسلیمان سجزی، یحییٰ نحوی، یعقوب بن اسحٰق کندی، ابوسلیمان محمد بن بجیر مقدسی ابو تمام یوسف بن محمد نیشاپوری، مامون الرشید سے پہلے اگرچہ ترجموں کا کام شروع ہوگیا تھا تاہم مامون نے جس فیاضی اور دریا دلی سے ترجمے کرائے اس کی نظیر گذشتہ ادوار میں نہیں ملتی۔ مشہور تو یہ ہے کہ جو کتاب ترجمہ کی جاتی تھی مامون اس کے صلہ میں اُس کتاب کے برابر سونا دیتا تھا، چنانچہ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ خود مجھکو حُنین کی بہت سی ترجمہ کردہ کتابیں ملیں جو نہایت دبیز کاغذ پر جلی حروف میں لکھی ہوئی تھیں اور ہر ورق میں صرف چند سطریں تھیں۔ چونکہ ان کے بدلہ میں ان کے وزن کے برابر درہم ملتے تھے اس لئے حنین اس طریقے سے کتاب کی ضخامت اور اس کا وزن بڑھانا چاہتا تھا۔

(طبقات الاطباء جلد اوّل ص ۱۹۷)

مامون الرشید کا مذکورہ کردار علمائے اسلام کی نظر میں

مامون الرشید کا یہ کام بذاتِ خود کیسا تھا؟ اور اس کی وجہ سے اس وقت کے مسلمانوں کے اخلاق و معاشرت اور افکار و خیالات پر کیا کیا اثرات رونما ہوئے؟ اُسے مولانا سعید اکبر آبادی مدظلہ کی زبان سے سنئے، مولانا لکھتے ہیں:۔

"اس عہد میں شریعت اسلام کا کوئی نظریہ یا عملی مسئلہ ایسا نہیں تھا جس کو فلسفہ اور عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش نہ کی گئی ہو، طبعی طور پر اس کا جو نتیجہ ہونا چاہیئے تھا وہی ہوا، مسلمانوں میں دماغی پراگندگی اور انتشار پیدا ہوگیا۔ افکار و آراء کے مختلف اسکول قائم ہو گئے اور عہد بنی امیہ میں

میں چند در چند کمزوریوں کے باوجود مسلمان اب تک جس مصیبتِ عظمیٰ سے محفوظ تھے یعنی عقیدہ و خیال کی کمزوری اور ابتری، اب وہ بھی اس کا شکار ہوگئے، فلسفۂ یونان میں انہماک کے انہی ہولناک نتائج کو دیکھ کر علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے تو ایک مستقل کتاب ہی یہ ثابت کرنے کیلئے لکھی تھی، کہ علوم فلسفہ اور منطق کا پڑھنا پڑھانا حرام ہے۔ علامہ نے اس کتاب میں دعویٰ کیا ہے کہ تمام سلف کا اس پر اجماع ہے"

(مسلمانوں کا عروج و زوال صـ۹۷)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں!۔

" اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مسلمانوں (مامون الرشید اور اس کے ہمنواؤں) کو اس کنج کاوی اور لاحاصل سے مستغنی کر دیا تھا اور نبوت کے ذریعہ ان کو ذات و صفاتِ الٰہی کا وہ یقینی اور محکم علم بخشا تھا جس کی موجودگی میں اس چھان بین اور اللہ کی ذات و صفات کے بارے میں اس کیمیاوی تحلیل و تجزیہ (جو فلسفۂ الٰہیات اور علم کلام کا طرز ہے) کی قطعاً ضرورت نہ تھی لیکن افسوس ہے کہ اہل فلسفہ و کلام نے اس نعمت عظیم کی قدر نہ کی اور ان مباحث میں جس کا دنیا و آخرت میں کوئی فائدہ نہ تھا، صدیوں تک دردسری و دیدہ ریزی کرتے رہے اور اپنی بہترین قابلیت و ذہانت اس لاحاصل مشغلہ میں صرف کی ۔

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر صـ۱۲)

انہی مفاسد و فتن کیوجہ سے علامہ تقی الدین بن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ مامون الرشید کے بارے میں فرمایا کرتے تھے !۔

مَا اَظُنُّ اَنَّ اللہَ یَغْفُلُ عَنِ الْمَامُوْنِ وَلَابُدَّ اَنْ یُقَابِلَهٗ عَلٰی مَا اعْتَمَدَهٗ مَعَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ مِنْ اِدْخَالِ هٰذِهِ الْعُلُوْمِ الْفَلْسَفِیَّةِ بَیْنَ اَهْلِهَا	میرا خیال نہیں ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ مامون کو یونہی چھوڑ دیں گے بلکہ اس سے ان چیزوں کے بارے میں ضرور باز پرس فرمائیں گے جن کے اعتماد پر اسنے علوم فلسفہ کو امت مسلمہ کے درمیان داخل کیا ہے

[illegible]

ہندوستان میں منطق وفلسفہ

ہندوستان میں اگرچہ بیرونی ممالک سے علماء و فضلاء کا قافلہ ابتداء ہی سے آنے لگا تھا لیکن اربابِ معقولات کا سلسلہ سب سے پہلے نویں صدی ہجری میں شروع ہوا جس کا سبب یہ ہے کہ حاکم سندھ جام نظام الدین نے (جو ۸۶۶ھ میں سندھ میں تخت نشین ہوا تھا) علماء وصلحاء کی جمعیت خاطر کے سامان مہیا کئے اور تعلیمی ترقی کے لئے کثرت سے مدارس قائم کئے، اس کی علم پروری کا غلغلہ سن کر امام المعقولات علامہ جلال الدین دوّانی متوفی ۹۰۷ھ نے شیراز سے سندھ میں آنے کا ارادہ کیا اور اپنے دو ممتاز شاگرد میر شمس الدین اور میر معین الدین کو ٹھٹھہ میں بھیجا اور جام نظام الدین سے درخواست کی کہ ٹھٹھہ میں ان کے قیام کا انتظام کیا جائے۔ جام نے ان کے لئے نہایت عمدہ قیامگاہ کا انتظام کیا اور مصارف سفر کے ساتھ قاصدوں کو روانہ کیا کہ علامہ کو جا کر لے آئیں لیکن قاصدوں کے پہونچنے تک علامہ سفر آخرت کر چکے تھے اس لئے سندھ ان کے فیض سے محروم رہا، البتہ میر معین الدین اور میر شمس الدین نے ٹھٹھہ میں قیام کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملتان میں علوم عقلیہ کا رواج ہو چکا تھا اور جام نظام الدین نے سندھ میں اس کی تقلید کی تھی لیکن اب تک ہندوستان میں علوم عقلیہ کا رواج بہت کم تھا لیکن اس صدی میں جب ملتان پر تباہی آئی تو سکندر لودھی کے زمانہ میں ملتان کے دو عالم شیخ عبداللہ تلبنی اور شیخ عزیز اللہ تلبنی ہندوستان آئے، شیخ عبداللہ نے دہلی میں اور شیخ عزیز اللہ نے سنبھل میں قیام کر کے علوم عقلیہ کا رواج دیا۔ اس کے بعد تیموری دورِ حکومت شروع ہوا تو اکبر کے زمانہ میں معقولات کی بہت زیادہ اشاعت ہوئی جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اکبر نے دین الٰہی کے نام سے ایک نام سے ایک جدید مذہب کی بنیاد ڈالی اور اس سلسلہ میں تمام مذاہب کی تحقیقات کے لئے ہر مذہب و ملت کے علماء کو دربار میں جمع کیا اور ان میں آزادانہ مذہبی مناظرے ہوئے اور عقلی آزادی پیدا ہو گئی۔

دوسرے یہ کہ جب ۹۹۱ھ میں میر فتح اللہ شیرازی جو حکمت عملی و نظری میں یگانۂ روزگار تھے۔ امرائے اکبری میں داخل ہوئے تو انھوں نے ایران کے متاخرین علماء معقولات مثلاً محقق

دوّانی۔ میر صدر الدین، میر غیاث الدین منصور اور مرزا جان کی تصنیفات کو ہندوستان کے نصاب تعلیم میں داخل کیا اور اسی وقت سے معقولات کا رواج ہونے لگا۔ اس کے بعد شاہ جہاں اور عالمگیر کے عہد حکومت میں میر زاہد ہروی نے معقولات میں زیادہ شہرت حاصل کی، عہد شاہجہانی میں ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بھی علوم عقلیہ میں بڑی شہرت حاصل کی۔ ان اسباب سے اب ہندوستان کے تمام صوبوں میں علوم عقلیہ کی تعلیم ہونے لگی۔

(تاریخ حکمائے اسلام جلد دوم ص۳۲)

ہندوستان میں نوی صدی ہجری تک عام طور پر منطق و فلسفہ کی طرف توجہ و اعتنا کم رہا ہے نصاب درس میں صرف شرح شمسیہ داخل تھی۔ پھر سب سے پہلے مطالع و مواقف کا اضافہ شیخ عبداللہ تلنبی اور ان کے بھائی شیخ عزیز اللہ تلنبی نے کیا۔ مگر جب معقولات کی طرف لوگوں کی توجہ زیادہ بڑھی تو شرح مطالع و شرح مواقف کا اضافہ کیا گیا۔ اس کے بعد خطیب ابوالفضل گازرونی، عماد الدین محمد طارمی گجرات، فضل اللہ شیرازی دکن۔ اور فتح اللہ شیرازی بیجاپور آئے تو اپنے ساتھ دوّانی، شیرازی، مرزا جان وغیرہ کی تصنیفات لائے اور ان کو یہاں کے نصاب درس میں شامل کیا، ملا فتح اللہ شیرازی بیجاپور سے آگرہ دربار اکبری میں آئے تو ان کے ذریعہ معقولات کا عمومی رواج ہوا۔

(اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں ص۲۶۵)

گیارہویں صدی ہجری میں لوگوں کا منطق و فلسفہ سے شغف بہت بڑھ گیا۔ معقولات کی کتابیں ہندوستان کے تمام علمی مراکز میں بکثرت داخل ہوگئیں۔ شیخ وجیہہ الدین علوی گجراتی اس عہد کے مشہور عالم گذرے ہیں۔ انھوں نے نصاب درس میں حکمت و فلسفہ رائج کیا اور طویل مدت تک درس و افادہ کی مسند پر متمکن رہے۔

انشاء اللہ مئی ۱۹۸۵ء کے پہلے ہفتہ میں

ادارہ رضوان پیش کر رہا ہے

ایک اہم سالنامہ

امہات المومنین رض نمبر

اس اہم موضوع پر ممتاز اہل علم حضرات کی قلمی کاوشیں
اسی سالنامہ میں شریک اشاعت ہوں گی

* امہات المومنین رض کی حیات مبارکہ اور ان کے پُر ہدایت کارنامے۔
* امہات المومنین رض کی علمی و دینی اور سماجی خدمات۔
* امہات المومنین رض کی دین کی راہ میں بے مثال جدوجہد اور قربانیاں۔
* امہات المومنین رض کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آنے سے قبل و بعد کی زندگی کی تفصیلات۔
* عصر حاضر میں امہات المومنین رض کی زندگیوں سے ہم کو کیا روشنی ملتی ہے؟
* منتخب مضامین کا گلدستہ * تاریخی دستاویز * علمی و دینی روشنی۔

خوبصورت فوٹو آفسیٹ کی کتابت و طباعت

قیمت سالنامہ: آٹھ روپے ——— سالانہ چندہ: پندرہ روپے

نوٹ:- ۲۵ اپریل ۸۵ء سے قبل خریدار بن جانے والوں کو یہ سالنامہ مفت پیش کیا جائے گا

دفتر ماہنامہ رضوان، ۳۷ گوئن روڈ، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

جلد ٦٨ | اپریل ۱۹۸۵ء مطابق رجب المرجب ۱۴۰۵ھ | شمارہ ۱

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر مسئول

مولانا ریاست علی بجنوری

مدیر تحریر

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

قیمت فی پرچہ ۲/۵۰ سالانہ ۲۵/-

سالانہ بدل اشتراک بیرون ممالک سے } سعودی عرب کویت ابوظہبی ایرمیل ۱۱۵/- جنوبی و مشرقی افریقہ، و برطانیہ ۱۲۵/-
امریکہ کناڈا وغیرہ بذریعہ ایرمیل ۱۴۵/- پاکستان بذریعہ ایرمیل ۵۰/- بنگلہ دیش ۴۵/-

فہرست مضامین

ہندوستانی اور پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

(۱) ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ فرمائیں۔

(۲) پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ /۵۰ روپے مولانا عبدالستار صاحب مقام کرم علی والا تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان (پاکستان) کو بھیج دیں اور انہیں لکھیں کہ اس چندہ کو رسالہ دارالعلوم کے حساب میں جمع کرلیں۔

(۳) خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں۔ خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

مدیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

حقائق السنن

(ریاست علی بجنوری)

حامداً ومصلیاً! خداوند قدوس کے فضل وکرم سے، پچھلی اور موجودہ صدی میں دارالعلوم دیوبند اور اس کے اہم مشرب اہلِ علم کے زیر سایہ جو علمی، تحقیقی، سیاسی اور مذہبی خدماتِ جلیلہ انجام پذیر ہوئیں وہ اس حقیقت کا بین ثبوت ہیں کہ ان ایام کے لئے خداوندِ ذوالجلال نے اس سرزمین کو علم وفن کا مرکز ثقل بنا دیا ہے اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت عالمِ اسلام میں جہاں کہیں دین کا کوئی چراغ روشن ہے وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی آفتاب کی ضیا پاشیوں کا رہینِ منت ہے۔

دیگر علوم وفنون کی طرح علم حدیث بھی علماء دیوبند کی جولان گاہ رہا ہے یہیں کے اکابر اور فضلاء کے ذریعہ حدیث شریف سے متعلق سینکڑوں کتابیں وجود میں آئیں، ہزاروں شرحیں تیار ہوئیں اور الحمد للہ کہ اسکی رگ تاک سے دن بدن ہزاروں بادہ ہائے ناخوردہ کی تیاری کا عمل جاری ہے۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

ابھی چند ماہ پہلے "حقائق السنن" کے نام سے حضرت مولانا عبدالحق صاحب سابق مدرس دارالعلوم دیوبند، و بانی مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے درس ترمذی کے امالی کی جلد اوّل بڑی آب وتاب اور بڑی عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ اہلِ علم کے ہاتھوں میں آئی ہے۔ حضرت مولانا عبدالحق صاحب دام مجدہم حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ کے تلامذہ میں اپنے علم وفضل، اور زہد وتقویٰ کی بنیاد

پر امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند میں بھی مدرس رہ چکے ہیں۔ اس زمانہ میں حضرت مولانا پر معقولات کا رنگ غالب تھا اور وہ دارالعلوم کے حلقۂ درس میں ایک نامور معقولی تسلیم کئے جاتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد جب راستے مخدوش ہوگئے تو حضرت موصوف نے اپنی مسجد میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرمادیا جو مستقبل میں دارالعلوم حقانیہ کے نام سے پاکستان کی ایک مرکزی درس گاہ میں تبدیل ہوگیا۔ وہاں موصوف نے معقولات کے بجائے فقہ وحدیث اور منقولات کو اپنی خدمات کا محور قرار دیا اور دارالعلوم دیوبند کے درسِ حدیث کے طرز و انداز پر اپنی خدمات کا آغاز کیا۔

دارالعلوم دیوبند میں درسِ حدیث کا ایک خاص اسلوب ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح کوفہ کے محدثین۔ بالخصوص امام اعظم رحمۃ اللہ نے رسولِ پاک صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادا کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تفقہ کی روشنی میں سمجھا ہے بالکل اسی طرح علماء دیوبند نے اقوال رسالت پناہ صلے اللہ علیہ وسلم کو متقدمین بالخصوص احناف رحمہم اللہ کے اصول استنباط کی روشنی میں سمجھا ہے۔ چنانچہ ان حضرات کو کسی روایت کے متروک قرار دینے کی ضرورت شاذ و نادر ہی پیش آتی ہے۔ بلکہ یہ غالب احوال میں اس کے لئے ایسا قابلِ قبول محمل تلاش کر لیتے ہیں کہ بے ساختہ ان کے فقہی اور علمی کمال کا اعتراف ناگزیر ہوجاتا ہے۔

محدثین دارالعلوم میں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کے دور تک درس میں اختصار اور جامعیت کا رنگ غالب رہا۔ ان اکابر کے اسباق میں دریائے علم میں غواصی اور گہرائیوں سے آبدار موتیوں کو برآمد کر لینے کی سعی کا احساس ہوتا تھا۔ محدث وقت حضرت علامہ انور صاحب کشمیری قدس سرہ کے عہد سے اس طرز میں تبدیلی آئی۔ اختصار کے بجائے تفصیل اور بیان مذاہب کے بعد وجوہ ترجیح کی تفصیل میں وہ رنگ پیدا ہوا کہ دارالحدیث، علوم حدیث کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر یا گہرہائے علم برسانے والا ابر گہربار معلوم ہونے لگا۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کا درسِ حدیث کبھی حضرت شیخ الہند کی غواصی اور گہرائی و گہرائی کا نمونہ ہوتا اور اکثر تفصیل و اطناب میں ابر گہربار و دریا بدست کی تصویر نگاہوں میں گھوم جاتی، یا دش بخیر فخر المحدثین حضرت

مولانا سید فخرالدین احمد صاحب مراد آبادی رحمۃ اللہ کے عہد مبارک تک درس حدیث کا جاہ و جلال قابل صد رشک رہا اور آج بھی الحمدللہ انہی پیش رو بزرگوں کے خوشہ چینوں کے ذریعہ درس حدیث کی آبرو محفوظ ہے۔

انہی خوشہ چینوں میں حضرت مولانا عبدالحق صاحب دامت برکاتہم کا اسم گرامی بھی ہے جن کے امالی درس "حقائق السنن" کے نام سے اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔ حضرت موصوف کے امالی اپنے پیش رو بزرگوں کی علمی ژرف نگاہی کا شاہکار جمیل ہیں جنہیں مولانا عبدالقیوم صاحب حقانی مدرس دارالعلوم حقانیہ مرتب فرما رہے ہیں۔ اور جو مولانا سمیع الحق صاحب کی نگرانی میں مرتب اور طبع کئے جا رہے ہیں حضرت موصوف کا درس حدیث ایک ہی فن کے مباحث تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ صرف، نحو، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، بیان مذاہب، وجوہ ترجیح، اسرار وحکم، حقائق و معارف سے لبریز نکات، تاریخ، اور متن و سند کے ہر ہر جز کی دلنشیں تشریحات پر مشتمل ہے۔ ان تمام چیزوں میں سب سے زیادہ زور فقہ اور اصول فقہ پر صرف کیا گیا ہے پہلے ائمہ اربعہ بلکہ بعض مقامات پر تابعین و تبع تابعین کے عہد کے اکثر مجتہدین کے مذاہب کا بیان ہے نہایت وسعت و کشادہ قلبی کے ساتھ ان کے دلائل بیان کئے گئے ہیں۔ پھر حنفیہ کے مذہب کیلئے وجوہ ترجیح کی تفصیل کی گئی ہے اور دیگر ائمہ کی مستدل احادیث کے بارے میں ایسی لطیف توجیہات پیش کی گئی ہیں۔ جن سے قلب و دماغ منور ہو جاتے ہیں۔ کہیں کہیں احناف کے اصول استنباط کی مدد سے عصری مسائل کا واقعی حکم اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اسلام کا ابدی اور آفاقی ہونا ایک امر محسوس معلوم ہونے لگتا ہے جستہ جستہ قرن اول سے لیکر آج تک کے باطل فرقوں کی تردید کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

ان امالی کے آئینہ میں حضرت مولانا عبدالحق صاحب، اپنے اکابر کی طرح کسی خاص اقلیم کے فرماں روا نہیں بلکہ مملکت علم و فن کے تاجدار معلوم ہوتے ہیں۔ دعا ہے کہ خداوند قدوس علماء دیوبند کی جامعیت و عبقریت کے اس امین کو تادیر قائم و دائم رکھے۔ آمین، آخر میں مشورے کے طور پر مرتب امالی کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ خصوصی طور پر ان مقامات کو زیادہ منقح کریں جہاں متعدد توجیہات نقل کی گئی ہیں۔ یعنی اس مقام پر یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ صاحب امالی کے نزدیک کونسی توجیہ راجح ہے جیسے ص۱۱۳ و ص۱۱۴ پر امام ترمذی کے "حسن صحیح" کی تعیین مراد میں متعدد اقوال نقل کئے گئے ہیں۔ مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ صاحب امالی کس قول کو ترجیح قرار دیتے ہیں۔ نیز یہ کہ اگرچہ امالی کے مرتب کا کمال یہی ہوتا ہے کہ وہ کتاب کو

صاحب امالی کے درس کا محفوظ ریکارڈ بنا دے۔ لیکن دوران درس جو باتیں محض تقریب الی الفہم۔ یا تفکر کے طور پر ذکر کیجاتی ہیں انکا حذف کر دینا ہی مناسب ہے جیسے صلا۳۳ پر کچھ کو انسان کی بھر بھی کیا گیا ہے۔ وغیرہ دعا ہے کہ خداوند قدوس حضرت موصوف کے افادات کو طالبانِ علوم کیلئے نفع بخش فرمائے۔ اور مرتب موصوف کو اس علمی شاہکار کی تکمیل کی توفیق

ترکی میں دینی تعلیم کی موجودہ رفتار

از مولانا قاضی اطہر مبارک پوری

دنیا کی دو قدیم سلطنت روم اور فارس کے خاتمہ کے بعد سب سے بڑی سلطنت ترکان آلِ عثمان کی تھی۔ جو یورپ، ایشیاء اور افریقہ تین براعظموں کے بہت بڑے حصہ پر تقریباً چھ سو سال حکمران رہی ۱۲۸۸ء میں اس کا قیام ایسے حالات میں ہوا جبکہ پورا عالم اسلام عیسائیوں کی صلیبی جنگوں اور ہلاکو و چنگیز کی خون آشامیوں سے چور چور ہو چکا تھا اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان دونوں طاقتوں کے اجتماعی حملہ کے بعد اسلام اور مسلمان تاریخ انسانی میں "افسانہ" بنکر رہ جائیں گے ایسے وقت میں اللہ تعالےٰ نے ترکوں کو اسلام اور عالم اسلام کی نگرانی دی اور آخری وقت تک سلاطین عثمانیہ نے اسلامی قوانین و احکام پر عمل کیا کرایا۔ ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد الفاتح نے عیسائیوں کے مشرقی عظیم مرکز قسطنطنیہ کو فتح کیا تو سلطان، مرحوم نے اسلامی لشکر کو اللہ تعالےٰ کی جناب میں شکر پیش کرنے کے طور پر روزہ رکھنے کا حکم دیا اور اس موقع پر تقریر کی جس میں کہا کہ فتح قسطنطنیہ کی شکل میں اللہ تعالےٰ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بشارت کا معجزہ ہمارے سامنے ظاہر کیا ہے، ہمارے لشکر کے ایک ایک فوجی کو یہ پیغام پہونچا دیا جائے کہ ہماری اس

فتح سے اسلام کی سربلندی ہوگی۔ ہماری فوج کا نصب العین شریعت اسلامیہ کی تعلیم ہونا چاہیئے، کوئی ایسی حرکت نہ ہو جس سے اسلامی تعلیم پر زد پڑے عیسائیوں کے گرجوں اور عبادت خانوں کو نقصان نہ پہونچے۔ اور پادریوں اور کمزوروں کو کوئی تکلیف نہ ہو جو جنگ میں شریک نہیں تھے۔ اس کے بعد سلطان محمد الفاتح شہر پناہ کے شمالی دروازے سے اسلامی لشکر کا سیل جرار لیکر اندر داخل ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے شہدائے اسلام کے حق میں دعا کی۔ اور مشہور گرجا "ایاصوفیا" میں عصر کی نماز ادا کی اس وقت شیخ آق شمس الدین نے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار اقدس کی نشان دہی کی سلطان محمد الفاتح نے وہاں مسجد بنانے کا حکم دیا، سلطان نے اس مقام میں نماز ادا کی، شیخ آق شمس الدین نے نماز کے بعد سلطان کو ایک تلوار پیش کی اس کے بعد آل عثمان کے ہر سلطان کی تاج پوشی اور رسم سلطانی اسی مسجد میں ہوتی رہی۔ شیخ الاسلام گویا پوری سلطنت کے وردِ بست پر قابض ہوتا تھا۔ اس کے فتوی کے بغیر کوئی ترکی سلطان جہاد میں نہیں جا سکتا تھا۔ اور شیخ الاسلام جہاد کے ہر پہلو پر غور کرتا تھا کہ کوئی بات اسلامی تعلیم کے خلاف تو نہیں ہورہی ہے، شیخ الاسلام کو سلطان کے معزول کرنے کا اختیار تھا۔ درحقیقت وہی حقیقی حکمران ہوتا تھا۔ اور اس کے فتوی کے بغیر سلطان کوئی کام نہیں کرتا تھا سلطان بایزید نے ایک مرتبہ ایک مقدمہ میں قاضی شمس الدین محمد بن حمزہ فناری" کی عدالت میں گواہی دی، قاضی صاحب نے گواہی رد کردی سلطان بایزید نے وجہ معلوم کی تو فرمایا کہ آپ جماعت سے نماز نہیں پڑھتے ہیں اس لئے آپ کی شہادت معتبر نہیں ہے، اس کے بعد سلطان بایزید نے شاہی محل کے سامنے جامع مسجد بنوائی جس میں نماز باجماعت ادا کرتا تھا۔

سلاطین آل عثمان آخری دور تک اسلام پر عمل کرتے کراتے رہے۔ سلطان عبدالمجید اول نے ۱۸۵۶ء میں ایک وثیقہ لکھا جس میں یہ بھی لکھا تھا کہ یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ ہماری سلطنت کی ابتداء ہی سے قرآنی احکام کو بالادستی حاصل رہی ہے اور شریعت کے قوانین کا احترام عام رہا ہے۔ اس کے ساتھ عوام میں امن وامان۔ ملک کی خوشحالی وآبادی

ہر طرف خوش وقتی رہی ہے مگر ادھر ڈیڑھ سو سال سے حوادث کی وجہ سے شرعی احکام و قوانین کے اجراء میں کاہلی اور سستی آگئی، نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت میں طاقت کے بجائے کمزوری آگئی اور آبادی کی جگہ بربادی آگئی واقعہ یہ ہے کہ جو مسلم حکومت قوانین شرعیہ کا احترام نہیں کرے گی اس میں اضمحلال پیدا ہوگا۔

یہی کمزوری اور سستی آگے چل کر بہت بڑھ گئی اور یہودیوں کی غالب اکثریت پر مشتمل انجمن اتحاد و ترقی نے انقلاب کا نعرہ بلند کیا جس میں پیش پیش کمال اتاترک تھا، اس انجمن اتحاد و ترقی والوں نے جنرل حسین حسینی اور کمال اتاترک کی قیادت میں ۱۹۰۹ء میں سلطان ترکی کو ملک چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اور مارچ ۱۹۲۴ء میں علمانی اور لادینی حکومت قائم کر کے اسلام کو اپنے زعم میں ترکی سے نکال باہر کیا اور ترکی مسلمانوں سے اسلامی اثرات ختم کرنے کیلئے پوری کوشش کی ترکی رسم الخط کو عربی حروف کے بجائے لاطینی حروف میں کیا، ترکی زبان سے عربی الفاظ نکالے۔ مسجدیں بند کردیں جامع ایا صوفیا کو میوزم بنایا اذان بند کی عورتوں سے برقعہ اور پردہ ختم کیا، قرآن و دین کی تعلیم بند کی۔ الغرض وہ سب کام کیا جس سے ترک مسلمانوں کا اپنے اسلامی ورثہ سے تعلق ختم ہو جائے۔ اور چھ سو سال کی اسلامی ثقافت ان میں باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ کسی قوم کے لئے قدیم اور دیرپا ثقافی و دینی ورثہ کو آسانی سے ختم نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ جس زمانہ میں کمالی الحاد نے یہ حرکت شروع کی تھی، اسی زمانہ میں مقابلہ کرنے والے غیور ترکی مسلمان سامنے آگئے تھے۔

شیخ عمر مفتی زادہ اپنے والد مفتی استانبول کے ساتھ کمالی الحادی انقلاب میں فرار ہوگئے تھے، اور پچاسوں سال تک مختلف ممالک میں پھرنے کے بعد ملک فیصل مرحوم کی عنایت سے سعودی ہوگئے تھے، ان کا بیان ہے کہ جس وقت الحادی پارلیمنٹ میں اذان بند کرنے کی قرارداد پاس ہوئی دو ترکی عالم نے مقابلہ میں جان دی۔ دونوں عالم پارلیمنٹ کی گیلری میں دائیں بائیں بیٹھ گئے اور جب یہ تجویز پاس ہوگئی تو ایک عالم نے اذان بلند آواز سے شروع کی جن کو گولی ماردی گئی اور اسی وقت باقی اذان

دوسرے عالم نے اسی بلند آہنگی کے ساتھ پوری کی اور ان کو بھی گولی مار دی گئی۔

جس زمانہ میں دین کی تعلیم اور اذان وغیرہ بند کرنے کی تحریک سرکاری طور سے جاری ہوئی۔ ترکی کے مسلمان اپنے بچوں کو راتوں کو جگا کر دین کی تعلیم دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں بہت سے والدین قید وبند سے دوچار بھی ہوئے نیز بہت سے خاندان شہر سے دیہاتوں میں اپنے بال بچوں کیساتھ منتقل ہوگئے جہاں حکومت کی نظروں سے بچکر دینی تعلیم دیا کرتے تھے، یوں بھی دیہات ایسے کاموں کیلئے شہروں سے زیادہ مفید ہوتے ہیں اسکا نتیجہ ہے کہ آج ترکی کے دیہاتوں میں دینی تعلیم اور حفظ قرآن کا ظہور زیادہ اور وہاں کے باشندے اسلامی تعلیمات سے زیادہ واقف ہیں، نیز اسی زمانہ میں بہت سے والدین نے اپنے بچوں کو دینی تعلیم کیلئے غیر ممالک میں روانہ کر دیا تھا جس سے مدتیں خط وکتابت تک نہیں کر سکتے تھے اور نا اپنے وطن لوٹ سکتے تھے ان لڑکوں میں سے کئی جامع ازہر قاہرہ گئے اور اب چند سال ہوئے وہ اپنے وطن آگئے ہیں۔ اور اپنے ملک کے احوال وظروف کی رعایت کرتے ہوئے دینی تعلیم کے فرائض ادا کر رہے ہیں۔

دو سال ہوئے، حج وزیارت کے موقع پر مسجد نبوی میں دو ترکی طالب علموں نے ملاقات کی تھی جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں زیر تعلیم تھے۔ انھوں نے ہمیں تفصیل سے بتایا کہ آج بھی ترکی میں معیاری دینی تعلیم کا انتظام نہیں ہے۔ حکومت نے ابتدائی دینی تعلیم کے لئے بڑی مشکل سے کچھ وقت دیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم اپنی داڑھی اور اس لباس میں رہ کر ترکی میں سرکاری ملازمت نہیں کر سکتے ہیں اس کے باوجود علماء کام کر رہے ہیں۔ گذشتہ سال مارچ میں کراچی میں سندھ کے ادبی وعلمی سمینار میں شرکت ہوئی تو اس موقع پر ایک ترکی نمائندہ نے اپنا مقالہ پڑھا جس میں اس نے بتایا کہ انگورہ یونیورسٹی کے الہیات کالج میں قرآنی تحقیق کا ایک شعبہ کھولا گیا ہے۔ جس نے قرآن کے تراجم پر قیمتی معلومات جمع کی ہیں اور پورے عالم اسلام میں ابتک (۹۰۰) قرآنی تراجم کا پتہ چلا یا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ براہ راست نہ سہی بالواسطہ علمی ریسرچ اور تحقیق کے نام پر قرآنی کام ہو رہا ہے۔ اس طرح اس یونیورسٹی سے بعض اہم کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں

جو عام طور سے ڈاکٹریٹ کیلئے اڈٹ کی جاتی ہیں، چنانچہ خطیب بغدادی کی کتاب "شرف اصحاب الحدیث" اسی سے شائع ہوئی ہے جو ہمارے پاس ہے ...... اسی طرح امام احمد بن حنبل کی "کتاب العلل" یہیں سے شائع ہوئی ہے۔

ذیل میں ہم بعض عربی مصادر کی مدد سے ترکی میں موجودہ دینی تعلیم و تربیت کے بارے میں معلومات پیش کررہے ہیں. جو وقف مرادیہ انگورہ اور وقف اخضر استانبول کے ذریعہ انجام پارہی ہے، اور تحفیظ قرآن کے نام پر اسلامی عقائد و مبادی، حدیث و فقہ کا چھ سالہ نصاب پڑھایا جارہا ہے. کمالی دورالحاد کے بعد ترکی میں یہ دینی کروٹ بہت ہی خوش آئند ہے کمال اتاترک نے ترکی سے خلافت عثمانیہ کو ختم کرکے علمانی یعنی لادینی حکومت بنائی. اور اسلام کو ترکی قوم کے زوال و انحطاط کا سبب قرار دیکر وہاں سے اسلام کو نعوذ باللہ شہر بدر کیا، مگر چونکہ ترکی تقریباً چھ سو سال تک اسلامی تعلیمات پر چلتا رہا، اور وہاں کی زندگی کے ہر شعبہ میں اسلام کا رنگ غالب رہا اس لئے الغائے خلافت اور عثمانی حکومت کے باوجود اسلامی اثر و نفوذ لوگوں میں کسی نہ کسی درجہ میں باقی رہا. بلکہ دینی حلقہ احوال و ظروف کو دیکھکر اسلامی تعلیمات پر کاربند رہا اس طرح اسلامی تعلیم کا سلسلہ کسی نہ کسی طور سے جاری رہا. حتیٰ کہ آجکل باقاعدہ قرآنی اور دینی تعلیم کا انتظام اوقاف و تبرعات کے ذریعہ ہورہا ہے. اور لڑکوں اور لڑکیوں کی قرآنی اور دینی تعلیم کیلئے نشاط و انبساط کے ساتھ درس گاہیں آباد ہورہی ہیں، اس سلسلہ میں دو اوقاف خاص طور سے کام آرہے ہیں. ایک وقف مرادیہ اور دوسرا وقف اخضر ہے، انگورہ (انقرہ) میں وقف مرادیہ کا صدر دفتر ہے. اس کے مدیر جناب "مصطفےٰ تلغا اولو" ہیں. ان کا بیان ہے کہ ہمارے بزرگوں نے مرنے کے بعد صدقہ جاریہ کیلئے بڑے بڑے اوقاف چھوڑے ہیں، جن کا اجر قیامت تک جاری رہے گا. ان اوقاف کے ذریعہ غریبوں، یتیموں، بیواؤں کی مدد کیجاتی ہے. نیز دوسرے کارہائے خیر میں ان سے کام لیا جاتا ہے۔

ہمارے یہاں وقف مرادیہ ہے کہ جو ہماری دینی تعلیم کا راس المال اور سرمایہ ہے اسی وقف کے ماتحت انگورہ میں مدرسۃ الامامۃ والخطابۃ والوعظ جاری ہے۔ اس میں علوم شرعیہ اور عربی زبان کے مدرس جناب حسین کا دتشر ہیں۔ اسی قسم کا ایک وقف قدیم زمانہ میں قاضی ابن حبان نے نیساپور میں قائم کیا تھا جس کے ماتحت بہت بڑا مدرسہ، اس سے متعلق عظیم الشان کتب خانہ، اور طلبہ کیلئے دارالاقامہ تھا۔ شہر انگورہ میں بھی یہی صورت حال ہے۔

اسی وقف مرادیہ کے ماتحت ۱۹۷۸ء میں دو لاکھ ترکی لیرہ سے قرآنی تعلیم کا ادارہ قائم کیا گیا۔ اس کے ساتھ مسلمانوں کے چندے، زکوٰۃ کی رقمیں، اور دوسرے ذرائع سے اموال جمع کئے گئے ایک کمیٹی بنائی گئی، جس کا کام غریبوں، یتیموں، بیواؤں کی مدد کے ساتھ قرآنی اور دینی مدارس کا قیام، ائمہ اور واعظین کی تربیت اسلامیات پر خطبات کا انتظام وغیرہ ہے۔ اس کے ماتحت دینی لٹریچر اور کتابوں کی اشاعت بھی ہوتی ہے۔ وقف کی اپنی شاندار پلاننگ بھی ہے۔ اس وقف کے علاوہ دوسرے طریقوں سے کثیر رقم جمع کی جاتی ہے آج ترکی میں قرآن کریم کی تعلیم کے (۲۷۰۰) مدرسے جاری ہیں۔ جن میں طلبہ و طالبات کی تعداد تین لاکھ ہے، بہت سے طلبہ و طالبات ان مدرسوں میں داخلہ لینا چاہتے ہیں مگر جگہ اور وسائل کی کمی کے باعث انکی امید پوری نہیں ہو رہی ہے حتی کہ ترکی کے جو ترک مسلمان جرمنی وغیرہ دیگر ممالک میں ہیں وہ بھی اپنے بچوں بچیوں کو یہاں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر وسعت نہ ہونے کی وجہ سے مجبوری ہے۔ آئندہ پروگرام پر (۷۰۵۰۰۰) ترکی لیرہ درکار ہے۔ وقف کی ۲۲ دکانیں ہیں جن سے سالانہ (۱۳۵۰۰۰) لیرہ کی آمدنی ہوتی ہے باقی اخراجات باہمت اور دردمند مسلمان پورے کرتے ہیں، ان مدرسوں میں تعلیم مفت دیجاتی ہے۔ غذا وغیرہ کا انتظام مفت کیا جاتا ہے۔ البتہ دارالاقامۃ میں رہنے والے باحیثیت طلبہ و طالبات سے سالانہ چالیس ہزار ترکی لیرہ کی آمدنی ہوتی ہے، انگورہ کے مدرسہ میں طالبات کی تعداد (۲۵۰) ہے جنہیں

سے (۱۲۰) دارالاقامۃ میں مستقل طور سے رہتی ہیں اس مدرسہ میں بارہ معلمات اور تین معلم ہیں۔

مالی دشواری کے باوجود انگورہ کے مرکزی مدرسۃ القرآن کے علاوہ اطراف و جوانب میں بھی مدارس کھولے جارہے ہیں۔ چنانچہ ایک مدرسہ "قرہ بور جک" نامی مقام میں جاری ہوا ہے جس میں ڈیڑھ ہزار طالبات کی گنجائش ہے اسکی شاندار عمارت چھ منزلہ ہے۔ جس میں درسگاہیں، مدرسین کے کمرے، ادارہ، کتب خانہ وغیرہ ہے اس مقام میں ایک مرکز ثقافی کا قیام بھی ہورہا ہے جس میں طلبہ کیلئے ایک ہزار چار پائی ستائیس سونے کے کمرے، غسل خانہ، اور کتب خانہ ہوگا۔ اس کے ساتھ وقف مرادیہ کے زیراہتمام جامع اقصیٰ کی تعمیر اور اس سے ملحق قرآن کے حفظ کا مدرسہ قائم ہے۔ نیز جامع بوغارہ سے ملحق طلبہ کے لئے مفت دارالاقامۃ ہے، اور مقام انجیرلی میں بیت الاتیام اور مدرسۃ الاندلس کے نام سے قرآن کے حفظ کا مدرسہ ہے جس میں (۴۵۰) طالبات قرآن حفظ کررہی ہیں، مقام قازانی میں بھی ایک قرآنی مدرسہ کا قیام زیرغور ہے۔

ان مؤسسات قرآنیہ میں خاص طور سے حفظ قرآن کی تعلیم ہوتی ہے اسی کے ساتھ اصول دین، دینی عقائد، فقہ، حدیث، عربی زبان کی تعلیم ہوتی ہے عربی زبان کیلئے ہفتہ میں دو گھنٹے ہیں، اسی طرح علوم طبیعیہ کے لئے ہفتہ میں دو گھنٹے مقرر ہیں، مدت تعلیم چھ سال ہے اس کے بعد طالبات انگورہ یونیورسٹی کے الٰہیات کالج میں داخل لیتی ہیں، اور طلبہ مدرسۃ الامامۃ والخطابۃ میں جاتے ہیں

نیز اس چھ سالہ تعلیم کے بعد طلبہ و طالبات سرکاری مدارس میں دینی تعلیم کے لئے جاتے ہیں یا سرکاری آفسوں میں کام کرتے ہیں۔ ابتک مؤسسات قرآنیہ سے ایک سو طالبات فارغ ہوکر سرکاری اسکولوں میں دینیات کی تعلیم دیتی ہیں۔ جہاں ہفتہ میں دو گھنٹے دینیات کی تعلیم رکھی گئی ہے۔ حکومت کے ابتدائی اور ثانوی اسکولوں میں یہی انتظام ہے۔ استانبول میں وقف اخضر کے ماتحت بہت بڑا مدرسۃ قرآنیہ

قائم ہے جس طرح انگورہ کا موستہ قرآنیہ لڑکوں کیلئے ہے اسی طرح ... قرآنیہ لڑکوں کیلئے ہے اس میں ابتدائی اور ثانوی درجات تک تعلیم ہوتی ہے۔ اور تعلیم وقیام کا انتظام مفت ہے اس کے ماتحت اسلامی لائبریری، شفاخانہ وغیرہ ہے ترکی میں مسلمانوں کی آبادی ۹۲ فیصد ... کے باوجود حکومت لادینی ہے، یعنی سرکاری مذہب اسلام نہیں ہے۔ قانونی طور سے عقیدہ کی آزادی ہے، موجودہ ترکی کا کل رقبہ (۷۸۰۰۵۷۶) مربع کلومیٹر ہے ۱۹۵۱ء میں جلال بایار کے دور میں پہلی بار مسجدوں کے میناروں سے اذان بلند ہوئی، اور اسلام سے حکومت کی کچھ گرفت ڈھیلی ہوئی مہجور و مغلق مسجدوں میں اذان و نماز اور جماعت کی منظم تحریک چلی، سعید نورسی اور دوسرے کئی دینی زعماء کھل کر میدان عمل میں آئے اور قید و بند سے دو چار ہوئے، مسلمانوں کی اکثریت حنفی المسلک ہے۔

پندرہویں صدی ہجری میں پوری دنیا میں اسلام کی لہر چل پڑی ہے یہ لہر ترکی میں بھی چل رہی ہے جو تقریباً چھ سو سال تک ایشیا، یورپ اور افریقہ کے وسیع و عریض خطہ میں اسلام کا امین رہ چکا ہے، اور یہ امانت دینی مکاتب و مدارس کے ذریعہ ترکی کو واپس ہو رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دینی مکاتب مدارس اسلام کے قلعے ہیں۔

حسد اور اس کے مہلک اثرات
قرآن و حدیث کی روشنی میں

حسد کے معنی دوسروں کی خوشی دیکھ کر جلنے یا دوسروں کی نعمت کا زوال اور اپنے لئے اس نعمت کی خواہش کرنے کو حسد کہتے ہیں. خواہ اس نعمت کا تعلق مال و دولت، عزت و جاہ، صحت و تندرستی کسی چیز سے بھی ہو بالفاظ دیگر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ نے جو نعمت یا خوبی یا فضیلت عطا، فرمائی ہے اس پر کسی دوسرے شخص کا جلکر یہ چاہنا کہ وہ نعمت. خوبی یا فضیلت اس شخص سے چھنکر خود اس کو حاصل ہوجائے یا کم از کم اس دوسرے شخص کے پاس سے ضرور چھن جائے "حسد" کہلاتا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حسد، کسی مستحق نعمت کی نعمت کا زوال اور اپنے لئے اس کی خواہش کرنے کو کہتے ہیں. قطع نظر اس بات سے کہ حاسد نے مستحق نعمت کے خلاف عملاً کوئی اقدام کیا ہے یا نہیں.

اقسام حسد کی تین قسمیں ہیں (۱) اگر حاسد اپنے محسود کی نعمت کا زوال یا اس میں نقص پیدا کرنے کیلئے کسی قسم کی کوئی سعی و کوشش کرتا ہے تو یہ حسد ظلم کہلائے گا اور حاسد کا یہ فعل جور و تعدی پر محمول ہوگا جسکی قرآن و حدیث میں سخت ممانعت آئی ہے (۲) حاسد نے مستحق نعمت کے خلاف کوئی عملی اقدام یا ناپسندیدہ ذرائع واسباب کا استعمال تو نہیں کیا لیکن اگر اس کا بس چلتا تو وہ اس سے دریغ ہرگز نہ کرتا تو یہ حسد بھی قابل مذمت و نفرت بلکہ قابل گرفت و مواخذہ ہے (۳) تیسری قسم یہ ہے کہ حاسد

اپنے محسود کے خلاف کوئی نامناسب قدم یہ سمجھ کر نہیں اٹھاتا ہے کہ یہ تقوی کے خلاف ہے تو یہ حسد قابل عفوو درگذر ہے، چنانچہ جن احادیث میں رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ "ثلاث لا یسلم منہا احد، الطیرۃ والظن والحسد" تین چیزیں ایسی ہیں جن سے کوئی محفوظ نہیں پہلی بدشگونی دوسری بدظنی اور تیسری حسد اسیطرح "ثلاث لا ینفلت المؤمن عنہن، الحسد والظن والطیرۃ" تین چیزوں سے کسی مسلمان کو رستگاری نہیں ہے پہلی چیز حسد دوسری بدظنی اور تیسری بد فالی۔ اس حسد سے مراد یہی تیسری قسم ہے۔ کیونکہ یہ غیر ارادی وغیر اختیاری ہے جسکے متعلق قرآن کریم میں حضرت حق جل مجدہ کا ارشاد ہے "لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا۔ لہا ما کسبت وعلیہا ما اکتسبت" یعنی اللہ تبارک وتعالے صرف انہیں چیزوں کا کسی کو مکلف بناتا ہے جو اس کے قدرت واختیار میں ہو۔ اس کو ثواب بھی اسی کا ملے گا جو ارادہ سے کرے اور عذاب بھی اسی کا ہوگا جو ارادہ سے کرے (سورۃ بقرہ آیت ۲۸۵)

ایک غلط فہمی

چونکہ بعض جگہوں پر لفظ حسد کا استعمال منافسہ اور منافسہ کا استعمال حسد کے معنی میں کیا گیا ہے اس لئے غلط فہمی کی بنا پر کچھ لوگ دونوں کو مترادف وہم معنی لفظ سمجھتے ہیں، حالانکہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے حسد سراسر ناجائز اور حرام فعل ہے جبکہ منافسہ جسکو اردو میں رشک کہا جاتا ہے نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ ایمان اور نماز وغیرہ جیسی نعمتوں کیلئے رشک کرنا ضروری ہے اور فضائل ومکارم کیلئے مستحب وپسندیدہ ہے اللہ تعالے کا ارشاد ہے " فلیتنافس المتنافسون" حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا "ان المؤمن یغبط والمنافق یحسد" مومن اچھی چیزوں کو دیکھکر رشک کرتا ہے اور منافق حسد۔ کیونکہ اسلام وایمان جیسی نعمتوں کو اپنے لئے نہ چاہنا معصیت پر رضامندی کی دلیل ہے جسکا نتیجہ جہنم ہے

مثال

ایک حدیث میں حسد اور رشک کے فرق کو مثال کے ذریعہ واضح کرتے ہوئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مثل ہذہ الامۃ مثل اربعۃ، رجل آتاہ اللہ مالا وعلما، فہو یعمل بعلمہ فی مالہ، ورجل آتاہ اللہ علما

ولم یؤته مالاً، فیقول: رب لو انّ لی مالاً مثل مال فلان، لکنت اعمل فیه بمثل عمله، فھما فی الاجر سواء، وھذا منه حب لان یکون له مثل ماله، فیعمل مثل ما یعمل من غیر حب زوال النعمة عنه، قال: ورجل آتاه الله مالاً، ولم یؤته علماً، فھو ینفقه فی معاصی الله ورجل لم یؤته علما ولم یؤته مالاً، فیقول، لو انّ لی مثل مال فلان، لکنت انفقه فیه من المعاصی، فھما فی الوزر سواء" اس امت کی مثال ان چار آدمیوں کی طرح ہے جنہیں ایک کو اللہ تبارک و تعالےٰ نے مال اور علم دونوں سے نوازا ہے اس لئے وہ اپنے علم کی روشنی میں مال کو کار خیر میں صرف کرتا ہے دوسرا وہ آدمی ہے جسکو اللہ تعالےٰ نے صرف دولت علم سے نوازا ہے چنانچہ یہ آدمی بارگاہ خداوندی میں اپنی خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ یاالٰہ العالمین اگر تو مجھے بھی پہلے شخص کے جتنا مال دیتا تو میں بھی اسی کیطرح کار خیر میں خرچ کرکے تیرے ثواب کا زیادہ سے زیادہ مستحق ہوتا۔ چونکہ یہ خواہش دوسرے کی نعمت کا زوال چاہے بغیر محض حصول ثواب اور قرب خداوندی کیلئے ہے اس لئے اللہ تعالےٰ کے یہاں دونوں اجر میں برابر ہوں گے پھر آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیسرا وہ شخص ہے جس کو صرف مال دیا گیا اس لئے یہ شخص اپنے مال کو برے کاموں میں صرف کرتا ہے اور چوتھا شخص وہ ہے جس کو نہ مال نہ دیا گیا اور نہ علم چنانچہ یہ شخص خواہش کرتا ہے کہ اگر میرے پاس بھی تیسرے آدمی جتنا مال و دولت ہوتا تو میں بھی اسی کی طرح برے کاموں میں صرف کرتا۔ لہذا یہ دونوں اس گناہ میں برابر کے حصہ دار ہو گئے۔

مذکورہ بالا حدیث سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ نعمت یافتہ کی نعمت کا زوال چاہے بغیر اس جیسی نعمت کی اپنے لئے خواہش کرنا جائز ہے تاکہ وہ بھی خیر میں اس کے مساوی ہو جائے۔ اس جگہ یہ بات بھی خوب اچھی طرح ذہن نشین رہنی چاہئے کہ مساوات کی خواہش کا رخ منفی پہلو نہ اختیار کرنے پائے یعنی اگر خدانخواستہ کسی وجہ سے اسی جائز خواہش کی تکمیل نہ ہو تو یہ نہ سوچنے لگے کہ چونکہ مجھے وہ نعمت میسر نہیں ہو سکی ہے

اس لئے اس نعمت کے پانے والے سے بھی وہ ضرور چھن جائے تاکہ مساوات ہو جائے کیونکہ اس طرح کا سوچنا یہ حسد ہو جائے گا۔

حسد کے درجات واحکام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حسد کے چار درجے ہیں اور ہر ایک کے احکام الگ الگ اور جداگانہ ہیں

(۱) کسی شخص کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو نعمت یا خوبی یا فضیلت عطا فرمائی ہے اس پر حلکر حاسد یہ چاہے کہ وہ نعمت، خوبی یا فضیلت خود اسے حاصل ہو یا نہ ہو اس دوسرے شخص سے ضرور چھن جائے۔ یہ حسد انتہائی مذموم ہے (۲) کسی دوسرے شخص کو اللہ تعالیٰ نے جو نعمت عطا فرمائی اس پر جلکر حاسد یہ چاہے کہ اس شخص سے نعمت چھن کر بعینہ وہی نعمت خود اس کو حاصل ہو جائے یہ حسد بھی مذموم ہے (۳) تیسرا درجہ یہ ہے کہ حاسد کسی دوسرے کی نعمت کا ابتداءً زوال نہ چاہے اور بعینہ اس نعمت کی اپنے لئے خواہش نہ ہو بلکہ اس جیسی نعمت کا متمنی ہو ہاں اگر یہ نعمت اسے میسر نہیں آتی ہے تب وہ محسود کی نعمت سے زوال کی خواہش کرتے لگے تاکہ دونوں میں کوئی چیز وجہ امتیاز نہ بن سکے یہ حسد بھی ممنوع ہے (۴) چوتھا درجہ یہ ہے کہ حاسد اپنے محسود جیسی نعمت کا خواہشمند تو ہے مگر اس سے اس نعمت کا زوال ہرگز نہیں چاہتا ہے لہذا اگر چہ دنیاوی امور کیلئے ہے تو قابل عفو و درگذر ہے اور اگر دینی امور کیلئے ہے تو محبوب و پسندیدہ ہے

حسد کا آغاز حسد ایک ایسا لاعلاج ومہلک مرض ہے جسمیں انسان ابتدائے آفرینش سے مبتلا ہے بعض علماء کا خیال ہے کہ وہ حسد ہی کی کارفرمائی تھی جسکی بناء پر سیدنا آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سب سے پہلا نامناسب کام ہوا جس سے اللہ تعالیٰ نے آپکو پہلے ہی منع فرما دیا تھا) تاکہ فرشتوں کی طرح آپ بھی ہمیشہ جنت میں رہ سکیں۔ اسی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا" یاآدم اسکن انت وزوجك الجنة، فكلا من حيث شئتما، ولا تقربا هذه الشجرة، فتكونا من الظالمين. فوسوس لهما الشيطان ليبدى لهما ما ؤرى عنهما من سوءاتهما، وقال: ما نهاكما ربكما

ـن ھـذہ الشـجرۃ ، الّا ان تکونا ملکین أو تکونا مـن الخالـدین و
"سـمـھما انی لکما لمـن الناصـحین فدلّاھما بغرور. فلمّا ذاقا
الشجرۃ . بدت لھما ... سوءاتھما ، وطفقا یخصفان علیھما مـن
ورق الجنۃ ، ونادا ھما ربھما . ألم انھکما عن تلکما الشجرۃ ، واقل
لکما إن الشیطان لکما عدو مبین "

ترجمہ :- اور ہم نے حکم دیا ، اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو ، پھر جس جگہ سے چاہو تم دونوں کھاؤ ، اور اس درخت کے پاس مت جاؤ . کبھی ان لوگوں کے شمار میں آ جاؤ جن سے نامناسب کام ہو جایا کرتے ہیں . پھر شیطان نے ان دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تاکہ ان کا پردہ کا بدن جو ایک دوسرے سے پوشیدہ تھا . دونوں کے روبرو بے پردہ کر دیئے . اور کہنے لگا کہ تمہارے رب نے تم دونوں کو اس درخت سے منع اسلئے منع فرمایا ہے کہ کہیں تم دونوں فرشتے نہ ہو جاؤ . یا ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ . اور ان دونوں کے روبرو قسم کھائی کہ میں آپ دونوں کا خیر خواہ ہوں ، سو ان دونوں کو فریب سے نیچے لے آیا . پس ان دونوں نے جب درخت کو چکھا تو دونوں کا پردہ کا بدن ایک دوسرے کے روبرو بے پردہ ہو گیا . اور دونوں اپنے اوپر درخت کے پتے جوڑ جوڑ کر رکھنے لگے . اور ان کے رب نے ان کو پکارا ، کیا میں تم دونوں کو اس درخت سے منع نہ کر چکا تھا اور یہ نہ کہہ چکا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے . (سورہ اعراف آیت ۱۹ تا ۲۲)

اللہ تبارک و تعالیٰ کے یہاں سیدنا آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے بعد ان کی اولاد کا جو مقام تھا ابلیس اس سے ناواقف نہیں تھا . چنانچہ وہ اس بات سے انتہائی دردمند ہوا کہ آدمؑ اور ان کی اولاد تو نوازے جائیں اور میں محروم کر دیا جاؤں . اس لئے اسکی فطرت میں حسد کی چنگاری بھڑک اٹھی اور یہ لاعلاج مرض وجود میں آیا ، جسکی وجہ سے شیطان روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کی سب سے پہلی نافرمانی کا مرتکب ہوا . اور خداوند قدوس کی رحمت سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مردود و محروم ہوا . اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے:-

" ولقد خلقناکم ثم صوّرناکم. ثم قلنا للملئکۃ اسجدوا لآدم فسجدوا الآ ابلیس. لم یکن من الساجدین.
قال: مامنعک الاّ تسجد إذ أمرتک. قال: اناخیر منہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین. قال: فاھبط منھا فما یکون لک ان تتکبر فیھا فاخرج ، انک من الصاغرین "

ترجمہ: اور ہم نے تم کو پیدا کیا اور ہم نے ہی تمہاری صورت بنائی. پھر ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو. سو سب نے سجدہ کیا. بجز ابلیس کے وہ سجدہ کرنیوالوں میں شامل نہیں ہوا. حق تعالےٰ نے فرمایا، تو سجدہ کیوں نہیں کرتا جب کہ میں تجھکو حکم دے چکا. کہنے لگا میں اس سے بہتر ہوں. آپ نے مجھکو آگ سے پیدا کیا اور اس کو خاک سے. اللہ تعالےٰ نے فرمایا تو آسمان سے اتر تجھکو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ تو (آسمان) میں رہ کر تکبر کرے. (سورہ اعراف آیت ۱۱تا۱۳)

اس شرمناک ذلت ورسوائی کے بعد شیطان نے اس بات کا عہد کر لیا کہ جس مرض کا میں شکار ہوں ابن آدم کو بھی اس کا ذائقہ چکھائے بغیر چین نہیں لوں گا. چنانچہ اس اللہ کے دشمن نے اللہ تعالےٰ سے باضابطہ اس بات کی اجازت طلب کی کہ آپ مجھے قیامت تک کی مہلت دیجیے کہ میں ابن آدم کی تباہی و بربادی کیلئے ہر ممکن، کوشش کروں اور انہیں ایسے کاموں کی ترغیب دوں جس سے وہ آپکی ناراضگی و عتاب کے مستحق ہوں، قرآن کریم میں اسی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تبارک و تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے" قال انظرنی الی یوم یبعثون، قال: انک من المنظرین
قال: فبما اغویتنی لاقعدن لھم صراطک المستقیم، ثم لآتینھم من بین ایدیھم ومن خلفھم وعن ایمانھم وعن شمائلھم ولا تجد اکثرھم شاکرین "

ترجمہ:- شیطان کہنے لگا مجھے اجازت دیجئے قیامت کے دن تک. اللہ تعالےٰ

نے فرمایا تجھکو مہلت دی گئی. وہ کہنے لگا چونکہ آپ نے مجھے گمراہ کیا ہے میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ان کیلئے آپکی سیدھی راہ پر بیٹھوں گا. پھر ان پر ہر چہار جانب سے حملہ کروں گا اور آپ ان میں سے بیشتر کو احسان فراموش پائیں گے.

(سورہ اعراف آیت ۱۳ تا ۱۴)

حسد کے اسباب حسد کے اسباب ان گنت ہیں جن کو احاطۂ شمار میں لانا ناممکن نہیں مشکل ضرور ہے تاہم "مشتے از خروارے" کے طور پر چند اہم اسباب ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں جو حقیقت میں حسد کے جملہ اسباب کا منبع سرچشمہ ہیں.

(۱) بغض و عداوت حسد اور دشمنی دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے کیونکہ یہ ناممکنات میں سے ہے کہ ایک شخص دوسرے سے بغض و عداوت بھی رکھے اور پھر اس کے خوشی و غم میں شریک بھی ہو. اسی لئے اللہ تبارک و تعالےٰ نے ارشاد فرمایا: واذا لقوکم قالوا آمنا و اذا خلوا. عضوا علیکم الانامل من الغیظ، قل موتوا بغیظکم. ان اللہ علیم بذات الصدور ان تمسسکم حسنۃ تسؤھم وان تصبکم سیئۃ یفرحوا بھا. جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب تنہائی میں ہوتے ہیں تو غصے سے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں آپ کہہ دیجئے تم لوگ اپنے غصے میں ہلاک ہو جاؤ یقیناً اللہ تعالےٰ سینوں کے بھید کو خوب جانتا ہے اور اگر تم کو کوئی بھلائی حاصل ہو جاتی ہے تو انہیں بری لگتی ہے اور اگر تم کو کوئی مصیبت پیش آ جاتی ہے تو اس پر یہ خوش ہوتے ہیں. ایک دوسری آیت میں اسی مضمون کو بیان کرتے ہوئے اللہ جل جلالہٗ نے فرمایا" ودوا ما عنتم قد بدت البغضاء من افواھھم وما تخفی صدورھم اکبر۔ تمہاری مشقت و تکلیف کی تمنا کرتے ہیں ان کے منہ سے بغض ظاہر ہو رہا ہے اور جو کچھ ان کے دلوں میں پوشیدہ ہے وہ اس ظاہر سے بھی بڑھکر ہے۔

(۲) کبر و غرور کبر و غرور کی وجہ سے بھی انسان حسد کا شکار ہو جاتا ہے کفار مکہ

تکبر کے نشہ میں دھت ہو کر آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہتے تھے کہ اس یتیم، امی و جاہل غلام کی ہم کیسے اتباع کریں اور اپنا سربراہ مانیں؟ ہاں اگر اسکی جگہ کوئی عظیم شخص جو ہم میں ہر اعتبار سے لائق و فائق ہوتا تو ہم بلا چوں وچرا اس کو اپنا مقتدا و پیشوا بنا لیتے اور اس کے احکام کی تعمیل کو اپنے لئے باعث فخر و سعادت سمجھتے اس لئے یہ لوگ آپ سے جلنے لگے اسی کو نقل کرتے ہوئے حضرت حق جل مجدہ نے ارشاد فرمایا: لولا نزل ھذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم " کیوں نہیں نازل کیا گیا قرآن ان دونوں شہروں میں سے کسی عظیم اور بڑے شخص پر، اسی طرح قریش مکہ مسلمانوں کا مذاق اڑاتے ہوئے یہ کہتے تھے کہ کیا " أھولاء من اللہ علیھم من بیننا " کیا یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہمارے درمیان احسان کیا ہے

(۳) تعجب اسباب حسد میں سے ایک سبب تعجب ہے۔ اسی تعجب کی وجہ سے پہلی امتوں نے " ما انتم الا بشر مثلنا " تم تو ہمارے ہی جیسے ہو، اور " أنؤمن لبشرین مثلنا " کیا ہم اپنے ہی جیسوں پر ایمان لے آئیں اور " أبعث اللہ بشرا رسولا " کیا اللہ نے انسان کو رسول بنا کر بھیجا ہے جیسی باتیں کہکر اپنے انبیاء کرام کی نبوت کا انکار کر دیا۔ ان کی کوتاہ عقل میں یہ بات نہیں سما سکی کہ اللہ تعالے نے انہیں میں سے کسی کو مقام نبوت سے سرفراز فرمادیا ہے۔ کیونکہ ان کے خیال کیمطابق نبی کو فرشتہ ہونا چاہیئے نہ کہ انسان اس لئے وہ اپنے انبیاء سے حسد کرنے لگے کہ یہ اعزاز خداوندی انہیں کیسے مل گیا۔ باری تعالے فرماتے ہیں۔ اوعجبتم ان جاءکم ذکر من ربکم علی رجل منکم " کیا تمہیں تعجب ہے کہ وحی آئے تمہارے کسی شخص پر تمہارے رب کیجانب سے۔

(۴) جاہ پرستی جاہ پرستی کی وجہ سے بھی انسان حسد کی آگ میں جلنے لگتا ہے علماء یہود اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ حضور پاک صلے اللہ علیہ وسلم نبی صادق و برحق ہیں مگر وہ ایمان لانے کے بجائے آپ سے صرف اس لئے حسد کرتے تھے کہ ان کی سابقہ پوزیشن برقرار رہے ورنہ انہیں کوئی گھاس

ڈالنے والا بھی نہ ملتا۔

جاہ پرستی کا مرض معاشرہ کے ہر طبقہ و جماعت میں پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص ہے جو کسی زبان کا ماہر ہے اسکی یہ خواہش بلکہ تمنا ہے کہ صرف میں ہی اس زبان کا عالم بے نظیر رہوں تا کہ لوگ صرف میری ہی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابہ ملائیں اور یہ کہیں کہ فلاں صاحب تو وحیدالدہر و فریدالعصر ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر کوئی اس کا مثیل و نظیر پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے سینہ پر سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ آنکھوں سے نیند اڑ جاتی ہے اور وہ اپنے مثیل کے خلاف طرح طرح کا شیطانی حربہ استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے۔ جب اس کی ساری کوششیں بلکہ سازشیں محسود ہمسر کو نقصان پہونچانے کی بیکار ہو جاتی ہیں تو وہ جادو، ٹوٹکے اور منتر کرانے پر اتر آتا ہے تاکہ اس کی قیمتی جان سے اپنی انفرادیت کی ڈھتی ہوئی دیوار کو گرنے سے بچالے تقریباً یہی حال زاہدوں، صوفیوں، امیروں، مترفوں، دانشوروں اور دین کے ٹھیکیداروں کا ہے کہ وہ اپنے میدان میں کسی دوسرے کو اپنا ہمسر و مقابل دیکھنا تو کجا سننا بھی گوارا نہیں کرتے تاکہ ان کی انفرادیت پر "دہم چنیں دیگرے نیست" پر کوئی آنچ و حرف نہ آسکے۔ علم و دانش، زہد و عبادت اور امیری و مرفہ الحالی کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان کے حاملین عجز و انکساری، محبت و رافت، سخاوت و فیاضی، حلم و مروت اور خدا کی ممنونیت اور شکر گذاری کا جذبہ ہوتا۔ لیکن ہم ان میں اخلاق حمیدہ کے بجائے تفاخر و حسد، رشک ضد، جاہ پرستی، حب مال، فضول گوئی قساوت قلبی خود غرضی و خدا کی ناشکری زیادہ پاتے ہیں۔ عجیب معاملہ ہے کہ اس دور میں غرور، جاہ پرستی حب مال اور بغض و حسد جیسے اخلاقی امراض سب سے زیادہ عالموں، دانشوروں، صوفیوں اور خوشحال و مطمئن لوگوں کے طبقے میں پائے جاتے ہیں۔

مقصد براری

پانچواں سبب مقصد براری ہے جسکی وجہ سے لوگ ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں۔ یہ بیماری ہم پیشہ میں زیادہ پائی جاتی ہے چنانچہ ہم آئے دن یہ دیکھتے ہیں کہ ایک شخص خود اپنے حقیقی بھائی سے صرف اس لئے حسد

کرتا ہے کہ وہ اپنے والدین کا نور نظر بن جائے۔ طلبہ آپسمیں ایک دوسرے سے اس لئے جلتے ہیں۔ تاکہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ اپنے استاد کا منظور نظر ہوجائے علی ہذالقیاس ندمار و مصاحبین، خطبار واعظین کا حال ہے کہ ہر شخص دوسرے سے محض اس لئے بغض رکھتا ہے تاکہ وہ اپنے حصول مقصد کیلئے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ بادشاہ اور عوام کا دل جیتنے میں کامیاب ہوجائے۔

خباثت نفس | خباثت کی وجہ سے آدمی بلاوجہ ہر اس شخص سے جلنے لگتا ہے جسکو اللہ تعالےٰ نے کوئی نعمت یا خوبی یا فضیلت عطا فرمائی ہے اس قسم کے لوگ دنیا میں بہت ہیں جن میں نہ جاہ طلبی ہے اور نہ ان میں کبر و غرور کا کوئی شائبہ اور نہ دشمنی بلکہ وہ اپنی خباثت نفس کی بنا پر اپنے بھائیوں کی پریشانی اور درد سے خوش اور ان کی خوشیوں سے کبیدہ خاطر و ملول ہوتے ہیں ایسے لوگوں کو شحیح کہا جاتا ہے جسکے معنی ہیں "دوسروں کے مال میں بخل کرنے والا کیونکہ یہ لوگ اپنے رب کریم کے بیکراں خزانوں سے بھی اپنی رذالت طبع و خباثت نفس کی بنا پر اس بات کے خواہشمند رہتے ہیں کہ اس سے حبہ بھر بھی کسی کو نہ ملے۔ اس حسد کا علاج تقریبًا ناممکن ہے۔ الا من یشاء اللہ

دردِ پنہاں

قافلہ زندگی کا گرم خرام — صبح امید، ناامیدی شام
بربط وقت پر نوا پرداز — خوگر زخم گردش ایام
پایۂ گل اور مایۂ پردار — گاہے خورشید گاہے ماہ تمام
تیغ بردوش برسر بیکار — نغمہ برلب شریک گردش جام

زندگی صرف پردہ دار نمو
آب آتش ز درد جام و سبو
کس نے لکھا جبین ہستی پر
آیۂ لا الٰہ اللہ ھو

دوسری قسط

مولوی عزیز اللہ اعظمی

فقہ اسلامی اور جدید مسائل کا حل

اقوال صحابہ

منجملہ دلائلِ شرعیہ کے صحابی کا قول بھی ایک دلیل شرعی ہے لیکن صحابہ کرام کے فتاوی و اقوال کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) ایسے تمام مسائل میں جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابی نے یہ مسئلہ اجتہاد و رائے سے اخذ نہیں کیا ہے بلکہ سماع سے حاصل کیا ہے یا یہ کہ صحابی کا قول، حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مستفاد ہے تو ایسی صورت میں صحابی کا قول سنت نبوی میں شامل ہوگا اور وہ سنت نبوی کی طرح بالاتفاق قابل اعتبار و اتباع ہوگا۔

(۲) دوسرے یہ کہ صحابی کا قول و فتوی اجتہاد و رائے پر مبنی ہو سنت نبوی سے مستفاد نہ ہو تو اس بارے میں علماء کا اتفاق ہے کہ یہ قول ان جیسے دوسرے صحابی کیلئے حجت نہیں ہے البتہ صحابہ کے علاوہ دوسرے مجتہدین کیلئے یہ کہاں تک قابل تسلیم ہے اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے لیکن یہ اختلاف درست نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ صحابی کا قول و فتوی خواہ مستفاد با سنۃ ہو یا مستفاد با لرائے بہر صورت حجت اور دلیل شرعی ہے۔

شمس الائمہ سرخسی علیہ الرحمہ نے تمام احوال میں اتباع صحابی کے وجوب کو ثابت کرنے کیلئے متعدد نقلی و عقلی دلائل پیش کئے ہیں بشرطیکہ وہاں کوئی نص معارض نہ ہو نقلی دلیل۔ ارشاد ربانی ہے۔

(۱) والسابقون الاولون من المهاجرين والانصار والذين اتبعوهم باحسان
(سورۃ توبہ)

خداوند کریم نے آیت ہذا میں مہاجرین وانصار صحابہ اور تابعین کی مدح فرمائی ہے الذین اتبعوھم میں لفظ موصول سے واضح ہو رہا ہے کہ تابعین کی ستائش کی وجہ اتباع صحابہ تابعین کی مدح وستائش سے یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جہاں نصوص کتاب وسنت موجود نہ ہوں وہاں صحابہ کی اطاعت کرنا چاہئے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ ان کے ذہنی نظریات کو تسلیم کیا جائے۔

عقلی دلائل (۲) صحابہ کرام کی صحبت وقربت میں اوروں کی بہ نسبت حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب تھے وہ نزول قرآن کے شاہد عدل تھے، انہوں نے بچشم خود وہ مقامات ملاحظہ کئے تھے جہاں قرآن اترا۔ وہ حضرات اپنی عقل سلیم اور حسن فہم کی بناء پر شریعت اسلامیہ کے مقاصد کو سب سے بہتر سمجھتے تھے وہ حضرات قرآن کریم کے معانی ومطالب اور منشاء رسول سے اوروں کی بہ نسبت زیادہ واقف تھے۔ لہٰذا جو کچھ بیان کرتے وہ شریعت اور منشاء رسول کے عین مطابق ہوتا تھا ایسی صورت میں ان کے اقوال کو ماننا از حد ضروری ہے۔

(۳) دوسری عقلی دلیل یہ ہے کہ اگر صحابہ کرام سے کوئی ایسی رائے منقول ہو جو مبنی بر قیاس ہو اور ادھر ہماری رائے بھی دوسرے قیاس پر مبنی ہو تو احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی رائے کی پیروی کیجائے حدیث نبوی ہے۔

خیر القرون قرنی الذین بعثت فیھم (مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۹) سب سے بہتر میرا زمانہ ہے جسمیں میں مبعوث کیا گیا ہوں۔

اب تک وہ بنیادی اصول بیان کئے گئے جو ائمہ اربعہ کے درمیان متفقہ طور پر مسلم ہیں اب ذیل میں وہ اصول بیان کئے جائیں گے جنکی تعریف، حجیت، مقدار اور ان کے دائرہ عمل میں اختلاف ہے ان میں بعض اصول کسی امام کے نزدیک حجت ہیں۔ اور کسی کے نزدیک حجت نہیں ہیں آگے ان کی تفصیل آرہی ہے۔

(۶) استحسان کی تعریف

حضرت امام ابوحنیفہؒ کا معمول تھا جب تک قیاس ٹھیک بیٹھتا اور اس میں کوئی قباحت نہ ہوتی قیاس کرتے جب قیاس حالات کے مطابق نہ ہوتا تو استحسان کرتے اور لوگوں کے تعامل کو پیش نظر رکھتے استحسان کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں لیکن سب سے اچھی تعریف علامہ ابوالحسن کرخی نے کی ہے جو یہ ہے۔

"استحسان اس چیز کا نام ہے کہ مجتہد ایک مسئلہ میں اس کے نظائر واشباہ کے مطابق حکم نہ لگائے بلکہ ایک قوی تر دلیل کی جانب رجوع کرے جو اشباہ ونظائر سے عدول کا تقاضا کرتی ہے"

المبسوط ص۱۴۵ج۱۰ میں استحسان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"استحسان کا معنی قیاس کو ترک کر کے ایسی چیز پر عمل کرنا ہے جو لوگوں کیلئے مفید ہے حاصل یہ ہے کہ عُسر کو چھوڑ کر یُسر کو اختیار کرنیکا نام استحسان ہے اور یہ دین اسلام کا ایک اہم اصول ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔ اللہ تمہارے ساتھ آسانی کا معاملہ کرتا ہے تنگی نہیں چاہتا ہے۔

استحسان اور مصالح مرسلہ میں فرق

استحسان اور مصالح مرسلہ میں فرق یہ ہے مصلحت مرسلہ اس کے ترک کرنے کو کہتے ہیں جس کے نفی واثبات پر کوئی خاص دلیل قائم نہ ہو اور اس کا مصلحت ہونا ہی دلیل ہو اس کے مقابلہ میں استحسان کا مفہوم یہ ہے کہ کسی جزئی مسئلہ میں جس پر ایک ایسی

دلیل کلی منطبق ہوتی ہو جو کتاب وسنت میں مذکور نہ ہو تو مصلحت کیلئے اس دلیل کلی کو ترک کر دیا جائے۔

استحسان کی حمایت

استحسان کی تعریف کے اختلاف کے باوجود ائمہ ثلٰثہ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ نے اسکی حمایت کی ہے اور اسے ان معتبر اور مستند دلائل میں شامل کیا ہے جن کے ذریعہ شرعی احکام معلوم ہوتے ہیں مگر یہ حضرات استحسان کا وہ مفہوم مراد نہیں لیتے ہیں جو امام شافعی علیہ الرحمہ نے بیان کیا ہے کیونکہ ایسے مفہوم کا کوئی قائل نہیں ہے کہ استحسان کا مفہوم یہ ہے کہ عدم دلیل کے بغیر شریعت کی کوئی بات بیان کیجائے۔

مسائل استحسان اس کثرت سے ہیں جس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ اصول شریعت کے بنیادی اصولوں کے مقاصد سے الگ نہیں ہے بلکہ اس میں ان اصولوں سے انجام اور ان کے لوازم پر نظر رکھی جاتی ہے اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ مصلحت انسانی کے انجام کو پیش نظر رکھا جائے اور عام خرابیوں کے انسداد کی طرف اس وقت خصوصی توجہ مبذول کیجائے جب کہ عام اصولوں کی لفظی پابندی کیوجہ سے یہ منشار پورا نہ ہوتا ہو ورنہ اگر ہم ہر وقت عام اصولوں کو پیش نظر رکھیں تو مصلحت بینی کا مقصد فوت ہو جائے۔

استحسان حنفیہ کے نزدیک

حنفیہ کے نزدیک استحسان نص شرعی کتاب وسنت۔ اجماع یا قیاس اور شریعت کے عام اصولوں سے خارج نہیں ہے بلکہ اسلام کے عام اصول وقواعد کے ماتحت ہے مثلاً عام اصول اسلامی یہ ہیں:-

(۱) لا ضرر و لا ضرار ترجمہ نہ خود نقصان اٹھاؤ اور نہ کسی کو نقصان پہونچاؤ۔

(۲) الضرورات تبیح المحظورات ترجمہ ضرورت و مجبوری ممنوع چیز کو مباح کر دیتی ہے۔

(۳) انما المشقۃ تجلب التیسیر ترجمہ مشقت آسانی مہیا کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مشہور حنفی عالم علامہ ابوبکر الجصاص فرماتے ہیں۔

"جن معاملات میں ہمارے علماء استحسان کے قائل ہوتے ہیں وہ سب دلائل اور اصول پر مبنی ہیں ان میں سے کسی چیز میں انکی خواہش اور ذاتی رجحان نہیں پایا جاتا"

اس قول کی مزید وضاحت کیلئے ہم یہ کہتے ہیں کہ حنفیہ کے نزدیک استحسان کا اطلاق اس دلیل پر ہوتا ہے جو قیاس جلی کے مخالف ہو بالعموم حنفی علماء استحسان کا اطلاق قیاس خفی پر کرتے ہیں اسے استحسان کے نام سے اس لئے موسوم کرتے ہیں کہ انھوں نے قیاس حنفی کے مقابلہ میں قیاس جلی کو چھوڑنا مستحسن سمجھا۔

استحسان کے اقسام

مذکورہ بالا تعریف کے مطابق احناف کے نزدیک استحسان کی دو بڑی قسمیں ہیں:-

(۱) استحسان القیاس (۲) استحسان خلاف القیاس

استحسان القیاس

یہ قسم وہ قیاس حنفی ہے جس کے اثرات اسقدر زبردست ہوں کہ وہ اپنے مخالف قیاس جلی پر غالب آجائے تاہم وہ قابل ترجیح قیاس شرعی کے دائرہ سے باہر نہیں ہوتا ہے اس کی صورت یوں ہوتی ہے کہ کبھی کسی فرعی مسئلہ کی دو اصولوں کے ساتھ کشمکش برپا ہوتی ہے اور ہر ایک سے اس کا کچھ نہ کچھ تعلق ہوتا ہے آخر کار کسی خاص نکتہ کی بناء پر اسے کسی ایک اصول کے ساتھ شامل کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح استحسان کا یہ طریقہ بہت پیچیدہ بن جاتا ہے کیونکہ اس صورت میں مجتہد کو بہت غور و فکر اور دقت سے کام لینا پڑتا ہے اس کے بعد ہی کسی ایک اصول کو ترجیح دیکر فرعی مسئلہ کو اس کیساتھ شامل کرنا پڑتا ہے۔

استحسان خلاف قیاس کی تین قسمیں ہیں

(۱) استحسان النص (۲) استحسان الاجماع (۳) استحسان الضرورت

(۱) استحسان النص

وہ استحسان جو نص شرعی کے ذریعہ ثابت ہو حنفی علماء نے

اسکی کئی مثالیں دی ہیں ان میں سے ایک (۱) بیع سلم ہے کیوں کہ اس میں معدوم اور غیر موجود چیز کو پیشگی قیمت لے کر فروخت کیا جاتا ہے قیاس کی رو سے ایسی بیع ممنوع ہے لیکن حدیث شریف کی رو سے قیاس کے خلاف اسکی اجازت دی گئی ہے۔

(۲) اسی طرح اگر کوئی روزے کی حالت میں بھول کر کھا پی لے تو حدیث پاک کی رو سے روزہ نہیں ٹوٹتا حالانکہ قیاس کی رو سے روزہ ٹوٹ جانا چاہیئے۔

(۲) استحسان الاجماع قیاس کو عام تعامل کیوجہ سے ترک کر دیا جائے اسکی مثال بیع استصناع ہے جیساکہ بالعموم یہ طریقہ لوگوں میں رائج ہے آدمی کاریگر سے یہ کہتا ہے کہ میرے لئے موزے یا برتن یا فلاں چیز بنا دو وہ شخص کام کی نوعیت، مقدار اور اسکی صفات سب سمجھا دیتا ہے قیاس کی رو سے یہ بیع جائز نہیں ہونی چاہیئے، کیونکہ یہ معدوم شے کی بیع ہے لہٰذا قبل از وقت خرید و فروخت نہیں ہونی چاہیئے۔ مگر چونکہ لوگوں کی ضروریات اس کے بغیر ممکن نہیں ہیں۔ اس لئے اجماع امت کے فیصلہ سے یہ معاملہ جائز ہے ایسے احکام کو استحسان الاجماع کہتے ہیں۔

(۳) استحسان الضرورت اسکی مثال یہ ہے کہ جب کنواں ناپاک ہو جائے تو اس کے پانی کا کچھ حصہ نکال لیا جائے تو کنواں پاک ہو جاتا ہے جیساکہ کتب فقہ میں یہ مسئلہ مذکور ہے مگر قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ جب کنواں ناپاک ہو جائے تو وہ پاک نہیں ہو سکتا کیونکہ پانی ڈالکر نہ تو اس کو پاک کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ تو پورا پانی نچوڑ کر نکالا جا سکتا ہے تاکہ اس کی پوری نجاست دور ہو جائے بلکہ کنویں کے سوتوں سے جو پانی آتا ہے وہ بھی نجس پانی سے مل کر ناپاک ہو جاتا ہے اس لئے پانی کا کچھ حصہ نکالنے سے باقی ماندہ پانی کی صفائی نہیں ہو سکتی تاہم عوام کی ضرورت کو رفع کرنے کیلئے استحسان کے اصول کو اختیار کیا گیا۔

(۷) مصالح مرسلہ

یہ وہ اصول ہیں، جنکی تائید و تردید میں کوئی متعین شرعی قاعدہ نہیں ہوتا۔ ان کے ذریعہ شرعی.

مقاصد کی حفاظت کی جاتی ہے جنکا علم کتاب وسنت یا اجماع سے حاصل ہوتا ہے مگر یہ کسی مقرر اصول پر مبنی نہیں ہوتے ہیں ان کا پتہ قرائن حالات دیگر علامات سے چلتا ہے اس لیئے ان مصالح کو مرسلہ کہتے ہیں کیونکہ اس سے متعلقہ احکام کسی معین دلیل کی پابندی سے آزاد ہوتے ہیں بلکہ ان کے ذریعہ کسی بڑی مصلحت کی تکمیل ہوتی ہے یا بہت بڑے فتنہ وفساد یا شدید ضرر کا ازالہ کیا جاتا ہے یا شریعت کے اغراض ومقاصد مصالح عامہ اور انصاف اور ان بنیادی اصولوں کی تکمیل پیش نظر ہوتی ہے جنکی وجہ سے شریعت کا وجود عمل میں لایا گیا ہے۔

مصالح مرسلہ کے بارے میں علماء کا اختلاف

مصالح مرسلہ کو قابل عمل اور حجت تسلیم کرنے اور شرعی اصول تسلیم کرنے میں علماء کا اختلاف ہے اس بارے میں چند اقوال منقول ہیں:۔

(۱) جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ یہ شرعی حجت نہیں ہے اور تمام حالات میں اسکی پابندی نہیں کیجا سکتی۔

(۲) بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ یہ کسی شرعی اصول کے موافق ہوں تو اس صورت میں ان پر شرعی احکام کی بنیاد قائم کی جا سکتی ہے اور اگر یہ کسی شرعی اصول کے موافق نہ ہوں تو ان سے احکام استنباط کرنا جائز نہ ہوگا۔ یہ قول امام الحرمین نے امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے اکثر اصحاب کی طرف منسوب کیا ہے کہ وہ اس صورت میں مصالح مرسلہ کو جائز قرار دیتے ہیں۔ جب کہ وہ شرعی اصول کی موافقت کر سکیں۔

(۳) امام غزالیؒ اور ان کے اصحاب کی یہ رائے ہیکہ مصالح مرسلہ اس وقت شرعی حجت بن سکتے ہیں جب ان میں یہ تین اوصاف موجود ہوں یعنی وہ اوصاف (۱) ضروری (۲) قطعی (۳) اور کلی ہوں اگر ان میں کوئی وصف موجود نہیں ہوگا تو قابل اعتبار نہیں سمجھے جائیں گے اوصاف ضروریہ کا مفہوم یہ ہے کہ ان کا تعلق ان پانچ ضروری بنیادوں پر ہو جن پر شرعی احکام کا دارومدار ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ شرعی احکام پانچ بنیادوں کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) مذہب (۲) جان (۳) مال (۴) نسل (۵) عقل۔

لہٰذا اگر ہم شریعت کے احکام و مسائل پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انھیں پانچ چیزوں پر شرعی احکام گردش کرتے ہیں۔

اوصاف ضروریہ سے مراد یہ ہیکہ ان کا تعلق تمام مسلمانوں سے ہو اگر کسی مصلحت کا تعلق کچھ مسلمانوں سے ہو اور کچھ سے نہ ہو یا ایک حالت میں ہو اور دوسری حالت میں نہ ہو تو جائز نہیں ہے امام غزالیؒ نے مذکورہ بالا تینوں اوصاف کی جامع مثال یہ پیش کی ہے "کافروں نے مسلمان قیدیوں کو جنگ میں ڈھال بنا کر آگے اس طرح کھڑا کر دیا کہ اگر ہم ان مسلمان قیدیوں کو بچانے کیلئے ان سے جنگ نہیں کرتے ہیں تو کفار ہم سے جنگ کر کے ہمارے دارالاسلام پر قابض ہو جائیں اور مسلمانوں کا قتل عام کریں گے۔ لیکن اگر ہم جنگ کریں تو پہلے ہم بے گناہ مسلمان قیدیوں کو قتل کریں گے اس صورت میں عام مصلحت کا تقاضہ یہی ہے کہ ہم جنگ کریں خواہ چند معصوم مسلمان قتل ہو جائیں کیونکہ شریعت کا مقصد یہ ہے کہ یا تو خون ریزی بالکل نہ ہو یا کم از کم خون ریزی ہو اور یہ مقصد کافروں سے جنگ کرنے میں پورا ہوتا ہے کیونکہ اگر ہم جنگ کرنے سے باز رہ گئے تو مسلمانوں کو قتل کرنیکے بعد ان مسلمان قیدیوں کو بھی قتل کر ڈالیں گے جنگ کی صورت میں اگر ہم خون ریزی بالکل بند نہیں کر سکیں تو کم از کم خون ریزی میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لہٰذا یہ ایسی مصلحت ہے جسمیں ایک شرعی ضرورت کا لحاظ رکھا گیا ہے اگر اگر عام مصلحت نہ ہو تو اسکا اعتبار نہیں کیا جائے گا اگر مصلحت غیر ضروری ہو غیر قطعی ہو تو وہ بھی قابل عمل نہیں ہے مثلاً کفار ایسے قلعہ میں محصور ہو کر کسی مسلمان کو ڈھال بنا کر آگے کر دیں جسکا فتح کرنا ضروری نہ ہو جنگ کی صورت میں ہمیں فتح کرنیکی قطعی امید نہ ہو یا بصورت عدم جنگ میں کفار کے تسلط پر شک و شبہ ہو تو ان تمام حالات میں ان مسلمانوں پر حملہ کرنا جائز نہیں ہے جنہیں دشمن نے قلعہ میں بیٹھ کر ڈھال بنا رکھا ہے۔

امام مالک کی رائے گرامی

حضرت امام مالکؒ کی رائے یہ ھیکہ مصالح مرسلہ پر عمل کرنا اور ان کے ذریعہ شرعی احکام معلوم کرنا جائز ہے اور حضرت امام موصوف عام خرابیوں اور نقصانات کا ازالہ کرنے کیلئے بھی اس اصول پر عمل کرتے تھے۔ گم شدہ مرد کی بیوی کے بارے میں حضرت امام مالکؒ نے ایسی

ہی مصلحتوں کے پیش نظر فتویٰ دیا ہے یعنی اگر مرد کی موت وزیست کے بارے میں کوئی علم نہ ہو اور بیوی کئی سال تک انتظار کی زحمت برداشت کرچکی ہو تو اس صورت میں امام مالکؒ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے پر عمل کیا ہے گم شدہ مرد کی بیوی کیلئے جائز ہے کہ اس کی گمشدگی کی خبر کے چار سال کے بعد نکاح ثانی کرے اس مسئلہ میں اسکی بیوی کی بھلائی کو ترجیح دی گئی ہے اور معاشرہ کے فتنہ وفساد کو دور کیا گیا ہے۔

(۸) عرف وعادت

حضرت امام ابو حنیفہؒ کا استنباط احکام کے باب میں معمول یہ تھا کہ جب تک لوگوں کے معاملات قیاس سے کام لینے میں درست رہتے آپ سب امور اس کے مطابق جاری رکھتے تھے۔ جب قیاس میں کوئی قباحت دیکھتے تو معاملات کو استحسان کے مطابق حل کرتے جب تک کہ استحسان کام دیتا رہتا لیکن جب اس کا امکان بھی نہ ہوتا تو لوگوں کے تعامل کیطرف رجوع کرتے اس سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے (۱) پہلی بات یہ کہ جب نص نہ ہوتی تو آپ لوگوں کے امور کو قیاس واستحسان کی روشنی میں حل کرتے پھر ان دونوں میں سے جو زیادہ امن وسلامتی پر مبنی ہوتا اور حالات وشرعی مقاصد سے زیادہ قریب ہوتا اسے اخذ کرتے۔ (۲) دوسری بات یہ ہے جب کسی مسئلہ میں قیاس واستحسان سے کام نہ چلتا تو لوگوں کے تعامل کو دیکھتے۔

تعامل سے مراد وہ عرف ہے جو لوگوں میں عام طور سے جاری ہو۔ آپ عرف پر اس وقت عمل کرتے جب کتاب وسنت۔ اجماع امت میں سے کوئی دلیل موجود نہ ہوتی نہ قیاس واستحسان پر محمول کرنیکا کوئی امکان ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ آپ عرف کو ایک شرعی قاعدہ کی حیثیت دیتے تھے اور جب

کوئی دلیل نہ ہوتی تو اس کی طرف رجوع فرماتے تھے۔

عرف کا ثبوت عرف کے دلیل شرعی ہونیکا ثبوت حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس قول سے ملتا ہے۔

ماراٰہ المسلمون حسناً فھو عند اللّٰہ حسنٌ۔ جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھتے ہوں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔

اس قول کی عبارت اور مفہوم سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے عرف عام میں جس چیز کو امور حسنہ میں سے خیال کیا جاتا ہو وہ بلاشبہ حسن ہے اور نیز عرف عام کی مخالفت کرنے میں حرج اور دشواری پائی جاتی ہے حالانکہ اللہ تعالے کا ارشاد ہے۔

ماجعل علیکم فی الدین من حرج (سورہ حج) ہم نے دین میں تمہارے لئے تنگی نہیں پیدا کی۔

عرف کی تعریف المستصفی میں ہے " جو بات عقلی اعتبار سے ذہن میں راسخ ہو اور طبائع سلیمہ کے یہاں قابل قبول ہو اسے عرف وعادت کہتے ہیں۔

شرح التحریر میں لکھا ہے۔" عادت نام ہے کسی چیز کے عقلی رابطہ کے بغیر بار بار کیے جانے کا"

حضرت العلامہ ابن عابدینؒ نشر العرف میں لکھتے ہیں:

" عادت کا لفظ معاودت سے ماخوذ ہے تکرار و اعادہ کی وجہ سے ایک بات نفوس وعقول میں راسخ ہو جاتی ہے اور کسی تعلق اور قرینہ کے بغیر عام طور سے قبول کیجاتی ہے اور اس طرح وہ حقیقت عرفیہ بن جاتی ہے۔ مصداق کے اعتبار سے عادت و عرف ایک ہی چیز ہے گرچہ مفہوم کے اعتبار سے مختلف ہے"

ایک شبہ کا ازالہ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جب علماء کرام یہ کہتے ہیں کہ عرف اصول استنباط میں سے ایک اصول ہے۔ تو اس

ں مراد یہ ہوتی ہے کہ جہاں قرآن وسنت کی دلیل نہ ہو وہاں عرف پر عمل
جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ عرف عام. قرآن وسنت کے خلاف
ہن حدیث عرف شریعت کی نظر میں مقبول ومحبوب ہوگا ہرگز نہیں بلکہ ایسا
شریعت کے نزدیک مردود ہوتا ہے۔

عرف عام. آثار کے مقابلہ میں بھی نہیں ٹھہر سکتا ہاں اسمیں اختلاف ہے کہ
ت عام. قیاس کا مقابلہ کرسکتا ہے کہ نہیں. حضرت العلامہ ابن عابدینؒ لکھتے
: " اگر دلیل یعنی نص کا حکم عام ہو اور اس کے بعض افراد میں عرف اس کے خلاف
یا دلیل قیاس ہو تو عرف کا اعتبار کیا جائے گا. بشرطیکہ وہ عرف عام ہو کیونکہ
ف عام. مخصص ہوسکتا ہے اور اس سے قیاس کو ترک کیا جا سکتا ہے جیسا کہ
سئلہ استصناع میں ہے.

عرف عام سے مراد

وہ عرف عام جو امام ابو حنیفہؒ اور صاحبین کے نزدیک حجت شرعی ہے اور مخصص آثار وناسخ قیاس ہے سے
ر وہ عرف ہے جسمیں لوگوں کا عام طور سے تعامل جاری ہو کہ اگر عرف کا اعتبار
کیا جائے تو لوگ مشقت اور پریشانی میں مبتلا ہو جائیں. عرف زمانہ ومکان کے
اتھ خاص نہیں ہے. وقت کے ساتھ اس میں تغیر آتا رہتا ہے اس لئے ضروری
ہیں کہ وہ عرف زمانہ صحابہ سے لے کر آج تک برابر موجود ہو.

عرف عام وخاص

عرف عام کے مقابلہ میں عرف خاص ہے یعنی ایک شہر کا عرف ایک قوم کا عرف، عرف خاص. مطلقاً نص کا مقابلہ نہیں
رسکتا خواہ نص خاص ہو یا عام. البتہ عرف خاص اس قیاس کے راستہ میں مزاحم
جاتا ہے جسکی علت قطعی نہ ہو یا جو قیاس. وضاحت کے اعتبار سے نص کا مشابہ
د عرف خاص صرف اسی شہر پر چسپاں ہوگا جنکا وہ عرف ہو اور دوسرے شہروں پر
فذ نہیں ہوگا. تاہم عرف عام ہر لحاظ سے مخالف نص ہو تو اسے ناقابل التفات
سمجھ کر ترک کر دیا جائے گا. ایسے ہی عرف خاص کے مقابلہ میں قیاس ظنی العلت کو

چھوڑ دیا جائے گا۔

عرف عام کے بدلنے سے فقہی احکام میں تغیر

عرف عام. نص کی عدم موجودگی میں دلیل کا کام دیتا ہے بلکہ ان بعض ظنی آثار کا مخصص بھی ہوتا ہے جنکی بعض صورتیں اس عرف عام کے منافی ہوتی ہیں جن پر تمام عالم کے مسلمان عامل ہیں۔ عرف عام پر عامل ہونیکی بناء پر ہی مذہب حنفی میں سہولت و خوشگواری اور قوت پائی جاتی ہے حنفی اہل تخریج حضرات نے فروعات فقہیہ میں اسے پیش نظر رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ حنفی میں جدت کی صلاحیت پیدا ہو گئی اور یہ فقہ اس قابل ہو گئی کہ تمام زمانوں میں لوگوں کے حالات اور ضروریات اور عرف کا ساتھ دے سکے۔

چنانچہ بعد میں آنے والے ائمہ مجتہدین سابقہ کے اجتہادات پر ٹھہر ہی نہیں گئے بلکہ نص کی عدم موجودگی کیصورت میں اسے عرف عام کے تابع کر دیا یعنی جب ثابت ہو جائے کہ مذہب حنفی کی صحیح روایات کے مطابق جو حکم صادر کیا گیا ہے وہ عرف عام کے مخالف کتاب وسنت یا کسی صریح دلیل پر مبنی نہیں ہے تو حنفی مفتی کو یہ حق حاصل ہے کہ مذہب کی صریح روایات کی خلاف ورزی کرے۔ ایسا کرنے والا مذہب حنفی سے خروج کرنے والا نہیں کہا جائے گا۔

حضرت العلامہ ابن عابدین لکھتے ہیں :۔

فقہی مسائل یا تو صریح نص سے ثابت ہوتے ہیں. یہ پہلا درجہ ہے یا قیاس واجتہاد سے ثابت ہوتے ہیں بہت سے مسائل زمانہ کے تغیر سے بدل جاتے ہیں کیونکہ اہل زمانہ کا عرف وہ نہیں رہتا یا کوئی نئی ضرورت پیش آجاتی ہے یا اہل زمانہ میں فساد رونما ہو جاتا ہے لہٰذا اگر سابقہ احکام باقی رہیں تو اس سے ضرر اور مشقت کا اندیشہ ہے۔

عرف اور دلائل شرعیہ میں اختلاف اور تضاد کی صورتیں

عرف اور دلائل شرعیہ میں اختلاف کی عموماً تین صورتیں ہوتی ہیں :۔

(۱) ایک یہ کہ عرف کتاب وسنت کے کسی خاص حکم سے ٹکراتا ہو۔
(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ عرف اور کسی عام حکم شریعت میں تعارض ہو رہا ہو
(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ عرف اور اجتہاد فقہاء میں تضاد پیدا ہو رہا ہو۔

نص خاص اور عرف میں ٹکراؤ کی صورت

وہ اعراف وعادات جن سے شریعت نے یا تو صراحۃً روک دیا ہے یا شریعت کے منشاء کے مطابق ممنوع ہونا چاہیئے مثلاً زمانہ جاہلیت میں تبنی یا بیع منابذہ وغیرہ کا رواج تھا جسے قرآن وسنت نے منع کر دیا تو ایسے تمام اعراف وعادات کی شریعت میں کوئی قیمت نہیں ہے کیونکہ عرف ونص کے تصادم میں دو ہی صورت ہوگی ایک یہ کہ عرف پر عمل کیا جائے اور نص کو ترک کر دیا جائے ظاہر ہے اگر نص کو ترک کر کے عرف پر عمل کیا جائے تو شرعی احکام کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ علامہ شامیؒ اس صورت حال کے بارے میں لکھتے ہیں:

اذا خالف العرف الدلیل الشرعی فان خالفہ من کل وجہ بان لزم منہ ترک النص فلا شک فی ردہ کتعارف الناس کثیرا من المحرمات من الربوا وشرب الخمر ولبس الحریر والذھب وغیر ذالک مما ورد تحریمہ نصا۔

(نشر العرف ص۱۱۶)

اگر عرف اور دلائل شرعیہ میں من کل الوجوہ مخالفت ہو یعنی عرف پر عمل کرنے سے نص کا ترک لازم آتا ہے تو اس عرف کے رد کرنے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ جیسے لوگ بہت سے محرمات سود، شراب نوشی، ریشمی کپڑوں اور سونے کے استعمال کے عادی ہو جاتے ہیں۔ تو ایسے محرمات جنکی حرمت نص سے ثابت ہو وہ قابل ترک ہیں۔

نص اور عرف عام میں تعارض

اگر کسی عام منصوص حکم اور عرف میں تعارض یا تضاد پیدا ہو جائے تو عرف کو ترجیح دینے کی کئی صورتیں ہیں۔ سب سے پہلے تو دیکھنا ہوگا کہ جس وقت وہ منصوص حکم

دیا گیا وہ عرف اسوقت موجود تھا یا نہیں یعنی فقہاء کی زبان میں یہ عرف "العرف المقارن" ہے یا "العرف المتأخر" یا "الحادث بعد النص" ہے فقہاء نے پہلے عرف کی کچھ صورتوں کا اعتبار کیا ہے اور دوسرے کا نہیں کیا ہے۔ علامہ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں:

العرف الذی تحمل علیہ الالفاظ انما هو المقارن السابق دون المتأخر	جس عرف پر الفاظ محمول کئے جاتے ہیں وہ عرف مقارن ہے نہ کہ عرف متأخر۔

(الاشباہ ص۸۶)

العرف المقارن وہ عرف جو ورود نص کے وقت موجود تھا اسکی دو صورتیں ہیں (۱) عرف لفظی (۲) عرف عملی

عرف لفظی اگر عرف لفظی ہے تو شریعت میں اس کا اعتبار کیا جائے گا یعنی شریعت کے عام حکم کو اسی عرف کی روشنی میں سمجھا جائے گا۔ بشرطیکہ کوئی قرینہ عرف کی حدود سے باہر ہو جانے کا موجود نہ ہو اگرچہ لغوی معنی عرفی معنی سے وسیع کیوں نہ ہو مگر منصوص حکم کے عرف کی تعیین عرف ہی کی روشنی میں کیجائے گی۔ لغت کے معنی کو نظر انداز کر دیا جائے گا کیونکہ مخاطب کی زبان اس وقت عرف ہی ہوتی ہے البتہ اگر کوئی قرینہ ایسا موجود ہو کہ شریعت کے حکم کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع یا محدود ہے جتنا معاشرہ میں رائج ہے تو پھر عرف کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔ فاذا کان الشرع یقتضی الخصوص واللفظ یقتضی العموم اعتبرنا خصوص الشرع۔

عرف عملی اگر نص عام معارض عرف لفظی نہیں بلکہ عرف عملی ہے تو اس کے قابل اعتبار ہونے کے سلسلے میں فقہاء کی رائیں مختلف ہیں کہ اس سے نص عام میں تخصیص پیدا ہو سکتی ہے یا نہیں اگر وہ بالکل نص کے خلاف ہے تو اس کے بارے میں یہ حکم ہے التعامل بخلاف النص لا یعتبر (الاشباہ ص۱۰۶) نص کے خلاف کوئی تعامل قابل اعتبار نہیں ہے۔

نص عام اور عرف خاص

اگر نص عام اور عرف خاص میں تعارض ہو تو حنفی علماء کے نزدیک عرف خاص کا کوئی لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ عرف عام کے ذریعہ تخصیص وتبیین کی اس لئے اجازت دی گئی ہے کہ یہ شارع کا منشاء بھی ہے اور ایک ضرورت عامہ بھی ہے لیکن عرف خاص کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے اگر عرف خاص کو تخصیص وتبیین کی اجازت دے دی جائے تو شرعی احکام کھیل بن جائیں گے۔

حضرت العلامہ ابن عابدینؒ اور علامہ ابن نجیم مصریؒ دونوں نے اس کی وضاحت کی ہے علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں۔

والحاصل ان المذهب عدم اعتبار العرف الخاص (الاشباہ ص۱۳۲)	خلاصہ یہ ہے کہ مذہب حنفی میں مفتی بہ قول یہ ھیکہ عرف خاص کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

ازحضرت العلامہ ابن عابدینؒ رقمطراز ہیں۔

وان کان العرف خاصًا فانه لایعتبر وهوالمذهب ص۱۱۶۔	مذہب حنفی یہ ہے کہ اگر عرف خاص ہو تو اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

استصحاب الحال

استصحاب الحال کی تعریف اسمیں علماء کا اختلاف

اسکی چند تعریفیں کی گئیں ہیں۔ (۱) بعض علماءؒ نے یہ تعریف کی ہے "اگر کوئی تسلیم شدہ معاملہ نزاع ہو جائے تو اس کے برقرار رہنے کا فیصلہ کرنا۔ (۲) دوسری تعریف یہ ھیکہ تسلیم شدہ شئے کو ہمیشہ مسلم الثبوت رکھا جائے یا جو موجود نہ ہو اسکی نفی کیجائے۔

علامہ شوکانیؒ نے اسکی وضاحت اس طرح کی ہے" اسکا مفہوم یہ ہے کہ،

اگر کوئی معاملہ گذشتہ زمانہ میں ثابت ہوجائے تو اصولی طور پر وہ زمانہ مستقبل میں بھی اسی طرح برقرار رہے گا۔

یہ لفظ مصاحبت سے ماخوذ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ جوں کا توں رہے جب تک کہ کوئی دوسری چیز آکر اسے تبدیل نہ کردے اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ استصحاب الحال حالتِ اثبات یا حالت نفی میں بھی ہوتا ہے اور موجود یا معدوم میں بھی ہوتا ہے اگر کوئی معاملہ زمانہ ماضی میں ہو تو وہ زمانہ حال میں بھی برقرار رہتا ہے لیکن بعض حنفی علمار نے جن میں مصنف عنایہ شارح ہدایہ بھی شامل ہیں۔ استصحاب کی یہ تعریف کی ہے۔

" اگر کوئی معاملہ کسی وقت بھی ثابت ہوجائے تو اسے دوسرے وقت میں بھی تسلیم کیا جائے گا۔"

اس تعریف کی بنار پر استصحاب کا مفہوم زمانہ ماضی کے ثبوت تک محدود نہیں ہے اسے زمانہ حال میں بھی برقرار رکھا جائے گا۔

بعض علمار کے نزدیک اسکی دو قسمیں ہیں:-

(۱) جو شے زمانہ ماضی میں تسلیم شدہ ہے وہ زمانہ حال میں بھی تسلیم شدہ رہیگی مثلاً اگر کوئی آدمی گم ہوجائے اور یہ نہ معلوم ہو کہ وہ زندہ ہے یا مردہ اسکے زمانہ ماضی کی زندگی کے حقوق زمانہ حال میں بھی برقرار رکھے جائیں۔ یہ سب کچھ استصحاب کے اصول کے مطابق ہوگا۔ لہذا جب تک اسکی وفات کا حکم نہ دے دیا جائے اس وقت تک اس کا مال وارثوں میں تقسیم نہیں ہوگا۔

(۲) جو چیز فی الحال ثابت ہوجائے تو زمانہ ماضی کے لئے بھی اس کا ثبوت برقرار رہے گا۔ اسکی مثال یہ ہیکہ اگر کوئی عیسائی شوہر مرجائے اس کے بعد اسکی مسلمان بیوی آکر یہ دعویٰ کرے کہ میں اس کی موت کے بعد مسلمان ہوئی تھی تاکہ یہ کہہ کر وہ اپنے شوہر کی وارث بن سکے لیکن اس کے دیگر ورثار یہ کہیں کہ تو اس کی موت سے پہلے مسلمان ہوئی تھی یہ کہہ کر وہ اسے میراث سے محروم کرنا چاہیں تو ایسی صورت

میں وارثوں کا قول تسلیم کیا جائے گا اور اس عورت کی تصدیق اس وقت کیجائے گی جب وہ اپنے دعوئی کے ثبوت میں گواہ پیش کرے کیونکہ یہ میراث سے محرومی کا سبب فی الحال ثابت ہے لہٰذا حال کے مطابق ماضی کے معاملہ میں بھی فیصلہ ہوگا اس قسم کو استصحاب المقلوب کہتے ہیں۔

استصحاب الحال حنفیہ کے نزدیک

احناف کے نزدیک استصحاب کا اصول کسی حق کو زائل کرنے کیلئے حجت ہے اور استقرار حق کیلئے حجت نہیں ہے یعنی اس کے ذریعہ کسی حق کو ثابت نہیں کیا جا سکتا ہے اور نہ اسے فریق مخالف کے سامنے حق حاصل کرنے کیلئے پیش کیا جا سکتا ہے یہ وہ رائے ہے جسے علامہ ابوزید، شمس الائمہ سرخسی اور فخر الاسلام بزدوی نے قابل ترجیح سمجھا ہے۔

حاصل یہ کہ حنفیہ کے نزدیک اصول فقہ میں اسے کمزور دلیل کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔

استصحاب کے اقسام

اس کی چند قسمیں اور صورتیں ہیں بعض میں علماء کا اتفاق ہے اور بعض میں اختلاف ہے۔

اہم اقسام درج ذیل ہیں:۔

(۱) استصحاب العدم الاصلی جیسے ان باتوں سے بری الذمہ ہونا جن کا ثبوت شریعت میں موجود نہ ہو جیسے چھٹی نماز فرض نہیں ہے۔

(۲) استصحاب عقلی و شرعی اس کا تعلق ان مسائل سے ہے جنہیں عقل و شریعت نے ہمیشہ کیلئے ثابت کر دیا ہو جیسے نکاح ثابت ہونے کے بعد بیوی ہمیشہ کیلئے حلال ہو جاتی ہے یہ قسم بھی قابل حجت اور عمل ہے جب تک کہ اس کے خلاف کوئی چیز ثابت نہ ہو جائے یا اس کے متضاد کوئی چیز موجود نہ ہو۔

(۳) استصحاب دلیل اس میں اسباب کا احتمال ہے کہ کوئی اور مخالف ثبوت آکر اسکی تخصیص کر دے یا اسے منسوخ کر دے یہ بھی متفقہ طور پر قابل عمل ہے۔

غیر فانی شریعت خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر آپ فقہ اسلامی کے ان اصولوں پر غور و فکر سے کام لیں جنہیں ہم بیان کر چکے ہیں یعنی کتاب وسنت، اجماع، قیاس، استحسان، مصالح مرسلہ اور عرف و عادت وغیرہ اور ان اصولوں کا دوسری شریعت سے مقابلہ کریں تو یہ واضح ہو جائے گا کہ اسلامی شریعت کا دائرہ بہت وسیع ہے وہ نہ صرف عدل و انصاف کی حامی ہے بلکہ امن و امان اور عوام کی بھلائی کے ذرائع بھی اس میں بافراط مہیا کئے گئے ہیں اور نیز یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ قیاس و اجتہاد اور استحسان و عرف و عادت وغیرہ شریعت کے بنیادی اصول ہیں ان اصولوں کے ذریعہ شریعت اسلامیہ ہمیشہ تر و تازہ ہوتی رہے گی۔

وباللہ التوفیق

قسط ۴

منطق وفلسفہ ایک علمی وتحقیقی جائزہ

(مولانا اطہر حسین قاسمی بستوی)

معقولات نصاب تعلیم میں موجودہ درس نظامی منطق وفلسفہ کی بہت سی کتابوں کا اضافہ بغیر کسی غور وفکر کے محض، اتفاقیہ طور پر ہوگیا ہے اور عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ کتابیں ابتداہی سے درس نظامی میں موجود ہیں۔ ملا نظام الدین سہالوی رح کے بعد منطق میں رسالہ میر زاہد کا حاشیہ غلام یحییٰ قاضی مبارک کی شرح سلّم، ملا مبین کی شرح مسلّم اور ملا حسن کی شرح سلّم کا اضافہ ہوا اور بعض مدارس میں بحر العلوم کی شرح سلّم، ملا حمداللہ کی شرح سلّم، میر زاہد کا حاشیہ بحر العلوم اور میر زاہد کا حاشیہ ملا مبین کا اضافہ ہوا۔

اس اضافہ کی تاریخ بہت دلچسپ ہے مولانا مفتی محمد فاروق چڑیا کوٹی اپنے استاد مفتی محمد یوسف سے نقل کرتے ہیں کہ ان کے بچپن میں شرح سلّم علی العموام رائج نہیں تھی، بلکہ قاضی مبارک کے شاگرد مولوی مدن وغیرہ اپنے شاگردوں کو سلّم کے ساتھ شرح سلّم قاضی مبارک بھی پڑھاتے تھے اور ملا حسن کے شاگرد شرح سلم ملا حسن پڑھاتے تھے اور بحر العلوم کے خاندان میں شرح سلم بحر العلوم چلتی تھی اور حمداللہ کے تلامذہ اپنے استاد کی شرح سلم حمداللہ پڑھاتے تھے، پڑھانے میں ایک دوسرے پر نوک جھونک بھی ہو جایا کرتی تھی اس لئے ایک کو دوسرے کی کتاب دیکھنا ضروری ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ یہ ساری کتابیں درس میں داخل ہوگئیں جن کو اگر ہم کہنا چاہیں تو ناخواندہ مہمان یا سبزۂ خود رو سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

(اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں ص ۳۲)

موجودہ نصاب تعلیم اس زمانہ میں جو نصاب تعلیم رائج ہے وہ درس نظامی کی بگڑی ہوئی صورت ہے، تفسیر کی صرف دو کتابیں ہیں اور منطق کی پندرہ، تفسیر کی جلالین اور بیضاوی ہے اور منطق کی. صغریٰ، کبریٰ ایسا غوجی. قال اقوال، میزان المنطق، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، حمداللہ ملاحسن، میرزاہد غلام یحییٰ، میرزاہد ملا جلال، قاضی مبارک[1] ہیں. اس نصاب میں تاریخ جغرافیہ، علم اعجاز القرآن، انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سیرتیں خصوصاً سرکار دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمہ مجتہدین کی تاریخیں اور علم تعبیر الرؤیا بالکل موجود نہیں ہے۔

(اسلامی علوم و فنون ہندستان میں ص۲۱)

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والے عصمت انبیاء اور حجیت صحابہ جیسے مسائل میں تردد کرنے لگتے ہیں. انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں کوئی حرف شکایت لانے یا صحابہ رضی اللہ عنہم پر کیچڑ اچھالنے میں انہیں باک نہیں ہوتا اور ائمہ مجتہدین کی شان میں وہ گستاخیاں کرتے ہیں کہ الامان والحفیظ ، رفتہ رفتہ ان کی اتباع و تقلید ہی سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں. اور اپنی عقل کو امام گردان کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگتے ہیں. اس کا سبب وہی ہے کہ ہم نے ان کے دلوں میں انبیاء علیہم السلام اور صحابۂ کرام کی فوقیت و برتری کا سکہ نہیں بٹھایا اور ائمہ مجتہدین کی وقعت و عظمت کی چھاپ اُن کے دل پر نہیں لگائی. اور نصاب تعلیم میں جو حدیث کی کتابیں ہیں ان میں زیادہ تر رفع یدین. آمین بالجہر فاتحہ خلف الامام کے مباحث رٹائے جاتے ہیں اور اختلافی مسائل پر زور صرف کیا جاتا ہے اور وہ حدیثیں جن کا تعلق اخلاق و معاشرت، عادات و معاملات، زہد و تقویٰ

---

[1] یہ کتابیں اگر مجموعی طور پر فی الوقت کسی جگہ نہیں پڑھائی جاتیں تو اس سے کوئی اعتراض عائد نہیں ہوتا کیونکہ ممکن ہے دوسری جگہوں میں پڑھائی جاتی ہوں نیز ہم نے نصاب کی حیثیت سے گفتگو کی ہے اور ماضی قریب میں یہ تمام کتابیں نصاب میں داخل تھیں ۱ قاسمی۔

حشر و نشر، جنت و نار، فضائل انبیاؑ اور مناقب صحابہ سے ہے ان کی ورق گردانی کرلی جاتی ہے اور بس۔ رہی فقہی کتابیں تو اس کے اسباق صوم وصلوٰۃ اور حج وزکوٰۃ تک محدود ہوتے ہیں۔ طلباء ہر سال اپنی کتاب کو کتاب الطہارت سے شروع کرتے اور اخیر سال تک حج یا نکاح و طلاق تک پہونچتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں ایمان و نذور، حدود و کفارات، بیع و شرا، سیر و جہاد صنعت و زراعت کے مسائل کی خبر نہیں ہوتی۔ اس لئے ضرورت ہے کہ موجودہ نصاب میں اصلاح کی جائے اور وہ کتابیں جن کا دین و دنیا سے کوئی تعلق نہیں انھیں نصاب سے یک لخت خارج کیا جائے اور قرآن و حدیث، فقہ و تفسیر، اصول فقہ، اصول تفسیر، ادب، بلاغت علم اعجاز القرآن اور اسلامی تاریخ پر بحث کی جائے اور ایسے افراد تیار کئے جائیں جو موجودہ زبانوں میں اسلام کی حقانیت اور اس کے محاسن و فضائل کو تقریروں و تحریروں کے ذریعہ اقوام عالم کے سامنے پیش کرسکیں اور اسلام پر ہر آنے والے اعتراض کا مدلل و مبرہن جواب دے سکیں، عیسائیوں، آریوں اور دوسرے فرقوں نے اپنے مذاہب کی ترویج و اشاعت کیلئے کتنی مشنریاں اور تبلیغی طریقے قائم کئے ہیں مگر ہم نے کیا کیا ہے بجز اس کے کہ فروعی اختلافات میں پڑکر اپنی عزت و آبرو کو خیرباد کہا اور غیروں کو خوش ہونے کا موقع فراہم کیا۔ ہماری کتابیں اور رسالے آپسی مخالفت و سرکشی کی نذر ہوتی ہیں۔ اسلام دشمن تحریکوں کے خلاف ہمارا قلم نہیں چلتا، ان کے رد میں کتابیں نہیں لکھی جاتیں ایسے ادارے اور مبلغین نہیں تیار کئے جاتے جو اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کا مطالعہ کریں پھر ان کے عجز و ضعف اور ان کی قباحت و شناعت کی نشاندہی کریں اور اسلام کے محاسن و مکارم اور عقائد و عبادات کو موجودہ زبانوں میں سمجھائیں۔ ہمارے وہ دشمن جو ہمارے استیصال اور ہمارے مذہب کے بالکلیہ بیخ کنی کے درپے ہیں اس پر ہمیں بھولے سے بھی غصہ نہیں آتا اور ہمارا بھائی ہمیں کچھ برا بھلا کہدے تو ہم اس پر تلوار لیکر کھڑے ہوجاتے ہیں فیا حسرتاہ و یا اسفاہ، حق تعالےٰ شانہٗ سے دعا ہے کہ ہماری ہر طرح سے حفاظت فرمائے اور ہمیں حق بات سننے اور سمجھنے کی

توفیق بخشے۔ آمین ثم آمین یارب العالمین۔

باب سوم

تدوین و ترتیب

منطق و فلسفہ کی تدوین مختلف زبانوں میں ہوئی مگر سب سے پہلے ارسطو نے ہی کی، باوجودیکہ ارسطو سے پہلے بقراط، سقراط، اور افلاطون جیسے حکماء پیدا ہو چکے تھے لیکن کسی نے یہ کام انجام نہ دیا۔ ارسطو ہی نے سب سے پہلے علوم عقلیہ کو مدون کیا اور اس پر کتابیں لکھیں، اس کے بعد اور لوگوں نے بھی اس کی تقلید کی اور اپنے اپنے زمانہ میں اس کی تدوین میں حصہ لیا مگر بنیاد کا سہرا ارسطو ہی کے سر ہے۔

تدوین اول ارسطو سب سے پہلا شخص ہے جس نے علوم عقلیہ کو مدون کیا اور اس میں کتابیں لکھیں، اسکی کتابوں کی ترتیب یہ ہے المنطقیات الطبیعیات، الالہیات، الخلقیات، منطقیات میں آٹھ کتابیں لکھیں، اول قاطیغوریاس یعنی مقالات، حنین نے اس کو نقل کیا اور فرفوریوس اور فارابی نے اس کی تفسیر کی، دوم باریمینیاس یعنی عبارت، اس کو حنین نے سریانی میں اور اسحٰق نے عربی میں منتقل کیا اور یعقوب بن اسحٰق کندی نے اس کی تفسیر کی، سوم انالوطیقیا یعنی تحلیل القیاس، اس کو تیودروس نے عربی میں منتقل کیا اور کندی نے اس کی تفسیر کی، چہارم انولوطیقا یعنی البرہان، اس کو اسحٰق نے سریانی میں منتقل کیا اور متیٰ نے اس نقل کو عربی میں منتقل کیا اور فارابی نے اس کی تشریح کی، پنجم طوبیقا یعنی الجدل، اس کو اسحٰق نے سریانی میں منتقل کیا اور اس نقل کو یحییٰ بن عدی

نے عربی میں منتقل کیا اور فارابی نے اسکی تفسیر کی، ششم سوسطیقا یعنی المغالطہ اس کو ابن ناعمہ عبدالمسیح حمصی نے سریانی میں نقل کیا اور اس نقل کو یحییٰ بن عدی نے عربی میں منتقل کیا اور کندی نے اس کی تفسیر کی۔ ہفتم ریطوریقا یعنی الخطابۃ اس کو اسحٰق نے عربی میں منتقل کیا اور فارابی نے اس کی تفسیر کی، ہشتم انوطیقا یعنی الشعر، اس کو ابوبشر متی بن یونس نے سریانی سے عربی میں منتقل کیا۔ ارسطو نے طبیعیات اور الہٰیات میں تین کتابیں لکھیں اوّل کتاب السماع الطبیعی۔ یہ آٹھ مقالے ہیں اسکندر نے اس کی تفسیر کی ہے دوم کتاب السماء والعالم یہ چار مقالے ہیں ازدوسیؔ نے اس کی تفسیر کی ہے، سوم کتاب الکون والفساد، اس کو حنین نے سریانی میں اور اسحٰق نے عربی میں منتقل کیا۔ ارسطو نے خلقیات میں ایک کتاب لکھی جس کا نام کتاب الاخلاق ہے۔ اس کی تفسیر ذفوریوس نے کی ہے۔

(ظفر المحصلین بحوالہ المصنفین صـ۳۳)

تدوین ثانی مامون الرشید کے زمانہ میں جن لوگوں نے یونانی کتابوں کے ترجمے کئے تھے ان میں ہر ایک کا ترجمہ دوسرے سے مختلف تھا اور وہ ترجمے باقاعدہ مرتب و مہذب نہ تھے اس لئے منصور بن نوح سامانی نے ابونصر فارابی متوفی ۳۳۹ھ کو ان تراجم کی تلخیص و تہذیب کا حکم دیا چنانچہ فارابی نے ان کو ملخص و مہذب کیا۔ اسی لئے فارابی کو معلم ثانی کہا جاتا ہے لیکن اب بھی یہ تراجم مبیضہ کی شکل میں نہ آئے تھے اس لئے دوبارہ ان کی تبییض کی ضرورت پڑی جیسا کہ آگے آئے گا۔ یہ سارا ذخیرہ اصفہان کے کتبخانہ میں سلطان مسعود کے زمانہ تک رہا۔ اس کتبخانہ کا نام صوان الحکمت تھا فارابی نے ان ترجموں کو مرتب و مہذّب اور کتابی شکل میں اس لئے نہیں کیا کہ اس کے مزاج میں سیر و سیاحت کا غلبہ تھا اس لئے اس کو موقع نہ مل سکا۔

(اسلامی علوم و فنون ہندستان میں صـ۲۴۹)

تدوین ثالث ابونصر فارابی کی یہ کاوش بیاض تک نہ آسکی تھی صرف مسوّدہ

ہی کے درجہ میں تھی اس لئے سلطان مسعود کے حکم سے بوعلی بن حسین بن سینا
یا ابن سینا متوفی ۴۲۸ھ نے اس کو تیسری بار مدون کیا اور فارابی کی تصانیف سے
اقتباس کر کے کتاب الشفاء وغیرہ کتابیں لکھیں۔ ابو محمد بن احمد اندلسی وزیر
عبدالرحمٰن مستظہر باللہ اور محمد زکریا رازی متوفی ۳۲۰ھ نے بھی چوتھی صدی ہجری
میں اس پودے کو پروان چڑھایا۔ آخر الذکر نے تو فلسفۂ ارسطو کی دھجیاں
فضائے آسمانی میں اڑائیں اور اعتراضات وشبہات کا بے پناہ ذخیرہ کتابوں
میں رکھ چھوڑا، پانچویں صدی ہجری میں اور اس کے بعد امام ابو حامد محمد بن محمد
غزالی متوفی ۵۰۵ھ ابن رشد متوفی ۵۹۵ھ فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ نجم الدین نخجوانی ابن سہلان
ابن تیمیہ حرانی متوفی ۷۲۸ھ افضل الدین خونجی وغیرہ نے ان فنون میں باریکیاں
پیدا کیں اور اجتہادات کئے۔ آخر الذکر کی کتابیں دوسو سال تک داخل نصاب
رہیں۔ (ظفر المحصلین ص ۳۴۳) (باقی آئندہ)

قرآن سے شخصی سلطنت ثابت ہے نہ کہ جمہوری حکومت

(حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ)

"لیکن گفتگو (اس وقت) یہ ہے کہ یہ جو خیال ہے کہ جمہوری سلطنت شریعت ہی کی تعلیم ہے
اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالےٰ عنہم کی سلطنت بھی جمہوری ہی تھی، یہ کہاں تک صحیح ہے؟ سو میں کہتا ہوں
کہ بالکل غلط ہے۔ یہ لوگ دلیل میں اَمْرُھُمْ شُوریٰ بَیْنَھُمْ ۔ وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ کو پیش کرتے ہیں
کہ دیکھئے۔ مشورہ کا حکم ہے، اور جمہوری سلطنت کی یہی حقیقت ہے کہ وہ مشورہ سے ہوتی ہے۔ لیکن ان
مستدلین کی وہ حالت ہے کہ حَفِظْتَ شَیْئًا وَغَابَتْ عَنْكَ اَشْیَاءُ کہنے تو یہ ہیں کہ ہم بڑے فلسفی
ہیں مگر حقیقت میں کچھ نہیں سمجھتے۔ صاحبو! جمہوری سلطنت صرف مشورہ کا نام نہیں ہے بلکہ جمہوری
سلطنت میں مشورہ کے خاص اصول بھی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر اختلاف ہو تو کثرت
رائے پر فیصلہ ہو اور بادشاہ اس کے خلاف ہرگز نہ کر سکے۔ اور اگر بادشاہ سب کو جمع کر کے رائے
لے مگر سب کے خلاف اپنی رائے پر عمل کرے تو وہ سلطنت شخصی ہوگی بس معلوم ہوا کہ محض مشورے

سے سلطنت کا جمہوری ہونا لازم نہیں آتا۔ اب اس کو ثابت کیا جائے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی سلطنت میں کبھی یہ بات ہوئی ہو۔ کوئی ایک ہی واقعہ بتلادے کہ خلیفہ مشورہ لینے کے بعد مجبور کیا گیا ہو۔ واقعہ یہ ہے شریعت میں سلطنت شخصی ہی ثابت ہے"۔

"چنانچہ میں اسی آیت شریف وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ سے سلطنت شخصی ثابت کرتا ہوں اگرچہ بظاہر یہ آیت شریف دونوں سے ساکت معلوم ہوتی ہے تقریر اثبات کی یہ ہے کہ اسی سے آگے فرماتے ہیں فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (پس جب تو ارادہ کرے تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر) یہ جملہ صاف بتلا رہا ہے کہ شریعت میں سلطنت شخصی ہے کیوں کہ مشورہ کے بعد اِذَا عَزَمَ اَکْثَرُھُمْ یا اِذَا عَزَمُوْا نہیں فرمایا بلکہ مدار کار محض آپؐ کے عزم پر رکھا کہ بعد مشورہ لینے کے جب آپؐ تن واحد کسی بات کا عزم فرمالیں تو خدا پر توکل کر کے اُسے کر لیجیے۔ اب بتلائیے کہ اس آیت شریف سے سلطنت شخصی ثابت ہوئی یا جمہوری؟"

"اور اس سے بھی واضح یہ مسئلہ ایک دوسری آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ (نور ۶۲)۔ بس مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں اور جب رسولؐ کے پاس کسی ایسے کام پر ہوتے ہیں جس کیلئے مجمع کیا گیا ہے (اور اتفاقاً وہاں سے جانے کی ضرورت پڑتی ہو) تو جب تک آپؐ سے اجازت نہ لیں نہیں جاتے (اے پیغمبر) جو لوگ آپ سے (ایسے مواقع پر) اجازت لیتے ہیں بس وہی اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں تو جب (اہل ایمان) لوگ (ایسے مواقع پر) اپنے کسی (ضروری) کام کیلئے آپؐ سے (جانے کی) اجازت طلب کیا کریں تو انہیں سے آپ جس کیلئے (مناسب سمجھ کر اجازت دینا) چاہیں اجازت دے دیا کریں اور (اجازت دیکر بھی) آپ ان کیلئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کیا کیجئے) اس میں اول تو یہ حکم ہے کہ پوچھ کر جایا کریں۔ پھر آگے فرماتے ہیں کہ جب وہ پوچھیں تو جسکو آپ چاہیں اجازت دیدیں۔ سو غور کیجئے کہ اِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ کے بعد فَاْذَنْ میں لِمَنْ شِئْتَ بھی فرماتے ہیں اور اسْتَاْذَنُوْكَ سب کے اذن چاہنے کو بھی محتمل ہے تو فرض کیجئے کہ اگر سب کے سب اذن چاہنے لگیں تو ظاہر ہے کہ اس وقت سب کا اتفاق اعطاء اذن پر متحقق ہوگا مگر اسوقت بھی یہی حکم ہے فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ کہ جس کو چاہو اجازت دو اور چاہو نہ دو۔ دیکھئے باوجود اتفاق کے مدار کار تنہا حضورؐ کی رائے پر رکھا تو بتلائیے اس سے سلطنت جمہوری ثابت ہوئی یا شخصی؟" صاحبو! انسان کو چاہیے کہ وہ جس کام کا نہ ہو اس میں دخل نہ دے۔ نصوص کا سمجھنا ترجمہ دیکھنے والے کا کام نہیں سے "نہ کہ ہر آئینہ دار د سکندری داند" [ماخوذ از وعظ "قطع التمنی" دعوات عبدیت جلد چہارم]

کوائفِ دارالعلوم

(۱) جلسہ تقسیم انعامات سال گذشتہ سالانہ امتحان میں اچھے نمبرات سے کامیاب ہونے والے طلبہ کی حوصلہ افزائی کی غرض سے ۱۹، ۲۰ ر جمادی الثانی ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۰، ۱۱ ر مارچ ۱۹۸۵ء کو دارالحدیث تحتانی میں تقسیم انعام کا دو روزہ اجلاس منعقد ہوا جس میں حضرت مہتمم صاحب مدظلہ، دارالعلوم کے تمام اکابر و اساتذہ کے علاوہ مجلس شوریٰ دارالعلوم کے دو معزز ارکان حضرت مولانا عبدالحلیم جونپوری اور حضرت مولانا قاضی زین العابدین میرٹھی مدظلہ نے بھی شرکت فرمائی۔

جلسہ کا افتتاح تلاوت قرآن کریم کے بعد محترم ہر دو ارکان شوریٰ کے ناصحانہ کلمات سے ہوا۔ تقسیم انعام کا آغاز دورۂ حدیث میں اول پوزیشن حاصل کرنے والے طالب علم مولوی خورشید انور گیاوی سے ہوا جنہیں منجانب دارالعلوم اہم دینی کتابوں کے علاوہ حضرت مہتمم صاحب نے اپنی جیبِ خاص سے سات سو روپے مالیت کی کتابیں بطور انعام کے عنایت فرمائیں ان کے بعد دوسرے درجہ میں کامیابی حاصل کرنے والے خوش قسمت طالب علم مولوی شبیر احمد میرٹھی کو حضرت مہتمم صاحب نے مبلغ تین سو روپے کی کتابیں عطا کیں علاوہ ازیں گذشتہ سے پیوستہ سالانہ امتحان میں اول پوزیشن سے کامیابی حاصل کرنے والے مولانا عبدالرؤف افغانی کو (جو اب دارالعلوم میں تدریسی خدمت انجام دے رہے ہیں) بھی (ایک ہزار کی کتابیں اپنی طرف سے دیں۔

دو روزہ اجلاس میں تقریباً چودہ سو (۱۴۰۰) طلبہ کو اڑتیس ہزار (۳۸۰۰۰) کے لگ بھگ کی کتابیں تقسیم کی گئیں سالہائے گذشتہ کے اعتبار سے اس سال انعامات کی مالیت میں دوگنا کا اضافہ کیا گیا اور بھی بعض اہم اصلاحات کی گئیں۔

ہر درجہ میں اول آنے والے عزیز طلبہ کے اسماء حسب ذیل ہیں۔

(۱) دورۂ حدیث — مولوی خورشید انور گیاوی

(۲) درجہ ہفتم ——— مولوی زین العابدین میرٹھی
(۳) درجہ ششم ——— مولوی معین الدین گونڈوی
(۴) درجہ پنجم ——— حافظ محمد سلمان منصورپوری
(۵) درجہ چہارم ——— عبدالحسیب مظفرپوری
(۶) درجہ سوم ——— شفیق عالم دیناج پوری
(۷) درجہ دوم ——— احمد حسین کٹھیاری
(۸) درجہ اول ——— { نذرالاسلام سندرگڈھی
فیض الرحمٰن بیگوسرائے بہار }

(۲) مجلس عاملہ کا اجلاس

۱۸/۱۹ جمادی الثانی کو مجلس عاملہ کا دو روزہ اجلاس دارالاہتمام میں انعقاد پذیر ہوا۔ عاملہ کا یہ اجلاس اس لحاظ سے نہایت اہم ہوتا ہے کہ اس میں دارالعلوم کے پورے سال کی کارکردگی اور دیگر معاملات وامور کا جائزہ لیا جاتا ہے اور آنے والے سال کیلئے لائحہ عمل پر غور وخوض ہوتا ہے مجلس نے اپنے دو روزہ اجلاس میں پوری ژرف نگاہی اور بیدار مغزی کے ساتھ دارالعلوم کے جملہ مسائل ومعاملات پر غور وفکر کیا اجلاس میں درج ذیل حضرات نے شرکت فرمائی۔

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا معراج الحق صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب میرٹھی۔ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری، حضرت مولانا وحیدالزماں صاحب کیرانوی معاون مہتمم دارالعلوم دیوبند، جناب الحاج نواب عبیدالرحمٰن خان شیروانی اپنی علالت اور بعض دیگر مصروفیات کی بناء پر شریک اجلاس نہ ہو سکے۔

(۳) حضرت معاون مہتمم صاحب کا دورۂ مغربی یوپی وشہر کانپور

حضرت مولانا وحید الزماں صاحب مدظلہ معاون مہتمم ادھر چند ہفتوں سے تنظیمی وترقیاتی دورہ فرمارہے تھے اس سلسلے میں وہ مغربی یوپی کے اضلاع بلندشہر، غازی آباد میرٹھ، مظفرنگر اور سہارنپور وغیرہ کے دورہ سے تقریباً فارغ ہوچکے ہیں ان اضلاع کے ارباب خیر، دردمندان ملت اور بہی خواہان دارالعلوم نے اس موقع پر دارالعلوم کی امداد واعانت کا

حوصلہ مندانہ اعلان کیا۔ علاوہ ازیں مولانا مفتی منظور احمد صاحب رکن شوریٰ دارالعلوم حافظ حمید اللہ کانپوری اور ان کے رفقاء نے ۲۱، ۲۲، ۲۳ جمادی الثانیہ کو دارالعلوم کی تنظیم و ترقی کے عنوان سے کانپور میں تین روزہ اجلاس کا پروگرام بنایا۔ ان مخلصین کی دعوت پر دارالعلوم سے حضرت معاون مہتمم صاحب حضرت مولانا عبدالحق صاحب استاد حدیث اور قائم مقام ناظم تنظیم و ترقی قاری فخر الدین صاحب وغیرہ کانپور تشریف لے گئے۔ جہاں ان حضرات کی متعدد تقریریں ہوئیں۔ بالخصوص معاون مہتمم صاحب مدظلہ نے کانپور کی گلی گلی کا گشت کر کے وہاں کے باشندگان کو دارالعلوم کی صحیح صورت حال سے باخبر کیا اور مخالفین کی جانب سے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات کو دور فرمایا جس سے اہل کانپور بیحد متأثر ہوئے اور بغیر کسی خاص تحریک کے تقریباً ایک لاکھ کی خطیر رقم آپ کی خدمت میں پیش کی یہ تین روزہ پروگرام اپنے مقصد میں نہایت کامیاب رہا۔ مسلمانان کانپور نے بڑی گرم جوشی اور اپنائیت کے جذبے سے مہمانوں کا استقبال کیا اور انکی ہر طرح سے خدمت و تواضع کی۔ مولانا مفتی منظور احمد صاحب اور انکے رفقاء بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک قابل تقلید سلسلہ کا آغاز فرما کر دیگر اہل شہر کو اسیطرح کے پروگرام مرتب کرنے کی مخلصانہ عملی دعوت دی ہے امید ہے کہ دیگر قصبات اور شہروں کے مسلمان بھی اپنے مضافات پر اسیطرح کے پروگرام بنائیں گے۔

تعارف و تبصرہ

حبیب الرحمٰن قاسمی

ایرانی انقلاب، خمینی اور شیعیت

از حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ تقطیع متوسط

کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ۔ صفحات ۲۹۶، قیمت ۲۰/- روپے۔ ناشر الفرقان بکڈپو ۳۱ نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ۔ کتاب کی اہمیت و افادیت کیلئے حضرت مولانا موصوف کا اسم گرامی کافی ہے مزید براں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے رفیع اور فکر انگیز مقدمہ نے اسکی قدر و قیمت میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ایرانی انقلاب اور مذہب شیعہ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے یہ کتاب کلیدی حیثیت کی حامل ہے حقیقت تو یہ ہے کہ مولانا موصوف نے اس کتاب کو لکھ کر

اور خمینی فتنہ کے تار و پود بکھیر کر رکھدیئے. اس کتاب کے مطالعہ کے بعد خمینی کی حمایت وتائید اور ان کے زیر اثر برپا انقلاب کو اسلامی انقلاب کہنے کی اب گنجائش باقی نہیں رہی۔ یہ کتاب عام وخاص دونوں حلقوں کیلئے یکساں طور پر مفید ہے ضرورت ہے کہ اسے مسلمانوں کے ایک ایک گھر میں پہنچایا جائے تاکہ شیعیت کے سلسلہ میں اہل سنت والجماعت کے حلقوں میں جو غلط فہمیاں بعض جماعتوں کی جانب سے پھیلا دی گئی ہیں وہ ختم ہو جائیں. اور مخلصین اسلام کی اصل صورت وحقیقت نکھر کر سامنے آجائے۔

سید المرسلین= از مولانا حافظ عبدالمجید شاکر چغتائی کھروڑ پکا. تقطیع متوسط کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ. صفحات ۴۷۶ قیمت تیس/۳۰ روپے

ناشران، چغتائی جنرل اسٹور اینڈ بکڈپو کھروڑ پکا ملتان مولانا حافظ عبدالمجید علمائے ملتان میں اپنی تبلیغی اور دینی سرگرمیوں کے لحاظ سے نمایاں حیثیت کے مالک ہیں. تبلیغی معروفیوں کے ساتھ مولانا تصنیف وتالیف کے ذریعہ بھی دعوت و تبلیغ کی خدمت انجام دیتے ہیں اس سے پہلے موصوف کی متعدد کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں زیر تبصرہ کتاب موصوف کی وہ اہم ترین تصنیف ہے. جسے حکومت پاکستان کی وزارت امور مذہبیہ کی جانب سے دس ہزار کا انعام حاصل ہو چکا ہے. موصوف نے سیرت کے موضوع پر ایک نئے انداز سے قلم اٹھایا ہے اور حق یہ ہے کہ موضوع کا بڑی حد تک حق ادا کر دیا ہے. البتہ بعض جگہ اردو محاوروں کے استعمال میں تسامح ہوا ہے اور امید ہے کہ اگلے ایڈیشن میں انکی اصلاح کر لی جائے گی۔

تذکرۃ الفنون= از مولانا محمد عثمان معروفی اعظمی. تقطیع خورد. کاغذ، کتابت، طباعت قابل قبول. صفحات ۱۱۲، قیمت ۴/ روپے ملنے کے پتے۔

مکتبہ دینیہ دیوبند/ دارالاشاعت اسلامیہ کولوٹولہ کلکتہ ۷۳ ہلال بکڈپو مبارک پور اعظم گڈھ اور مدرسہ جامع العلوم کو پاگنج اعظم گڈھ . مولانا محمد عثمان صاحب معروفی طلبہ اور متوسطین کیلئے ہلکی پھلکی کتابیں لکھ کر شائع کرتے رہتے ہیں اسی سلسلہ کی ایک کڑی زیر نظر کتاب بھی ہے اس میں اختصار کیساتھ علوم قرأت حدیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، کلام، تاریخ، منطق. فلسفہ، نحو وادب. بلاغت. عروض، لغت، تصوف، سیر اور تاریخ وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے بطور خاص طلبہ کیلئے یہ کتاب بڑی مفید ہے۔

مکرمی!　　زید مجدکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ امر یقیناً آپ کیلئے باعث اطمینان ومسرت ہوگا کہ مادر علمی دارالعلوم دیوبند اب انتہائی پرسکون اور خوشگوار علمی اور دینی ہمہ جہتی ترقی کی راہ پر زیر سرپرستی حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند" گامزن ہوچکا ہے۔ دفتری نظام کو مستحکم اور تیز رفتار کردیا گیا ہے۔ طلبہ میں دینی بیداری، اسباق اور نماز کی پابندی کا جذبہ فروغ پر ہے بہت سے ایسے شعبہ جات جو یا تو بند ہوچکے تھے یا نیم جان تھے ان کو ازسرنو قائم کرنے اور فروغ دینے کا کام شروع کردیا گیا ہے۔ دارالعلوم جیسے عظیم مرکز اسلامی کی تعلیمی، تربیتی، تبلیغی اور اشاعتی سرگرمیوں کیلئے جس قدر وسیع اور کثیر عمارتوں کی ضرورت ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے جگہ کی تنگی کے باعث کام میں حرج واقع ہوتا ہے۔ اس وقت مندرجہ ذیل ترقیاتی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا از حد ضروری ہے۔

(۱) دارالافتاء، کتب خانہ، دارالاقامہ اور مہمان خانہ کی موجودہ عمارتوں میں فوری توسیع۔
(۲) جدید کشادہ مسجد اور دارالمدرسین کی فوری تعمیر۔
(۳) ملحق آراضی کے احاطہ کی تعمیر اور ان پر لب سڑک دروازوں کی تعمیر۔
(۴) پانی کی فراہمی کیلئے ایک بڑی ٹنکی کی تعمیر
(۵) ایک مزید جنیریٹر کا انتظام
(۶) دارالعلوم کے فلیش سسٹم میں توسیع۔
(۷) طلبہ کے مطالعہ کیلئے شروح کتب کی خریداری۔

اللہ کے توکل اور بہی خواہان دارالعلوم کے تعاون پیش نظر اکثر کاموں کا آغاز کردیا گیا ہے اب ضرورت ہے کہ دارالعلوم موجودہ اخراجات اٹھاون لاکھ روپیہ کے علاوہ فوری اور ہنگامی سرمایہ فراہم کیا جائے اگر فضلاء دارالعلوم اپنی روایات کیمطابق اسطرف خصوصی توجہ سے کام لیں اور وہ از خود اور دوسرے اصحاب خیر کو خصوصی توجہ دلاکر فراہمی سرمایہ میں تعاون شروع

کردیں تو اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی سے امید ہے کہ دارالعلوم کے تمام تر منصوبہ جات ہندوستان کے غیور مسلمانوں کے مخلصانہ عطیات سے پورے ہو جائیں گے اور فرزندان دارالعلوم کا نام سرفہرست رہے گا جسکی آسان صورت یہ ہے کہ فضلاء دارالعلوم مادر علمی کی تعمیر نو میں سب سے پہلے اپنے عطیات حسب توفیق الٰہی روانہ کرنا شروع کر دیں مذکورہ ضروریات میں کسی ایک کیلئے خاص رقم ہو تو اسکی تصریح کر دیجائے اگر اس سلسلے میں خدام دارالعلوم کے دورہ کی ضرورت ہو تو اسکا پروگرام بھی بنایا جا سکتا ہے طویل المعیاد اور مختصر المعیار منصوبوں کے سلسلے میں ضروری تفصیلات بعد میں روانہ کی جائیں گی جملہ رقومات نقد ڈرافٹ ذیل کے پتہ پر روانہ کیجائیں اور مہربانی فرماکر یہ بھی حوالہ دیا جائے کہ یہ رقم اس خط کے جواب میں حالیہ منصوبہ کی تکمیل کیلئے بھیجی جارہی ہے۔

تعاون کے سلسلہ میں آپکے امید افزا جواب موصول ہو جانے پر اس سلسلہ میں ضروری اقدامات کئے جائیں گے خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔ (مولانا) وحید الزماں

جملہ رقومات نقد ڈرافٹ بھیجنے کا پتہ
(مولانا مرغوب الرحمٰن دارالعلوم دیوبند)

معاون مہتمم دارالعلوم دیوبند

ادبیات

أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ

(حضرت کاشف الہاشمی کا غیر مطبوعہ کلام)

عنایت کی گئی ہے دولت کون و مکاں تم کو
بطور جستجو دی ہے حیات جاوداں تم کو

گہر کی پاسبانی کی ہے موجوں کی تباہی میں
نظر بنکر دکھایا ہے جمال بیکراں تم کو

شب تاریک ہستی کو تماشائے سحر بخشا
کیا ہے انجم سیماب پا کا ہم عناں تم کو

خلش رکھ کر دل بیتاب میں فکر دو عالم کی
کیا ہے نکتہ داں گردش ہفت آسماں تم کو

مبادا نکتہ چیں ہوں پھر کوئی تقدیر امکاں پر
بنایا ہے سر و سامان تعمیر جہاں تم کو

تمہیں شکوہ نہ ہونا چاہیئے فیضان قدرت کا
کہ قدرت نے بنایا تھا چمن کا پاسباں تم کو

میان قعر ظلمت صورت تابندگی دی ہے
حناں بندی چمن میں ہر گل نوخیز کی کی ہے

درونِ سینۂ امکاں، یہ عنوانِ اثر کیا ہے تماشا گاہِ شب میں، کثرتِ نورِ سحر کیا ہے
نسیمِ صبح کو بخشی ہے روحِ گلستاں کس نے کبھی دیکھی ہے تم نے سرخیٔ گلہائے تر کیا ہے
یہ آخر کون بجلی ان کے پوشیدہ ہر اک شے میں یہ خشت و بام و در کیا ہے یہ موجِ بحر و بر کیا ہے
یہ اک صورت بنائی ہے تماشائے حقیقت کی یہ فکر کو بہ کو کیا ہے یہ چشمِ تر بہ تر کیا ہے
جنوں کو آئینہ بردارِ معنی کون رکھتا ہے دریں حسرت سرا، تجدیدِ ذوقِ بال و پر کیا ہے
یہ افسونِ جرس پھونکا ہے کس نے زندگانی میں دلِ آشفتہ کیا ہے، جرأتِ عزمِ سفر کیا ہے
یہ بالا دستیاں کس کی ہیں ہر شے کو اٹھاتی ہیں زفیضِ دل تپیدن آرزوئے یک نظر کیا ہے
بگڑ جاتی ہیں تقدیریں، بدل جاتی ہیں تقدیریں فسادِ بحر و بر کیا ہے، نگاہِ معتبر کیا ہے

یہ گل کے واسطے سامانِ شبنم کون کرتا ہے
سر و سامانِ شرحِ حرفِ مبہم کون کرتا ہے

جزائے روحِ گل، روحِ چمن افتادگی کب تک خرد کی چاکدامانی، نظر کی گم رہی کب تک
جزائے عندلیبِ گل نوا سنجی کا موسم ہے سکوتِ بے محل کب تک، اثر کی خامشی کب تک
تمہیں شکوہ ہے تقدیرِ عمل محکم نہیں ہوتی سحر گمنام کب تک، غربتِ تیرہ ہستی کب تک
علاجِ بے یقینی، انجمن کی شورشیں کب نہیں سیہ بختی تری عزت فروشِ زندگی کب تک
بڑی مشکل سے ہوتی ہے گلِ تر کی حنا بندی برس اے ابرِ دریا پاش آخر تشنگی کب تک
بالآخر کاخِ ہستی مرکزِ نورِ سحر ہوگا مٹائے گی زدِ بخ صبحِ نو کو تیرگی کب تک
بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم فغانِ تشنگی کب تک سبو خانہ تہی کب تک
وہی غم خانۂ دہقاں وہی کاشانۂ سلطاں بہ تابانِ بقیدِ بندگی و خواجگی کب تک
تجھے کیا مل سکے گا ہو اگر دل دفترِ حکمت خرد کی تیز دستی، دشمنی، واماندگی کب تک

سکوتِ ساحل و ہنگامۂ طوفان تم سے ہے
یہ خشت و سنگ، یہ تعمیر، یہ ایوان تم سے ہے

فہرست کتب مکتبہ دارالعلوم دیوبند (شعبہ نشر و اشاعت دارالعلوم دیوبند)

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
فتاویٰ دارالعلوم جلد ۱	۲۴/-	دیوان المتنبی	۱۱/-	انتصار الاسلام	۹/-
" " ۲	۱۲/-	تاریخ دارالعلوم جلد ۱	۸/-	مصابیح التراویح	۶/۵۰
" " ۳	۲۵/-	" " ۲	۸/-	تفسیر معوذتین	۳/-
" " ۴	۳۱/-	" " انگریزی	۱۲۵/-	اسلامی عقائد اور سائنس	۲/-
" " ۵	۳۰/-	" " ۲	۱۷۵/-	مودودی مذہب	۳/۵۰
" " ۶	۳۶/-	سوانح قاسمی جلد اول	۸/-	نظریہ ود قرآنی پر ایک نظر	۴/-
" " ۷	۳۳/-	" " دوم	۴۰/-	مکتوبات ثلٰثہ	۳/۵۰
" " ۸	۲۸/-	" " سوم	۱۲/-	دودھ مزدوری مسئلے	۱/-
" " ۹	۳۱/-	مخطوطات جلد اول	۱۹/-	جماعت اسلامی کا دینی رُخ ۱	۳/۵۰
" " ۱۰	۲۲/-	" " دوم	۳۱/-	" " ۲	۳/۵۰
" " ۱۱	۱۱/-	قبلہ نما	۳۸/-	" " ۳	۲/۵۰
مقدمہ ابن الصلاح	۱۱/-	دینی دعوت کے قرآنی اصول	۲/۵	" " ۴	۴/-
ایضاح الحدیث	۱۲/-	ناقابل فراموش واقعات	۳۶/-	اجتماع گنگوہ	۱/-
مشکوٰۃ الآثار	۱۱/-	المنار الانوار	۷/-	در منثور اول	۱/-
المفتحیہ	۴/-	مثنوی فروغ	۴/۵۰	" دوم	۱/-
نفحۃ الادب	۶/-	براہین قاسمیہ	۱۰/-	اعفاء اللحیہ	۱/-
تفسیر مدارک التنزیل	۸/-	حکمت قاسمیہ	۵/-	ایمان و عمل	۳/-
الاشباہ والنظائر	۳۰/-	مدارج سلوک	۱۲/-	دارالعلوم دیوبند کا ایک	۱۶/۵۰
عقیدہ الطحاوی	۱۱/-	جائز تراجم قرآنی	۱۱/-	فتویٰ اور اسکی حقیقت	
حسامی	۴۲/-	قرآن محکم	۵/-	ماثورہ دعائیں	۱/۵۰
ملا حسن	۱۲/-	حجۃ الاسلام / اسرائیل	۱۰/- ۸/-	دستور عقائد	۲/۵۰
مقامات حریری	۲۵/-	قرآن پشتو	۳/۵۰	مکتوبات	۲/۵۰

Regd. No. SHN—13—NP—21—85

DARUL-ULOOM MONTHLY
DEOBAND (U.P.)
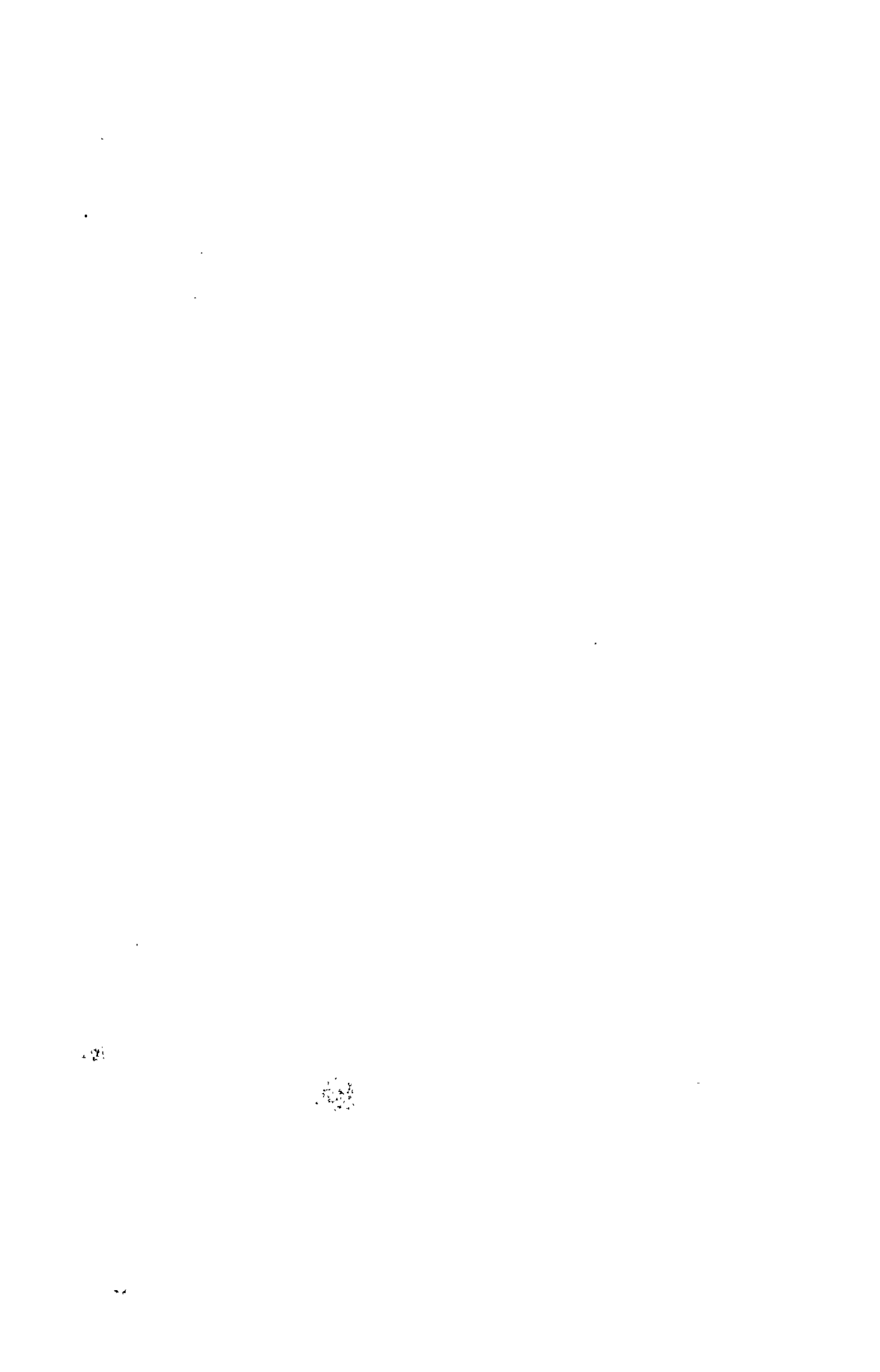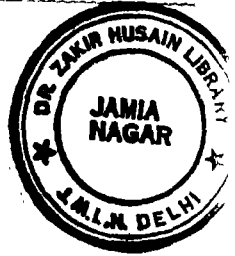
① رواق خالد کی دوسری منزل اور مزید جدید دارالاقامہ کی تعمیر جو طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لئے کافی ہو

② **دارالتربیت** (دارالاطفال) کا قیام اور اس کی تعمیر

③ ایک وسیع مسجد کی تعمیر جس میں اضافہ شدہ تمام طلبہ کی گنجائش ہو (قدیم مسجد ناکافی ہو چکی ہے)

④ علمی و دینی اجتماعات کے لئے ایک وسیع ہال کی تعمیر ——— ⑤ ملازمین کے لئے مکانات کی تعمیر

⑥ مہمان خانہ کی توسیع —— ⑦ نئی درسگاہوں کی تعمیر ——— ⑧ **لائبریری کی تعمیر جدید**

⑨ اساتذۂ دارالعلوم کی علمی ترقی کے لئے عالم اسلام سے علمی کتابوں کی فراہمی کا انتظام

⑩ تمام دنیا میں پھیلے ہوئے فضلاءِ دارالعلوم سے روابط اور اُن سے متعلق معلومات.

⑪ نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم پر تمام ذمہ دارانِ مدارسِ عربیہ کا **اہم کنونشن طلب کرنا.**

⑫ تعلیم و تربیت کے نئے اصول و ضوابط کی ترتیب اور اُن کا اجراء.

اس ادارے کے تمام منصوبوں کی تکمیل کے لئے

دستِ تعاون بڑھانے کی شدید ضرورت ہے

مندرجہ ذیل پتہ پر اپنی امداد روانہ فرمائیں ——————— **شکریہ**

(مولانا) مرغوب الرحمان (صاحب) دارالعلوم دیوبند یوپی

[illegible] دیوبند یوپی

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

جلد ۶۸ | مئی ۱۹۸۵ء مطابق شعبان ۱۴۰۵ھ | شمارہ ۲

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

مُدیر مسئول

مولانا ریاست علی بجنوری

مدیر تحریر

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

قیمت فی پرچہ ۲/۵۰ سالانہ ۲۵/-

سالانہ بدل اشتراک بیرون ممالک سے: سعودی عرب کویت ابوظبی ایرمیل ۱۱۵/- جنوبی و مشرقی افریقہ و برطانیہ ۳۵/- امریکہ کناڈا وغیرہ بذریعہ ایرمیل ۱۲۵/- پاکستان بذریعہ ایرمیل ۵۰/- بنگلہ دیش ۲۵/-

محبوب پریس دیوبند

سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زر تعاون ختم ہوگیا ہے ○

ترتیب مضامین

بنگلہ دیشی خریداروں سے ضروری گذارش

بنگلہ دیشی خریدار اپنا چندہ مبلغ /25 روپے ہندوستانی شیخ مولانا سراج الحق صاحب پرنسپل دارالعلوم، مولوی بازار، ضلع مولوی بازار، بنگلہ دیش کو بھیج دیں اور انہیں لکھیں کہ اس چندہ کو رسالہ دارالعلوم کے حساب میں جمع کر لیں۔

خریداران حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں۔ خط وکتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔ اور رسید منی آرڈر رسالہ دارالعلوم کو روانہ کردیں۔

والسلام

مدیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمؒ

حرفِ آغاز

(حبیب الرحمٰن قاسمی)

ادیان و ملل کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہر قوم و ملت میں جو عائلی اور ازدواجی دستور و قوانین رائج ہوتے ہیں انہیں ہر ملت اپنا مذہبی شعار سمجھتی ہے جنکی تقدیس اور حفاظت کو اپنی جانوں سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ جن کے چھوڑنے کو انتہائی عار اور اسمیں کسی طرح کی مداخلت کو اپنے ملی تشخص اور وقار کے سراسر خلاف تصور کرتے ہیں

اسلام! جو بنی نوع انسان کیلئے مہد سے لیکر لحد تک کا مکمل لائحہ عمل اور دستور حیات پیش کرتا ہے وہ بھلا اس اہم ترین شعبۂ زندگی کو کیسے نظرانداز کر سکتا تھا چنانچہ قرآن حکیم جو مذہب اسلام کا اولین اور سب سے عظیم ترین خدائی دستور ہے وہ عام طور پر اصول قانون کے بیان پر اکتفاء کرتا ہے۔ مگر ازدواجی مسائل کے بیان میں اس نے صرف اصول پر اکتفاء نہیں کیا ہے بلکہ وہ اس شعبہ کی اکثر جزئیات کو بھی پورے اہتمام سے بیان کرتا ہے۔ قرآن حکیم کے اس طرز بیان سے اس مسئلہ کی نزاکت اور اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

مسئلہ کی اسی اہمیت اور نزاکت کے پیش نظر جو حکومتیں کسی قوم کے مذہبی امور میں مداخلت پسند نہیں کرتیں وہ ہر قوم کے "پرسنل لاء" کی حفاظت کی ضمانت دیتی ہیں۔ چنانچہ خود ہمارے ملک ہندوستان میں مسلم عہد سلطنت میں یہاں کے حکمرانوں نے شخصی حکومت کے باوجود یہاں کے بسنے والی ہر قوم کے مذہبی معاملات

میں نہ صرف یہ کہ کسی طرح کی مداخلت کو جائز نہیں سمجھا بلکہ ان کے مکمل تحفظ کا بھی، انتظام و اہتمام کیا۔ مسلم حکومت کے سقوط کے بعد جب ملک پر انگریزوں کا تسلط ہوا تو انہوں نے بھی اپنے پورے دور میں یہاں کے جملہ اہل مذاہب کے عائلی و ازدواجی مسائل کو ہمیشہ محفوظ اور آزاد رکھا۔ ملک کی آزادی کے بعد جب یہاں سیکولر حکومت قائم ہوئی تو اس کے بنیادی دستور میں یہ ضمانت دی گئی کہ ہر قوم کے "پرسنل لاء" کا تحفظ حکومت کا فریضہ ہوگا، چنانچہ اسی دستور کے مطابق آنجہانی مسز اندرا گاندھی اپنے دور حکومت میں مسلمانوں کو یہ یقین دہانی کراتی رہیں کہ "مسلم پرسنل لا" میں حکومت کوئی مداخلت روا نہیں سمجھتی اور فرقہ پرست افراد اور تنظیموں کے شور و غوغا کے باوجود انہوں نے یکساں سول کوڈ کے نظریہ کو مسلمانوں پر تھوپنے کو پسند نہیں کیا۔ موجودہ وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی نے بھی بغیر کسی ابہام کے نہایت وضاحت کے ساتھ اپنے بیانات میں اس بات کا اعلان کیا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی قوانین میں حکومت کسی ترمیم کو پسند نہیں کرتی۔

دستور ہند میں دی گئی ضمانت کے مطابق مسلم پرسنل لاء کا تحفظ کیا جائیگا لیکن محمد احمد خاں بنام شاہ بانو بیگم کے مقدمہ میں سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے نے حکومت کے قدیم عمل، دستور ہند کی مستحکم ضمانت اور سربراہان ملک کی مسلسل یقین دہانیوں پر خط تنسیخ کھینچ دیا ہے اور اس پر طرہ یہ ہے کہ اس فیصلہ کی تائید میں سورۂ بقرہ کی آیت " وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ " کو پیش کیا گیا ہے جبکہ مطلقہ کے نان و نفقہ سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ اسمیں تو مطلقہ کو متعہ دینے کی ہدایت فرمائی گئی ہے چنانچہ تمام ائمہ تفسیر نے بغیر کسی اختلاف کے متاع بمعنی تمتیع یعنی متعہ دینے کے معنی میں لیا ہے اس سلسلہ میں جمع البیان طبری، جامع احکام القرآن قرطبی، تفسیر کبیر فخر رازی، احکام القرآن ابن عربی وجصاص رازی، ابن کثیر، تفسیر ابی سعود، کشاف روح المعانی، سید آلوسی، تفسیر احمدی، فتح القدیر، شوکانی وغیرہ کیجانب مراجعت کیجاسکتی ہے ہمارے فاضل جج شاید اس سے واقف نہیں کہ قرآن حکیم کی وہی تفسیر و تشریح معتبر اور قابل اعتماد سمجھی جاتی ہے، جو حامل وحی آقائے مدنی محمد صلے اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام تابعین عظام اور علمائے راسخین کے اقوال و تشریحات کیمطابق ہو اس سے ہٹ کر قرآن کی جو تفسیر و تشریح کی جائے گی

وہ غیر مقبول اور مردود مانی جاتی ہے اسلئے فاضل جج کا اپنے فیصلہ میں اس آیت کریمہ کا حوالہ دینا کوئی وقعت نہیں رکھتا بلکہ یہ حوالہ تغیر کے اعتبار سے قرآن میں تحریف ہے جسے مسلمان کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کر سکتے۔ فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں دستور ہند کو نظر انداز کرتے ہوئے "مسلم پرسنل لا" میں مداخلت کی ہے۔ مسلمانوں کی سب سے مقدس مذہبی کتاب میں تحریف کا ارتکاب کیا ہے اخلاق کو مذہب پر تو فوقیت دی ہے جو کسی مذہب کے اعتبار سے بھی درست نہیں ہے مزید براں اپنے منصب اور حدود کا لحاظ کئے بغیر حکومت کو یہ مشورہ دیا ہے کہ ملک میں یکساں سول کوڈ نافذ کر دیا جائے جبکہ ان کا یہ مشورہ دستور ہند کے خلاف ہونے کیساتھ ایسے وقت میں پریس میں آیا ہے کہ آسام، پنجاب اور گجرات کے واقعات ومسائل، حکومت اور ہر محب وطن کیلئے دردسر بنے ہوئے ہیں ایسے نازک وقت میں ایک انتہائی جذباتی مسئلے کو چھیڑ کر ملک میں بسنے والی دوسری اکثریت کے جذبات کو برانگیختہ کرنا اور انکے مذہبی امور میں مداخلت کر کے انکے اندر اشتعال پیدا کرنے کی مذموم کوشش کرنا دانشمندی اور وطن دوستی دونوں کے منافی ہے۔ ہم اس موقع پر فاضل جج کے علم میں یہ بات لا دینا چاہتے ہیں کہ دین اسلام میں مذہبی مسائل کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کا تعلق عرف رسم ورواج یا شخصی اور مقامی حالات سے ہوتا ہے یہ مسائل عرف اور حالات کے بدلنے سے متاثر ہو سکتے ہیں اور احوال وظروف اور مکان وزمان کے تابع ضروری حد تک انہیں تغیر وتبدل ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ تغیر وتبدل بھی علماء راسخین ہی کر سکتے ہیں ہر کس وناکس کو شریعت اسلامی نے یہ حق نہیں دیا ہے۔ دوسرے وہ مسائل ہیں جو زمان ومکان، اشخاص واحوال اور حالات وظروف کے بدلنے سے قطعاً متاثر نہیں ہوتے یہ اسلام کے غیر متبدل قوانین ہیں جو نزول قرآن کے وقت سے قیامت تک کیلئے ہیں۔ ان میں کوئی تغیر اور تبدل خواہ کتنی ہی نیک نیتی سے کیا جائے وہ دین میں تحریف کہلائے گا اور اسلامی حیثیت سے بالکل ناقابل قبول ہوگا، تمام عبادات اور ازدواجی وعائلی مسائل اسی دوسری قسم میں داخل ہیں نکاح وطلاق کے ذریعہ جو چیزیں حلال وحرام، واجب اور مستحب ہوتی ہیں اور جن قیود وشرائط کے ساتھ ہوتی ہیں انہیں قطعاً کسی زمانی یا مکانی اور شخصی وقومی اختلاف کا کوئی اثر نہیں پڑیگا۔ لہذا شریعت اسلامیہ کی رو سے مطلقہ کا نان ونفقہ عدت گذرنے کے بعد شوہر کے ذمہ سے ساقط ہو جائیگا اب اگر کوئی شخص اس سے ہٹ کر کوئی فیصلہ کرتا ہے تو دین اسلام میں تحریف کرتا ہے جسے مسلمان کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ ان گذارشات کے بعد ہم حکومت ہند سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ مسلم پرسنل لا کی حفاظت وضیانت کے سلسلہ میں جلد از جلد دوٹوک فیصلہ کر کے مسلمانوں کو مطمئن کرے اور دستور فوجداری کے جس دفعہ کا سہارا لیکر مسلم پرسنل لا میں مداخلت کی گئی ہے چونکہ یہ دفعہ دستور ہند کی اس بنیادی دفعہ سے متعارض ہے جسمیں تمام مذاہب کے مذہبی امور کی حفاظت کی ضمانت دی گئی ہے اسلئے اس میں مناسب ترمیم کیجائے۔

امام طبریؒ کا
اصولِ تاریخ نویسی

(از مولانا قاضی اطہر مبارک پوری)

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری (ولادت ۲۲۴ھ وفات ۳۱۰ھ) رحمۃ اللہ علیہ اسلامی علوم و فنون کے اجلّہ ائمہ میں سے ہیں، فقہ، تفسیر، حدیث، قرأت اور تاریخ میں امامت کا درجہ رکھتے تھے، امام ذہبیؒ نے ان کو ائمۂ مجتہدین کے طبقہ سادسہ میں شمار کیا، اور امام نوویؒ نے تہذیب الاسماء واللغات میں ان کا شمار امام ترمذی اور امام نسائی کے طبقہ میں کیا ہے، یوں تو ان کی متعدد کتابیں ہیں مگر تاریخ طبری کو خاص مقبولیت و شہرت حاصل ہے، ان کی تفسیر کی عظمت و اہمیت اور افادیت کا اندازہ امام ابو حامد اسفرائینیؒ کے اس قول سے ہوتا ہے کہ اگر تفسیر طبری کے حاصل کرنے کے لئے کوئی شخص چین کا سفر کرے تو یہ کوئی بڑی اہم بات نہیں ہو گی۔ (تاریخ بغداد ۲ ص ۱۶۳)

ایک مرتبہ امام ابو بکر بن خزیمہؒ نے ابو بکر بن خالویہؒ سے پوچھا کہ آپ نے تفسیر ابن جریر طبری دیکھی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے اس کو اول سے آخر تک دیکھا ہے، میرے نزدیک روئے زمین پر اس وقت محمد بن جریر سے بڑا عالم کوئی نہیں ہے مگر حنابلہ نے ان پر بہت زیادتی کی ہے، ایک مرتبہ امام محمد بن اسحاق بن خزیمہ نے حسین بن علی تمیمی (المشہور بحسینک) سے پوچھا کہ آپ نے کس کس عالم سے علم حاصل کیا ہے؟ انہوں نے اپنے شیوخ و اساتذہ

کے نام بتائے، جب محمد بن جریر کا نام لیا تو حسینک نے نفی میں جواب دیا اور کہا کہ ابن جریر بغداد میں تھے اور حنابلہ کی رکاوٹ کی وجہ سے ان کے یہاں جانا مشکل تھا، یہ سنکر ابن خزیمہ نے کہا کہ اگر آپ ان سے حدیث کا سماع کر لیتے تو سب سے بہتر ہوتا۔

حنابلہ نے ان کی زندگی میں ان کے خلاف سخت فتنہ برپا کر کے ان کے علم کو روکا، ہمارے زمانہ میں امام محمد بن جریر طبریؒ کی تاریخ کے خلاف کچھ لوگ آواز بلند کر کے ان کو شیعہ رافضی ثابت کرنے کے چکر میں ہیں، کیوں کہ انہوں نے کربلا وغیرہ کے واقعات کو ان کے راویوں کی ذمہ داری پر نقل کر دیا ہے اور اپنی تاریخ کی ابتدا میں تاریخ نویسی کا یہ اصول صراحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے:

وليعلم الناظر في كتابنا هذا، ان اعتمادي في كل ما احضرتُ ذكره فيه مما شرطت اني راسمه فيه انما هو على ما رويتُ من الاخبار التي انا ذاكرها فيه والآثار التي انا مسندها الى رواتها دون ما أُدرِك بحجج العقول، واستُنبط بفكر النفوس الا اليسير القليل منه، اذ كان العلم بما كان من اخبار الماضين، وما هو كائن من انباء الحادثين غير واصل الى من لم يشاهدهم ولم يدرك زمانهم، الّا باخبار المخبرين ونقل الناقلين، دون الاستخراج بالعقول والاستنباط بفكر النفوس، فما يكن في كتابي هذا من خبرٍ ذكرناه عن بعض الماضين مما يستنكره قارئه او يستشنعه سامعه من اجل انه لم يعرف له وجهًا في الصحة، ولا معنى في الحقيقة فليعلم انه لم يؤتَ في ذلك من قِبلنا، وانما أُتي من قِبل بعض ناقليه الينا وانا انما ادّينا ذلك على نحو ما اُدّي الينا

(تاریخ طبری ج ۱ صفحہ ۸)

یعنی ہماری اس کتاب (تاریخ طبری) کو دیکھنے والے کو معلوم ہونا چاہیے کہ جو کچھ میں

نے اس کتاب میں ذکر کیا ہے اس میں میرا اعتماد صرف ان واقعات واخبار پر ہے جن کو میں نے ان کے راویوں کی سند سے بیان کر کے اپنی ذمہ داری ختم کر دی ہو۔ عقلی دلائل اور فکری استنباط سے کام نہیں لیا ہے صرف چند مقامات کو عقل و فکر کے معیار پر جانچا ہے، کیوں کہ ماضی کے واقعات و حوادث کا علم بعد والوں یا ان میں حاضر نہ ہونے والوں تک راویوں اور ناقلوں کے ذریعہ ہی پہنچتا ہے اور اسی بارے میں عقل و فکر کا دخل نہیں ہوتا اس لئے میری اس کتاب میں جو خبر ایسی ہو کہ اس کے پڑھنے والے یا سننے والے کو غیر معتبر و منکر، یا ناپسندیدہ و مکروہ معلوم ہو اور اس کے نزدیک اسکی صحت و معنویت ناقابل فہم ہو تو اس کو معلوم ہونا چاہئیے کہ یہ صورت ہماری طرف سے پیدا نہیں کی گئی ہے بلکہ راویوں اور ناقلوں کیطرف سے لائی گئی ہے، اور بطور امانت کے جیسی ہمارے پاس آئی تھی ویسی ہی ہم نے ادا کر دی ہے۔

دراصل مورخ کا کام تاریخ سازی نہیں بلکہ تاریخ نویسی ہے۔ ماضی کے واقعات کو ان کے مشاہدوں اور ناقلوں کے ذریعہ بیان کر دینا تاریخ نویسی ہے، اخبار و واقعات کی صحت و لغویت پر نقد و نظر مؤرخ کی ذمہ داری نہیں ہے، یہ دوسرے اہل فکر و نظر کا کام ہے۔ اور جیسا کہ امام طبری نے اپنی تاریخ کی ابتدا میں تصریح کی ہے، اسی اصول تاریخ نویسی پر اپنی کتاب مرتب کی ہے وہ ناقل ہیں ناقد نہیں ہیں، یہ پڑھنے والوں کا کام ہے کہ اپنی اپنی استعداد و بصیرت کے مطابق راویوں اور ناقلوں پر اعتماد کریں یا نہ کریں، اور واقعات کی صحت و واقعیت کے بارے میں غور و فکر سے کام لیں۔ تیسری صدی تک مورخین اور محدثین اسی اصول پر تاریخ اور حدیث کی کتابیں لکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ امام طبری نے واقعات کو اپنے سلسلہ سند کے ساتھ بیان کیا ہے اور سند کے رجال و رواۃ کی جرح و تعدیل نہیں کی ہے۔

امام طبری نے بعد میں اپنی تاریخ کا ذیل لکھا ہے۔ امام سخاوی لکھتے ہیں :-

ولہ علی تاریخہ ذیل، بل ذیل علی الذیل ایضاً، طبری کا اپنی تاریخ پر ذیل ہے بلکہ ذیل کا بھی ذیل ہے (الاعلان بالتوبیخ ص۱۴۴) بعد میں عبداللہ بن احمد بن جعفر فرغانی نے بھی اس کا ایک ذیل لکھا تھا۔

(معجم الادباء یاقوت ۶ ص۴۴۸)

اس کے بعد ایک جماعت نے تاریخ طبری کا تکملہ لکھا اور اپنے اپنے زمانہ تک کے واقعات اس میں درج کئے، مگر یہ لوگ تاریخ نویسی میں معتبر نہیں تھے ابن ندیم نے لکھا ہے۔ ص۳۱۶

وقد الحق بہ جماعۃ من حیث قطع الی زماننا ھذا، لا یُعوّل علی الحاقہم لانہ لیس ممن یختص بالدولۃ ولا بالعلم۔ یعنی تاریخ طبری جہاں تک ختم ہو گئی ہے اس کے بعد ایک جماعت نے ہمارے زمانہ تک کے حالات کا ذیل و تکملہ لکھا ہے، مگر ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ان کے مصنفین نہ حکومت سے متعلق تھے اور نہ وہ علم سے تعلق رکھتے تھے۔

محمد بن عبدالملک ہمدانی نے بھی تاریخ طبری کا ایک ذیل یا تکملہ لکھا ہے جس میں مقتدر کے زمانہ سے لیکر مستظہر کے زمانہ تک کے واقعات ہیں۔

الغرض تاریخ طبری پر بہت سے تکملے، اذیال، مختصرات اور الحاقات لکھے گئے ہیں، جو اسکی عظمت و مقبولیت کی دلیل ہے، حضرات محدثین رحمہم اللہ عام طور سے تاریخ طبری کی روایات کو اپنی شروح حدیث میں نقل کرتے ہیں اور اس پر کامل اعتماد رکھتے ہیں کیوں کہ وہ ان ہی کے اصول پر مرتب کی گئی ہے اور احادیث واخبار کی طرح حالات اور واقعات کو اس میں سند کے ساتھ بیان کیا گیا ہے پھر امام طبری طبقۂ فقہا دالمحدثین میں امامت و ثقاہت کے جس بلند مقام پر ہیں، کوئی دوسرا مورخ نہیں ہے اس لئے مغازی ابن اسحاق، اور مغازی موسیٰ بن عقبہ وغیرہ کے بعد سیر و مغازی کے سلسلے میں تاریخ طبری معتبر و مستند کتاب ہے اور علماء و محدثین نے اس پر کامل اعتماد کیا ہے، جب کہ بعد کے ذیل اور

الحاقات غیر معتبر مانے گئے جیسا کہ ابن ندیم نے لکھا ہے مگر ادھر پچھلے چند سالوں سے تاریخ طبری اور دیگر تاریخی کتابوں اور ان کے مصنفوں کے بارے میں طرح طرح کی بے سروپا باتیں لکھی جارہی ہیں۔ اور ان کو رافضی، غالی شیعہ اور غیر معتبر قرار دینے کی کوشش کی جارہی ہے کیوں کہ انہوں نے واقعات کربلا اور اموی دور خلافت کے واقعات کو ان کے راویوں اور ناقلوں کے ذریعہ درج کر دیا ہے، حالانکہ خود انہوں نے ایسے واقعات اور روایات کے بارے میں ابتدا ہی میں اپنی برأت ظاہر کر دی ہے اور اپنے کو صرف ناقل قرار دے کر تاریخ نویسی کے اصول پر ہر قسم کے واقعات ان کی سندوں اور راویوں کے ساتھ درج کر دیا ہے۔

ان کو غیر معتبر بنانے والوں میں اتنا علمی و فکری شعور نہیں ہے کہ وہ راویوں کی خود تحقیق کریں اور ان کے راویوں اور ناقلوں پر جرح و تعدیل کی رو سے کلام کریں، اور کمال نادانی اور انتہائی بیجا جسارت سے اپنی تاریخ کو غیر معتبر بناتے ہیں، اس حرکت میں آج کل کے بعض اچھے اچھے لکھے پڑھے لوگ مبتلا ہیں اور صرف تاریخ طبری ہی نہیں بلکہ اسلامی تاریخ کی مشہور و متداول کتابیں ان کے نزدیک غیر معتبر اور ان کے مصنف شیعہ اور رافضی ہیں، معلوم نہیں ایسے لوگ اسلامی تاریخ کے ان خزانوں کو چھوڑ کر کہاں سے تاریخی سرمایہ حاصل کریں گے؟ یہ درست ہے کہ تاریخ کی حیثیت ظنی ہے وہ کوئی یقینی علم نہیں ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تاریخ کا تمام ذخیرہ غیر معتبر مستند ہے۔

❁

قلب
طب و شرع کے آئینہ میں

(محمد ساجد بستوی، مدرس دارالعلوم اسلامیہ بستی (یوپی))

ابتدائیہ:— قرآن حکیم نے دعوت وپیغام کے موقع پر انسانی قلوب کو مخاطب کیا ہے جب کہ قدیم فلسفہ اور طب یونانی جملہ افعال و اعمال میں تحریکات دماغی کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں —— بہت پہلے سے یہ متضاد نظریہ ذہن نارسا میں سوالیہ نشان بنا ہوا تھا، اس سلسلہ میں بار بار سوچا اور سمجھا یہ غور و فکر فن کی اساسی کتب کی روشنی میں ہوا۔ اب ذیل کی چند سطریں اس امید پر پیش کی جارہی ہیں کہ شاید علمی حلقوں میں کچھ مفید ثابت ہوں۔

قلب کا پہلا اطلاق —— تشریحی وضاحت —— قلب صنوبری شکل کا سینہ میں ایک عضو ہے جس کا اکثری (⅔) حصہ بائیں جانب کو مائل ہے اس عضو میں سطحی طور پر ، دو حصے، راس اور قاعدہ پائے جاتے ہیں اندرونی طور پر یہ عضو تجویفی ہے جس میں خون کی گردش کیلئے چار مختلف حصے پائے جاتے ہیں قلب فضائے صدر میں ترچھے طور پر آگے کی جانب عَظْمُ الْقَصّ اور پسلی کی کریوں سے، پیچھے کی جانب اور طی، اجوف نازل اور سینے کے مہروں سے گھرا رہتا ہے، چونکہ قلب ہی جملہ ارواح کی جائے تولید اور منبع ہے اس لئے اس کی تشریح اور منافع الاعضائی حیثیت۔ اطباء کے یہاں کما حقہٗ زیر بحث آتی ہے۔

قلب کا دوسرا اطلاق —— تشریعی وضاحت —— قلب کا اطلاق ایک اور مفہوم پر بھی ہوتا ہے کہ یہ منجملہ عطاء خداوندی ایک روحانی قسم کا

لطیفۂ ربانی ہے۔ یہی فی الحقیقت جزئیات و کلیات کا مدرک اور عارف ہے، اسی سے اخروی حساب وکتاب اور سزا و جزار کا بھی تعلق ہے۔ اس تشریح کے اعتبار سے اس قلب معنوی کا قلب جسمانی کے ساتھ ایک گہرا تعلق اور ایک مخفی جوڑ ہے، لیکن اہل علم اس بارے میں متحیر ہیں کہ اس علاقہ کی نوعیت کیا ہے ــــــ ظاہر ہے اس کا تعلق غیرمادی دنیا سے ہے۔ اور ہمارے علم وادراک کی پونجی صرف اسی دنیا تک محدود ہے اس لئے اسکی وضاحت عام حالات میں دشوار، بلکہ ناممکن ہے ایسی باتوں کا تمام تر تعلق علم مکاشفہ سے ہے جو نہ زبان وقلم کی تعبیروں میں بسہولت لایا جاسکتا ہے اور نہ ہی عام اذہان سمجھنے پر قادر ہیں۔

قلب کی پہلی تشریح کا تعلق فن طب کے علم تشریح سے ہے کیونکہ ارواح ثلاثہ روح حیوانی، روح نفسانی، روح طبعی کی جائے پیدائش قلب ہی ہے[1]۔ آئندہ اس کی کچھ مزید لیکن مختصر تشریح کیجائے گی۔

قرآن وحدیث میں قلب کا ایک ذمہ دار کی حیثیت میں تذکرہ

صوفیاء کے دفاتر یا قرآن وحدیث کے ذخائر میں قلب کو کیوں مخاطب کیا گیا ہے۔ اسکی دو توجیہہ ممکن ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ اگر قلب کو اس کے دوسرے مفہوم میں لیں تو کوئی خلجان ہی نہیں رہتا کیوں کہ اہل تصوف کے نقطۂ نگاہ سے یہی قلب مخاطب و معاقب ہے،

---

[1] روح حیوانی کا مرکز قلب ہے روح طبعی کا مرکز جگر اور روح نفسانی کا مرکز دماغ ہے مطلق روح کی پیدائش دم لطیف سے ہوتی ہے پھر یہی روح تینوں مقامات میں تین ناموں سے موسوم کیجاتی ہے یعنی روح جب جسم کو فساد اور تعفن سے بچانے کا کام کرتی ہے تو اسے روح حیوانی کہتے ہیں اور جب روح سے تغذیہ وتنمیہ کا کام انجام پاتا ہے تو اسے روح طبعی کہتے ہیں اور جب وہ حس وادراک کی خدمت انجام دیتی ہے تو روح نفسانی سے موسوم کی جاتی ہے۔ (مدیر)

چنانچہ امام غزالیؒ اسی دوسرے مفہوم کو بیان فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"وهو المدرك العالم العارف من الانسان وهو المخاطب و المعاقب والمعاتب و المطالب"	ترجمہ:۔ انسان کا قلب ہی عالم و عارف ہے یہی مخاطب ہے دنیا و آخرت کی جزا و سزا اسی سے متعلق ہے اور اعمال و اشغال کے ذیل میں جوابدہی اسی کی ہے

۱) احیاء العلوم ج ۳

اور چونکہ اس قلب معنوی کا قلب محسوس جسمانی سے گہرا تعلق ہے۔ جیساکہ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

لها بهذا القلب الجسمانی تعلق (۱)	ترجمہ:۔ اس قلب معنوی اور اس قلب جسمانی میں ایک رابطہ ہے۔

اس لئے قرآن و حدیث کے بیشتر مقامات میں قلب جسمانی ہی کو مراد قرار دیا گیا ہے۔ جیساکہ ایک جگہ حدیث میں فرمایا گیا۔

"ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا وهی القلب۔" (الحدیث)

جسم انسانی میں ایک خونی لوتھڑا ہے جب وہ ٹھیک رہتا ہے تو سارا بدن ٹھیک رہتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا بدن ہی بگڑ جاتا ہے یاد رکھو وہ لوتھڑا دل ہی ہے یا جیساکہ ایک اور موقعہ پر جبکہ حضرت اسامہ نے ایک شخص کے لا الہ الا اللہ کہنے لینے کے باوجود اس کو قتل کر دیا تھا، پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا: "هلا شققت قلبه" تم نے اس کا دل چیر کر نہ دیکھا؟) تو شق قلب فی الواقع اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ اس سے قلب جسمانی مراد لیں اگرچہ مقصود، حضرت اسامہؓ کو ان کی لغزش پر متنبہ کرنا تھا، درحقیقت مقتول کے قلب کو چروانا پھڑوانا نہیں تھا۔ محاورہ میں بھی جو شخص عواطف و میلانات کا منکر ہو تامل کرنے کیلئے اس سے کہتے ہیں کیا تم نے میرا دل دیکھا ہے کہ انکار کر رہے ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ شرعی اطلاقات و بیانات کے موقع پر قلب کو مفہوم ثانی کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے جیساکہ ایک موقع پر

حدیث میں فرمایا گیا "ینام عینی ولا ینام قلبی" یعنی آنکھیں تو میری سو جاتی ہیں مگر دل نہیں سوتا، کیونکہ قلب جسمانی کو تو طول العمر سکون ہے ہی نہیں ـــــ البتہ بہ مفہوم ثانی جو ایک لدنیا نی فرحت انگیز کیفیت سے عبارت ہے اس کا تعلق شعور سے ہے جو اپنے ادراک میں بیداری کا پابند ہے مگر چوں کہ پیغمبر علیہ السلام کی قوت قلبیہ فوق الفطرۃ تھی اس لئے آپ کا ادراک و وجدان بحالت خواب بھی مثل بیداری باقی رہتا تھا۔ اور اسمیں تعجب بھی کیا ہے یہ تو ہمارا اور آپ کا مسلسل مشاہدہ ہے کہ بعض سونے والوں کے سر پر آپ چلاتے رہیے وہ کروٹ بھی نہ لیں گے جب کہ بعض ایسے ہوشیار سوتے ہیں کہ ان کے قریب سے بھی گزر جیئے تو فوراً بیدار ہو جائیں گے۔

رہا قرآن پاک میں۔ یااولی الابصار یا یااولی الالباب وغیرہ خطابات جس سے متبادر ہوتا ہے کہ مخاطب قلب نہیں بلکہ عقل ہے تو اول تو محققین کے یہاں یہی طے نہیں ہے کہ عقل کیا ہے اس کا محل کوئی مخصوص عضو جسمانی ہے یا یہ نقطہ کوئی معنوی فیض رحمانی ہے ـــــ صاحب قاموس نے عقل کے مختلف معانی کے نقل کر لینے کے بعد لکھا ہے کہ حق یہ ہے کہ ایک روحانی نور ہے جسکی بدولت نفس علوم ضروریہ و نظریہ کا ادراک کرتا ہے۔

اگر کسی نے کچھ نشاندھی بھی کی ہے تو اس کا محل ایک گونہ قلب کو بتایا ہے چنانچہ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں عقل کی بحث میں مختلف اقوال کو گناتے ہوئے اسد ابن المحاسبی کے قول کو سر فہرست رکھا ہے۔

فرماتے ہیں کہ: "انہ غریزۃ یتھیأ بھا ادراك العلوم النظریۃ وکانہ نور یقذف فی القلوب بہ یستعد لادراك الاشیاء (۳)

مطلب یہ ہے کہ عقل قدرت کیطرف سے ایک طبعی عطیہ ہے جس کے ذریعہ علوم نظریہ کے ادراک کی قوت پیدا ہوتی ہے گویا یہ ایک نور ہے جو قلب میں القا کیا جاتا ہے جس کے ذریعہ ادراک اشیا کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے ـــــ یا پھر یوں کہا جائے کہ مخاطب اول قلب ہے اور مخاطب ثانی یا مُظہر خطاب عقل ہے، جیسا کہ دوسری

توجیہ کے ذکر سے پیشتر چند تمہیدی سطروں کو ملاحظہ کر لینا مفید ہوگا۔
(اور یہ توجیہ حکماء و اطباء کے نظریات کی مخلوط تعبیر ہوگی۔)

جسم انسانی کے ابتدائی اعضاء ہضم میں مخصوص تغیرات کے نتیجہ میں نضج تام کے بعد جگر میں جو خون حاصل ہوتا ہے اس کا کچھ حصہ قلب کے تجویف ایمن (دائیں خانے) میں پہنچتا ہے یہاں سے منتقل ہو کر قلب کی تجویف الیسر (بائیں خانے) میں پہنچکر مزید پخت و پز کے بعد ایک لطیف جسم بخاری پیدا ہوتا ہے اس جسم بخاری کی لطافت کی وجہ سے اس کو روح سے موسوم کیا جاتا ہے اسی روح کو قدرت کیطرف سے ایک قوت عطا ہوتی ہے جسکو قوتِ حیوانیہ کہتے ہیں۔ یہی وہ قوت ہے کہ جو انسان کو فساد و تعفن سے محفوظ رکھتی ہے اسی روح پر دو مزید قوتوں کا فیضان ہوتا ہے یعنی قوت طبعیہ، قوت نفسانیہ ـــــ لیکن روح جب تک جوف قلب میں رہتی ہے ان موخرالذکر دونوں قوتوں کے اثرات ظاہر نہیں ہوتے، پھر اس روح کا کچھ حصہ دماغ کیطرف چلتا ہے جس کو مخصوص تغیرات کے بعد روح نفسانی کہا جاتا ہے اب اس وقت اس روح نفسانی کے اثرات یعنی احساس و تحریک وغیرہ افعال ظاہر ہونے لگتے ہیں، اسی طرح روح کا کچھ حصہ جگر کی طرف منتقل ہوتا ہے جس کچھ مخصوص تغیرات کے بعد روح طبعی کا نام دیا جاتا ہے اور اس سے بھی متعلقہ اعمال میں تغذیہ و نشوونما وغیرہ صادر ہونے لگتے ہیں۔

بدن انسانی میں جتنی بھی قوتیں پائی جاتی ہیں انہیں پر انسان کی بقا خواہ شخصی ہو یا نوعی موقوف ہوتی ہے اور جملہ افعال خواہ نفسانی ہوں، طبعی ہوں، یا حیوانی سب انہیں سے انجام پاتے ہیں اور چونکہ یہ قوتیں بقول حکماء صورت یا عرض ہیں، اور بقول اطباء کیفیت ہیں۔ اس لئے یہ قوتیں اپنے مطلوبہ افعال و تحریک کی انجام دہی کیلئے متعلقہ اعضاء تک پہونچنے میں کسی خادم اور حامل کی محتاج ہوتی ہیں کوئی اور نہیں بلکہ وہ خادم یہی ارواح ہوتی ہیں، پھر چونکہ ان قوتوں سے انجام پانے والے افعال خواہ ہضم غذا ہو یا ادراک شعور اور احساسات سبھی بواسطہ قویٰ ارواح

ہی پر موقوف ہوتے ہیں اور ارواح کی جائے تولید اور مرکز جیسا کہ بتایا گیا قلب ہے اور قلب ہی میں جملہ قوتیں بھی ارواح کو عطا ہوتی ہے اس لئے قرآن وحدیث میں قلب ہی کو مخاطب کیا گیا ہے کیونکہ یہ ارواح، قویٰ، اور جملہ افعال وتحریکات کے لئے اصل اور منبع ہے ــــ غرضیکہ قرآن وحدیث وطب یونانی میں کوئی تضاد نہیں ایک کا رخ، بنیادی محرک پر ہے اور دوسرے کی توجہ. اس محرک سے پیدا احوال وعوارض پر. اور ظاہر ہے کہ عوارض کا براہ راست تعلق. اسی چیز سے ہوتا ہے جسکی وہ کیفیت وہ نتیجہ ہے۔

عصر حاضر سے اسلامی اقدار کی مناسبت

محمد رحمت اللہ قاسمی کشمیری . دارالعلوم رحیمیہ بانڈی پورہ کشمیر

" عصر حاضر سے اسلامی اقدار کی مناسبت " کا مسئلہ آجکل جگہ جگہ موضوع بحث بن چکا ہے اور ایسی اہمیت اختیار کرچکا ہے کہ بین الاقوامی سطح سے لے کر ایک فرد کی نجی زندگی تک اس کا اثر پہنچ چکا ہے اس موضوع پر اس وقت خوب قلمی اور زبانی معرکے گرم ہو رہے ہیں. اور ہر شخص اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ " خالق عقل " اور " حکیم کل " کی بتلائی ہوئی راہ کو اختیار کئے بغیر یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا. وقت کے محدود ہونے کی بنا پر اس وسیع موضوع پر مکمل یا تفصیلی بحث تو اس وقت ناممکن ہے البتہ اپنی مختصر معلومات کے پیش نظر اس سلسلے میں کچھ باتیں گوش گزار کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

اسلام جن تعلیمات، عقائد، تہذیب و تمدن اور آسمانی اصولوں کو لے کر آیا ہے ان کے بارے میں خود اس نے اعلان کیا ہے کہ یہ کامل مکمل اور ابدی ہیں. حجۃ الوداع کے موقع پر اعلان عام ہوا کہ

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ۔ (پارہ ۶ مائدہ)

کہ آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کی۔

عـــہ مقالہ ہذا کو کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام منعقدہ سمینار میں پڑھا گیا تھا"

جب ان اصولوں کو کامل قرار دیا گیا تو ان کا ہر دور کی تمام ضرورتوں پر حاوی ہونا لازمی بن جاتا ہے تاکہ کوئی بھی شعبہ کسی بھی وقت تشنہ نہ رہے۔ چنانچہ زندگی کے ہر ہر موڑ پر رہنمائی کرنے والے اصول موجود ہیں اور صرف رہنمائی ہی نہیں کرتے بلکہ یہ زندگی کے نگراں بھی ہیں کہ غلط راہ پر گامزن ہونے سے روکتے ہیں بھی ساعی ہیں۔ آج کل اس بات کا دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ موجودہ سائنسی دور میں ان اصولوں پر عمل مشکل بلکہ ناممکن ہے اور دلیل میں اس وقت کے عام مسلمانوں کے حالات کو پیش کیا جاتا ہے لیکن یہ استدلال غلط ہے اگر کسی نظریہ کے ماننے والے اس نظریہ کے اصولوں کو اپنے لئے مشعل راہ نہیں بناتے اور ان کو اپنی زندگی میں نافذ نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ نظریہ یا مذہب یا اس کے اصول غلط ہیں، بلکہ اس کو اس مذہب کے ماننے والوں کی غلطی کہا جائے گا۔

اسلام وہ دین ہے جس نے انسان کے تمام انفرادی اور اجتماعی مسائل کا حل پیش کیا ہے۔ نیز مذہبی امور کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی اور اقتصادی ضروریات کی طرف بھی رہنمائی فرمائی ہے اور یہ رہنمائی ہر وقت اور ہمیشہ اس وقت ملتی ہے۔ جب اس کو تلاش اور طلب کیا جائے۔ سائنسی اور غیر سائنسی تمام ادوار میں اس کے اصول تعلیمات اور اقدار بالکل موزوں مناسب اور قابل عمل ہیں بلکہ میں نے اپنے اساتذہ سے شیخ الحدیث علامۂ انور شاہ کشمیری'' کا مقولہ بار ہا سنا ہے کہ فلسفۂ قدیم میں تو اسلامی نظریات کے ساتھ کہیں کہیں تضاد پایا جاتا تھا۔ لیکن فلسفۂ جدید اور سائنسی تحقیقات، اسلامی اقدار کی تائید ہی کریں گے۔ یہاں پر مجھے اتنے طویل مسائل کو زیر بحث لانا نہیں ہے البتہ نمونۃً دو تین اہم اسلامی اقدار کی موزونیت اور مناسبت بیان کرنے کی کوشش کروں گا، جو عام انسانیت سے متعلق ہیں۔

(۱) **تعلیم و تربیت**:- اسلام نے بنیادی طور پر تعلیم پر انتہائی زور دیا ہے۔ یہاں یہ بنیادی نقطہ ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ اسلام، تعلیم کو عبادت قرار دیتا ہے۔ ذریعۂ معاش یا تجارت نہیں جب

کے اس ماحول میں، جہاں تعلیم یافتہ افراد کا تناسب مشکل سے ایک یا دو فی صد تھا، دعوت ایمان کے بعد سب سے پہلے تعلیم کی طرف توجہ دلائی گئی اور تا ابد یہ پیغام باقی رہے گا۔

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (سورہ زمر پارہ ۲۳) — کیا علم والے اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟ (یعنی نہیں ہو سکتے)

اور کسی خاص مدد یا ... ت کیلئے یہ تاکید نہیں ہے، بلکہ ہر فرد کو اس کا مکلف قرار دیا گیا ہے، چاہے مرد ہو یا عورت، بوڑھا ہو یا جوان، جب تک معاشرے کے سو فی صد افراد علم سے بہرہ ور نہیں ہوتے تب تک یہ ذمے داری ختم نہیں ہو سکتی اور کسی خاص طبقے پر اس کی ذمے داری نہیں، بلکہ ہر آدمی اپنی اپنی جگہ پر اس بات کا جواب دہ ہے کہ وہ جو کچھ جانتا تھا۔ اس نے دوسروں تک اسے پہنچایا کہ نہیں؟ حضورؐ نے صاف اعلان فرمایا:

بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً (الحدیث) — اگر ہماری ایک ہی بات کا علم ہو تو اس کو دوسروں تک پہنچا دو!

نیز فرمایا:

بُعِثْتُ مُعَلِّمًا (الحدیث) — مجھکو معلم بنا کر بھیجا گیا۔

پھر صرف تعلیم ہی کو مقصد نہیں بتایا گیا، بلکہ واضح کر دیا گیا کہ عمل کے بغیر چارہ کار نہیں صرف بلند بانگ دعوؤں سے کچھ نہ ہوگا۔ بلکہ عملی طور پر اسکا مظاہرہ کرنا ہوگا غرض تربیت کو تعلیم کا جزو لاینفک قرار دیا گیا اس سلسلے میں سب سے پہلے اپنے اساتذہ، درسگاہوں، کتابوں، تعلیم کے انتظام میں معاون افراد حتیٰ کہ کاغذ کے پرزوں تک کی تکریم اور احترام کرنے کو کہا گیا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عجز انکساری، محنت کشی اور تحمل کی عادت پیدا کرنے کی از حد تاکید کی گئی، اپنے اسلاف میں اسکی لاتعداد مثالیں موجود ہیں۔ دور نہ جائیں ابھی سات آٹھ سال قبل اس عالم فانی سے رخصت ہونے والے، اپنے ہی وطن کشمیر کے

مایۂ نازفرزند علامہ محمد صدیق کشمیریؒ کے بارے میں پڑھا ہے کہ صرف روٹی جیب میں لاکر رکھتے تھے اور جونہی موقع ملتا کھالیتے یہی انکی کل غذا تھی۔ اپنے وقت کی بچت کے پیش نظر سالن کے استعمال کو ترک ہی کردیا تھا۔ علمی دنیا نے ان کو امام النحو کا خطاب دیا تھا۔

امام جلیل امام ابو حنیفہؒ جن کو دنیا امام اعظم کے نام سے پکارتی اور پہچانتی ہے کے بارے میں ان کے استاذ حضرت حمادؒ کی ہمشیرہ عاتکہ فرماتی ہیں کہ امام صاحب ہمارے گھر کی روئی دھنتے تھے۔ دودھ ترکاری لاکر دیتے اور بہت سارے کام کیا کرتے تھے۔ آج یہ حقیقت ہمارے سامنے ہے کہ حماد کے گھر کا یہ خادم تمام عالم کا مخدوم بن گیا۔

مشہور امام فخر الدینؒ کو مرو میں دیکھا گیا کہ بادشاہ ان کی بہت تعظیم کرتا اور آپ باربار فرماتے کہ میں نے عزت اور سلطنت محض استاد کی خدمت سے پائی۔ کیونکہ میں اپنے استاد قاضی امام ابوزید دبوسی کا تیس سال تک متواتر کھانا پکاتا رہا اور خود ادب کی وجہ سے اس میں سے کچھ بھی کھانے کی جرأت نہ کرتا تھا۔

شمس الائمہؒ حلوائی فرماتے ہیں کہ ہم کو علم جو بھی حاصل ہوا۔ اس میں علم کی عظمت کو بڑا دخل ہے یہ کبھی کتاب کیا سادہ کاغذ تک کو بھی بغیر وضو کے نہیں چھوتے تھے۔

اپنے اسلاف کی یہ چند مثالیں۔ تعلیم و تربیت کی آپ کے سامنے پیش کردیں۔ اگر اسلام کی اسی قدر کو عام کیا جائے اور اسی پر عمل کی کوشش کیجائے تو دور حاضر کے تمام مدارس کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کیا اسٹرائکوں اساتذہ کرام کی بے حرمتیوں اور املاک کے نقصان کی بدعت جاری رہ سکتی ہے؟ پھر کیا مردم سازی اور علم دوستی کی وہ فضا دوبارہ عود نہیں کرسکتی ہے۔ جس پر معاشرے کی اصل بنیادیں تعمیر ہوتی ہیں اور جس کے نتیجے میں قابل تقلید سلطنتیں اور اچھوتے ماحول وجود میں آتے ہیں۔

(۲) **ایثار:** اسلام کی ایک اہم قدر ایثار ہے۔ پہلے تو ہم ہر متنفس کا حق الگ الگ بیان کیا گیا۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ (النساء پارہ ۵)

اور تم اللہ کی عبادت اختیار کرو۔ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اور اہل قربت کے ساتھ بھی اور یتیموں غریب غربا، پاس والے پڑوسی، ہم مجلس، راہ گیر اور ان کے ساتھ بھی جو تمہارے امکانہ قبضے میں ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں کہ راہ گیروں تک کا حق بیان کیا گیا پھر کچھ حقوق ایسے ہیں جو آپسی عقود اور معاملات کی وجہ سے لازم ہوجاتے ہیں ان میں بھی اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ یہ عقود بھی آپسی تعلق اور محبت بڑھانے میں معاون ہوں۔ مثال کے طور پر کسی چیز کو بیچا جارہا ہے۔ گاہک اس کو اُدھار خریدنا چاہتا ہے گاہک کی وقتی مجبوری اور ضرورت کے پیش نظر اس کو ادھار خریدنے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن اس بات کا پابند بنایا گیا کہ وقت متعین کرے کیوں کہ ادائے گی کا وقت متعین و معلوم ہوگا۔ تو کسی قسم کے تفرقے یا نزاع کا اندیشہ نہیں ہوگا۔ ہر ایسا معاملہ جسمیں نتیجۃً جھگڑے یا اختلاف کا امکان ہے اس کو غلط قرار دیا جائے گا۔ یہاں یہ بات بھی معلوم رہے کہ شریعت کے جزوی احکام بھی اپنے اندر مستقل اصولوں کو سموئے ہوئے ہیں، اسی وجہ سے یہاں پر اصول اس بات کو قرار دیا گیا کہ اجل مجہول پر جسکی ادائے گی کا وقت معلوم نہ ہو، قرضہ دینا ناجائز ہے۔ غرض حقوق چاہے کیسے بھی ہوں ان کی ادائے گی پر زبردست زور دیا گیا۔ مشہور حدیث شریف ہے کہ جناب رسول کریم ؐ نے صحابہ اکرام رضؓ سے معلوم کیا کہ بتاؤ مفلس کون ہے؟ عرض کیا کہ ہم مفلس اس کو کہتے ہیں جس کے پاس مال و دولت روٹی کپڑا اور مکان نہ ہو۔ فرمایا: نہیں وہ مفلس نہیں میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز خوب سارے اعمال کے ساتھ حاضر ہوگا۔ لیکن اس نے بے شمار حقوق پامال کئے ہوں گے حق داروں کے حقوق کے عوض

میں حسب اس کے اعمال تقسیم کئے جائیں گے تو اس کے تمام اعمال ختم ہو جائیں گے لیکن لوگوں کے حقوق پھر بھی باقی رہیں گے۔ لہٰذا حق داروں کے گناہ بقدر حقوق اس کے اوپر لادے جائیں گے جس سے یہ آخر کار جہنم رسید ہوگا۔ اَعَاذَنَا اللہُ مِنْہُ۔

حقوق کی ادائے گی پر ہی بس نہیں کیا گیا بلکہ مزید ایثار کا حکم دیا گیا۔ اور ایثار کرنے والوں کو سراہا گیا۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

(سورہ حشر۔ پارہ ۲۸)

(اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ خود فاقے میں ہوں) ان اصولوں کے اثرات کیا ہوئے تاریخ ان واقعات سے بھری پڑی ہے خود آقائے دوجہاں ایک موقع پر اعلان فرما رہے ہیں کہ اگر کسی کا مجھ پر کوئی حق ہے، یا کسی پر زیادتی ہوئی ہے تو وہ مجھ سے دنیا ہی میں بدلہ لے لے۔ ایک جاں نثار صحابیؓ نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اپنا مطالبہ پیش کیا تو پیارے نبیؐ نے مطالبے پر اپنے بدن مبارک سے کرتا ہٹا کر اُس کے سامنے پیش کیا اور اس صحابیؓ نے مہر نبوت کو چوم کر اپنی دلی مراد حاصل کر لی۔ اور ایثار کی مثالیں تو زبان زد عوام و خواص ہیں۔

اس بات میں حضرت ابوجہم ابن حذیفہؓ کی روایت ہی کافی ہے کہ یرموک کا معرکہ زوروں پر ہے۔ میدان کارزار گرم ہے پانی ساتھ لے کر ابوجہم اپنے چچازاد بھائی کو تلاش کرنے کے بعد اس حال میں پاتے ہیں کہ وہ دم توڑ رہے ہیں اور جانکنی شروع ہے جونہی پانی پلانے کا ارادہ کیا تو قریب سے کسی قریب المرگ نے آہ کی چچازاد بھائی نے اشارہ کیا کہ پہلے ان ہی کو پانی پلاؤ ان کی خدمت میں پانی لے کر حاضر ہوئے پلانا ہی چاہ رہے تھے کہ تیسرے کی آہ سُنائی دی، ان صاحب (جو حضرت ہشام ابن العاصؓ تھے) نے اُسی آدمی کے پاس جانے کا اشارہ کیا۔ پانی لے کر وہاں پہنچے تو وہ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے واپس پہلے دونوں صحابہؓ کے پاس آئے تو ان کی روحیں بھی پرواز کر چکی تھیں۔ خدا رحمت کند ایں

عاشقانِ پاک طینت را! کیا انتہا ہے اس ایثار کی کہ آخری گھڑی میں ان اللہ کے پیاروں نے جان، جان آفریں کے سپرد کردی، لیکن ایثار کے اپنے نشان کو نہ چھوڑا جذبہ ایثار پیدا کرنے کیلئے ہی اموال میں غریبوں اور مستحق لوگوں کا حق، زکوٰۃ، صدقہ فطرہ، اور عشر وغیرہ کی صورت میں متعین کردیا گیا۔ اور حتی الامکان غریبوں پر ایثار کیلئے آمادہ کیا گیا۔ کیوں کہ ممکن تھا کہ اس طبقے کو سماج میں پس ماندہ، غریب اور کمزور ہونے کی وجہ سے نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ اس کیلئے مختلف قسم کی صورتیں اختیار کی گئیں۔ ایک چھوٹی سی مثال پر غور فرمائیں، میوے کے درخت پر جب تک میوہ ظاہر نہ ہو اور آفات سے محفوظ نہ ہو جائے تب تک مالک باغ کو فروخت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ظاہر ہے جب خود فروخت نہیں کر سکتا، تو اس کی حفاظت کا انتظام کرے گا، تا کہ نقصان سے میوہ محفوظ رہے اور یہ رکھوالی کرنے سے خود قاصر ہے لہٰذا لامحالہ اس کو کسی ایسے شخص کو تلاش کرنا ہے جو اس کے باغ کی رکھوالی کا کام انجام دے سکے۔ اور یہ رکھوالی ایک غریب شخص ہی کر سکتا ہے۔ اس طرح سے غریب کیلئے روزگار کی صورت پیدا کی گئی۔ یہیں سے وہ الزام بھی دور ہوتا ہے جو اسلام پر سرمایہ داری کی طرف داری کے سلسلے میں لگایا جاتا ہے، غریبوں کی رعایت تو اسلام میں اتنی ہے کہ صاحب ثروت پر ہی یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ بغیر مطالبے کے مستحقین تک انکا حق پہنچا دے، کسی کے مانگنے کا انتظار نہ کرے۔ اگر کوئی مستحق مل گیا جس نے اس کا صدقہ یا زکوٰۃ قبول کیا۔ تو اس کا احسان مانے کہ اس نے قبول کر کے فریضے کی ادائے گی میں میرا تعاون کیا۔ ذرا غور فرمائیے۔ کس قدر حکمت اختیار کی گئی ہے ساتھ ہی دورِ حاضر کے اس نظریئے پر بھی نظر ڈالئے جو غریبوں کے حقوق کے تحفظ اور ان کو اپنا مقام دلانے کے دعوے کر رہا ہے کہ انھوں نے جو اختیار کیا ہے اسکی وجہ سے سرمایہ دار اور غریب کے درمیان کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہو کر دشمنی پر منتج ہوتی ہے اور باہمی اعتماد ختم ہو جاتا ہے اسلام کے نقطہ نظر سے آپ نے دیکھ لیا کہ خود سرمایہ دار، غریب تک اس کا حق پہنچاتا ہے پھر احسان مند بھی ہوتا ہے دورِ حاضر

میں اگر اسلام کی یہ قدر عام ہو جائے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کیجائے تو کیا رشوت، ڈکیتی، چوری، دھوکہ دہی، حق تلفی، اور لوٹ مار کا یہی دور دورہ رہیگا جو آج ہماری نظروں کے سامنے ہے جسکی وجہ سے پوری دنیا بے چینی، بداعتمادی، مس وفازت اور معرکہ اور باہمی لڑائی جھگڑے میں مبتلا ہے۔

(۳) مساوات:- اسلام کی ایک اہم قدر معاشرتی شعبے کا نظریۂ مساوات ہے۔ اسلام کی یہ قدر کتنی عظیم جامعیت اور حکمت کی حامل ہے تمام انسانوں کی مساوات کا اعلان کر کے انسانیت کا سر اونچا کر دیا گیا۔

حضور اکرم کا ارشاد ہے۔

لا فضل للعربی علی العجمی (الحدیث)

کسی عربی کو عجمی پر فوقیت نہیں۔

گویا۔ قوم، نسل، رنگ اور ملک کی بنار پر کسی پر فوقیت حاصل نہیں، ہاں فضیلت اور شرف کا مدار تقویٰ پر ہے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ (پارہ ۲۶ سورہ حجرات)

تم میں سب سے معزز اللہ کے نزدیک وہ ہے جو زیادہ متقی ہو۔

ذات پات، چھوت چھات، قومیت اور رنگ و نسل کے امتیاز کو سرے سے ختم کر دیا گیا۔ اس موقع پر آپ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں میں بھی تو خاندان اور قبائل کا رواج ہے اور اسلام نے بھی ان پر کوئی نکیر نہیں کی، تو عرض کروں گا کہ اس کا جواب خود اللہ تعالےٰ نے دے دیا۔

جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا (پارہ ۲۶ سورہ حجرات)

کہ ہم نے خاندانوں اور قبائل میں تم کو تقسیم کیا۔ تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔

خاندانوں اور قبائل کا ہونا فی نفسہٖ ضروری تھا۔ ایک ہی گھر میں جب تین چار برہ موجود ہیں تو ایک دوسرے کو پہچاننے کیلئے نام الگ الگ رکھے جاتے ہیں، یہی فرق کر لئے کافی ہے لیکن جب الگ محلے میں پہنچیں گے تو کئی شخصوں کے نام ایک جیسے

ہوتے ہیں۔ وہاں پر فرق خاندان کے اعتبار سے ہوگا اور اسی طرح قصبوں اور شہروں کا رخ کریں تو قبائل کا اعتبار ہوگا، غرض یہ محض تعارف اور پہچان کا ذریعہ ہیں، پھر آپ یہ بھی اعتراض کرسکتے ہیں کہ اسلام نے نکاح میں کفو اور خاندان کا اعتبار کیا ہے کیا یہ مساوات کے منافی نہیں ہے؟ میں جواباً کہوں گا، وہاں پر کفو کا اعتبار افضلیت کے لئے نہیں کیا گیا۔ بلکہ ازدواجی کو آسان اور بہتر بنانے کیلئے ایک اہم ضرورت کی تکمیل کی گئی ہے اسی وجہ سے اس کفائت میں صنعت وحرفت، نسب مہر و نفقہ (مال) اور دیانت کو ہی معتبر مانا گیا غرض مزاج، رہن سہن اور طرز زندگی میں یکسانیت اور توافق پیدا کرنے کے لئے کفائت کا اعتبار کیا گیا اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کی زندگی تلخ اور اجیرن بن جاتی۔ شریعت نے انسان کی فطرت کے عین مطابق یہ حکم جاری کیا ہے۔ اگر یہ حکم نہ ہوتا تو حالت ناگفتہ بہ ہوتی اور ایک شادی شدہ جوڑے کو نازک مراحل سے دو چار ہونا پڑتا۔ رہا نفس ہنر کا معاملہ۔ تو اسلام نے نفس ہنر کو حقیر نہیں جانا۔ خود صاحب شریعت علیہ السلام نے اپنے جوتے گانٹھے۔ صحابہ کرام پتھر توڑتے تجارت کرتے۔ محدثین اور مفسرین میں سے آپ کسی کو مٹھائی کا کاروبار کرنے والا کسی کو عطریات کا اور کسی کو ٹوپی بننے والا پائیں گے اگر کسی ہنر کی تحقیر کیجاتی تو یہ حضرات خود ان کو اختیار کیوں کرتے اور ایسا الزام کون دے سکتا ہے کیوں کہ اسلام نے اس نو مسلم تک کو، جو قبل اسلام اپنے یہاں کسی ادنیٰ سے ادنیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا سینے سے لگایا اس کا اکرام کیا ابتداءِ اسلام میں تو یہاں تک حکم تھا کہ غیر مسلم جس مسلمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتا۔ اسی کے خاندان کا فرد شمار کیا جاتا حتیٰ کہ غلاموں کو، جن کو سوسائٹی میں درندوں اور پالتو جانوروں سے بھی ادنیٰ تصور کیا جاتا تھا۔ گلے سے لگایا۔ ان کو اس ذلت سے رہائی دلانے کی، انتہائی کوشش کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ایک آدمی قسم کھا کر توڑ دیتا ہے تو اس کا کفارہ شریعت میں غلام کو آزاد کرنا ہے۔

فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ   اس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو

مِنۡ اَوۡسَطِ مَا تُطۡعِمُوۡنَ اَهۡلِيۡكُمۡ اَوۡ كِسۡوَتُهُمۡ اَوۡ تَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ (مائدہ، پارہ ۷)

کھانا کھلائے، وہ درمیانی کھانا جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑا پہنانا ہے یا ایک غلام کو آزاد کرنا (مفہوم)

اسی طرح اگر کوئی یمین ظہار کرتا ہے اور اس سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تو اس کفارہ میں سب سے پہلے غلام کو تلاش کرنا ہے تاکہ اس کو آزاد کر کے کفارہ ادا کر سکے۔

وَالَّذِيۡنَ يُظٰهِرُوۡنَ مِنۡ نِّسَآئِهِمۡ ثُمَّ يَعُوۡدُوۡنَ لِمَا قَالُوۡا فَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّتَمَآسَّا (سورہ مجادلہ پارہ ۲۸)

اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں، پھر اپنے کہے کو توڑتے ہیں، تو قبل اس کے ایک غلام کو آزاد کرنا ہوگا۔ (مفہوم)

اگر کوئی روزہ رکھ کر توڑ دیتا ہے تو اس کا بھی کفارہ یہی ہے۔ غلام آزاد کرے چنانچہ اسلام کی بدولت۔ دنیا کا ٹھکرایا ہوا۔ یہ طبقہ سلطنتوں پر بھی قابض ہو گیا۔ بڑے بڑے محدث، مفکر، فقیہ اور علماء ان میں پیدا ہوئے۔

خلیفہ عبدالملکؒ ایک مرتبہ حج کیلئے گئے اس وقت کے مایۂ ناز علماء میں سے امام زہریؒ تھے ان سے ملاقات ہوئی دوران گفتگو عبدالملکؒ نے سوال کیا کہ مکہ میں اس وقت سب سے بڑے عالم کون ہیں امام زہریؒ نے موالی میں سے کسی کا نام بتا دیا۔ خلیفہ نے پوچھا مدینہ منورہ میں کون تو جواب میں یہاں بھی کسی موالی کا نام بتایا گیا۔ غرض تمام مشہور جگہوں کے بارے میں یہی جواب ملا کہ وہاں کے امام وقت فلاں شخص ہیں جو (موالی) غلاموں میں سے ہیں عبدالملکؒ نے جب پوچھا کہ کوفہ میں کون ہے؟ تو امام از زہریؒ نے فرمایا کہ وہاں پر امام ابراہیم نخعیؒ ہیں پوچھا یہ کس خاندان سے ہیں؟ جواب ملا قریش سے بادشاہ نے ذرا سانس لیا اور کہا کہ میں تو یہ سمجھنے لگا تھا کہ اب تو اس شرف سے موالی ہی مشرف ہیں۔ یہاں پر اس اشکال کا ... دور کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جو آپ حضرات کے ذہنوں میں اٹھ رہا ہوگا کہ مرد اور عورت

کے تعلقات کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر شاید مساوات کے منافی ہے، کیونکہ قرآن نے اعلان کیا ہے۔

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَآءِ مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل ہے

(پارہ ۵ سورہ النساء)

لیکن مرد اور عورت کے بارے میں اسلام نے جو حد بندیاں کی ہیں، وہ مساوات کے منافی نہیں۔ بلکہ عین انصاف اور مساوات پر مبنی ہیں، ورنہ معاشرے میں عجیب قسم کی مطلق العنانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ نیز اس مسئلے کو سمجھنے کیلئے ہمیں ذرا مڑ کر دیکھنا ہوگا کہ عام تہذیبوں اور مذاہب نے عورت کو کیا مقام دیا تھا۔ اور اسلام نے اس بارے میں کیا حکم دیا۔ قدیم زمانے میں عورت کی حیثیت یہ تھی کہ اس کو جوئے میں بلا تکلف ہرا دیا جاتا۔ شراب کے چند گھونٹوں کیلئے بطور معاوضہ عورت کی خرید و فروخت ایک سہل ترین تدبیر تھی۔ بلکہ عورت اس عالم رنگ و بو میں ایک ایسی غلیظ چیز تھی، جسے بے محابا زندہ درگور کیا جاتا رہا۔ اس کو طفل نابالغ اور باندیوں کا درجہ دیا جاتا تھا۔ اسلام کے نظریات پر توجہ کیجئے، اسلام نے عورت کے مقام کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ حضورؐ کا ارشاد ہے؟ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے یا عورت میں حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی گئی تو ان کے دفاع کیلئے قرآن کریم میں سورت نازل ہوئی۔ نیز اس عورت کا واقعہ مشہور ہے جس کی شکایت پر پوری سورت مجادلہ نازل ہوئی، معصوم بچیوں کے قتل ناحق کو حرام قرار دیا گیا۔ ان کو عزت اور احترام کے ساتھ قیمتی سرمائے کی طرح پردے اور حفاظت میں رکھنے کی تاکید کی گئی ان کو مرد کی زرخرید محکوم نہیں بلکہ مشیر رفیقۂ حیات اور وزیر کا درجہ دیا گیا یہ ہے عورت کی عزت۔ عظمت اسلام میں کہ خود خدائے کائنات ان کی معمولی گذارشات پر بھی اپنی رحمتوں کے ساتھ متوجہ ہیں اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام ہی نے صنف نازک کو خاک سے طاق پر پہنچا دیا۔ جب کہ اس صنف نازک کو دنیا کی قوموں نے بلندیوں سے پستیوں کی طرف دھکیل دیا تھا۔ بیوہ کے حق کو آج کوئی تسلیم کرنے

کو تیار نہیں بلکہ بعض قومیں بیوگی کو نحوست تصور کرتیں ہیں اسلام نے بیوہ کے ساتھ نکاح کو پسندیدہ قرار دیا حضور ﷺ کی تمام ازدواج مطہرات بیوہ تھیں، سوائے ایک کے اسلام نے عورتوں کے ساتھ ایسا مشفقانہ برتاؤ کیا، ان کو اس منزل پر لا بٹھایا جس کی نظیر نہیں[۵] اسلام کی چند اقدار کو نمونے کے طور پر آپ کے سامنے اجمالی طور پیش کیا گیا اور اس کے ضمن میں کچھ جزئیات بھی آپ کے سامنے آئیں یہ اقدار ہر زمانے میں رہیں ہیں اور رہتی آئیں ہیں. آج کل بھی ان کا وجود ہے لیکن ذرا کم. اسی وجہ سے آج کی دنیا بے چین ہے، پوری انسانیت آج اطمینان اور سکون کی متلاشی ہے سکھ کیلئے سرگرداں اور حیران و پریشان ہے کبھی اس مقصد کے حصول کیلئے بین الاقوامی ملکی اور ملی سطحوں پر کانفرنسیں ہو رہی ہیں، کہیں کونسلیں بنائی جارہی ہیں اور کہیں مشاورتیں ہورہی ہیں. لیکن میں اتنا عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مسائل نہ کانفرنسوں سے حل ہوں گے. نہ ظاہری معاہدوں سے بات بنے گی. نہ ایسی مشاورتوں سے کوئی نتیجہ برآمد ہوگا. بلکہ اگر دنیا کو امن و چین اور سکون کی ضرورت ہے گورے اور کالے کے اختلاف کو حل کرنا ہے ملکی اور غیر ملکی نزاع کو رفع کرنا ہے ذات پات، چھوت، چھات کے فرق کو مٹانا ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور یہ نسخہ کوئی نیا نہیں بلکہ آزمودہ اور مجرب ہے اور اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں کہ ان اسلامی اقدار کو اپنی اصلی صورت اور طرز کے ساتھ عام کیا جائے اور ان کو اپنایا جائے یہ اب سے ہزار سال پہلے کے حالات کا آپ اندازہ لگائیں جب معاملات بھی محدود تھے. مواصلات بھی محدود، تجارت بھی محدود، ہر خطہ اور ہر بستی کی اپنی ایک الگ دنیا تھی اس ماحول میں جب ان اقدار کو اپنایا گیا تو دنیا نے دیکھ لیا اور ہم، آپ، سب جانتے ہیں

---

[۵] اس مسئلے پر تفصیل کے لئے راقم کے کتابچہ " اذان بلال" کو دیکھئے، جس کا اکثر حصہ اسی کے ساتھ خاص ہے ۱۲

کہ پوری دنیا نے اطمینان کا سانس لیا، اور امن وچین کی زندگی نصیب ہوئی آج جبکہ مشرق ومغرب کا راستہ قریب سے قریب تر ہوچکا ہے ہزاروں مہینوں کی مسافت طے کرنے کیلئے چند منٹ یا گھنٹے صرف ہوتے ہیں پوری دنیا مثل ایک گھر کے ہوگئی ہر ایسے حالات میں ان اقدار کو زیادہ اپنانے کی ضرورت ہے اور زیادہ سے زیادہ ان پرعمل پیرا ہونے کی حاجت ہے تاکہ پوری دنیا اطمینان اور آتشی کا گہوارہ بن جائے لیکن شرط یہ ہے کہ ان اقدار کو انکی اصلی حالات پر بغیر کسی ترمیم اور تغیر وتبدیل کے اپنایا جائے کیوں کہ یہ خود ہی کامل اور مکمل ہیں۔ اسلام کی یہ وہ انسانی اقدار ہیں۔ جن میں کسی مذہب فرقے یا قوم کا اختلاف تقریباً نہیں ہے نہ ہی ان میں اجتہاد وتجدید کی ضرورت ہے اور نہ ہی قدامت وتجدد کا سوال ہے۔ ان امور کو اپنی زندگی میں نافذ کرنے کے سلسلے میں حسب ذیل صورتیں اختیار کیجا سکتی ہیں۔

(۱) مدرسوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں اخلاقی تعلیم کو رائج کرانے کی کوششیں کیجائیں۔

(۲) ہندوستان اور کشمیر میں تعلیم بالغان (Adult Education) کا پروگرام چل رہا ہے۔ اس میں بھی اس تعلیم کا انتظام کردیا جائے۔

(۳) ذرائع ابلاغ اور نشر واشاعت میں ان چیزوں کو موثر اور مثبت پیرائے میں عوام کو سمجھانے کی کوشش کیجائے۔ (۴) سرکاری وغیر سرکاری تمام تعلیمی اداروں میں ہر مذہب کے طلبا رکیلئے ان کے مذہب کے مطابق ایک ایک مستند ومعتبر عالم کا تقرر کیا جائے جو ان کو مذہبی طور پر بھی ان کی جانب مائل کرے (۵) ہر قصبہ یا محلے میں ایک ایک انجمن یا کمیٹی قائم ہو جس میں وہاں کے علماء اور حکماء کے علاوہ مقامی ذمہ داران کو شامل کیا جائے تاکہ ان امور کے نفاذ میں دشواری نہ ہو۔ اور ان کمیٹیوں یا انجمنوں کی ضلعی، صوبائی اور قومی سطح پر ایک مرکزیت ہو جو کہ کم از کم ہر ماہ ان انجمنوں اور عام معاشرے کے عملی کام کا جائزہ لیا کرے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ (آمین)

مولانا حفظ الرحمن قاسمی قسط ۲

حسد اور اسکے مہلک اثرات قرآن وحدیث کی روشنی میں

ماہرین کا خیال ہے کہ حسد کے آثار بچپن سے ہی رونما ہوتے ہیں اور عمر کے ساتھ ساتھ وہ بھی نشو ونما پاتے رہتے ہیں اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسمیں والدین کا اہم کردار ہوتا ہے اگر والدین نیک وصالح اور تعلیم یافتہ ہوں، خویش و بیگانوں میں محبت و الفت اور بغض وحسد سے نفرت وعداوت رکھتے ہوں تو ان کی اولاد میں مثبت اثرات پیدا ہوتے ہیں ان میں خیر غالب اور شر مغلوب ہوتا ہے کیوں کہ ان کے والدین ان کی صحیح تربیت کرتے ہیں. انہیں بچپن ہی سے اس بات کی تعلیم دیتے ہیں کہ وہ اپنے بڑوں کے ساتھ اکرام وتعظیم کا معاملہ کریں. چھوٹوں کے ساتھ محبت وشفقت سے پیش آئیں دوسروں کا اگر بھلا نہ کرسکیں تو بھلا ضرور چاہئیں. اور اگر کسی کی شان میں کوئی گستاخی ہوجائے تو فوراً ان سے معافی کے طلبگار ہوں اور اگر خود انہیں کسی سے شکایت ہو تو عفو ودرگذر سے کام لیں وغیرہ وغیرہ. یہی اسلام کی تعلیم ہے،

رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :

" احب لاخیك ما تحب لنفسك ، وعامل الناس بما تحب ان یعاملوك به " یعنی جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو وہی اپنے بھائی کیلئے بھی پسند کرو، اور لوگوں کے ساتھ وہی برتاؤ کرو جس کے تم اپنے لئے ان سے خواہاں ہو. یہ وہ نسخہ کیمیا و آسمانی علاج ہے جو نہ صرف یہ کہ تمام خرابیوں اور برائیوں کو جڑ سے ختم کردیتا ہے بلکہ ایک دوسرے کیلئے دلوں میں وسعت ومحبت وہمدردی کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے جس سے

ایسا صالح وستھرا معاشرہ وجود میں آتا ہے جسکی زبانیں گرچہ مختلف ومتعدد ہوتی ہیں لیکن ان کی آواز ایک اور صرف ایک ہی ہوتی ہے وہ ہے "برا نہ کہو، نہ چاہو اور نہ دیکھو" اس کے برعکس اگر والد خود حسد کے مرض میں مبتلا ہوں تو اولاد "الولد سر لابیہ" کے مطابق "کریلا و نیم چڑھا" کا صحیح مصداق ہوتی ہے ان میں برے عادات وخصائل پروان چڑھتے ہیں، بغض وحسد کو فروغ ملتا ہے اس لئے وہ اپنی ساری انرجی وتوانائی مثبت راہ کے بجائے منفی راستوں میں صرف کرتی ہے حتی کہ وہ سوءظنی، سب وشتم اور فقرے بازی جیسے حرکات شنیعہ بھی گریز نہیں کرتے جس سے سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع فرمایا ہے حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا " المسلم من ، سلم المسلمون من لسانہ ویدہ الخ : مسلمان وہ شخص ہے جسکی زبان اور ہاتھ سے کسی دوسرے مسلمان کو کوئی گزند نہ پہونچے (بخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضؓ بخاری میں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا " من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلا یؤذ جارہ ومن کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ ومن کان یومن باللہ و الیوم الآخر فلیقل خیرا او لیصمت " جس کو حق تعالےٰ اور قیامت کے دن پر ایمان ہو وہ اپنے ہمسایہ کو تکلیف نہ پہنچائے، مہمان کی خاطر و مدارات کرے اور بری بات منہ سے نہ نکالے بلکہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا " ای عائشۃ ان شر الناس منزلۃ عند اللہ من ترکہ او ودعہ الناس اتقاء فحشہ " اے عائشہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک وہ آدمی سب سے برا ہے جسکی بدزبانی کی وجہ سے لوگ اس کو کچھ نہ کہیں اور برائیوں پر خاموش رہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث الخ " بدگمانی کرنے سے

بچو، کیوں کہ بدگمانی سب سے بدتر جھوٹ ہے اس زمانہ میں یہ مرض بہت عام ہوگیا ہے ساری خرابی و بیماری اسی بدظنی سے پھیل رہی ہے حتیٰ کہ مدارس و خانقاہیں جیسی خالص اصلاحی جگہیں بھی اس مرض سے محفوظ نہیں ہیں۔ الامان الحفیظ۔

حسد کی ممانعت

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات روز روشن کیطرح عیاں ہو گئی کہ حسد شیطان کا نہ صرف ہتھیار ہے بلکہ اسکی مرغوب غذا ہے جسکے ذریعہ وہ انسانی شکار کرتا ہے مگر کتنا افسوس کا مقام ہے کہ آج ہم اسی ہتھیار و غذا کا استعمال خود اپنے لئے اور اپنے بھائیوں کیلئے کرتے ہیں، جس سے سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع فرمایا ہے۔ سنن ابی داؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا: "ایاکم والحسد" تم حسد کے مرض سے بچو اس لئے کہ فان الحسد یاکل الحسنات کما تا کل النار الحطب" حسد آدمی کی نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ سوکھی لکڑی کو جلا دیتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ سے بخاری و مسلم میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث، ولا تجسسوا ولا تجسسوا ولا تناجشوا ولا تحاسدوا ولا تباغضوا ولا تدابروا وکونوا عباد اللہ اخوانا" تم دوسروں کے متعلق بدگمانی سے بچو، کیوں کہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے تم کسی کی کمزوریوں کے ٹوہ میں بھی نہ رہا کرو اور جاسوں کی طرح رازدارانہ طریقے سے کسی کے عیب معلوم کرنے کی کوشش بھی نہ کیا کرو اور نہ ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کی بے جا حوص کرو، آپسمیں حسد کرو اور نہ بغض وکینہ رکھو اور حق تعالےٰ کے بندے و بھائی بھائی ہوجاؤ۔

ایک اور حدیث میں رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے" دبّ الیکم داء الامم قبلکم، الحسد والبغضاء والبغضۃ" ھی الحالقۃ، لااقول حالقۃ الشعر ولکن حالقۃ الدین" تم سے پہلی ... امتوں کی ایک بیماری

تم لوگوں میں منتقل ہو گئی ہے وہ بیماری حسد اور بغض ہے یہ بیماری دین کو تباہ کر دیتی ہے یعنی حسد سے ایسے اقوال و افعال سرزد ہوتے ہیں جو اس کے دین کو تباہ کرنیکا سبب بن جاتے ہیں۔

صحیحین میں حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" لا تباغضوا و لا تحاسدوا و لا تدابروا وکونوا عباد اللہ اخوانا، ولا یحل لمسلم ان یھجر اخاہ فوق ثلاث لیال یلتقیان فیعرض ھذا و یعرض ھذا وخیرھما الذی یبدأ بالسلام" تم آپس میں کینہ کپٹ اور بغض وحسد مت رکھو اور اللہ کے بندے بھائی بھائی ہوجاؤ اور کسی شخص کیلئے یہ جائز نہیں ہے کہ اگر خدا نخواستہ کسی مسلمان بھائی سے شکر رنجی ہوجائے تو تین روز سے زیادہ بول چال بند رکھے۔ جب کسی جگہ آمنا سامنا ہوجائے سلام و ملاقات کا موقع ہو تو ایک اپنا منہ ادھر پھیرلے دوسرا اپنا منہ دوسری طرف پھیرے اور، دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام و ملاقات میں پہل کرے۔

ایک جگہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ" کاد الفقران یکون کفرا وکاد الحسد ان یغلب القدر"

اسی طرح آپ نے ارشاد فرمایا: "اخوف ما اخاف علی امتی ان یکثر فیھم المال فتتحاسدون و یقتتلون " میں اپنی امت کیلئے سب سے زیادہ خطرناک چیز مال و دولت کو سمجھتا ہوں اسلئے کہ اگر ان میں اسکی فراوانی و بہتات ہوگئی تو وہ آپس میں ایک دوسرے سے بغض وحسد کرنے لگیں گے۔ اور پھر مرنے مارنے کیلئے تیار ہوجائینگے۔

ترمذی شریف کی حدیث ہے حضرت ابوہریرہ اسلمی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یامعشر من آمن بلسانہ ولم یدخل الایمان قلبہ، لا تغتابوا ولا تتبعوا عوراتھم فان من اتبع عوراتھم یتبع اللہ عورتہ، ومن یتبع اللہ عورتہ یفضحہ فی بیتہ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: "ایاکم وسوء ذات البین فانها الحالقة" - امام ترمذیؒ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں "سوء ذات البین" بغض وحسد کو کہتے ہیں اور "الحالقة" کے معنی ہیں دین کو ضائع کر دینے والی چیز گویا سوء ذات البین سے دین و دنیا دونوں کا بیڑا غرق ہو جاتا ہے ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "ان لنعم الله اعداء، فقیل من هم، فقال: الذین یحسدون علی ما آتاهم الله من فضله" کچھ لوگ اللہ کی نعمتوں کے دشمن ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ وہ کون لوگ ہیں آپ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو دوسرونکی نعمت وفضیلت جسکو محض اپنے فضل وکرم کی بنا پر اللہ تعالے نے انہیں عطا فرمائی ہے دیکھکر جلتے ہیں۔

حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو یوم حساب سے ایک سال قبل ہی جہنم میں پہونچ جائیں گے۔ جنہیں ایک حاسد بھی ہوگا جو صرف حسد کی بنا پر اس سزا کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ سنن ابی داؤد میں حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے جسمیں رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اتعرف هذه الدیار فقلت. ما اعرفنی بها و باهلها، هذه دیار قوم اهلکم الله البغی والحسد" کیا تم اس جگہ سے واقف ہو، راوی نے کہا مجھے نہیں معلوم کہ یہ کیا جگہ ہے اور یہاں کون لوگ آباد تھے۔ ارشاد ہوا یہ وہ جگہ ہے جس کے باشندے بغض وحسد کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئے۔

مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا "تفتح ابواب الجنة یوم الاثنین و یوم الخمیس فیغفر لکل عبد لا یشرک بالله شیئا الا رجلا کانت بینه و بین اخیه شحناء فیقال. انظروا هذین یصطلحا" دوشنبہ اور جمعرات کو جنت کے دروازے کھولدیئے جاتے ہیں پھر مشرک کے علاوہ ہر شخص کی مغفرت کی جاتی ہے مگر اس شخص کی مغفرت نہیں کی جاتی جو اپنے بھائی سے دشمنی وحسد رکھتا ہو، پھر فرشتوں سے کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کو جو آپسمیں کینہ رکھتے ہیں، چھوڑے رکھو یہاں تک کہ آپسمیں صلح وصفائی کریں۔

...ممانعت حسد سے ممانعت کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ جو شخص حسد کرتا ہے وہ سب سے پہلے تو اللہ تعالےٰ کے نظام ربوبیت پر نکتہ چینی کرتا ہے ...عو باللہ یہ خیال کرتا ہے کہ خدا نے خود اسے اس نعمت سے محروم رکھکر اس کے ساتھ ...نا انصافی کی ہے کیوں کہ وہ دوسرا شخص اس کے خیال کے مطابق خود اس کے مقابلے اس نعمت کا اہل نہ تھا. گویا وہ شخص جو اس نعمت، خوبی یا فضیلت سے بہرہ ور ہے ...ہے اور اس شخص کے مقابلے میں حاسد خود زیادہ اہل، لائق اور ہنرمند ہے. نعوذ باللہ ظالم ہے کہ اس نے مستحق نعمت کے مقابلے میں ایک غیر مستحق کو انعام و اکرام سے نوازا! دوسرے لفظوں میں وہ اللہ تعالےٰ کی اس تقسیم سے ناراضگی کا اظہار کرتا ہے جو ...طلق نے اپنے دوسرے بندوں پر فرمائی ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے: "الحاسد عدو ...نعمتی، متسخط لقضائی غیر راض بقسمتی التی قسمت بین عبادی" حاسد ...ی نعمت کا دشمن اور میرے فیصلہ کا منکر ہے نیز میری اس تقسیم پر جو میں نے اپنے بندوں ...فرمائی ہے چراغ پا ونالاں ہے ظاہر ہے کہ ایک عبد، بندے اور غلام کا یہ منصب ...ں ہے کہ وہ اپنے آقا کی تقسیم پر اعتراض کا خیال بھی دل میں لائے۔

...سد کے اثرات ونتائج حسد درحقیقت ایک بہت بڑی روحانی بیماری ہے جس کا تعلق انسان کے قلب سے ہے۔ جیسا کہ ...ے بیان کیا گیا کہ حسد، غرور، تکبر، باہمی عداوت اور خباثت نفس سے پیدا ہوتا ہے نیز ...سری بہت سی اخلاقی بیماریوں کے پیدا کرنے کا سبب بھی بنتا ہے۔

...فرادی نقصان حسد سے پیدا ہونے والی برائیوں اور اس کے مہلک اثرات پر اگر ہم ذرا گہری نظر ڈالیں تو غالباً یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ حاسد ...سان خدا سے بغاوت کرنے کے جرم کا مرتکب ہوجاتا ہے اور ایک باغی کی سزا جو ہوتی وہ ہم سب جانتے ہیں چنانچہ سب سے پہلی سزا تو حاسد کو یہ ملتی ہے کہ وہ اپنے مالک ...نظر کرم سے محروم ہو جاتا ہے دنیا میں رسوائی و ناکامی اس کا مقدر بن جاتی ہے، اور

عاقبت میں سزائے جہنم ہے۔

ایک حاسد شخص، اپنے محسود کو جس سے حسد کرتا ہے نقصان پہونچا سکے یا نہ پہنچا سکے لیکن خود اپنے کو ضرور نقصان پہونچاتا ہے اور وہ اس طرح کہ اس کے اپنے نفس میں ایک آگ سی لگی رہتی ہے جو ہمہ وقت جسم و جان کو جلاتی رہتی ہے اسکی جو تمنائیں اور آرزوئیں ہوتی ہیں وہ قانون خداوندی "و یابی اللہ الا ان یتم نورہ"، کے پیش نظر پوری نہیں ہو پاتیں اور محرومی کا غم اسے کھائے جاتا ہے اور وہ ہمہ وقت ایک سرگردانی کی کیفیت سے دوچار رہتا ہے قناعت و آرام کی زندگی کو رخصت کرکے ہر وقت خلش اور دنیاوی کوفت میں مبتلا رہتا ہے اسی کی تصویر کھینچتے ہوئے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے

اصبر علی مضض الحسو ٭ د فان صبرک قاتلہ
النار تا کل بعضہا ٭ ان لم تجد ما تا کلہ

حاسد کو ایک دم نہیں راحت جہاں میں ٭ رنج حسد ہے، جان ہے جبتک کہ جان میں

کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جب اسکی ساری کوششیں بلکہ سازشیں محسود کو نقصان پہونچانیکی بیکار جاتی ہیں تو اس پر دہ جادو، ٹوٹکے اور منتر کرانے پر اتر آتا ہے جسکا ارتکاب بالآخر کفر کا سبب بن جاتا ہے اور اسکی تمام نیکیاں آخرت کے نقطہ نظر سے رائگاں بیکار اور ضائع ہو جاتی ہیں۔

اجتماعی نقصان حسد کا یہ فساد خود حاسد کی اپنی ذات تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ حاسد اپنے آپکو منعم علیہ کے مقابلے میں اسی نعمت کا زیادہ مستحق سمجھکر اپنے اور افعال کے ذریعہ معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے اسکی زبان شکوہ و شکایت کی زبان بن جاتی ہے اسکی ظاہری اور باطنی قوتیں اور صلاحیتیں صحیح عمل سے معطل ہو کر غلط عمل میں لگ جاتی ہیں اور دوسروں کا ذہن اسکی باتوں سے بیجا طور پر متاثر ہوتا ہے جس کا بالآخر یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ معاشرے

سے باہمی کریمانہ اخلاق مٹتا جاتا ہے باہمی اخوت، رواداری، ہمدردی اور چشم پوشی ختم ہونے لگتی ہے۔ اور معاشرے کے افراد ایک دوسرے سے باہمی کینہ، بغض و حسد رکھنے کے سبب بچھو کی خاصیت اختیار کر لیتے ہیں کہ موقع ملے تو ڈنک ماریں اور نقصان پہونچائیں ایسا معاشرہ فلاح سے بے بہرہ اور امن وسکون اور محبت وسلامتی سے ناآشنا ہوجاتا ہے جس کے سبب ایک اچھا معاشرہ جو کبھی کبھی باغ و بہار اور ہنستی کھلتی اور مسکراتی کلیوں کا گلزار تھا وہ بغض و عداوت، رسہ کشی و ریشہ دوانیوں کا شکار ہوکر انسانی معاشرہ کہلانے کا بھی مستحق نہیں رہتا، جسکی بہترین منظرکشی قرآن کریم کی اس آیت "تحسبھم جمیعًا وقلوبھم شتی، ذالک بانھم قوم لا یعقلون" میں کی گئی ہے

شریعت نے اسی واسطے ان چیزوں کا بڑا اہتمام کیا ہے اور ہر پہلو سے اسکی خرابی کو تبلایا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں بھی اور تمام امت مسلمہ کو بھی اس انسانیت سوز مہلک مرض سے بچنے کی توفیق ارزانی عطا فرمائے اور ایک دوسرے کی مدد، حسن سلوک الفت ومحبت کی دولت سے بہرہ ور فرمائے۔ آمین۔

پانچویں قسط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منطق وفلسفہ
ایک علمی وتحقیقی جائزہ

مولانا اطہر حسین قاسمی بستوی

باب چہارم تحقیقی جائزہ

علوم عقلیہ کی عظمت تمام عالم اسلام پر پانچویں صدی ہجری کے بعد ہی سے چھائی ہوئی ہے اس کے سرتاپا معقول ومدلل اور محکم ومبرہن ہونے پر عام طور پر اتفاق رہا ہے اس کے بارے میں درسی وعلمی حلقوں میں جس قدر غالیانہ اور مبالغہ آمیز عقیدت قائم رہی ہے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جو ان علوم سے ناآشنا ہو اس کو دیگر علوم وکمالات سے متصف ہونے کے باوجود جاہل اور احمق سمجھا جاتا رہا ہے اور عرصہ تک ہندوستان میں ان کو دانشمندی اور ان کی کتابوں کو کتب دانشمندی کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے اس غلو اور عقیدت کے خلاف ردّعمل بھی تدرتی امر ہے اور ناممکن ہے کہ اہل حق اور ارباب بصیرت علماء ومفکرین ان کا نوٹس نہ لیں اس لئے آئندہ اوراق میں ہم ان علوم کا تحقیقی طور پر تحلیل وتجزیہ پیش کر رہے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اب انشاء اللہ ان کے بارے میں کوئی معتدل رائے قائم کیجائے گی اور ان کو ان کا صحیح حق اور صحیح مقام دیا جائے گا۔ لیجئے پہلے منطق کا تجزیہ ملاحظہ فرمائیے۔

منطق

منطق سے دماغی ورزش ہوتی ہے

منطق ایک طرح کی ذہنی ورزش اور دماغی

ریا ضت ہے اس سے تشحیذِ ذہن کا کام لیا جا سکتا ہے اگر اس کو اسی حد تک رکھا جائے تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں[۱]!

وایضاً فانّ النظر فی العلوم الدقیقۃ یفتق الذھن ویدرّبہ ویقوّیہ علی العلم فیصیر مثل کثرۃ الرمی بالنشاب ورکوب الخیل تعین قوۃ الرمی والرکوب وان لم یکن ذالک وقت قتال وھذا مقصد حسن	نیز علوم دقیقہ میں غور مطالعہ ذہن سے کھلتا ہے اور اس کی مشق ہوتی ہے اور علم کی طاقت حاصل ہوتی ہے جس طرح سے تیراندازی اور شہسواری کی مشق سے نشانہ ٹھیک ہو جاتا ہے اور گھوڑے کی سواری آسان ہو جاتی ہے اور لوگ جنگ سے پہلے بھی ان چیزوں کی مشق کرتے ہیں، یہ ایک اچھا مقصد ہے۔

(الرد علی المنطقیین ص۲۵۵)

٭ ٭ ٭ ٭

منطقی طریقہ بعضوں کیلئے نفع بخش ہے

بعض لوگوں کی ذہنی ساخت اور افتاد طبع ایسی واقع ہوتی ہے کہ ان کو مقدمات کلامیہ و منطقیہ کے بغیر تشفی نہیں ہوتی، ان کو اسی سے فائدہ پہنچتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ علم و یقین ان طریقوں پر منحصر ہے بلکہ وہ ایک دماغی کیفیت ہوتی ہے جو خاص ماحول و تربیت اور نفسانی حالات کی وجہ سے بن جاتی ہے چنانچہ حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"بعض لوگوں کا یہ حال ہے کہ طریقۂ استدلال جس قدر دقیق اور خفی ہوتا ہے اور اس کے مقدمات جتنے کثیر اور طویل ہوتے ہیں اسی قدر ان کے لئے نفع بخش ثابت ہوتے ہیں اس لئے کہ انہیں باریک امور میں طویل غور و فکر کی عادت پڑ چکی ہوتی ہے جب کوئی بات یا دلیل قلیل المقدمات ہوتی

---

[۱] وایضاً فان النظر فی

ہے یا بہت واضح اور جلی ہوتی ہے تو ان کو اس سے خوشی اور تسکین نہیں ہوتی، ایسے لوگوں کے مقابلہ میں کلامی اور منطقی طریقہ استدلال کو استعمال کرنے میں مضائقہ نہیں اس لئے نہیں کہ مطلوب کا علم اس پر موقوف ہے بلکہ اس لئے کہ یہ اس کے حال کے مناسب ہے کیوں کہ اس طرح کے لوگوں کو جب ایسی چیزیں معلوم ہوتی ہیں جو عوام کو معلوم ہیں اور غیر ذہین لوگ بھی اس کو سمجھ سکتے ہیں تو ان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی اور ان کو کوئی علمی امتیاز حاصل نہیں ہوا وہ طبعی طور پر ایسے دقیق اور غامض مسائل کو جاننا چاہتے ہیں جو کثیر المقدمات ہوں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ بیشک یہ راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے" (الرّد علی المنطقیین صہ ۲۵۵)

منطق سے زبان وبیان میں تنگی ہوجاتی ہے

منطق سے اکثر اوقات یہ نقصان پہنچتا ہے کہ طبیعت کی جولانی اور زبان وخیالات کی روانی میں رکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے۔

اسی لئے جو لوگ منطقیانہ اصول وقواعد کی پابندی کرتے ہیں ان میں ژولیدہ بیانی مشکل پسندی واغلاق اور ایک طرح کی ذہنی کجی ہوجاتی ہے چنانچہ متاخرین کے متون اور پچھلے دور کی نصابی کتابیں اس کا واضح نمونہ ہیں، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

وَمَازَالَ نُظَّارُ الْمُسْلِمِیْنَ یُعِیْبُوْنَ طَرِیْقَ اَھْلِ الْمَنْطِقِ وَیُبَیِّنُوْنَ اَنَّھَا مِنَ الْعِیِّ وَاللُّکْنَۃِ وَقُصُوْرِ الْعَقْلِ وَعِجْزِ الْمَنْطِقِ وَیُبَیِّنُوْنَ اَنَّھَا اِلٰی اِفْسَادِ الْمَنْطِقِ الْعَقْلِیِّ وَاللِّسَانِیِّ اَقْرَبُ مِنْھَا اِلٰی تَقْوِیْمِ ذَالِکَ۔ (الرّد علی المنطقیین، صہ ۱۶۷)

مسلمان اہل نظر ومناظرہ شروع سے اہل منطق پر کڑی تنقید کرتے رہے کہ اس سے اشتغال کرنے والوں میں اکثر یہ عیب پیدا ہوجاتا ہے کہ بے تکلف اظہار خیال نہیں کرسکتے ان کی زبان و قلم میں بندش اور رکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے ذہن اپنا پورا کام نہیں کرتا اور زبان

نہیں دیتی اور وہ اس بات کو واضح
کرتے رہے کہ بجائے ذہن اور زبان
کی ترقی وتقویت کے اکثر یہی دیکھا گیا
ہے کہ اس نے ذہن اور زبان کو نقصان
پہنچایا ہے۔

ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ دوسری جگہ رقمطراز ہیں:-

إِذَا اتَّسَعَتِ الْعُقُوْلُ وَتَصَوُّرَاتُهَا اتَّسَعَتْ عِبَارَاتُهَا وَإِذَا ضَاقَتِ الْعُقُوْلُ وَالتَّصَوُّرَاتُ بَقِيَ صَاحِبُهَا كَأَنَّهُ مَحْبُوْسُ الْعَقْلِ وَاللِّسَانِ كَمَا يُصِيْبُ أَهْلَ الْمَنْطِقِ الْيُوْنَانِيِّ تَجِدُهُ مِنْ أَضْيَقِ النَّاسِ عِلْمًا وَبَيَانًا وَأَعْجَزِهِمْ تَصَوُّرًا وَتَعْبِيْرًا وَلِهٰذَا مَنْ كَانَ مِنْهُمْ ذَكِيًّا إِنْ تَصَرَّفَ فِي الْعُلُوْمِ وَسَلَكَ مَسْلَكَ أَهْلِ الْمَنْطِقِ طَوَّلَ وَضَيَّقَ وَتَكَلَّفَ وَتَعَسَّفَ وَغَايَتُهُ بَيَانُ الْبَيِّنِ وَإِيْضَاحُ الْوَاضِحِ مِنَ الْعِيِّ وَقَدْ يُوْقِعُهُ ذٰلِكَ فِي أَنْوَاعٍ مِنَ السَّفْسَطَةِ الَّتِيْ عَافَى اللّٰهُ مِنْهَا مَنْ لَمْ يَسْلُكْ طَرِيْقَهُ۔ (الرد علی المنطقیین ص۱۶۷)

یہ قاعدہ ہے کہ جب عقول وتصورات میں وسعت ہوتی ہے تو عبارتوں میں پیدا ہوجاتی ہے اور عقول وتصورات میں تنگی ہوتی ہے تو عبارتوں میں بھی تنگی پیدا ہوجاتی ہے تو دماغ تنگ اور تصورات محدود ہوجاتے ہیں۔ انسان ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ عقلی اور لسانی طور محبوس ہے جیسے کہ منطق یونانی سے اشتغال کرنے والوں کو اکثر پیش آتا ہے۔ تم دیکھو گے کہ وہ اپنے علم وبیان میں بڑے تنگ دامن اور اپنے تصور وتعبیر میں بڑے عاجز نظر آتے ہیں اسی لئے ان میں جو ذکی ہوتا ہے جب وہ علوم میں تصرف کرتا ہے اور اہل منطق کا راستہ اختیار کرتا ہے تو طویل وتضییق اور تکلف ومشقت کرنے لگتا ہے اور زیادہ سے

ؔ یقیناً بعض اطفال ایسے بھی گذرے ہیں جو نابغۂ علم وحکمت ہیں۔ باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ

زیادہ اس کا کارنامہ یہ ہوتا ہے کہ ایک معلوم چیز کو بیان اور ایک واضح چیز کو زیادہ واضح کردے اور اس کا نتیجہ ہے کہ منطق کے اشتغال سے بعض اوقات وہ سفسطہ اور حقائقِ اشیاء کے انکار کے مرض میں مبتلا ہوجاتا ہے جس سے وہ لوگ محفوظ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے راستے پر چلاتا ہے۔

منطق دماغی تکان اور کثرت ہذیان کا سبب ہے

منطقی حدود تعریفات نہ پورے طور پر جامع ومانع ہوتی ہیں نہ فنی طور پر مکمل، ان میں طویل پُرپیچ، پُرتکلف اور مرعوب کن باتیں ہوجاتی ہیں، جن کا اثر اضاعت وقت، دماغی تکان اور کثرتِ ہذیان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور بعض اوقات گمراہی، جہالت آفرینی اور نفاق تک کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں!۔

انہماک رکھنے اور ان علوم میں درجۂ امامت تک پہونچنے کے باوجود بڑے شگفتہ قلم خوش تحریر اور ادیب واقع ہوئے مثلاً ابن سینا جس کا قصیدہ عربیت کا عمدہ نمونہ اور جس کی تحریروں میں اہل منطق وفلسفہ کے برخلاف حلاوت وبلاغت پائی جاتی ہے تو یہ درحقیقت اس کے اسلامی وعربی ادب ولٹریچر سے اشتغال کا فیض اور مسلمانوں کے علوم وآداب سے فائدہ اٹھانے کا نتیجہ ہے ورنہ اگر وہ اپنے پیشروؤں کے راستہ پر چلتا اور مسلمانوں کے علوم وآداب سے اعراض کرتا تو اس کی عقل وزبان بھی ان ہی کی طرح کوتاہ اور قاصر نظر آتی۔ (الرّد علی المنطقیین صہ۱۹۹)

وَصَارُوْا يُعَظِّمُوْنَ أَمْرَ الْحُدُوْدِ وَيَدَّعُوْنَ أَنَّهُمْ هُمُ الْمُحَقِّقُوْنَ لِذٰلِكَ وَأَنَّ مَا يَذْكُرُهُ غَيْرُهُمْ مِنَ الْحُدُوْدِ إِنَّمَا هِيَ لَفْظِيَّةٌ لَا تُفِيْدُ تَعْرِيْفَ الْمَاهِيَةِ وَالْحَقِيْقَةِ . بِخِلَافِ حُدُوْدِهِمْ وَيَسْلُكُوْنَ الطُّرُقَ الصَّعْبَةَ الطَّوِيْلَةَ وَالْعِبَارَاتِ الْمُتَكَلَّفَةَ الْهَائِلَةَ وَلَيْسَ لِذٰلِكَ فَائِدَةٌ إِلَّا تَضْيِيْعُ الزَّمَانِ وَإِتْعَابُ الْأَذْهَانِ وَكَثْرَةُ الْهَذَيَانِ وَدَعْوَى التَّحْقِيْقِ بِالْكِذْبِ وَالْبُهْتَانِ وَشَغْلُ النُّفُوْسِ بِمَا لَا يَنْفَعُهَا بَلْ قَدْ يُضِلُّهَا عَمَّا لَا بُدَّ لَهَا مِنْهُ وَإِثْبَاتُ الْجَهْلِ الَّذِيْ هُوَ أَصْلُ النِّفَاقِ فِي الْقُلُوْبِ وَإِنْ ادَّعَوْا أَنَّهُ أَصْلُ الْمَعْرِفَةِ وَالتَّحْقِيْقِ

(الرد علی المنطقیین ص۱۳)

اہل منطق حدود منطقیہ کی اہمیت میں بڑا مبالغہ کرتے ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ وہ فن کے محقق ہیں اور یہ کہ ان کے علاوہ دوسرے علماء جو حدود بیان کرتے ہیں وہ لفظی ہوتی ہیں، اور حقیقت و ماہیت کو پورے طور پر بیان نہیں کرتیں۔ بخلاف ان کے حدود کے حالانکہ یہ اہل منطق بڑے دشوار اور طویل راستے اختیار کرتے ہیں اور بڑی پر تکلف اور مرعوب کرنے والی عبارتیں استعمال کرتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ سوائے اضاعت وقت دماغی تکان، کثرت ہذیان اور دعویٰ تحقیق ولاف زنی کے اس کا کوئی فائدہ نہیں، یہ لوگوں کو ایسی چیزوں میں مشغول کرتے ہیں جو کچھ مفید نہیں بلکہ بعض اوقات گمراہی اور جہالت آفرینی کے سوا جو قلوب کے نفاق کا ذریعہ ہے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا اگرچہ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ معرفت اور تحقیق کی بنیاد ہے۔

منطق دینی و الٰہی حقائق کے بارے میں بے بس ہے

منطق کے بارے میں ایک غلو شروع سے چلا آرہا ہے کہ جس طرح اس کے اصول و قواعد کو معقولات میں فیصلہ کن اور حکم تسلیم کیا جاتا ہے اسی طرح دینی و الٰہی حقائق کے بارے میں بھی اس سے بے تکلف کام

لیا جاتا ہے اور اس کے فیصلہ کو تسلیم کیا جاتا ہے لیکن یہ نہیں سوچا جاتا کہ اگر منطق کو ایک میزان و ترازو کا بھی درجہ دیدیا جائے تو اس کا کام اور اس کا دائرہ عمل، بہر حال محدود ہی رہے گا، اس پر حقائق دینیہ کو تولنا ایسا ہی ہوگا جیسے لکڑی، سیسہ اور پتھر تولنے کے ترازو پر سونے چاندی اور جواہرات کو تولا جائے۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ تحریر فرماتے ہیں :-

"اتنی بات مسلّم ہے کہ لکڑی اور سیسہ اور پتھر کو تولنے کیلئے جو ترازو بنائے گئے ہیں ان پر سونے چاندی کو نہیں تولا جاسکتا۔ نبوت کا معاملہ اور انبیاء علیہم السلام جن حقائق کو لے کر آتے ہیں وہ علوم میں اس سے کہیں زیادہ رفیع اور نازک ہیں جتنا کہ سونا مالیات میں ہے تمہاری منطق اس کیلئے میزان نہیں بن سکتی اس لئے کہ اس میزان میں جہل وظلم دونوں جمع ہیں یا تو وہ ان کے وزن و درجہ سے واقف نہیں اور ان کو وزن کرنے کی اور ان کی حیثیت بیان کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں لہٰذا جاہل ہے یا وہ حق کا انکار کرتی ہے اور اس کو قبول نہیں کرتی لہٰذا ظالم ہے حالانکہ علم نبوت حق ہے جس کا طبائع انسانی کے پاس کوئی بدل نہیں اور نہ ان علوم سے کسی کو استغنا رہے۔ بلکہ اسی پر نوع انسان کی سعادت منحصر ہے۔ (نقض المنطق ص۱۶۴)

اس موقع پر نامناسب نہ ہوگا کہ نویں صدی کے ایک دوسرے سلیم الطبع اور نقاد عالم ابن خلدون کا ایک اقتباس پیش کردیا جائے جو بالکل اسی معنی و مفہوم کو ادا کرتا ہے، وہ عقل کے محدود ہونے اور اس کے حقائق دینیہ وغیبیہ کا احاطہ کرنے سے قاصر ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"عقل ایک صحیح ترازو ہے اس کے فیصلے یقینی ہیں جن میں کوئی جھوٹ نہیں لیکن تم اس ترازو میں امور توحید، امورِ آخرت نبوت، صفات الٰہی اور وہ تمام امور و حقائق جو ماورار عقل ہیں تول نہیں سکتے، یہ

یہ لاحاصل کوشش ہوگی، اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے ایک ترازو دیکھی جو سونے کا وزن کرنے کیلئے تھی اس کو اس ترازو میں پہاڑوں کو وزن کرنے کا شوق ہوا جو ناممکن ہے اس سے ترازو کی صحت پر کوئی حرف نہیں آتا لیکن اس کی گنجائش کی ایک حد ہے اسی طرح کے عمل کا بھی ایک دائرہ ہے جس سے باہر وہ قدم نہیں نہیں نکال سکتی، وہ اللہ اور اس کی صفات کا احاطہ نہیں کر سکتی اس لئے کہ وہ اس کے وجود کا ایک ذرّہ ہے۔

(مقدمہ ابن خلدون ص۴۳۴)

منطق علوم عقلیہ کی میزان نہیں

منطقی منطق کو علوم عقلیہ کی میزان قرار دیتے ہیں اور اسی پر استدلال و استنتاج اور علم و یقین کو موقوف سمجھتے ہیں مگر یہ غلط ہے کیوں کہ دنیا کی قومیں اس کی وضع و ایجاد سے پہلے بھی حقائق اشیاء کو جانتی اور سمجھتی تھیں اور اس کی وضع و ایجاد کے بعد بھی بہت سی قومیں اس کو سیکھے بغیر حقائق اشیاء کا ادراک کر لیتی ہیں اس لئے اسی علوم پر علم و یقین اور ادراک و واقفیت کو موقوف سمجھنا درست نہیں۔ علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:-

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ منطق علوم عقلیہ کی میزان ہے اور اس کی رعایت ذہن کو فکری غلطی سے بچا لیتی ہے جیسے فن عروض شعر کیلئے اور نحو و صرف عربی کے مفرد و مرکب الفاظ کیلئے میزان کا درجہ رکھتے ہیں اور جس طرح آلات ہیئت اوقات کیلئے میزان ہیں لیکن واقعہ یہ نہیں ہے کیونکہ عقلی علوم ان اسباب ادراک کے ذریعہ حاصل کئے جا سکتے ہیں جو اللہ تعالےٰ نے بنی آدم کی فطرت میں ودیعت کئے ہیں، ان کا علم کسی شخص معین کی وضع کئے ہوئے میزان پر موقوف نہیں اور جس طرح عربیت میں تقلید کے بغیر چارہ نہیں کیوں کہ وہ ایک قوم کی عادت ہے جو صرف سماع سے

معلوم کیجا سکتی ہے اور ان کے قوانین کا ذریعۂ علم صرف استقراء ہے اسی طرح عقلیات میں تقلید نہیں چلتی اور اسی طرح کیل، وزن، عدد و شمار اور زراعت وغیرہ میں پیمانوں سے استغنار نہیں۔

یونانی منطق کی وضع و ایجاد سے پہلے بھی دنیا کی قومیں حقائق اشیار کو جانتی تھیں اور اسکی وضع و ایجاد کے بعد بھی اکثر قومیں منطق کی مدد کے بغیر حقائق اشیار کو جانتی اور سمجھتی ہیں بلکہ تمام دنیا کی قومیں اور ان کے اکثر عقلار ارسطو کے ان اصول و قواعد کو سیکھے بغیر حقائق کو سمجھتے ہیں حتی کہ یہ لوگ بھی اگر اپنی حالت پر غور کریں تو انکو محسوس ہوگا کہ ان کے نفوس کو اس وضعی فن کے بغیر حقائق کا علم حاصل ہو جاتا ہے

(الرد علی المنطقیین ص۳۰)

منطق کا فکری غلطی سے بچانا صحیح نہیں

منطقی منطق کی بڑی تعریف کرتے ہیں. کہتے ہیں کہ وہ فکری غلطی سے بچاتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ اس نے انہیں الٰہیات میں گمراہی سے کیوں نہیں بچایا اور وہ اس کو سیکھنے کے باوجود کیسے بھٹک گئے؟. مجدد الف ثانی، حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں!۔

"علم منطق ایک آلہ کے طور پر ہے اور اس کے متعلق لوگوں نے کہا ہے کہ وہ غلطی سے حفاظت کرنے والا ہے لیکن جب وہ ان کے کام نہیں آیا اور مقصد اعلیٰ میں ان کو غلطی اور خطار سے نہیں نکالا تو دوسروں کے کیا کام آئے گا اور غلطی سے کس طرح نکالے گا؟ اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ یعنی اے ہمارے پروردگار ہمارے دلوں کو کج نہ فرما بعد اس کے کہ آپ نے ہمیں ہدایت دی اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عنایت فرما بیشک آپ بڑے بخشنے والے ہیں۔ (مکتوب ۲۳ جلد سوم بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی)

باقی آئندہ

حضرت مولانا محمد عثمان صاحب نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا
سانحۂ ارتحال

زیر نظر رسالہ کتابت کے مراحل سے گذر کر پریس میں جانے ہی والا تھا کہ اچانک حضرت مولانا محمد عثمان صاحب نبیرۂ حضرت شیخ الہند و نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا سانحہ انتقال پیش آگیا۔ اس لئے بعجلت تمام یہ چند سطور لکھ کر اس شمارہ میں شامل کی جارہی ہیں آئندہ کسی شمارہ میں انشاء اللہ مرحوم و مغفور کے مفصل اور ضروری سوانح حیات پر روشنی ڈالی جائے گی مرحوم حضرت مولانا شیخ الہند کے نواسے، شہر دیوبند کے ہر دل عزیز اور محبوب لیڈر اور دارالعلوم دیوبند کے قدیم وابستگان میں تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ حق گوئی اور بیباکی میں تو اپنی مثال نہیں رکھتے تھے جو بات ہوتی تھی صاحب معاملہ کے منہ پر نہایت صفائی کے ساتھ کہہ دیتے بالعموم یہ دیکھا گیا ہے کہ لوگ حق کہنے میں تو جری ہوتے ہیں لیکن اپنے خلاف حق سننے کی ان کے اندر طاقت نہیں ہوتی۔ مگر مولانا مرحوم کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ جس طرح حق کہتے تھے بالکل اسی طرح سے پوری سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اپنے خلاف سننے کیلئے بھی تیار رہتے تھے اس طرح کے لوگ اب کہاں سے تلاش کئے جائیں۔

مولانا مرحوم کو ادھر چار پانچ ماہ سے ضعف قلب کی شکایت ہوگئی تھی ذیابیطس کا عارضہ تو پرانا تھا ہی۔ ان دونوں مرضوں نے انہیں دو تین ماہ کے اندر بالکل نڈھال کر دیا تھا لیکن تحمل اور برداشت کی فطری صلاحیت کی بناء پر ہمیشہ ہشاش بشاش رہنے کی کوشش کرتے رہتے تھے اور انتہائی ضعف کی حالت میں بھی مدرسہ آتے رہتے تھے چنانچہ ۶؍ شعبان کو جس دن یہ سانحہ پیش آیا حسب معمول مدرسہ تشریف لائے اور اپنے دفتر میں کچھ دیر بیٹھے لیکن تکلیف زیادہ تھی اس لئے بے چینی

کی حالت میں کبھی لیٹ جاتے اور پھر کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتے، مولانا کا یہ حال دیکھ کر ان سے کہا گیا کہ آپ گھر چلے جائیں لیکن اس کیلئے تیار نہیں ہو رہے تھے بدقت تمام انکی مرضی کے بغیر رکشا منگوا کر ان کے ایک عزیز کے ذریعہ انہیں گھر روانہ کر دیا گیا۔ گھر پہنچتے ہی ڈاکٹر بلائے گئے، ڈاکٹروں نے یہ حالت دیکھکر تشویش کا اظہار کیا اور آکسیجن چڑھانا تجویز کیا مگر ابھی اس کا انتظام ہو ہی رہا تھا کہ مولانا مرحوم کی زبان پر کلمہ طیبہ جاری ہو گیا اور تین بار کلمہ پڑھا اور روح قفس سے پرواز کر گئی۔ بجلی کی طرح یہ خبر دارالعلوم اور پورے شہر میں پھیل گئی۔ جو بھی اس خبر کو سنتا ایک لمحہ کے لئے سناٹے میں آ جاتا۔ دارالعلوم میں اسی وقت کلمہ طیبہ کے ختم کا انتظام کیا گیا، جس میں تمام طلبہ کارکنان اساتذہ اور ذمہ داران مدرسہ شریک ہوئے کلمہ طیبہ کے ورد اور دعائے مغفرت کے بعد حضرت مولانا وحید الزماں صاحب معاون مہتمم دارالعلوم دیوبند نے مولانا مرحوم کے احوال وسوانح پر روشنی ڈالی اور مولانا مرحوم کے اوصاف حسنہ کو تفصیل سے بیان فرمائے بعد میں دارالعلوم میں عام تعطیل کر دی گئی۔ نماز جنازہ کے بعد العصر احاطہ مولسری دارالعلوم میں مولانا سید ارشد مدنی نے ادا کرائی۔ اور قبیل مغرب حضرت شیخ الہند کی اس آخری یادگار کو مزار قاسمی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سپرد خاک کر دیا گیا۔

کیا خوب آدمی تھے خدا مغفرت کرے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
دار العلوم دیوبند کا ترجمان
ماہنامہ
دار العلوم
شمارہ ۳ | بابت ماہ جون ۸۵ء مطابق رمضان ۱۴۰۵ھ | جلد ۶۸
نگران
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند
مدیر مسئول
مولانا ریاست علی بجنوری
مدیر تحریر
مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی
قیمت فی پرچہ ۲/۵۰
سالانہ -/۲۵
سالانہ بدل اشتراک بیرون ممالک سے
سعودی عرب کویت ابوظبی ایرمیل -/۱۱۵ - جنوبی و مشرقی افریقہ و برطانیہ -/۱۲۵
امریکہ کناڈا وغیرہ بذریعہ ایرمیل -/۱۲۵ - پاکستان بذریعہ ایرمیل -/۵۰ بنگلہ دیش -/۲۵
محبوب پریس دیوبند
سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زر تعاون ختم ہوگیا ہے

فہرست مضامین

بنگلہ دیشی خریداروں سے ضروری گذارش

بنگلہ دیشی خریدار اپنا چندہ مبلغ -/25 روپے ہندوستانی شیخ مولانا سراج الحق صاحب پرنسپل دارالعلوم مولوی بازار ضلع بنگلہ دیش کو بھیج دیں اور انھیں لکھیں کہ اس چندہ کو رسالہ دارالعلوم کے حساب میں جمع کریں۔

خریداران حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں۔ خط وکتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔ اور رسید منی آرڈر رسالہ دارالعلوم کو روانہ کردیں۔

والسلام

مدیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

وَقَعَتِ الوَاقِعَة

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک ارشاد" ان اللہ لا یقبض العلم انتزاعاً ینتزعه من العباد ولکن یقبض العلم یقبض العلماء (الخ متفق علیہ) کا ظہور آجکل اس کثرت سے ہو رہا ہے کہ علم و دین کی اہم شخصیات اٹھتی جا رہی ہیں اور کوئی بھی اپنا بدل نہیں چھوڑ رہا ہے۔ ابھی ۶ر شعبان کو حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی آخری نشانی حضرت مولانا محمد عثمان صاحب نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا سانحۂ ارتحال پیش آیا، مرحوم کا غم تازہ ہی تھا کہ دفتر جمعیۃ علماء ہند دہلی سے اطلاع آئی کہ حضرت شیخ التفسیر مولانا لاہوریؒ کے فرزند رشید و جانشین حضرت مولانا عبید اللہ انور کا لاہور کے میو ہسپتال میں ۷ر شعبان کو انتقال ہوگیا۔ اس دوہرے غم کے آنسو ابھی خشک نہیں ہو پائے تھے کہ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب جونپوری خلیفہ حضرت شیخ الحدیث سہارنپوری ۱۴ر شعبان کو داغِ مفارقت دے گئے۔ ہفتہ عشرہ کے اندر اندر علم و عرفان کی ان اہم شخصیات کا اٹھ جانا ملت کا اتنا بڑا خسارہ ہے کہ اس پر جتنا بھی غم کیا جائے اور آنسو بہایا جائے کم ہے۔ ان مرحومین کی تعزیت کا سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ ۴ر رمضان کو ریڈیو پاکستان نے اپنے صبح کے نشریہ میں یہ اندوہناک خبر نشر کی کہ برصغیر کے نامور عالم دین، بلند پایہ مصنف، حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا کل انتقال ہوگیا، مرحوم تقریباً سات آٹھ ماہ سے علیل چل رہے تھے، علاج و معالجہ کی غرض سے اپنی صاحبزادی اور داماد کے اصرار پر پاکستان گئے ہوئے تھے وہیں یہ حادثہ پیش آیا۔

مولانا مرحوم تقریباً ۱۳۲۶ھ میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن بچھرایوں ضلع مرادآباد تھا

لیکن آپ کی پیدائش اور نشو ونما آگرہ میں ہوئی (جہاں آپ کے والد ماجد مقیم تھے) اسلئے اکبرآبادی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد ماجد کی زیر نگرانی گھر ہی پر ہوئی خانگی تعلیم کے بعد آپ کو مدرسہ شاہی مرادآباد میں داخل کردیا گیا۔ جہاں آپ نے متوسطات تک پڑھا پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند آئے اور تقریباً تین سال یہاں رہ کر محدث عصر حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ مفتی اعظم حضرت مولانا عزیزالرحمٰن عثمانی صاحبؒ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ محدث دیوبندیؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحبؒ وغیرہ اساتذہ دارالعلوم سے درسیات کی تکمیل کی اور ۱۳۴۴ھ میں فارغ التحصیل ہوئے، اسکے بعد اورنٹیل کالج لاہور سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا جس کی اس وقت بڑی اہمیت تھی تحصیل و تکمیل کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور دو سال جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تدریسی خدمت انجام دیکر مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی میں السنہ شرقیہ کے استاذ کی حیثیت سے چلے آئے۔ یہیں کے زمانہ تدریس میں سینٹ کالج دہلی سے ایم۔اے کیا۔ بعد میں اسی کالج میں لکچرار ہوگئے پھر یہاں سے ۱۳۶۸ھ/۱۹۴۸ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل منتخب ہوئے۔ اور ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۸ء میں مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ دینیات کے صدر کے منصب پر فائز ہوئے۔ جس وقت مولانا اکبرآبادی مرحوم وہاں پہنچے اس وقت شعبۂ دینیات انتہائی بے حیثیت اور کس مپرسی کی حالت میں تھا۔ مولانا مرحوم نے اپنی فعال و متحرک شخصیت اور بے لوث جد وجہد سے علمی اور انتظامی دونوں حیثیتوں سے اس شعبہ کو ترقی دیکر یونیورسٹی کے دیگر اعلیٰ شعبوں کے معیار پہ پہنچا دیا۔ یہ مولانا اکبرآبادی کا ایسا اہم کارنامہ ہے جسے مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ دینیات میں پی، ایچ۔ ڈی کے شعبہ کا قیام بھی مولانا مرحوم ہی کی سعیٔ مشکور کا نتیجہ ہے۔ علی گڑھ سے ریٹائر ہونے کے بعد کچھ دنوں تک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ تغلق آباد میں علمی و تحقیقی خدمات انجام دیں۔

مولانا مرحوم ۱۳۵۷ھ سے آخری سانس تک ندوۃ المصنفین دہلی کے بلند پایہ علمی مجلہ "برہان" کے مدیر رہے۔ آپ کے اداریئے بڑے مدلل اور فکر انگیز ہوتے تھے اور قدیم و جدید دونوں حلقوں میں شوق اور وقعت سے پڑھے جاتے تھے۔ مرحوم تقریباً ایک درجن محققانہ کتابوں

کے مصنف بھی تھے جن میں غلامانِ اسلام، وحی الٰہی، فہم قرآن، مسلمانوں کا عروج و زوال، صدیق اکبر، عثمان ذی النورین اپنے اپنے موضوع پر نہایت گرانقدر اور بیش بہا معلومات کی حامل ہیں۔ اُن کے علاوہ مختلف دینی، ادبی، تنقیدی اور سیاسی موضوعات پر آپ کے سیکڑوں سے زائد تحقیقی مقالے بھی ملک و بیرونِ ملک کے جریدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ کوئی صاحب ذوق انھیں مرتب کر کے شائع کردے تو یہ ایک بڑی خدمت ہوگی۔

مولانا مرحوم ایک بین الاقوامی شخصیت کے مالک تھے۔ ملک کے علاوہ ایشیا، یورپ اور افریقہ کے علمی سمیناروں اور ادبی و تحقیقی تقریبوں میں آپ کو شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں آپ پاکستان، مصر، کناڈا، روس اور افریقہ وغیرہ کے متعدد اسفار کر چکے تھے۔ علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں کناڈا کی مشہور میک گل یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے۔

مولانا اکبر آبادی صاحب ایک بلند پایہ مصنف و محقق ہونے کے ساتھ بہترین خطیب و مقرر بھی تھے، اُردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں میں تقریر کرتے تھے آپ کے خطبات بڑے فکر انگیز اور مؤثر ہوتے تھے اور خاص طور سے جدید حلقے میں بہت پسند کئے جاتے تھے ان علمی کمالات کے ساتھ مرحوم ایک اچھے انسان بھی تھے۔ شہرت و مقبولیت کے بلند ترین مقام پر فائز ہوتے ہوئے، غرورِ علم سے آپ کا دامن حیات بالکل پاک و صاف تھا۔ تواضع اور انکساری آپ کی عادت ثانیہ بن چکی تھی اپنے خوردوں اور شاگردوں کے لئے بھی تواضعاً کھڑے ہو جاتے تھے۔

آپ عمر کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے۔ جہاں پہنچ کر آدمی میں بالعموم خشکی اور یبوست پیدا ہو جاتی ہے لیکن مرحوم کے مزاج کی شگفتگی اور سبک روحی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا جس مجلس میں بھی ہوتے اُسے اپنی نکتہ سنجیوں اور جولانیٔ طبع سے باغ و بہار بنائے رہتے۔

دارالعلوم دیوبند سے مرحوم کو فطری تعلق تھا ۱۳۸۲ھ سے اس کی مجلسِ شوریٰ کے رکن رکین رہے۔ اور ۱۴۰۲ھ میں جب دارالعلوم میں شیخ الہند اکاڈمی کے نام سے تصنیف و تالیف کے ایک جدید شعبہ کا قیام عمل میں آیا تو مرحوم اس کے صدر منتخب ہوئے اس وقت سے آپ کا

مولانا کفیل احمد علوی استاذ دار العلوم دیوبند

تعلیمات نبویؐ اور موجودہ جمہوری نظام کی فاصل حدیں

یہ مقالہ جامعہ دار العلوم حیدر آباد کی سیرت کانفرنس میں ۳۰ مارچ ۱۹۸۵ء کو پڑھا گیا تھا۔

حق تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ جب کسی قوم میں اجتماعی طور پر تمرد و سرکشی اور فتنہ و فساد کی آگ بھڑکی ہے۔ نا اہل حکمرانوں، مغرور لوگوں کی جانب سے غریب اور تہی دست انسانوں پر لرزہ خیز مظالم ڈھائے گئے ہیں اور جب صلح پسند اور نیک لوگوں کیلئے زندگی گذارنا مشکل ہو گیا ہے اور جب ان کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں رہی اور ان کی داد و فریاد کی ہر آواز صدا بہ صحرا ثابت ہونے لگی تو ایسے حالات میں انبیاء علیہم السّلام کو مبعوث فرمایا گیا۔ لیکن ان حضرات کا دائرہ عمل علاقائی اور محدود رہا تاہم انھوں نے اصلاحات کی کوششیں کیں اور ان کے بہتر نتائج بھی سامنے آئے۔

حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل بھی نہ صرف عرب کے بلکہ پوری دنیا کے حالات انتہائی ابتر ہو چکے تھے۔ لوگ عام طور سے خدائے واحد کو بھول چکے تھے اس کے بتلائے ہوئے طریقوں کو ٹھکرا چکے تھے۔ اور اگر کہیں مذہب کی تھوڑی بہت پاسداری تھی بھی تو اس کی حقیقت بس اتنی تھی کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کو اپنی نفسانی خواہشات کے سانچے میں ڈھال کر اسی کو مذہب کا روپ دیدیا گیا تھا۔ اس طرح وہ مذہب کی آڑ میں بیٹھکر بے محابا

انسانیت سوز حرکات کا ارتکاب کرتے رہتے تھے۔ روم میں انسانوں کو غلام بنا کر ان کے ساتھ جانوروں سے زیادہ بدتر سلوک کیا جاتا قانونی طور پر جائز تھا۔ ایران کی وسیع سلطنت میں غریب طبقوں کو جن میں زیادہ تر غیر ایرانی تھے۔ عملی طور پر یہ احساس دلایا جاتا تھا کہ تم ہماری خدمت گذاری اور ہماری خواہشات کی تکمیل کیلئے پیدا ہوئے ہو۔ ہندوستان میں ایک بہت بڑا طبقہ اونچی ذات والوں کے مظالم سہتے سہتے بری طرح احساس کمتری کا شکار ہو گیا تھا۔ انھیں شودر یعنی ناپاک قرار دیدیا گیا تھا۔ دنیا کے چند ملکوں ہی میں نہیں، ساری دنیا میں یہی کچھ ہو رہا تھا۔

خود عرب کی سرزمین پر پھیلی ہوئی برائیاں کسی دوسری جگہ سے کم نہیں تھیں، جوا، شراب، لوٹ مار اور قتل و غارتگری وغیرہ جرائم ان کی معاشرت کو گھن کی طرح کھا رہے تھے۔ معصوم بچوں کو زندہ درگور کر دینا ان کی نظر میں کوئی گناہ نہیں تھا۔ ذات پات کی تفریق اور اسکے نتیجہ میں پیدا ہونے والی تمام برائیاں اُن کے معاشرہ میں رچی بسی ہوئی تھیں۔

ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ کی بعثت کیلئے حجاز کا اہم علاقہ منتخب کیا گیا جو کرۂ ارضی کا وسطی علاقہ تسلیم کیا گیا ہے۔ کیونکہ آپ کے بعد رسالت و نبوت کے سلسلے کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینا تھا۔ اسلئے ضرورت تھی ایک ایسی جگہ کو مرکزی حیثیت دینے کی جہاں سے روئے زمین پر آباد تمام انسانوں تک آپ کی تعلیمات و ہدایات کو سہولت کے ساتھ پہنچایا جا سکے۔

آپ کا پیغام ہمہ گیر ہے۔ آپؐ دنیا نے انسانیت کی ہدایت کیلئے تشریف لائے ہیں۔ آپؐ کی تعلیمات میں ان تمام باتوں کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے جو ہر حالت میں ہر دور میں اور ہر جگہ رہنے والوں کی جملہ ضروریات کو پورا کر سکیں۔ وہ ضرورتیں انفرادی ہوں یا اجتماعی، عبادات سے متعلق ہوں یا اخلاقیات سے، معاشی و سماجی ضرورتیں ہوں یا تمدنی و سیاسی غرض یہ کہ زندگی سے متعلق کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں جس میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات انسب طریقہ پر رہنمائی نہ کرتی ہوں، یہ سمجھنا سراسر غلط ہے کہ اسلام صرف مسلمانوں کیلئے ہدایات پیش کرتا ہے۔ اسلام نے یاایھا الناس کہکر تمام انسانوں کو مخاطب کیا ہے۔

اسلام ہی وہ آفاقی مذہب ہے جس نے روئے زمین پر آباد تمام انسانوں کو ایک باپ اور ایک ماں کی اولاد بتا کر ذات پات اور طبقاتی اونچ نیچ کی تمام دیواریں ڈھادی ہیں۔ اس کا اعلان ہے کہ خواہ کوئی کسی گھرانے میں پیدا ہوا ہو، غریب طبقہ میں یا متمول گھرانے میں عرب میں پیدا ہوا ہو یا عجم میں۔ اسلام کی نظر میں بحیثیت انسان سب برابر ہیں۔ نہ کسی عربی کو عجمی پر فوقیت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو عربی پر۔ اگر تمام انسانوں کو سمیٹ دیا جائے۔ تو ان کا پورا سلسلہ آدم و حوا پر جا کر ختم ہو جاتا ہے، پھر پیدائشی اعتبار سے اونچ نیچ کا کیا مطلب؟ اسلام نے اس بلا وجہ کی تفریق کی شدت سے مخالفت کی ہے۔ اور اسلام ہی نے دنیا میں آباد کروڑوں انسانوں کو پستی کی ان ذلتوں سے نکال کر صحیح معنی میں انسانیت کے بلند مقام پر پہنچا دیا ہے۔ جس کے لئے ایسے لوگوں کو اسلام کا ممنون ہونا چاہیئے!

رومیوں کی سرکوبی کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک بڑا لشکر روانہ فرماتے ہیں اور اس کی قیادت کا شرف زید بن حارثہؓ کو دیا جاتا ہے۔ جو ایک آزاد کردہ غلام ہیں ــــ آپؐ کے وصال کے بعد خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پہلا اہم کام یہ کرتے ہیں کہ شام میں انہیں رومیوں کے .... جارحانہ عزائم پر ضرب کاری لگانے کیلئے ایک عظیم لشکر اسامہؓ کی قیادت میں جو زید ابن حارثہؓ کے باصلاحیت بیٹے ہیں۔ بھیج دیتے ہیں۔ دراصل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وصال سے کچھ عرصہ قبل سپہ سالاری کا یہ اعزاز خود اسامہؓ کو مرحمت فرما چکے تھے۔ جسے صدیق اکبرؓ نے باقی رکھا اور اس کے نہایت خوشگوار نتائج سامنے آئے ــــ لشکر کی قیادت کا شرف کوئی معمولی شرف نہیں تھا۔ اُس دور میں بھی اس کی اہمیت و افضلیت تھی اور آج بھی ہے۔ مجاہدین کے اس لشکر میں) عمر فاروقؓ اور عبیدہ ابن الجراحؓ جیسی) کئی اہم شخصیتیں موجود ہیں۔ بعض ان لوگوں کو جن کے دلوں سے ذاتی اونچ نیچ کا احساس پوری طرح محو نہیں ہوا تھا، اس پر انقباض ہے۔ کچھ دوسرے حضرات بھی اسامہؓ کی کم عمری کی وجہ سے مطمئن دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ "ہمارا لشکر اپنی حدود سے دُور جا رہا ہے۔ دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور وہ جنگی وسائل سے پوری طرح لیس ہیں اپنے علاقوں میں ہیں، جن کے لئے رسد وکمک کی تمام سہولتیں موجود ہیں۔ اسامہؓ کم سن ہیں کسی بڑی

جنگ کا تجربہ نہیں رکھتے۔ اس لئے قیادت بدل دی جائے"۔ صدیق اکبر فرماتے ہیں "یہ فیصلہ میرا نہیں، رسول اللہ کا فیصلہ ہے جو مجھ سے اور آپ سے زیادہ بہتر جانتے تھے۔ ہیں اس میں تبدیلی کا کوئی حق نہیں رکھتا"

صدیق اکبرؓ اس انقباض کو بھی محسوس کر رہے تھے جو اسامہؓ کے ابن غلام ہونے کی وجہ سے بعض لوگوں میں پیدا ہو رہا تھا۔ اسی لئے لشکر کی روانگی کو خلیفۃ المسلمین، سالار لشکر یعنی اسامہؓ کو ہدایات دیتے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ فرما رہے ہیں "اسامہ! کبھی کسی کو دھوکہ مت دینا۔ بددیانتی سے کام مت لینا، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر ہاتھ مت اٹھانا۔ پھل دار درختوں کو مت کاٹنا۔ باغوں اور کھیتوں کو جلا کر خاک نہ کر ڈالنا۔ شدید ضرورت کے سوا بکری اور اونٹ وغیرہ کو بھی ذبح نہ کرنا۔ لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آنا۔ نرمی کے ساتھ انھیں اپنے نصب العین کی طرف دعوت دینا۔ کبھی کسی کے ساتھ بدعہدی نہ کرنا۔ تمہیں ایسے لوگ بھی ملیں گے جو دنیا کو چھوڑ کر اپنی خانقاہوں میں مصروف عبادت ہوں گے، ان سے تعارض نہ کرنا"

اسامہؓ گھوڑے پر سوار ہیں اور خلیفۃ المسلمین پا پیادہ۔ اسامہؓ بار بار گھوڑے سے اترنا چاہتے ہیں۔ لیکن صدیق اکبرؓ اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اسامہؓ کہتے ہیں۔ اچھا آپ بھی گھوڑے پر سوار ہو جائیے۔ حضرت ابوبکرؓ اس کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے۔ مجاہدین حیرت سے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔ اور وہ لوگ جن کے دلوں میں اسامہؓ کی قیادت پر انقباض تھا۔ اپنے انقباض پر نادم ہیں، افسوس کر رہے ہیں۔ حضرت صدیق کے اس طرزِ عمل کا مقصد جہاں ذاتی۔ اونچ نیچ کے احساس کو جڑ سے نکال دینا تھا۔ وہاں یہ بھی تھا کہ تعلیماتِ نبوی کے بموجب کسی بھی منصب کیلئے قرابت و دوستانہ تعلقات سے ہٹکر صرف دیانت و اہلیت پر نظر رکھنی ضروری ہے۔ نیز اہل نوجوانوں کی حوصلہ افزائی بھی ناگزیر ہے۔

فاتح اندلس طارق ابن زیاد بھی افریقی النسل ایک غلام ہیں جنھیں موسیٰ ابن نصیر نے عرب سالاروں پر ترجیح دیکر اندلس بھیجا تھا۔ جہاں عیسائیوں نے اہل یہود کا ناطقہ بند کر رکھا تھا جن کے لئے زندگی گذارنا مشکل ہو گیا تھا۔ اور پھر ان یہودیوں نے مسلمانوں کے زیر اقتدار

صدیوں سکون وراحت کی زندگی بسر کی

درحقیقت قرآن کریم نے یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی کی شکل میں انسانی مساوات کا بنیادی اصول پیش کرکے تمام دنیا کے انسانوں کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے اس کے بعد کسی کیلئے بھی پیدائشی برتری یا کمتری کا کوئی سوال باقی نہیں رہتا۔ اب اگر چھوٹے بڑے کا کوئی سوال ہوسکتا ہے تو وہ کردار کی بلندی یا پستی کی بنیاد پر ہوسکتا ہے۔ تعلیم یا جہالت کی بنیاد پر ہوسکتا ہے۔ شرافت یا عدم شرافت کی وجہ سے ہوسکتا ہے اور یہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ ایک شخص نیکوکار ہے، بلند اخلاق ہے، انصاف پسند ہے۔ خدا ترس ہے، معاملہ فہم ہے، بھلائی کے راستہ پر گامزن ہے جس کا برتاؤ سب کے ساتھ ہمدردانہ ہے۔ اُسے آخر ہم ایک ظالم اور بدکردار آدمی کے برابر درجہ کیسے دے سکتے ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو یہ یقیناً عقل وفہم اور دیانت کے سراسر خلاف ہوتا۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ قابلِ احترام وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

آج دنیا کی اکثریت انسانی مساوات کی طرف آرہی ہے۔ یہ درحقیقت اسلام ہی کا فیض ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ حضراتِ صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے صحیح امین ہیں خدا کے ان نیک اور مخلص بندوں نے اسلامی تعلیمات کو زندہ رکھنے، دور، دور تک فروغ دینے اور اپنی پوری زندگی میں رچا لینے کی جو بہترین مثالیں پیش کی ہیں، ان کا جواب کسی بھی نبی کی امت میں نہیں ملتا۔ انھوں نے زندگی کے نازک سے نازک موڑ پر بھی دینی تعلیمات کو نظرانداز نہیں کیا، جنگ کے اہم مواقع پر فتح سے ہمکنار افواج فرطِ جوش میں اپنے قواعد وضوابط توڑ بیٹھتی ہیں۔ اور وہ سب کچھ کرتی ہیں۔ جو اس وقت ان کا دل چاہتا ہے۔ لیکن اسلام کے ان جاں نثاروں نے جنگوں میں بھی اپنی تعلیمات کے دائروں کو نہیں توڑا۔ اوّل تو صحیح یہ ہے کہ ان حضرات نے حتی الامکان جنگوں سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ بحالت مجبوری اگر ان کی تلوار اٹھی ہے تو وہ لوگوں کو مسلمان بنانے، ملک گیری یا مال ودولت کے حصول کیلئے نہیں بلکہ اپنے تحفظ کیلئے اٹھی ہے؛ مدافعانہ اٹھی ہے یا مظلوم انسانوں کی حمایت کیلئے اٹھی ہے۔ —— یہ کہنا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ غلط ہے، قطعی بے بنیاد ہے۔ دراصل یہ پروپیگنڈہ مجرمانہ طور پر جانبداری سے

عیسائیوں کی طرف سے کہا جاتا رہا ہے۔ جن لوگوں کی نظر حقائق پر ہے اور جو اسلامی تعلیمات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن کریم میں لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ موجود ہے جس کے معنیٰ ہیں کہ دین کے معاملہ میں کسی طرح کی زبردستی نہیں اللہ تعالیٰ کے اس واضح ارشاد کے بعد کسی کو بالجبر مسلمان بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام قبول کرنے کا معاملہ دراصل خلوص دل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص کسی لالچ یا کسی دباؤ کی وجہ سے مسلمان ہونا چاہتا ہے تو اس کا اسلام قبول نہیں کیا جاتا۔ پھر اسلام کو تلوار کے زور سے کیسے پھیلایا جا سکتا تھا؟

مسلمانوں کی فتوحات کے بعد اگر لوگ جوق درجوق اسلام میں داخل ہوئے ہیں تو اسکی وجہ مسلمانوں کی تلوار نہیں بلکہ ان کے کردار کی بلندی رہی ہے۔ ان کے اچھے معاملات رہے ہیں۔ ان کی انصاف پسندی رہی ہے۔ ان کی شرافت اور نیکی رہی ہے۔ جس کے نتیجہ میں مفتوحہ اقوام بہت جلد اقتصادی اور اخلاقی وتہذیبی اعتبار سے ایک شاندار دور میں پہنچ گئیں۔ ورنہ دنیا کی تاریخ یہ تھی کہ جب کوئی قوم کسی ملک کو فتح کرتی تھی تو مفتوحہ قوم کی تمام املاک لوٹ لی جاتی تھیں۔ ان کا قتلِ عام ضروری سمجھا جاتا تھا۔ نہ اُن کے بوڑھوں کو بخشا جاتا تھا اور نہ عورتوں اور معصوم بچّوں کو، ان کے مذہب یا تہذیب کو باقی رکھنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ فتوحات ایران کے موقع پر اسلامی سپہ سالار حضرت خالد بن ولیدؓ نے اپنے افسران سے فرما دیا تھا کہ "اگر یہاں کسی بھی شخص پر زیادتی کی گئی تو اس کو اس کے عہدہ سے معزول کر دیا جائے گا"۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے فتح مدائن کے فوراً بعد چند افسران کو اس پیغام کے ساتھ پورے شہر میں گھما دیا تھا کہ "آپ سب لوگ پوری طرح مامون ہیں۔ خوف زدہ ہو کر گھروں میں بند رہنے کی ضرورت نہیں۔ ہماری آپ سے کوئی لڑائی نہیں۔ جن سے لڑائی تھی وہ بھاگ چکے ہیں"۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں معتبر تاریخی کتابوں میں موجود ہیں۔

اسلام ایک انقلابی دین ہے اس کا پیغام امن ایک عالمگیر پیغام ہے۔ وہ اپنی تعلیمات کے ذریعہ دنیا کی تاریک فضاؤں کو بدلنا چاہتا ہے ظالم کی تلوار کو مظلوم کی گردن سے ہٹانا چاہتا ہے۔ امن و انصاف کا ماحول پیدا کرنا چاہتا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں انسانیت و مساوات کی روح پھونکنا چاہتا ہے۔ غور و فکر کے زاویے بدلنا چاہتا ہے۔ اخلاقی و معاشرتی اور تہذیبی قدریں بدلنا چاہتا ہے۔ ہمسایوں کے ساتھ پُرامن رہنے کے آداب سکھانا چاہتا ہے۔ انسان کو صحیح معنیٰ میں انسان بنانا چاہتا ہے۔ دنیا کو ایک

توحیدِ خالص اور اتباعِ سنّت

حضرت شیخ عبد القادرِ جیلانی کے ارشادات کی روشنی میں

ملک کے ممتاز عالم مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدّظلہٗ لکھتے ہیں کہ "توحید کا پیغام اور شرک کی تردید قیامت تک کے لئے دینی دعوتوں اور اصلاحی تحریکوں کا بنیادی رکن ہے اور نبوت کی دائمی میراث ہے

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (زخرف)

اور یہی بات (حضرت ابراہیم) اپنی اولاد میں پیچھے چھوڑ گئے۔ تاکہ وہ خدا کی طرف رجوع کریں۔

اور یہی تمام مصلحین، مجاہدین اور اللہ کی طرف دعوت دینے والوں کا شعار رہے گا۔ علماء اور نائبینِ رسول اور اصحابِ دعوت کا فرض ہے کہ وہ اس خطرہ سے چوکنا رہیں اور شرک کے معاملہ میں کسی رواداری اور رعایت سے کام نہ لیں۔

(عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح)

نبوت کی مذکورہ دائمی میراث کو ہر دور میں حقیقی نائبین رسول علمائے حقانی اور مشائخ ربّانی نے اللہ کے بندوں تک پہونچانے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سلسلۂ قادریہ کے امام ہیں۔ انھوں نے بھی نیابتِ رسول کا یہ حق بدرجۂ اتم ادا فرمایا ہے آج بھی اُن کے مواعظ حسنہ کے دفاتر اور تصنیفات میں سب سے زیادہ توحید اور اتباعِ سنّت کی اہمیت پر مشتمل بیانات موجود ہیں۔ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ ایک طبقہ سلسلۂ قادریہ سے منسلک ہونے کا دعویٰ زور و شور سے کرتا ہے مگر توحید خالص اور اتباع سنّت کی دعوت کی مخالفت کرنے میں بھی پیش پیش ہے۔ "صلوٰۃ غوثیہ" تک ایجاد کر ڈالی ہے اور پریشانیاں دور کرنے کے لئے سب سے مجرب وظیفہ یہ بتلاتے ہیں کہ مصیبت میں پڑھنا چاہیے "اَغِثْنِیْ یَا غَوْثَ الْاَعْظَم

اور "المدد یا غوث الاعظم" کا نعرۂ قادری بھی لگوایا جاتا ہے۔ اس رویہ پر یہ قول صادق آتا ہے۔ ع　یاروں نے بت شکن کو بت گر بنا کے چھوڑا۔

حضرت شیخؒ کے یہ ارشادات جو تحریر کئے جارہے ہیں۔ غور سے مطالعہ کئے جائیں۔ اور اس کی روشنی میں ان کی حقیقی اور سچی تعلیمات کو لائحہ عمل بنایا جائے تاکہ نسبت قادری کی سچی جلوہ گری سے قلوب ولاذہان منور ہوسکیں۔ واللہ ولی التوفیق۔

(۱) توحید حقیقی

انہ لیس الی احدٍ ضرہٗ ولا نفعہٗ ولا جلبٌ ولا دفعٌ ولا عزٌ ولا ذلٌ ولا رفعٌ ولا خفضٌ ولا فقرٌ ولا غناءٌ ولا تحریکٌ ولا تسکین الاشیاء کلھا خلق اللہ بید اللہ بامرہ واذنہ جریانھا کلٌ یجری لاجلٍ مسمّیٰ وکل شیئٍ عندہ بمقدار لا مقدم لما اخر ولا مؤخر لما قدم۔

(اللہ کے سوا) کسی کے اختیار میں نہیں ہے ضرر اور نفع اور نہ (فائدوں) کا حاصل کرنا اور نہ (بلاؤں) کا ٹالنا اور نہ عزت نہ ذلت نہ بلند کرنا نہ پست کرنا نہ حرکت دینا نہ ساکن کرنا۔ سب چیزیں اللہ کی مخلوق ہیں اسی کے دست قدرت میں ہیں۔ اسی کے حکم و اجازت سے ان کا چلنا ہے۔ ہر چیز ایک اجل معین تک چلتی ہے اور ہر چیز اس کے نزدیک ایک اندازہ کے ساتھ ہے وہ جس کو پیچھے کردے کوئی آگے بڑھانیوالا نہیں اور جس کو آگے کردے کوئی پیچھے کرنیوالا نہیں۔

ان یمسسک اللہ بضرٍ فلا کاشف لہٗ الا ھو وان یردک بخیرٍ فلا راد لفضلہ۔ (فتوح الغیب مقالہ ۱۸)

اور اگر اللہ تم کو کوئی تکلیف پہونچائے تو اس کے سوا کوئی دور کرنے والا نہیں۔ اور اگر وہ تم کو کوئی بھلائی پہونچانی چاہے تو کوئی اسکے فضل و کرم کو رد کرنے والا نہیں'

(۲) اللہ تعالیٰ ہی مختار کل اور فاعل حقیقی ہے

الخلیقۃ مفتقرۃ الیہ فعال لما یرید

"تمام مخلوق اس کی محتاج ہے۔ جو چاہتا ہے

منفردٌ بالقدرة علی اختراع الاعمال وکشف الضرّ والبلوی وتقلیب الاعیان وتغییر الاحوال کُلّ یومٍ هُوَ فی شانٍ (غنیة الطالبین ص۲۳)

کرتا ہے اور تنہا وہی قادر ہے نئے نئے طور پر اعمال بنانے پر اور ضرر اور بلا کے دور کرنے پر اور اعیان کے پلٹنے پر اور حالات کے بدلنے پر ہر دن وہ ایک نئی شان میں ہے۔

فیقطع ان لا فاعل علی الحقیقة الا اللّٰہ ولا محرك ولا مسکن الا اللّٰہ و لا خیر ولا شرّ ولا ضرّ ولا نفع ولا عطاء ولا منع ولا فتح ولا غلق ولا موت ولا حیٰوة ولا عزّ ولا ذل ولا غنی ولا فقر الا بید اللّٰہ (فتوح الغیب مقالہ ۲)

یقین رکھے کہ اللہ کے سوا کوئی فاعلِ حقیقی نہیں ہے اور اللہ کے سوا کوئی نہ حرکت دینے والا ہے نہ سکون اور خیر و شر اور نفع و ضرر اور دینا نہ دینا۔ کھولنا اور بند کرنا، موت اور زندگی عزت اور ذلت فراخی اور تنگدستی صرف اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ قدرت میں ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ ہی سے دعا مانگو بس اسی سے مدد چاہو۔

قال عزمن قائل وَاسْئَلُوا اللّٰہَ من فضلہٖ وقالَ عَزَّ وجَلَّ انّ الذین تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا یَمْلِکُوْنَ لَکُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْہُ وَاشْکُرُوْا لَہٗ (فتوح الغیب مقالہ ۲)

تمہارے رب العزت نے فرمایا ہے۔ اللہ سے اس کا فضل مانگو۔ اور رب عز وجل نے فرمایا ہے بلاشک وہ لوگ جن کو تم پکارتے ہو خدا کے سوا وہ تمہارے رزق کے مالک نہیں بس خدا ہی کے پاس سے رزق طلب کرو اور اسی کی عبادت کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔

من سال الناس ما سأل الا لجھلہ و ضعف ایمانہ ومعرفتہ ویقینہ وقلة صبرہ وما تعفف عن ذالك الا لوفور علمہٖ باللّٰہ عز وجلّ وقوة ایمانہٖ و

جس نے آدمیوں سے مانگا اس نے صرف اپنی جہالت اور ایمان کے ضعف اور معرفت و یقین کی کمزوری اور صبر کی کمی کی وجہ سے مانگا اور جس نے اس سے پرہیز کیا اس نے اللہ عز وجل

یقینہ (فتوح الغیب مقالہ ۴۲)　　کی پوری معرفت اور ایمان ویقین کی قوت کی وجہ سے پرہیز کیا۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما انہ قال بین انا ردیف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذ قال یاغلام احفظ اللہ یحفظک اللہ احفظ اللہ تجدہ امامک فاذا سئلت فاسئل اللہ واذا استعنت فاستعن باللہ جفت القلم بما ھو کائن ولو جھد العباد ان ینفعوک بشئ لم یقضہ اللہ لک لم یقدروا ولو جھد العباد ان یضروک بشئ لم یقضہ اللہ علیک لم یقدروا۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سوار تھا کہ آپ نے فرمایا۔ اے لڑکے خدا کے حقوق کی حفاظت کر وہ تیری حفاظت کرے گا۔ اس بزرگاہ رکھ اسکو سامنے پائے گا۔ تو جب کچھ مانگے تو اللہ سے مانگ اور جب مدد چاہے تو صرف اللہ سے مدد چاہ جو کچھ ہونا ہے۔ تقدیر کا قلم اسکو لکھ چکا۔ اگر سب بندے کوشش کریں کہ تجھکو کوئی ایسا نفع پہونچائیں۔ جو خدا نے تیرے لئے مقدر نہیں کیا تو وہ اس پر قادر نہ ہوں گے اور اگر سب اس کی کوشش کریں کہ تجھ کو کوئی ایسا ضرر پہونچادیں جو خدا نے تیری تقدیر میں نہیں لکھا تو وہ ایسا نہ کرسکیں گے۔

فینبغی لکل مومن ان یجعل ھذا الحدیث مرآۃ لقلبہ وشعارہ ودثارہ فیعمل بہ فی جمیع حرکاتہ وسکناتہ حتی یسلم فی الدنیا والآخرۃ ویجد العزۃ فیھما برحمتہ اللہ۔ (فتوح الغیب مقالہ ۴۳)

تو مومن کو چاہیئے کہ اس حدیث کو اپنے دل کا آئینہ بنالے اور اپنے اندر باہر کا لباس قرار دیدے اور اپنی تمام حرکات وسکنات میں اسی پر عمل کرے تاکہ دنیا وآخرت میں سالم رہے۔ اور اللہ کی رحمت سے دونوں جگہ عزت پائے۔

(۴) کتاب وسنت کے سوا کوئی راہ ہدایت نہیں۔

لیس لنا نبی غیرہ فنتبعہ ولا کتاب　　اب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ہمارے لئے

غير القرآن فنعمل به فلا تخرج عنهما فتهلك فيضلك هواك والشيطان قال الله تعالىٰ ولا تتبع الهوىٰ فيضلك عن سبيل الله (فتوح الغيب مقاله ۳۶)

کوئی نبی نہیں جس کی ہم پیروی کریں اور قرآن کے سوا ہمارے پاس کوئی کتاب نہیں جس پر ہم عمل کریں ان سے قدم باہر نہ نکالو ورنہ ہلاک ہوجاؤگے اور نفسانی خواہش اور شیطان تم کو اللہ کے راستہ سے بھٹکادیں گے۔

* * * * * * *

اجعل الكتاب والسنة امامك وانظر فيهما بتأمل وتدبر واعمل بهما ولا تغتر بالقال والقيل والهوس قال الله تعالىٰ مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا - فتوح الغيب مقاله ۳۶

کتاب وسنت کو اپنا رہنما بنالو اور ان میں تدبر وتفکر سے کام لو اور اُن پر عمل کرو اور قیل وقال ہوی وہوس میں مت پھنسو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے جو تم کو رسول دیں لے لو اور جس سے منع کریں رُک جاؤ۔

والسلامة مع الكتاب والسنة والهلاك مع غيرهما بهما يرتقي العبد الى حالة الولاية والبدلية والغوثية - (فتوح الغيب مقاله ۳۶)

اور سلامتی کتاب سنت کے ساتھ ہے۔ اور ہلاکت ان کے غیر کے ساتھ ہے۔ انھیں کے ذریعہ بندہ ولایت ابدالیت اور غوثیت کے درجہ تک پہونچتا ہے۔

(۵) اعتقاد وعمل میں اہل سنت والجماعۃ کی موافقت ہی طریقت کی بنیاد ہے۔

فالذی يجب على المبتدی فی هٰذه الطريقة الاعتقاد الصحيح الذی هو الاساس فيكون على عقيدة السلف الصالح اهل السنة القديم سنة الانبياء والمرسلين والصحابة والتابعين والاولياء والصديقين - (غنية الطالبين ص۸۳۶)

جو شخص اس راہ طریقت پر قدم رکھے اس پر لازم ہے کہ اعتقاد صحیح رکھے جو کہ بنیاد ہے سلف صالحین کے عقیدہ پر قائم ہے جو کہ سنت قدیم والے ہیں۔ انبیاء ومرسلین کی سنت اور صحابہؓ وتابعین، اولیاء اور صدیقین کے طریقہ پر چلنے والے ہیں۔

على المومن اتباع السنة والجماعة -

مومن پر ضروری ہے کہ وہ سنت والجماعت کی

فالسنة ما سنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والجماعۃ ما اتفق علیہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی خلافۃ الائمۃ الاربعۃ الخلفاء الراشدین المھدیین

(غنیۃ الطالبین صـ۱۸۰)

پیروی کرے اور سنت وہ طریقہ ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چلتے رہے اور جماعت وہ امر ہے جس پر آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے چاروں خلفائے راشدین مہدیین کے دور میں اختیار کیا۔

(۶) سنت پر چلو اور بدعت سے بچو

اتبعوا ولا تبتدعوا واطیعوا ولا تمرقوا ووحدوا ولا تشرکوا

(فتوح الغیب مقالہ ۲)

سنت کی پیروی کرو اور بدعت ایجاد نہ کرو۔ فرمانبرداری اور شریعت کے احکام سے باہر نہ نکلو توحید پر قائم رہو اور شرک مت کرو۔

وقد لعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم المبتدع فقال صلی اللہ علیہ وسلم من احدث حدثا او اوی محدثا فعلیہ لعنۃ اللہ والملئکۃ والناس اجمعین ولا یقبل اللہ منہ الصرف والعدل

(غنیۃ الطالبین صـ۸۱)

اور بے شک رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بدعتی پر لعنت کی ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔ کہ جس شخص نے کوئی بدعت ایجاد کی یا کسی بدعتی کو پناہ دی۔ پس اس پر خدا کی اور اس کے فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ خدا نہ اس کا کوئی فرض قبول کرے گا نہ نفل۔

(۷) آخری وصیت

حضرت شیخ جیلانی قدس سرہٗ نے اپنے فرزند عزیز شیخ عبد الوہاب کو اپنے مرض وفات میں یہ وصیت فرمائی تھی جو تکملہ فتوح الغیب میں درج ہے۔

علیک بتقوی اللہ ولا تخف احدا سوی اللہ ولا ترج احدا سوی اللہ وکل الحوائج الی اللہ ولا تعتمد الا الیہ واطلبہا جمیعا منہ ولا تثق باحد

خدا سے ڈرو اور اس کے سوا کسی سے نہ ڈرو اور اپنی تمام حاجتوں کو خدا کے سپرد کر دو اور اس کے سوا کسی پر اعتماد نہ رکھو اور اپنی سب حاجتیں خدا سے طلب کرو اور خدا کے سوا کسی پر بھروسہ نہ رکھو

حضرت شیخ علیہ الرحمہ کی آخری وصیت پر اس مقالہ کو ختم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ حضرت شیخ جیلانی پر اپنی بے شمار رحمتیں نازل فرما۔ جو یہی توحید اور اتباع سنت کا پیغام آخری وقت تک دیتے ہوئے اور شرک و بدعت سے پرہیز رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے وصال فرما گئے اے اللہ ان کی زریں ھدایات پر عمل کرنے کی توفیق سے ہمیشہ ہم سب کو نواز اور اپنی رضامندی کے راستہ پر ہر وقت گامزن رہنے کی سعادت بخش دے۔ آمین۔

قسط ۶

منطق و فلسفہ ایک علمی و تحقیقی جائزہ

مولانا محمد اطہر حسین قاسمی بستوی

منطق کو واجب کہنا غلط ہے

منطق ایک کوہ کندن اور کاہ برآوردن کا سا عمل ہے کہ محنت اور بحث بہت زیادہ اور حاصل محصول بہت کم، ایسی چیز کو واجب کہنا حقیقت سے ناآشنائی ہے، خود اس کے ماہرین بھی اس کے تمام قوانین کی پابندی نہیں کرتے بلکہ بہت سے موقعوں پر اس کے اصول و قواعد چھوڑ دیتے ہیں، جیساکہ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں!۔

"یہ بات واضح ہے کہ منطق کو واجب قرار دینا محض ان لوگوں کا قول ہے جو غالی اور حقیقت سے ناآشنا ہیں، خود ماہرین فن بھی اپنے تمام علوم میں منطق کے قواعد کی پابندی نہیں کرتے بلکہ بعض اوقات ان کی طوالت کی وجہ سے یا غیر مفید ہونے کی بنا پر یا بعض قوانین کے فاسد ہونے کی وجہ سے یا ان کے اجمال و اشتباہ کی بنا پر وہ خود ان سے اعراض کر جاتے ہیں، اس میں متعدد ایسے مقامات ہیں جو کوہ کندن اور کاہ برآوردن کا مصداق ہیں۔ (نقض المنطق ص۱۵۵)

منطق کے تحلیل و تجزیہ کے بعد اب قلم کا رُخ فلسفہ کی طرف کیا جاتا ہے جس میں بتایا جائیگا کہ فلسفہ کے کون سے مباحث قابل قبول اور کون سے مردود ہیں، اختلاف کا میدان کیا اور اتفاق کا میدان کیا ہے، فلاسفہ اور انبیاء علیہم السّلام کے علوم کا باہمی تقابل کرنا کیسا ہے۔ اور فلاسفہ، اسلام کی حیثیت کیا ہے وغیرہ، انشاء اللہ ان میں سے ہر مسئلہ پر پوری تفصیل سے کلام کیا جائے گا، واضح ہو کہ ہمارا مقصد فلسفہ پر اصولی اور عمومی حیثیت سے گفتگو کرنا ہے جیساکہ منطق میں کیا گیا تھا، فروعی اور جزدی مسائل سے ہمیں بحث نہیں ہے۔

فلسفہ

طبعیات وریاضیات سے انکار نہیں

یونانی فلسفہ جو طبعیات و ریاضیات والٰہیات سب کو شامل ہے اس کے تمام مباحث متکلم فیہ نہیں ہیں بلکہ طبعیات و ریاضیات کے بہت سے مسائل صحیح اور معقول ہیں اور ان میں یونانیوں نے اپنی ذہانت و ذکاوت کو کافی استعمال کیا ہے۔ علماء اسلام اس کا اعتراف کرتے ہیں اور ان میں ان کی دماغی صلاحیت وعبقریت کو تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں۔

نَعَمْ لَهُمْ فِي الطَّبِيْعَاتِ كَلَامٌ غَالِبُهُ جَيِّدٌ وَهُوَ كَلَامٌ كَثِيْرٌ وَاسِعٌ، وَلَهُمْ عُقُوْلٌ عَرَفُوْا بِهَا ذٰلِكَ وَهُمْ قَدْ يَقْصِدُوْنَ الْحَقَّ لَا يَظْهَرُ عَلَيْهِمُ الْعِنَادُ

(الرد علی البکری ص۱۳۳)

فلاسفہ کی طبعیات میں جو گفتگو اور بحث ہے اس کا بڑا حصہ اچھا ہے اور اُن کا یہ کلام خاصا وسیع اور مفصل ہے، ان باتوں کو سمجھنے اور معلوم کرنے کے لئے وہ اچھا دماغ رکھتے تھے۔ بہت سے مباحث میں وہ حق کے جویا اور طالب نظر آتے ہیں اور ضد زبردستی سے کام نہیں لیتے۔

طبعیات وریاضیات فلاسفۂ یونان کا اصل موضوع ہے اور وہی ان کے غور وفکر کا اصل میدان ہے، حافظ ابن تیمیہؒ رقمطراز ہیں:-

لٰكِنْ لَهُمْ مَعْرِفَةٌ جَيِّدَةٌ بِالْاُمُوْرِ الطَّبِيْعِيَّةِ وَهٰذَا بَحْرُ عِلْمِهِمْ وَلَهُ تَفَرَّغُوْا وَفِيْهِ ضَيَّعُوْا اَزْمَانَهُمْ۔

(تفسیر سورۃ الاخلاص ص۵۸)

امور طبعیہ سے اُن کی واقفیت اچھی خاصی ہے اور درحقیقت یہی ان کا دائرۂ فکر اور فن خاص ہے، اسی میں انھوں نے اپنے اوقات کا بیشتر حصہ ضائع کیا۔

علم ریاضی کے مسائل معقول اور مفید ہیں، علم اور عمل دونوں کے لئے اس کی ضرورت پڑتی ہے، ان کی صحت پر اتفاق اور ان کے واجب القبول ہونے پر اجماع ہے، چنانچہ حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں۔

فَهٰذِهِ الْاُمُوْرُ وَاَمْثَالُهَا مِمَّا يَتَكَلَّمُ فِيْهِ الْحِسَابُ اَمْرٌ مَعْقُوْلٌ مِمَّا يَشْتَرِكُ فِيْهِ ذَوِي الْعُقُوْلِ وَمَا مِنْ اَحَدٍ مِنَ النَّاسِ اِلَّا يَعْرِفُ مِنْهُ شَيْئًا فَاِنَّهُ ضَرُوْرِيٌّ فِي الْعِلْمِ ضَرُوْرِيٌّ فِي الْعَمَلِ وَلِهٰذَا يَمْثُلُوْنَ بِهٖ فِي قَوْلِهِمْ اَلْوَاحِدُ نِصْفُ الْاِثْنَيْنِ وَلَا رَيْبَ اَنَّ قَضَايَاهُ كُلِّيَّةٌ وَاجِبَةُ الْقَبُوْلِ لَا تَنْتَقِضُ اَلْبَتَّةَ۔

(اَلرَّدُّ علی المنطقیین ص۱۳۴)

ریاضی کے یہ مسائل جن سے اہل حساب بحث کرتے ہیں ایسے معقول مسائل ہیں جن پر تمام اہل عقول کا اتفاق ہے اور ہر شخص اس سے کچھ نہ کچھ واقفیت رکھتا ہے اس لئے کہ وہ علم اور عمل دونوں کے لئے ضروری ہے، اس سے کس کو اختلاف ہو سکتا ہے کہ الواحد نصف الاثنین (ایک دو کا آدھا ہے) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کے سب قضایا کلی ہیں واجب القبول ہیں اور ان پر کوئی نقض وارد نہیں ہو سکتا۔

اختلاف کا میدان الہیات ہے

علماء حق کو فلسفۂ یونان کے جس دائرہ سے اصل اختلاف ہے وہ الہیات کا دائرہ ہے اس میں فلسفۂ یونان کا ذخیرہ بے بضاعتی دبے مائگی اور ناکامی دبے حاصلی کا شکار ہوا ہے، اس کے متعلق فلاسفہ جہل مرکب میں مبتلا ہو گئے ہیں، یہ درحقیقت ان کا میدان نہ تھا، وہ اس دائرہ میں قدم رکھکر اپنے حدود سے تجاوز کر گئے اور اپنے لئے تحقیر وتضحیک کا سامان بہم پہونچا گئے، امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں!۔

لِلْمُتَفَلْسِفَةِ فِي الطَّبِيْعِيَّاتِ خَوْضٌ وَتَفْصِيْلٌ تَمَيَّزُوْا بِهٖ بِخِلَافِ الْاِلٰهِيَّاتِ فَاِنَّهُمْ مِنْ اَجْهَلِ النَّاسِ بِهَا وَاَبْعَدِهِمْ عَنْ مَعْرِفَةِ الْحَقِّ مِنْهَا وَكَلَامُ اَرِسْطُوْ مُعَلِّمِهِمْ فِيْهَا قَلِيْلٌ كَثِيْرُ الْخَطَاءِ

(معارج الاصول من مجموعۃ الرسائل الکبریٰ ص۱۸۶)

فلسفہ سے اشتغال کرنے والے فن طبیعات میں غور وفکر اور تفصیل سے کام لیتے ہیں اور یہی ان کا امتیاز ہے۔ لیکن الہیات میں وہ جاہل محض اور حق سے بالکل ناآشنا ہیں، اس سلسلہ میں انکے استاذ ارسطو سے جو کچھ منقول ہے وہ بہت تھوڑا ہے اور اور اس میں غلطیاں زیادہ ہیں۔

امام ابن تیمیہؒ دوسری جگہ الہیات میں ان کی نامرادی اور تہی دستی کا ذکر کرتے ہیں۔

وَاَمَّا مَعْرِفَةُ اللهِ تَعَالٰى فَحَظُّهُمْ مِنْهَا مَبْخُوْسٌ جِدًّا وَاَمَّا مَلٰئِكَتُهُ وَكُتُبُهُ وَرُسُلُهُ فَلَا يَعْرِفُوْنَ ذٰلِكَ الْبَتَّةَ (تفسیر سورۃ الاخلاص ص۵۷)

جہاں تک اللہ تعالیٰ کی معرفت کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں فلاسفہ بڑے محروم اور نامراد ہیں رہے ملائکہ اور اللہ کی کتابیں اور اس کے رسول تو اس کا ان کو قطعاً علم نہیں۔

فلسفۂ یونان کے اصل ارکان و اساطین کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ ان کو اس علم کے حصول کے ذرائع اور مقدمات و مبادی حاصل نہیں اور اس کے بارے میں یقین تک پہونچنا اُن کے لئے مشکل ہے، چنانچہ امام ابن تیمیہؒ رقمطراز ہیں!

بَلْ قَدْ صَرَّحَ اَسَاطِيْنُ الْفَلْسَفَةِ بِاَنَّ الْعُلُوْمَ الْاِلٰهِيَّةَ لَا سَبِيْلَ فِيْهَا اِلَى الْيَقِيْنِ وَاِنَّمَا يُتَكَلَّمُ فِيْهَا بِالْاَحْرٰى وَالْاَلْيَقِ فَلَيْسَ لَهُمْ فِيْهَا اِلَّا الظَّنُّ (وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا) (نقض المنطق ص۱۴۱)

فلسفہ کے ارکان و اساطین نے اس بات کو صاف طور پر کہا ہے کہ علوم الٰہیہ میں یقین تک پہونچنے کوئی راستہ نہیں، ان میں جو کچھ کہا جائے گا اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ یہ ہوگی کہ یہ ہلکی ہوئی بات ہے یا یہ زیادہ مناسب ہے اس سے معلوم ہوا کہ فلاسفہ کے پاس الہیات میں ظن و تخمین کے سوا کچھ نہیں اور جیسا کہ قرآن مجید میں کہا گیا کہ ظن و تخمین کبھی حق سے مستغنی نہیں کرسکتے

❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊

❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊

مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مکتوب میں فلسفۂ الٰہیات کی بُری طرح خبر لیتے ہیں اور بے قابو ہو کر فرماتے ہیں۔

"فلاسفہ نے خدا کی ذات و صفات اور اس کے متعلقات پر بلا کسی سامان و اسباب اور بلا کسی علم و روشنی کے ایسی تفصیل و تدقیق سے اور ایسے وثوق و علم سے بحث کی جو ماہر کیمیا اپنے کیمیاوی تجربوں اور تحلیل و تجزیہ کے بعد کرتا ہے، اُن کے یہ مباحث و تحقیقات تمام تر فرضیات و تخمینات اور طلسمات کا مجموعہ ہیں اور محض قیاس پر مبنی ہیں، یہ الٰہیات کا اچھا خاصہ "طلسم ہوشربا" اور "فسانۂ عجائب" ہے۔
(مکتوب ۲۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی)

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ دوسری جگہ رقمطراز ہیں!

"ہزاروں برس کی ان کاوشوں اور مجاہدوں کا نتیجہ وہ متعارض و متناقض اور مضحکہ خیز اقوال و تحقیقات ہیں جو الٰہیات کا سرمایہ ہیں اور جنھوں نے اپنے مشتغلین اور متبعین کو خدا سے بجائے قریب کرنے کے خدا سے اور زیادہ دور اور اس کی ذات و صفات سے ناآشنا اور اس سے مستغنی کر دیا، اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝ یعنی کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنھوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری کر کے بدل ڈالا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں اُتار دیا۔

(مکتوب ۲۳/۲ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی فلسفۂ الٰہیات کا شجرہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں! ۔

"یہ دراصل یونانیوں کا وہ علم الاصنام ہے جس کا نام انھوں نے فلسفہ اور الٰہیات رکھ دیا اور لوگوں نے اس پر سنجیدگی سے غور و فکر یا مباحثہ شروع کر دیا یا محض فرضی داستان گوئی اور افسانہ آرائی ہے جس پر بے اختیار قرآن کریم کی یہ آیت یاد آتی ہے، مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۠ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ۝ یعنی میں نے ان کو آسمان و زمین کی پیدائش پر اور خود ان کی پیدائش پر گواہ نہیں بنایا اور میں گمراہ کرنے والوں کو اپنا دست و بازو بنانا بھی نہیں،

(تاریخ دعوت و عزیمت جلد چہارم صـ ۲۰۴)

فلسفہ دینی و الٰہی حقائق کے بارے میں بے بس ہے

دینی حقائق کا علم انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے واسطے کے بغیر نہیں ہو سکتا، وہی دینی حقائق و معارف سے آگاہی کا ذریعہ ہیں اور انھیں پر علوم الٰہیہ موقوف ہیں، فلاسفہ ہزاروں سال کی عرق ریزی اور محنت کے باوجود حقائق دینیہ کا ایک شمہ بھی نہیں حاصل کر سکتے، چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں! ۔

"دینی حقائق پیغمبروں کے واسطے کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتے، جن کو اللہ منصب رسالت سے سرفراز فرماتا ہے ان کو اپنی ذات و صفات اور ملکوت السموات والارض (زمین و آسمان

کی بادشاہی) کا سب سے بڑا علم بخشتا ہے اور پسندیدگی اور ناپسندیدگی اور احکام کا براہ راست علم عطا کرتا ہے اور ان کو اپنے اور انسانوں کے درمیان واسطہ بناتا ہے، ان کی رسالت و نبوت دنیا کے لئے اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ ذات و صفات الہٰی کا جو عظیم الشان علم وہ ان کو بلا زحمت اور بلا قیمت عطا کرتا ہے اسکے ایک ذرّہ کو بھی ہزاروں برس کی فلسفیانہ غور و فکر اور بحث و استدلال اور سالہا سال کے مجاہدہ و مراقبہ و تزکیۂ نفس سے نہیں حاصل کیا جا سکتا، ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ۔ یعنی یہ اللہ کا ہم پر اور تمام لوگوں پر فضل و احسان ہے لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ اور یہ بالکل صحیح فرمایا کہ اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے کیونکہ فلاسفہ اور حکماء اشراق در حقیقت اس نعمتِ نبوت کی ناقدری و ناشکری کرتے ہیں اور ان حقائق تک اپنی محنتوں سے پہونچنا چاہتے ہیں جن سے اللہ نے ان کو مستغنی کیا تھا۔

(مکتوب ۲۳ ج ۲ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی)

فلسفہ قرآن و حدیث کا منکر ہے

فلسفہ کتاب و سنت کا مخالف اور ان کی تعلیمات کا صاف طور پر منکر ہے، اُسے آسمان کے پھٹ جانے اور تاروں کے جھڑ جانے کا یقین نہیں آتا، اسلئے اس نے معراج سماوی، نزولِ ملائکہ، قیامت کے آنے اور اجسام کے دوبارہ زندہ ہونے کا کھلے طور پر انکار کر دیا، افسوس اُسے کتاب و سنّت کا تصریحات ہونے کے باوجود انکار کرتے ہوئے شرم نہ آئی، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں!

"فلاسفہ کی عقل ناقص گویا نبوت سے بالکل ضد اور مقابل سرے پر واقع ہوئی ہے ابتلائے عالم کے بارے میں بھی اور آخرت کے بارے میں بھی، ان کے مسائل صحت انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات کے بالکل مخالف ہیں، انھوں نے نہ ایمان باللہ درست کیا نہ ایمان بالآخرت اور عالم کے قدیم ہونے کے قائل ہیں حالانکہ تمام اہل ادیان و اہل ملل کا اجماع ہے کہ عالم اپنے تمام اجزاء کے ساتھ حادث ہے

اسی طرح وہ آسمانوں کے پھٹ جانے، تاروں کے جھڑ جانے، پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہونے اور سمندروں کے بہہ پڑنے کے قائل نہیں ہیں جس کا بروز قیامت وعدہ ہے، اسی طرح اجسام کے دوبارہ زندہ ہونے کے منکر ہیں اور قرآنی تصریحات کا انکار کرتے ہیں۔ (مکتوب ۲۳/۲ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی)

فلسفہ غیبی حقائق کا منکر ہے

فلاسفہ ہر ایسی چیز کا انکار کر دیتے ہیں جو ان کی محدود معلومات سے ٹکرائے خواہ وہ کیسی ہی صداقت اور سچائی کے ساتھ ہم تک پہونچی ہو، حد یہ ہے کہ انھیں انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بیان کردہ علوم وحقائق کے ساتھ انکار وخلاف سے پیش آنے میں کبھی باک نہیں ہوتا۔ چنانچہ حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:۔

"جس غیب کی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام خبر دیتے ہیں اور وہ کلیات عقلیہ جو تمام موجودات پر حاوی اور شامل ہیں اور جو موجودات کی صحیح تقسیم کرتی ہیں۔ ان سے فلاسفہ بالکل ناآشنا ہیں۔ اس لئے کہ اس پر اسی کو قدرت ہو سکتی ہے جو موجودات کی تمام انواع کا احاطہ کر سکے اور ان فلاسفہ کا یہ حال ہے کہ یہ صرف حساب اور اس کے بعض لوازم سے واقف ہیں اور یہ بہت تھوڑے موجودات کی واقفیت ہے۔ اس لئے کہ جن موجودات کا انسانوں کو مشاہدہ نہیں ہے وہ ان موجودات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ کثیر اور وسیع ہیں جن کا ان کو مشاہدہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر جن لوگوں کا علم فلاسفہ کی معلومات تک محدود ہے جب وہ انبیاء، ملائکہ، عرش، کرسی، جنت، جہنم وغیرہ کا ذکر سنتے ہیں اور وہ اس کے قائل ہوتے ہیں کہ موجود وہی ہے جو ان کو معلوم ہے اور ان کی معلومات کے دائرہ سے باہر موجودات کا وجود نہیں تو وہ حیران رہجاتے ہیں اور اپنی معلومات کے مطابق انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے کلام کی تاویل کرنے لگتے ہیں، اگرچہ یہ سرے سے کوئی دلیل نہیں ہے اور ان کو ان موجودات کے نہ ہونے کا کوئی مثبت علم بھی نہیں ہے۔ کیونکہ کسی چیز کے موجود نہ ہونے کا علم نہ ہونا الگ چیز ہے اور کسی چیز کے

معدوم ہونے کا علم ہونا الگ چیز ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو ہمیں معلوم نہیں وہ معدوم بھی ہو،

وہ جب ان غیبی حقائق کا انکار کرنے لگتے ہیں تو ان کا انکار ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کوئی طبیب جنات کے وجود کا انکار کر دے محض اس بنا پر کہ فن طب میں جنات کا کوئی ثبوت نہیں ہے حالانکہ فن طب میں جنات کے وجود کا انکار بھی نہیں ہے اسی طرح سے تم دیکھو گے کہ جس شخص کو کوئی فن آتا ہے اور وہ اس میں کچھ امتیاز بھی رکھتا ہے تو وہ اپنی ناواقفیت سے ان چیزوں کی نفی کرنے لگتا ہے جو اس کے فن سے خارج ہیں، واقعہ یہ ہے کہ لوگوں نے چیزوں کے ماننے اور اقرار کرنے میں اتنی ٹھوکر نہیں کھائی جتنی نہ ماننے اور انکار کرنے میں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ جس چیز کی حقیقت سے انسان پورے طور پر واقف نہیں ہوتا اس کو جھٹلانے اور اس کے وجود کا انکار کرنے کا رجحان انسان میں بہت قدیم اور عام رہا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہے۔ بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ، یعنی کافروں نے ان چیزوں کو جھٹلا دیا جن کا ان کو پورا علم نہیں تھا۔ حالانکہ ابھی تک ان پر اُن کی پوری حقیقت منکشف نہیں ہوئی[۱]،،

باقی آئندہ

---

[۱] حافظ ابن تیمیہؒ کی نقض المنطق اور الرد علی المنطقیین کا حوالہ دینے تک آچکا تھا۔ اس لئے تسوید کے وقت اس جگہ حوالہ چھوڑ بیٹھا، اگر ضرورت ہو تو مطلع فرمائیں، کہیں سے معلوم کر کے بھیجدوںگا ویسے مدرسہ میں یہ کتابیں نہیں ملتی ہیں۔ (قاسمی)

ایک استفتا اور اس کا جواب

بعد سلام مسنون عرض ہے کہ میں جزائر مالدیپ کا رہنے والا ہوں اس وقت لیبیا کے ایک جامعہ میں زیر تعلیم ہوں اس سے پہلے ہندوستان میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں پڑھا ہندوستان میں مشکوۃ تک پڑھکر پاکستان گیا وہاں فیصل آباد میں تعلیم مکمل کر کے کلیۃ الدعوہ واصول الدین میں تعلیم مکمل کی اس کے بعد سرکاری کوٹے میں گذشتہ سال لیبیا آیا یہاں مجھے ہندوستان کی تعلیم میں بڑا فرق محسوس ہو رہا ہے، اللہ کے فضل وکرم سے ہندوستان و پاکستان میں صحیح تعلیم حاصل کی جس سے میں بڑا مطمئن ہوں یہ مختصر تعریف تھی اس سے مقصد آپ سے کچھ باتیں معلوم کرنی ہیں امید ہے کہ آپ اپنے علم سے افادہ فرمائیں گے۔

ایک سوال یہ ہے کہ فقہ میں پڑھا تھا قذف محصنات میں چار گواہ ضروری ہیں اور گواہی کی صورت ان تکون شہادتہم نتیجۃ معاینۃ کالمرود فی المکحۃ، اس میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کل کے زمانہ میں ویڈیو کیمرہ موجود ہے جو آدمی کی حرکات، افعال واقوال اور اصوات کو بعینہٖ ریکارڈ کر لیتا ہے اور بعد میں ٹیلی ویژنوں کے ذریعہ دوسرے دیکھ سکتے ہیں تو اگر کسی نے کسی کو زنا کرتے ہوئے دیکھا اور کیمرہ سے اس کو محفوظ کر لیا اور قاضی کے سامنے پیش کر دیا تو کیا اس سے شرعی لحاظ سے یہ بات ثابت ہو سکتی ہے کہ وہ زانی ہے یا وہی چار گواہ کی صورت شرط لازم ہے، میں بھی جانتا ہوں کہ تصویر ممنوع ہے لیکن یہ ایک ایسا ثبوت ہے جو بظاہر آدمی کی گواہی سے بھی زیادہ قوی ہے۔ اس لئے کہ چار آدمی جھوٹی گواہی پر متفق ہو سکتے ہیں۔ لیکن کیمرہ کبھی حقیقت کے خلاف نہیں دکھائے گا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ہم سب کا عقیدہ ہے کہ قرب قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف

لائیں گے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تقریباً جتنے بھی عرب علماء ہیں وہ سب اسکے منکر ہیں اور اس بارے میں جو آیات اور حدیث موجود ہے اس کی تاویل کرتے ہیں۔ تقریباً قادیانی بھی یہی تاویلیں کرتے ہیں امید ہے کہ آپ اس بارے میں صحیح بات تفصیل سے تحریر فرمائیں گے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا یہ سچ ہے کہ "ولتکن منکم امۃ" والی آیت میں امت سے مراد عرب ہے۔ اس سے پہلے ہم یہ جانتے آئے کہ امت سے مراد مسلمانوں میں سے کوئی بھی جماعت جو آیت میں مطلوب ہے اُسے انجام دے تو وہ اس میں داخل ہے جس نے یہ بحث بیٹھی کی اس نے دلیل میں یہ کہا کہ انہ ذکرلك ولقومك فسوف تسئلون، اور آیت میں بھی خطاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور عرب کو ہے اور دین کے بارے میں قیامت میں عرب سے پوچھ گچھ ہو گی" اس سے یہ لوگ یہ کہنا چاہتے ہیں بلکہ کہتے بھی ہیں کہ ہم جو کہتے ہیں وہی سچ ہے، غیر عرب کو قرآن کیا سمجھ میں آئے گا۔ ہماری زبان ہے ہم پر نازل ہوا اور دوسروں کو پہنچانا ہمارا کام ہے" میں یہ دیکھتا ہوں کہ یہ لوگ اس بہانہ سے دین کے اندر جو اپنی مرضی میں آئے داخل کر لیتے اور جو مرضی میں آئے نکال دیتے ہیں۔

چوتھا اور آخری سوال یہ ہے کہ کسی ملک میں سب کے سب امیر ہیں کوئی غریب نہیں ہے اور سب کے پاس اتنا مال ہے کہ نصاب زکوٰۃ پورا ہوتا ہے۔ تو پھر یہ ملک والے زکوٰۃ کس طرح دیں گے ایک عجیب بات میں نے یہ دیکھی ہے کہ یہ بنام اسلامی و عربی ملک ہے لیکن یہاں عربی کی ہزاروں کروڑوں کتابیں موجود ہونے کے باوجود کوئی حدیث و تفسیر اور فقہ کی کتاب نہیں ملتی ہے صرف تفسیر میں ابن کثیر اور منار ملتی ہے۔ باقی صحیح بخاری تک نہیں ملتی، کوئی باہر سے منگوائے تو بھی ڈاکخانہ سے ضبط کر لی جاتی ہے، جب میں یہاں آیا تو میں نے سوچا کہ عرب ملک ہے یہاں حدیث فقہ، تفسیر اور اصول کی کتابیں ملیں گی ان سے خوب فائدہ اٹھاؤں گا لیکن بہت افسوس ہوتا ہے کہ یہاں بالکل خلافِ ظن کام ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دارین میں سعادت سے نوازے اور آپ کے علم سے دنیا کو نفع ہو۔

والسلام علیکم
۸ر نومبر ۱۹۸۲ء

باسمہٖ سبحانہ تعالیٰ

الجواب :- سب سے پہلے چند اصولی باتیں بابت سوال ملا ذہن نشین کریں تاکہ جواب کے سمجھنے میں سہولت ہو ،

زنا کی سزا سخت ہے اس لئے اس کے گواہوں میں بھی شریعت نے دو طرح سے سختی سے کام لیا ہے ۔ زنا کی وجہ سے خود اس شخص کی بھی عزت و عفت مجروح ہوتی ہے اور ساتھ ہی خاندانوں کیلئے ننگ و عار کی بات ہے اس لئے اوّلاً تو یہ شرط لگائی کہ اس کے گواہ صرف مرد ہی ہو سکتے ہیں ۔ اس مسئلہ میں عورتوں کی گواہی کا اعتبار نہیں کیا گیا ہے ۔ ثانیاً گواہ میں چار مردوں کا ہونا ضروری قرار دیا ۔

اور وہ بھی عینی شہادت ، ظاہر ہے کہ یہ شرط بہت ہی سخت ہے ۔ جس کا وجود میں آنا شاذ و نادر ہی ہو سکتا ہے ۔ یہ سختی اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ عورت کا شوہر یا اس کی والدہ یا بیوی ، یا بہن یا کوئی اور ذاتی پرخاش کی وجہ سے خواہ مخواہ الزام نہ لگا سکے کیونکہ اگر چار مرد سے کم زنا کی گواہی دیں گے تو ان کی گواہی قابل اعتبار نہ ہوگی اور ایسی صورت میں مدعی اور گواہ سب جھوٹے قرار دئے جائیں گے ۔ اور ایک مسلمان پر الزام لگانے کی وجہ سے اُن پر حد قذف جاری ہوگی ۔ سورۂ نور میں واضح طور پر ارشاد باری تعالیٰ ہے ۔

لولا جاؤا علیہ باربعۃ شھداء فاذ لم یاتو بالشھداء فاولئک عند اللہ ھم الکاذبون ،، کہ جو لوگ چار گواہ نہ لاسکیں وہ جھوٹے ہیں نیز چونکہ شریعت مطہرہ کا منشاء پردہ پوشی ہے تاکہ افشاء فاحشہ نہ ہوسکے اس لئے بھی چار گواہ مناسب ہیں ۔ قال صاحب روح المعانی **واشترط الاربعۃ فی الزنا تغلیظا علی المدعی و سترا علی العباد** ، اس کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے ۔ **البینۃ او حدًا فی ظھرک** (بخاری شریف بحوالہ مشکوٰۃ)
وجاء فی بعض الطرق ، ائت باربعۃ شھداء والا فحد ،،

امام ابوبکر حصاص رازی نے احکام القرآن (ص ۲۶۷/۳ میں) **ثم لم یاتوا باربعۃ شھداء** کے تحت لکھا ہے ۔ **ومعلوم ان ھذا العدد من الشھداء انما ھو مشروط فی الزنا** ۔

کتاب وسنت اور اجماعِ امت کی روشنی میں آیت شہود زنا "وَالّتِی یاتین الفاحشة من نسائکم فاستشہدوا علیہن اربعة منکم کی صحیح تفسیر کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ثبوت زنا کیلئے چار مردی گواہ ہونے چاہئیں۔

ان بنیادی اور ضروری توضیحات کے بعد اب اصل جواب ملاحظہ ہو۔

(۱) ثبوت زنا کیلئے چار مرد (مسلمان، آزاد، عاقل، بالغ) ہی کی شہادتِ معاینہ ضروری ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور طریقہ سے مثلاً ویڈیو کیمرہ وغیرہ کے ذریعہ سے زنا کا ثبوت نہیں ہو سکتا ہے۔

مسئلہ کے پہلے جزء کے متعلق دلائل آچکے ہیں تاہم مزید چند فقہی عبارات بھی ملاحظہ ہوں۔

صاحب ہدایہ بدایۃ المبتدی (متن ھدایۃ) میں فرماتے ہیں الزنا یثبت بالبینۃ او الاقرار، فالبینۃ، ان تشھد اربعۃ من الشھود علیٰ رجل وامرأۃ بالزنا،

صاحب فتح القدیر علامہ ابن ہمام مصنف رح (صاحب ھدایۃ) کی پیش کردہ دلیل کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں وانما کانت الشھود اربعۃ لقولہ تعالیٰ، فاستشھدوا علیھن اربعۃ منکم، اربعۃ منکم کی تقیید بطور خاص پیش نظر رہے) وقال تعالیٰ ثم لم یاتوا باربعۃ شھداء وقال صلی اللہ علیہ وسلم اربعۃ شھود والا فحد فی ظھرك (رواہ البخاری)

چار گواہوں کا ہونا اجماعی مسئلہ ہے۔

والمسئلۃ وھی اشتراط الاربعۃ قطعیۃ مجمع علیھا (فتح القدیر)

شریعتِ مطہرہ کا منشاء زنا کو ختم کرنا ہے۔ لان الشیئ کلما کثرت شروطہ قل وجودہ فان وجودہ اذا توقف علی اربعۃ لیس کوجودہ اذا توقف علی اثنین منھا فیتحقق بذلك الاندراء (فتح القدیر)

ستر زنا مندوب ہے۔ قال صلی اللہ علیہ وسلم من اصاب منکم من ھٰذہ القاذورات شیئا فلیستر بستر اللہ، وقال من ستر علی مسلم سترہ اللہ

فی الدنیا والآخرۃ (عنایۃ شرح ھدایۃ)

نیز چار گواہوں سے توثق پیدا ہوتا ہے جو ضروری ہے اسی توثق کی خاطر فقہاء نے شرط لگائی کہ (واذا شھدوا سألھم الامام عن الزنا[1] احترازاً عن الغلط فی الماھیۃ (وکیف ھو[2]) احترازاً عن الغلط فی الکیفیۃ (واین زنیٰ[3]) احترازاً عنہ فی المکان (ومتیٰ زنیٰ[4]) احترازاً عنہ فی الزمان (وعن المزنیۃ[5]) احترازاً عنہ فی المفعول بہ (عنایۃ شرح ھدایۃ) بلکہ توثق مستزاد ہی کے لئے شہادت معاینہ کی بھی شرط لگائی گئی۔ قالوا رأیناہ وطیھا فی فرجھا کالمیل فی المکحلۃ (ھدایۃ) پھر اسی پر بس نہیں بلکہ علانیہ وخفیہ (سی۔آئی۔ڈی۔کے ذریعہ) تحقیق وتعدیل کرائی جائے گی۔ تاکہ گواہ محض جھوٹا الزام نہ لگا رہے ہوں۔ فعدلوا فی السر والعلانیۃ۔(ھدایۃ) حتیٰ کہ اقرار کی صورت میں بھی چار مرتبہ پوچھا جائے گا تاکہ یہ چار مرتبہ کا اقرار چار گواہوں کے قائم مقام ہوسکے چنانچہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حضرت ماعز اسلمیؓ نے خود اقرار کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف عنوانوں سے چار مرتبہ سوال کیا۔

مسئلہ کے دوسرے جزء کے بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ویڈیو کیمرہ وغیرہ کے ذریعہ فوٹو لینا زنا کے اثبات کے لئے نصوص صریحہ غیر مسئولہ کے قطعًا خلاف ہے کما لا یخفیٰ چنانچہ جہاں تک معلوم ہے دنیاوی قانون میں بھی صرف فوٹو... شہادت کے قائم مقام نہیں تسلیم کیا گیا ہے۔ فوٹو غلط بھی ہوسکتا ہے اور مرد وعورت کے فوٹو الگ الگ لیکر دونوں کو ملایا بھی جاسکتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ منشاء شریعت کے بھی خلاف ہے جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، شریعت کا منشاء ستر (پردہ پوشی) ہے اور زنا کی حالت میں لی ہوئی تصویر کو ٹیلی کاسٹ کرنا اشاعت فاحشہ ہے، والاشاعۃ ضد الستر فیکون مذمومًا لقولہ تعالیٰ ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشۃ فی الذین اٰمنوا لھم عذاب الیم فی الدنیا والاٰخرۃ (کفایہ شرح ھدایہ)

اگر فوٹو سے زنا کا ثبوت ہوجائے تو یہ بطریق قیاس ہوگا، ولا سبیل الی اثبات الحدود من طریق القائسین وانما طریقھا الاتفاق او التوقف (احکام القرآن للجصاص)

نیز بیان سابق سے معلوم ہو چکا ہے کہ باجماع امت مسلمہ (آیت شہود زنا میں) چہار مردوں ہی کی گواہی قطعی ہے اور اب کسی شے کی زیادتی ثبوت حکم قطعی کے بعد زیادتی نص پر ہے "والزیادة فی النص بعد استقرار حکمہ توجب النسخ" (احکام القرآن للجصاص)

رہا یہ سوال کہ ——— اور یہی آپ کا منشاء سوال ہے کہ جس طرح چار گواہوں سے تیقین ہوتا ہے اسی طرح بلکہ اس سے مستزاد ہی فوٹو سے یقین کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، کیونکہ چار گواہوں میں اتفاق علی الکذب کا احتمال ہے۔ لیکن فوٹو میں یہ احتمال نہیں کہ فوٹو کبھی خلاف واقعہ دکھا ہی نہیں سکتا۔

واقعہ قطعاً اس کے برعکس ہے کیونکہ گواہوں میں جتنے بھی احتمالات داخلی وخارجی ہو سکتے تھے ان سب کی تحقیق وتفتیش کے لئے ابھی عنایہ وہدایہ کی عبارتیں گذری ہیں اس ترتیب کے بعد قطعاً کوئی احتمال نہیں رہتا چنانچہ اگر گواہ معیار پر پورے نہیں اترتے ہیں تو ان کی شہادت پر فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ لوشھد اربعة فساق بالزنا لا یقضیٰ شہادتہم (فتح القدیر) اس کے برخلاف فوٹو چونکہ عکس ہے لہٰذا اس میں ہزاروں احتمال ہیں۔ چنانچہ ابھی معلوم ہو چکا ہے فوٹو کے لئے بالکل ضروری نہیں ہے کہ واقعہ کے مطابق ہی ہو بلکہ بسا اوقات فوٹو فرضی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ بات مشاہدہ کی ہے نیز چار گواہوں میں جس درجہ کا توثق ہوتا ہے۔ فوٹو میں نہیں ہوتا ہے۔ چنانچہ گواہ کالمیل فی المکحلة کا معاینہ کر سکتے ہیں لیکن فوٹو میں معاینہ نہیں ہو سکتا ہے بلکہ زائد سے زائد انضمام دکھایا جا سکتا ہے اور اس سے زنا کا ثبوت نہیں ہو سکتا ہے۔ چونکہ یہ مشتبہ ہے اور فرمانِ نبوی ہے "تندرء الحدود بالشبہات" "وفی بعض الروایة ادرء الحدود ما استطعتم" ان سب کے علاوہ فوٹو دکھانے کے بعد زانی یا تو اقرار کرے گا یا انکار اگر اقرار کر لیتا ہے تو اقرار کی بناء پر زنا کا ثبوت ہوگا اور اگر انکار کرتا ہے تو جرم ثابت نہ ہوگا چونکہ یہ عکس حجة مشتبہ وملزمہ نہیں ہے۔

(۲) دنیا میں صرف یہودیوں کا یہ کہنا ہے کہ عیسیٰ علیہ السّلام مقتول ومصلوب ہو کر دفن ہو گئے اور پھر زندہ نہیں ہوئے اور ان کے اس خیال کی حقیقت قرآن کریم نے سورۂ نساء کی آیت "وما قتلوه وما صلبوه ولکن شبہ لہم" میں واضح کر دی ہے اور آل عمران کی

آیت ومکروا ومکر اللہ میں بھی اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں کے کید اور تدبیر کو خود انہی کی طرف لوٹا دیا۔

نصاریٰ کا یہ کہنا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام مقتول ومصلوب تو ہو گئے مگر پھر دوبارہ زندہ کر کے آسمان پر اٹھا لئے گئے، مذکورہ آیت نے ان کے اس خیال کی بھی تردید کر دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ شبہ لہم، کے مصداق یہود کی طرح نصاریٰ بھی ہیں ان دونوں گروہوں کے بالمقابل اسلام کا وہ عقیدہ ہے جو اس آیت اور دوسری کئی آیتوں میں وضاحت سے بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان یہودیوں کے ہاتھ سے نجات دینے کے لئے زندہ آسمان پر اٹھا لیا نہ اُن کو قتل کیا جا سکا نہ سولی پر چڑھایا جا سکا وہ زندہ آسمان پر موجود ہیں اور قرب قیامت میں آسمان سے نازل ہو کر یہودیوں پر فتح پائیں گے اور آخر میں طبعی موت سے وفات پائیں گے۔ اسی عقیدہ پر تمام امت مسلمہ کا اجماع واتفاق ہے حافظ ابن حجر عسقلانی نے تلخیص الجبیر صفحہ ۳۱۹ میں یہ اجماع نقل کیا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات اور حدیث کی متواتر روایات سے یہ عقیدہ اور اس پر اجماع امت ثابت ہے۔ حافظ ابن کثیر نے سورہ احزاب کی آیت وانہ لعلم الساعۃ کی تفسیر میں لکھا ہے،

وقد تواترت الاحادیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ اخبر بنزول عیسیٰ علیہ السلام قبل یوم القیامۃ اماماً عادلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے اور زندہ رہنے پھر قرب قیامت میں نازل ہونے کا عقیدہ قرآن کریم کی نصوص قطعیہ اور احادیث متواترہ غیر مؤولہ سے ثابت ہے۔ جن کو علماء امت نے مستقل کتابوں رسالوں کی صورت میں شائع کر دیا ہے جن کا مطالعہ کافی ہے۔ ملاحظہ ہو، عقیدۃ الاسلام فی حیات عیسیٰ علیہ السلام اور التصریح بما تواتر فی نزول المسیح۔ از حضرت مولانا حجۃ الاسلام انور شاہ کشمیری۔ مؤخر الذکر میں سو سے زائد احادیث کے ذریعہ حضرت مسیح علیہ السلام کا زندہ آسمان پر اٹھایا جانا اور پھر قرب قیامت میں نازل ہونا تواتر ثابت کیا گیا ہے۔ جس کو شیخ ابو الفتاح ابو غدہ نے بیروت سے شائع کیا ہے۔

(۳) ــ ولتكن منكم امة ،، میں امت بمعنی جماعت ہے اور جماعت سے مراد پوری امت محمدیہ ہے قال صاحب روح المعانی تحت قولہ تعالیٰ کنتم خیر امۃ ٥ والخطاب قيل لاصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم خاصة واليه ذهب الضحاك وقيل المهاجرين من بينهم وهو احد خبرين عن ابن عباس رضى الله تعالى عنه وفى آخر انه عام لامة محمد صلى الله عليه وسلم ويؤيده ما اخرجه الامام احمد بسند حسن عن ابى الحسن كرم الله تعالى وجهه، قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم - اعطيت مالم يعط احد من الانبياء نصرت بالرعب واعطيت مفاتيح الارض، وسميت احمد وجعل التراب لى طهوراً وجعلت امتى خير الامم ،، مزید اس قول کی وجہ ترجیح اور دیگر روایتوں کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں - والظاهر ان الخطاب وان كان خاصا بمن شاهد الوحى من المومنين اوبعضهم لكن حكمه يصلح ان يكون عاما للكل كما يشير اليه قول عمر رضى الله عنه فيما حكى قتادة - يا ايها الناس من سره ان يكون من تلكم الامة فليؤد شرط الله تعالى منها واشار بذلك الى قوله تعالى تامرون بالمعروف و تنهون عن المنكر فانه يفهم الشرطية وصححه ابن كثير رح .

دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی قومی اور اجتماعی فلاح دو چیزوں پر ـــ موقوف ہے پہلے تقویٰ اور اعتصام بحبل اللہ کے ذریعہ اپنی اصلاح دوسرے دعوت و تبلیغ کے ذریعہ دوسروں کی اصلاح ،، آیت ،، ولتکن منکم امۃ ،، اس دوسری ہدایت کا بیان ہے - یہی مضمون ہے جو سورہ والعصر میں بھی ارشاد فرمایا گیا ہے ۔" الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر،، اور اسی سورہ آل عمران میں ارشاد ہے - کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر اس میں بھی پوری امت پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ عائد کیا گیا ہے ۔ اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس بارے میں بے شمار ہیں ۔ ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ۔

والذی نفسی بیدہ لتامرون بالمعروف ولتنھون عن المنکر او لیوشکن اللہ ان یبعث علیکم عقاباً من عندہ ثم لتدعونہ فلایستجیب لکم۔ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذالک اضعف الایمان،

ان تمام آیات کریمہ اور احادیث شریفہ سے ثابت ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر حسب مراتب امت کے ہر فرد پر لازم ہے۔ نیز اس امت مسلمہ کا وصف ممدوح "امت وسطہ" بیان کیا گیا ہے۔ وکذالک جعلنا کم امۃ وسطا لتکون شھداء علی الناس اور یہ بات اپنی جگہ ثابت ہے کہ امت محمدیہ میں ہر قسم کا اعتدال ہے اس میں اعتقادی اور روحانی واخلاقی اعتدال بھی ہے تو عمل اور عبادت کے لحاظ سے بھی اعتدال ہے، معاشرتی اور تمدنی اعتدال بھی ہے۔ اور مالی واقتصادی اعتدال بھی ہے۔ توجب وصف میں پوری امت شریک ہے تو مصداق آیت بھی پوری امت ہوگی۔ بشرطیکہ ماموارت کی بجاآوری اور منہیات سے احتراز کرے۔

(۴) صورت مسئولہ میں اگر زکوٰۃ سرکاری طور پر وصول کی جاتی ہے اور اس کے لئے عاملین مقرر ہیں تو وہ (بشرطیکہ غیر ہاشمی ہوں) لیں گے خواہ غنی (شرعی) ہی کیوں نہ ہوں، یأخذ وان کان غنیاً (ھدایۃ) اور اگر ایسا نظام نہیں ہے یا ان کی ضروریات سے زائد ہے یا وہ اپنا حق نہ لیں تو دوسری جگہ جہاں مصرف زکوٰۃ ہوں۔ زکوٰۃ کے اموال کو منتقل کیا جاسکتا ہے۔ الا تری ان معاذاً رضی اللہ عنہ کیف نقلھا من الیمن الی المدینۃ (کفایۃ للکولانی) فقط۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب وعندہ علم الکتاب

محمد ظفیر الدین غفرلہٗ
مفتی دارالعلوم دیوبند، ۱۸ ربیع الاول ۱۴۰۵ھ

کفیل الرحمٰن نشاط
نائب مفتی دارالعلوم دیوبند
۱۹ ربیع الاول ۱۴۰۵ھ

اسلام میں روزہ کی افادیت

از۔ حبیب الرحمٰن القاسمی

اسلام ایک جامع اور مکمل شریعت ہے جس کے اندر مختلف نوع کی عبادتیں ہیں جن میں سے بعض کا تعلق قول سے ہے جیسے ذکر، دعا، دعوت الی الخیر، وعظ و تذکیر اور تعلیم و تعلم وغیرہ اور بعض عبادتیں ایسی ہیں جن کا تعلق فعل سے ہے، خواہ وہ بدنی ہوں جیسے نماز یا مالی ہوں جیسے زکوٰۃ وصدقات یا بدنی و مالی دونوں ہوں جیسے حج اور جہاد فی سبیل اللہ اور بعض عبادتیں وہ ہیں جو نہ قولی ہیں اور نہ فعلی بلکہ ان میں صرف رکنا پایا جاتا ہے جیسے روزہ (اکثر علماء نے روزہ کو عبادت بدنی میں شمار کیا ہے۔ اور یہی اقرب الی الصواب ہے، کیونکہ کسی چیز سے رکنا بھی تو ایک فعل اور عمل ہی ہے۔

روزہ کی حقیقت عبادت کی نیت سے صبح صادق سے غروب آفتاب تک کھانے پینے اور جماع سے رکے رہنے کا نام روزہ ہے یہ عبادت اسلام سے پہلے دیگر مذاہب میں بھی کیفیت و کمیت کے فرق کے ساتھ مشروع تھی جیسا کہ قرآن خود شہادت دے رہا ہے

یا ایہا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام۔ کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون

اے ایمان والو فرض کیا گیا تم پر روزہ جیسے فرض کیا گیا تھا ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ

لیکن جس طرح اسلام نے نماز، زکوٰۃ میں جامعیت و مرکزیت پیدا کر کے انھیں دیگر ادیان و مذاہب کے نماز و زکوٰۃ............ سے ممتاز بنا دیا۔ اسی طرح سے روزہ کو بھی دیگر مذاہب کے روزوں کے مقابلہ میں اختصاص و امتیاز عطا کیا گیا۔ چنانچہ اسی غرض سے صوم مفروض کو ایک مہینے کے لئے خاص کیا گیا اور پھر اس کے لئے وہ مہینہ منتخب کیا گیا جس میں اللہ کی جانب سے مسلمانوں کو دستور ہدایت یعنی قرآن مرحمت فرمایا گیا ارشاد خداوندی ہے

شهر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ھدی للناس وبینات من الھدیٰ والفرقان فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ (البقرہ)

رمضان وہ مہینہ ہے جس میں نازل کیا گیا قرآن جو انسانوں کے لئے ہدایت ہے اور ہدایت کی واضح دلیل اور حق وباطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے لہذا جو شخص اس مہینہ کو پائے تو اس کے روزے ضرور رکھے۔

روزہ کی مصالح

(۱) ہمیں اس بات پر یقین کامل ہے کہ روزہ کی فرضیت میں بہت سی حکمتیں ومصلحتیں پوشیدہ ہیں اگرچہ ہمارا نارسا ذہن ان تمام اسرار وحکم اور مصالح تک نہ پہنچ سکے البتہ بعض حکمتیں جو سمجھ میں آرہی ہیں انھیں یہاں بیان کیا جارہا ہے

اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے خود اپنے وجود پر... غور کرنا چاہیئے کہ انسان کی اصل حقیقت کیا ہے۔ کیا انسان گوشت و پوست اور ہڈی چمڑے کے اس ظاہری مجموعہ کا نام ہے یا اس کی حقیقت اس ظاہری ڈھانچہ کے علاوہ کچھ اور ہے۔ ظاہر ہے کہ صرف اس ظاہری ڈھانچہ کو انسان کبھی نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ اس صورت میں انسان سے زیادہ حقیر اور کم درجہ کی کوئی اور مخلوق نہ ہوگی حالانکہ انسان اشرف مخلوقات اور خلاصۂ کائنات ہے اس لئے لازمی طور پر یہ ماننا ہوگا کہ انسان اس ظاہری شکل وصورت کا نام ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ کسی اور ہی چیز کا نام ہے جس کی بنا پر وہ تمام مخلوقات میں ایک امتیازی مقام رکھتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کونسی چیز ہے جس کے ذریعہ انسانیت کا وجود متحقق ہوتا ہے تو نفس انسانی میں غور وفکر کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ درحقیقت انسان ایک جوہر روحانی کا نام ہے جس کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے غور و فکر کی استعداد و صلاحیت پیدا کر رکھی ہے جس کے ذریعہ وہ نہ صرف سمجھتا بوجھتا ہے بلکہ پوری کائنات پر حکومت کرتا ہے اور اسی امتیازی وصف کی بنا پر مسجود ملائکہ بنایا گیا۔ چنانچہ قرآن حکیم اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

اذ قال ربک للملائکۃ انی خالق — جب کہا تمہارے رب نے فرشتوں سے میں بناتا ہوں

بشرا من طین فاذا سویتہ ونفخت فیہ من روحی فقعوا لہ ساجدین ۔ (سورۂ ص) — ایک انسان مٹی کا پھر جب ٹھیک بنا چکوں اور پھونکوں اس میں اپنی روح سے تو تم جھک پڑو سجدہ میں۔

اور خواہشات نفسانیہ کو دبانے سے قوت روحانیہ کو تقویت حاصل ہوتی ہے روزہ میں خواہش بطن و فرج کی شکست و ریخت ہوتی ہے۔ اسلئے لازمی طور پر روحانیت کو قوت و طاقت ملے گی اور اسی جوہر روحانی سے آدمی انسان کہلاتا ہے تو گویا روزہ کے ذریعہ انسانیت کی تشکیل و تکمیل ہوتی ہے۔

(۲) روزہ سے جہاں روح کو طاقت ملتی ہے وہیں اس سے بدن کی بھی اصلاح ہوتی ہے اسلئے کہ اکثر امراض معدہ کی خرابی کی بناء پر پیدا ہوتے ہیں (چنانچہ کہا جاتا ہے "المعدۃ ام الامراض" معدہ بیماریوں کی جڑ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ "ما ملاء ابن آدم وعاء شرا من بطنہ" انسان کے لئے سب سے خراب بات اپنے شکم کو پُر کرنا ہے۔ لہذا جب پیٹ کا بھرنا۔ امراض اور بیماریوں کا پیش خیمہ ہے ——— تو اس کا علاج یہ ہے کہ پیٹ کو خالی رکھا جائے اور روزہ کے اندر یہی بات ہے کہ پیٹ کو خالی رکھا جاتا ہے۔ جس سے بدن کی اصلاح ہو جاتی ہے اور آدمی بہت سے امراض سے محفوظ ہو جاتے

(۳) روزہ کا ایک اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ سے آدمی کے اندر صبر و استقامت کی قوت پیدا ہوتی ہے (جو انسان کے لئے بڑی خوبی کی چیز ہے) روزہ دار کے سامنے عمدہ اور مرغوب غذائیں ٹھنڈا اور شیریں پانی رکھا رہتا ہے مگر ان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا حالانکہ بظاہر اس کو ان چیزوں کے استعمال کرنے سے کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ لیکن اس کا ضمیر اس کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ وہ اپنے روزہ کو برباد کر کے خدا کے غضب کا مستحق بنے ایک مہینہ کی یہ مشق و تمرین لامحالہ انسان کے اندر استقلال و استقامت کی طاقت پیدا کرے گی چنانچہ ماہرین نفسیات نے اپنے علم و تجربہ کی بنیاد پر یہ بات کہی ہے کہ روزہ سے زیادہ ارادوں میں پختگی اور عزائم میں پائیداری پیدا کرنے والی کوئی دوسری چیز نہیں ہے ۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور خاص جوانوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے۔

معشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء (بخاری شریف)

اے جوانو! تم میں سے جس کے اندر استطاعت ہو وہ ضرور نکاح کرے اسلئے کہ نکاح نگاہوں کو پست رکھنے والا اور فرج کی حفاظت کرنے والا ہے اور جو نکاح کی طاقت نہیں رکھتا وہ اپنے اوپر روزہ کو لازم کرلے اسلئے کہ روزہ اسکے لئے بندش کا کام دے گا۔

ایک موقع پر اسی مضمون کو یوں بیان فرمایا

لکل شیٔ زکوٰۃ وزکوٰۃ الجسد الصوم، والصوم نصف الصبر۔

ہر چیز کی زکوٰۃ ہے اور جسم کی زکوٰۃ روزہ ہے اور روزہ نصف صبر ہے۔

اس حدیث پاک میں روزہ کو نصف صبر اسلئے فرمایا گیا ہے کہ انسان کے اندر تین قوتیں ہیں ایک قوت شہوانی، دوسری قوت غضبی اور تیسری قوت روحانی اور روزہ سے انسان قوت شہوانی پر غالب آجاتا ہے تو گویا اُسے نصف صبر حاصل ہوگیا۔

(۴) اسلام صرف نام و نمود کا مذہب نہیں ہے بلکہ یہ دین جہاد ہے۔

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے ۔ لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا۔

اور جہاد کیلئے صبر و استقامت ایک لازمی چیز ہے۔ لہذا جو شخص اپنی ذات کے مقابلہ میں جہاد نہیں کرسکتا وہ اپنے دشمن سے کیا مقابلہ کرے گا۔ اور جس کا اپنے نفس پر قابو نہیں چلتا وہ اپنے دشمن کو کیونکر زیر کرے گا۔ اور جسے ایکدن کی بھوک و پیاس پر صبر نہیں ہوتا وہ گھر بار چھوڑنے پر کیسے صبر کرے گا ؟ اسلئے سال میں ایک ماہ کے روزے کا حکم دیکر صبر و استقامت کی تمرین کرائی جاتی ہے تاکہ آدمی جہاد کیلئے تیار ہوجائے۔

(۵) روزہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کی قدر و منزلت کا عرفان پیدا ہوتا ہے، کیونکہ "تعرف الاشیاء باضدادہا"، جب تک آدمی کو بھوک و پیاس کی شدت کا احساس نہ ہو اُسے کھانے پینے کی سچی قدر کیا ہوگی اور جب ان نعمتوں کی قدر و منزلت کی معرفت حاصل ہوگی تو اس کا زیادہ سے زیادہ حق ادا کرنے کی کوشش کرے گا تو اس طرح روزہ

اللہ تعالیٰ کے شکر اور اس کی عبادت پر آمادہ کرنے میں ایک قوی اثر رکھتا ہے۔ اسی لئے ہمارے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر کو غنا پر ترجیح دی۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

عرض علیّ ربی لیجعل لی بطحاء مکۃ ذھبا قلت لا یارب ولکن اشبع یوما واجوع یوما فاذا جعت تضرعت الیک وذکرتک واذا شبعت شکرتک وحمدتک ۔ (ترمذی)

مجھ پر میرے رب نے یہ بات پیش کی کہ میرے لئے بطحاء مکہ سونا بنادیا جائے تو میں نے عرض کیا اے میرے رب مجھے اس کی ضرورت نہیں میں تو ایکدن آسودہ شکم رہونگا اور ایک دن بھوکا رہوں گا۔ جس دن بھوکا رہوں گا آپ سے تضرع کروں گا اور آپ کو یاد رکھوں گا۔ اور جس دن آسودہ رہوں گا آپ کا شکر اور حمد کروں گا۔

(۶) پھر روزہ کی وجہ سے جب آدمی بھوک و پیاس کی شدت کو محسوس کرتا ہے تو اس کے اندر غرباء و مساکین کی تکلیف کا احساس بیدار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ناز و نعمت میں پلا ہوا جس نے بھوک و پیاس کی تکلیف کبھی برداشت نہ کی ہو۔ اسے بھوکوں، پیاسوں کی حالت زار اور اذیت کا کیا علم ہو گا۔ لیکن روزہ کی وجہ سے جب اُسے بھوک کی اذیت کا ذاتی تجربہ ہوتا ہے تو پھر اس کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو گا۔ کہ غریبوں اور ناداروں کی امداد و اعانت کرکے انھیں اس تکلیف واذیت سے بچائے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارباب سیر لکھتے ہیں کہ حیاتِ طیبہ کے آخری دور میں جب اموال فئی کی وجہ سے آپ کی تنگدستی دور ہو گئی تھی اس زمانہ میں آپ نے روزوں کی تعداد میں زیادتی فرمادی تھی۔ اور جب آپ سے اس کا سبب پوچھا گیا تو فرمایا کہ "روزہ اس لئے رکھتا ہوں تاکہ غریبوں کو بھول نہ جاؤں۔

(۷) اور ان سب مصالح کے علاوہ سب سے اہم بات جو روزہ سے حاصل ہوتی ہے وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دینا ہے اور یہ تسلیم اور خود سپردگی ہر عبادت کا حاصل اور خلاصہ ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے

سمعنا واطعنا غفرانک ربنا والیک المصیر (البقرۃ)

ہم نے سُنا اور قبول کیا تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب اور تیری طرف لوٹ کر جانا ہے

إن صلاتي ونسكي ومحياي ومماتي لله رب العلمين۔
یقیناً میری نماز اور میری دیگر عبادتیں اور میری حیات اور موت سب اللہ ہی کیلئے ہے

اور یہ تسلیم و رضا روزہ کے ذریعہ یوں حاصل ہوتی ہے کہ روزہ دار کے سامنے اس کی مرغوبات موجود ہیں جن کے استعمال پر وہ قدرت بھی رکھتا ہے اور ان کے استعمال کی اُسے شدید خواہش بھی ہوتی ہے۔ لیکن وہ محض اللہ کی رضا کیلئے انھیں ہاتھ نہیں لگاتا اور ان کے استعمال سے رُکا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کو بطور خاص اپنی جانب منسوب فرمایا ہے۔

كل عمل ابن آدم له إلا الصيام فإنه لي وأنا أجزي به يدع طعامه من أجلي ويدع شرابه من أجلي ويدع لذته من أجلي ويدع زوجته من أجلي۔
(ابن خزیمہ)

انسان کا ہر عمل اس کے لئے ہے البتہ روزہ یہ خاص میرے لئے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا وہ میرے لئے اپنا کھانا چھوڑ دیتا ہے میرے لئے اپنا پینا چھوڑ دیتا ہے میرے لئے اپنی لذت چھوڑ دیتا ہے اور میرے لئے اپنی بیوی کو چھوڑ دیتا ہے۔

روزہ کی مشروعیت سے مقصود انسان کو تنگی اور دشواری میں مبتلا کرنا نہیں ہے جیساکہ خود اللہ تعالیٰ روزہ کی فرضیت کے بعد اس حکمت کو بیان کرتے ہیں۔

يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر۔ (البقرة)
اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا ہے تم پر دشواری۔

بلکہ روزہ سے مقصود روحانیت کو قوی کرنا ارادہ میں استحکام پیدا کرنا اور صبر و رضا کا خوگر بنانا جسم کو امراض سے بچانا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی انسان کے دل میں قدر و منزلت پیدا کرنا ہے۔

روزہ اور ہمارا طرز عمل

رمضان المبارک کا روزہ جن مقاصد حسنہ کی تحصیل کے لئے فرض کیا گیا تھا۔ ہمارے سلف صالحین نے روزہ کے آداب و واجبات کی رعایت کرکے ان مقاصد کو پورے طور پر حاصل کیا۔ وہ حضرات

ن کو روزہ رکھتے تھے اور رات بھر ذکر و فکر اور نماز و تلاوت میں مشغول رہتے تھے
ور رمضان المبارک کے ایک ایک لمحہ کو اللہ کی عبادت میں گذارتے تھے وہ اپنی زبانوں
کو بیہودہ گوئی سے بند رکھتے تھے اور کانوں کو لغو اور فحش باتوں کے سننے سے محفوظ رکھتے
تھے، ان کی آنکھیں حرام چیزوں کی طرف قطعاً نہیں اٹھتی تھیں۔ اس طرح اُن کے تمام
اعضاء روزہ سے رہتے تھے۔ لیکن آج ہمارا یہ حال ہے کہ ہم اس مبارک مہینہ کو بھی دیگر
مہینوں کی طرح ضائع کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے روزہ کو اس لئے فرض کیا تھا کہ اس
کے ذریعہ روح و قلب کو فائدہ پہنچے مگر ہم نے روزہ کو پیٹ اور معدہ کو پُر کرنے
کا مہینہ بنا لیا۔ اللہ نے اُسے حلم و صبر کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا تھا مگر ہم نے اُسے
غیض و غضب اور غم و غصہ کا مہینہ بنا لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے سکینت و وقار کا مہینہ
بنایا تھا۔ مگر ہم نے اُسے گالی گلوج اور لڑائی جھگڑے کا مہینہ بنا لیا اللہ تعالیٰ نے
روزہ کو اس لئے فرض کیا تھا کہ ہماری عادتوں میں تبدیلی آئے مگر ہم نے سوائے
کھانوں کے اوقات میں تبدیلی پیدا کرنے کے کچھ نہیں کیا۔

ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

(بقیہ اداریہ ص۳ کا)

مستقل قیام دارالعلوم میں ہو گیا تھا۔ اکاڈمی کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے ساتھ۔
فارغ التحصیل طلبہ کو حجۃ اللہ البالغہ کا درس بھی دیتے تھے طلبہ کے ساتھ بڑی شفقت
و محبت اور ہمت افزائی کا معاملہ کرتے تھے۔

دارالعلوم میں مرحوم کے قیام سے نہ صرف طلبہ بلکہ اساتذہ اور ارباب انتظام کو
بھی بہت فائدہ تھا۔ اساتذہ کو علمی پیچیدگیوں اور انتظامیہ کی انتظامی گتھیوں کے سلجھانے
میں مرحوم کے علم و تجربہ سے بڑی مدد ملتی تھی۔ افسوس کہ مولانا کی وفات سے دارالعلوم
اپنے ایک قابل قدر فرزند، فعال و متحرک کارکن اور بے لوث و مخلص سرپرست سے
محروم ہو گیا۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت میں اعلیٰ درجات سے ہم کنار فرمائے اور
دارالعلوم اور ملت اسلامیہ کو ان کا نعم البدل نصیب فرمائے۔

مدیر دارالعلوم

جدید طلباء کیلئے قواعد داخلہ

قدیم طلبہ کے ترقی و تنزل اور تکمیلات وغیرہ کے شعبوں میں داخلہ کے ضروری ضابطے

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے طلبۂ عزیز کے ساتھ خیر خواہی کی وصیت فرمائی ہے آپ کا ارشاد ہے۔

ان رجالا یاتونکم من اقطار الارض یتفقھون فی الدین فاذا اتوکم فاستوصوا بھم خیرًا (رواہ الترمذی)

بے شک بہت سے لوگ زمین کے گوشے گوشے سے علم دین میں تفقہ حاصل کرنے کیلئے تمہارے پاس آئیں گے۔ جب وہ آئیں تو تم ان کے بارے میں خیر خواہی کی وصیت قبول کرو۔

اس لئے طلبۂ عزیز کے ساتھ خیر خواہی تمام مدارسِ عربیہ کے ذمہ داروں کا فرض اولین ہے طلبہ کے لئے بہتر تعلیم عمدہ تربیت اچھا انتظام اور حسب استطاعت راحت رسانی خیر خواہی کے ضمن میں آتی ہے۔ اور الحمد للہ مدارس عربیہ کے ذمہ دار بڑی حد تک اس وصیت پر عمل پیرا بھی ہیں۔

ان مدارس عربیہ میں جو طلبہ عزیز کے ساتھ خیر خواہی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں — دارالعلوم دیوبند کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی ترقی علم و فن کی ترقی ہے۔ دین و دیانت کی ترقی ہے اور مسلمانانِ عالم کی ترقی ہے۔

چنانچہ امسال طلبہ عزیز کی خیر خواہی اور معیار تعلیم کی بلندی کیلئے چند ضروری اصول و

ضوابط کا اعلان کیا جا رہا ہے ۔

آپ حضرات سے مخلصانہ درخواست ہے کہ ان چیزوں پر عمل درآمد کے سلسلہ میں ارباب دارالعلوم کا تعاون فرمائیں۔ اور درج ذیل ضروری باتوں پر عمل فرما کر ممنون فرمائیں ۔

۱۔ آپ دارالعلوم دیوبند میں صرف ان صالح اور ذی استعداد طلبہ کو روانہ فرمائیں جو ہر اعتبار سے اس مرکزی درسگاہ کے شایان شان ہوں

۲۔ تعلیمی اور اخلاقی تصدیق نامہ دینے میں دیانت وامانت کی بھرپور رعایت فرمائیں، بعض مدارس کے بارے میں یہ اطلاع ملی ہے کہ اُن کے یہاں اس سلسلہ میں کوئی اہتمام نہیں ہے۔

۳۔ جن افراد کا آپ کے یہاں سے کسی اخلاقی جرم یا جعلسازی وغیرہ میں اخراج ہوا ہے ان کے بارے میں صحیح تفصیلات سے دارالعلوم کے ذمہ داروں کو مطلع فرمائیں۔

۴۔ امتحان داخلہ میں استعداد کی صحیح جانچ کی جارہی ہے اور نظام کار میں سفارش بے جا کے تمام دروازوں کو بند کرنے کی سعی کی گئی ہے ۔ امید ہے کہ آپ اس کو پسند فرمائیں گے اور اس سلسلہ میں تعاون فرمائیں گے ۔

۵۔ سال گذشتہ ناکام طلبہ کو بالکل نہیں لیا گیا تھا، لیکن امسال بشرط گنجائش ان کا موقت داخلہ کیا جا سکے گا

دارالعلوم دیوبند کا مقصد رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی تبلیغ واشاعت عہد رسالت سے لیکر آج تک کے علمی ورثہ کی حفاظت اور تعلیم وتعلّم کے ذریعہ ایسے رجال کار کی تیاری ہے جو ہر میدان میں دین مبین کی بہتر خدمات انجام دے سکیں

چنانچہ ماضی بعید یعنی اپنے قیام کے ابتدائی دور میں اس ادارہ نے اتنی جلیل القدر خدمات انجام دیں اور ایسے ایسے نابغۂ روزگار افراد تیار کئے جن کی نظیر تاریخ اسلام میں شاذ ونادر ہی نظر آتی ہے ۔ افراد سازی کی اس حیرت انگیز مہم میں اساتذہ کرام کا بے پایاں اخلاص ان کا بے مثال علمی رسوخ اور ان کی انتھک جد وجہد بھی کارفرما تھی، اور طلبۂ علم کی پاک

نیتوں اور شمع علم پران کی پروانہ وار جاں نثاری کا بھی بڑا دخل تھا۔

پھر عصر حاضر میں طلبہ اور اساتذہ دونوں ہی کی جد وجہد میں کمی آئی۔ لیکن سب سے زیادہ علمی انحطاط اس بنیاد پر رونما ہوا کہ طلبۂ عزیز کے معاشرہ میں علم دین اور دینی اقدار سے محبت نہ رکھنے والے افراد نے دنیوی مفادات کے لئے شمولیت اختیار کرلی، ابتداء میں یہ تناسب اتنا معمولی رہا کہ اسکے مضر اثرات کا ادراک نہ کیا جاسکا۔ پھر آہستہ آہستہ ایسے افراد کا تناسب اتنا زیادہ ہو گیا کہ محنتی، مخلص اور باذوق طلبہ کیلئے میدان تنگ ہو گیا لیکن خدا کے فضل وکرم پر یقین کے ساتھ اصلاح احوال کی کوشش کی جارہی ہے اور اس کے لئے کچھ قواعد و ضوابط مرتب کئے گئے ہیں۔

عربی درجات میں جدید داخلے کے ضروری قواعد

۱۔ ۱۴۰۵ھ میں دارالعلوم کے تمام تعلیمی شعبوں میں مجموعی طور پر ڈھائی ہزار قدیم وجدید طلبہ کو داخل کیا جائے گا۔ جن میں سے پندرہ سو کو پوری امداد اور بقیہ طلبہ کو حسب گنجائش جزوی امداد دی جاسکے گی۔

۲۔ آنے والے جدید طلبہ دارالعلوم میں حاضر ہونے کے بعد سب سے پہلے "فارم برائے شرکت امتحان داخلہ" پُر کریں گے، یہ فارم انھیں دفتر تعلیمات سے ۱۲ر شوال کی شام تک دیا جائے گا۔

۳۔ سال اوّل، سال دوم، اور سالِ سوم کیلئے امتحان داخلہ تقریری ہوگا۔

۴۔ سال چہارم، سال پنجم، سال ششم، سال ہفتم اور دورۂ حدیث کے امیدواروں کا امتحان داخلہ تحریری ہوگا، تحریری امتحانات بدھ، جمعرات، جمعہ ۱۴ر ۱۵ر ۱۶ر شوال مطابق ۳ر ۴ر ۵ر جولائی میں لئے جائیں گے۔

۵۔ ۲۰ر شوال تک جدید طلبہ کے تمام نتائج کا اعلان کر دیا جائے گا۔

۶۔ جدید طلبہ میں جو کامیابی کے نمبرات حاصل کریں گے ان کو مطلوبہ درجات میں داخل کر لیا جائے گا۔

۷۔ جو طلبہ کامیابی کے نمبرات حاصل نہ کرسکیں گے ان کا بشرطِ گنجائش موقت داخلہ اسطرح

کیاجا سکے گا کہ ۲۶ سے ۲۹ تک اوسط حاصل کرنے والوں کو ممتحنہ درجہ میں، اور ۲۱ سے ۲۵ تک اوسط حاصل کرنے والوں کو درجۂ ممتحنہ سے ایک درجہ نیچے داخلہ دیا جائے گا۔

موقت داخلہ کی تفصیل یہ ہے کہ ان ناکام طلبہ کا دو ماہ کے بعد از سر نو تعلیمی و اخلاقی جائزہ لیا جائے گا، جس میں اسباق کی پابندی، علمی استعداد، وضع قطع اور اخلاق کی درستگی کو ملحوظ رکھا جائے گا، اس جائزہ میں جو طلبہ مکمل طور پر کامیاب رہیں گے اور ان کی جزوی امداد جاری ہوگی ان کی امداد مکمل جاری کردی جائے گی۔

۸۔ سال اوّل کیلئے اردو اور فارسی کی استعداد کی جانچ کی جائے گی۔

سال دوم کیلئے سال اوّل کی تمام کتابوں کا تقریری امتحان ہوگا۔

سال سوم کیلئے سال دوم کی تمام کتابوں کا تقریری امتحان ہوگا۔

سال چہارم کیلئے سال سوم کی کتابوں میں سے قدوری، ترجمۃ القرآن قطبی تصدیقات، اور ابن عقیل یا شرح جامی کا تحریری امتحان ہوگا۔

سال پنجم کیلئے سال چہارم کی کتابوں میں سے کنز الدقائق، اصول الشاشی، مختصر المعانی اور ترجمۃ القرآن کا تحریری امتحان ہوگا۔

سال ششم کیلئے سال پنجم کی کتابوں میں سے ہدایہ اولین، نور الانوار، مقامات حریری کا امتحان ہوگا۔

سال ہفتم کیلئے سال ششم کی کتابوں میں سے جلالین شریف، حسامی اور میبذی کا تحریری امتحان ہوگا۔

دورۂ حدیث کیلئے سال ہفتم کی تمام کتابوں، یعنی ہدایہ اخیرین، مشکوٰۃ شریف، بیضاوی شرح عقائد، شرح نخبۃ الفکر اور سراجی کا تحریری امتحان ہوگا۔

۹۔ سال اوّل و دوم عربی میں نابالغ بیرونی بچوں کا داخلہ نہ ہوگا، نہ ان درجات میں امداد جاری کی جائے گی۔

۱۰۔ جو طالب علم اپنے ساتھ صغیر السن بچوں کو لائے گا اس کا داخلہ ختم کردیا جائے گا۔

۱۱۔ جن امیدواروں کی وضع قطع طالب علمانہ نہ ہوگی مثلاً غیر شرعی بال، ریش تراشیدہ ہونا

یا دارالعلوم کی روایات کے خلاف کوئی بھی وضع، اُن کو شریک امتحان نہیں کیا جائے گا۔ درمیانِ سال میں اگر کسی نے وضع تبدیل کی تو حسب قواعد دارالاقامہ عمل کیا جائے گا۔

۱۲۔ سرحدی صوبوں میں سے آسام اور بنگال کے امیدواروں کو حسب سابق تصدیقنامہ وطنیت پیش کرنا ضروری ہوگا۔

۱۳۔ جدید امیدواروں کیلئے سابقہ مدرسہ کا تعلیمی و اخلاقی تصدیق نامہ اور مارک شیٹ دنمبرات کتب) پیش کرنا ضروری ہوگا۔

۱۴۔ اگر ماضی میں کسی طالب علم کا کسی مدرسے سے اخراج ہوا ہے وہ سابقہ مدرسہ کے ذمہ داروں سے معافی طلب کر کے، تصدیق لے آئے تو اس کے داخلہ پر غور کیا جا سکے گا۔

۱۵۔ بنگلہ دیشی طلبہ حسب ذیل علمائے کرام کی تصدیق لیکر آئیں۔

(۱) مولانا فریدالدین مسعود صاحب ڈھاکہ، (۲) مولانا قاضی معتصم باللہ صاحب لال باغ بازار ڈھاکہ

(۳) مولانا شمس الدین قاسمی، جامعہ حسینیہ ارض اباد میرپور ڈھاکہ

(۴) مولانا حافظ عبدالکریم صاحب، چوکی دیکھی محلہ سلہٹ،

ھدایت:۔ جدید طلبہ کو خاص طور پر یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ امتحان داخلہ کی کاپیاں اور امیدواروں کے نام اور نمبر کے بغیر کوڈ نمبر ڈال کر حضرات ممتحنین کو دی جاتی ہیں تاکہ امیدوار کو صرف استعداد کے مطابق نمبر دیئے جا سکیں۔ اس لئے امیدوار صرف اپنی استعداد پر اعتماد کریں، اور انہی سالوں میں امتحان دیں جن کی تیاری وہ مکمل طور پر کر چکے ہوں۔

قدیم طلبہ کیلئے

۱۔ جو قدیم طلبہ تمام کتابوں میں کامیاب ہوں گے ان کو ترقی دیدی جائے گی۔

۲۔ جو طلبہ بعض کتابوں میں کامیاب، اور بعض میں ناکام ہوں گے، اگر ان کا اوسط ۳۰ ہوگا تو ترقی دیدی جائے گی۔ ۳۰ سے کم ہوگا تو اعادۂ سال کر دیا جائے گا۔ امسال ضمنی امتحان ختم کر دیا گیا ہے۔

۳۔ تکمیلات میں صرف ان فضلاء کا داخلہ ہو سکے گا جن کا دورۂ حدیث کے سالانہ امتحان میں اوسط کامیابی ۴۴ رہا ہو اور وہ کسی کتاب میں ناکام نہ ہوں۔

۴۔ امیدواروں کی تعداد زیادہ ہونے کی صورت میں نمبرات کو وجہ ترجیح بنایا جائے گا۔

۵۔ ایک تکمیل کے بعد دوسری تکمیل میں داخلے کیلئے ضروری ہو گا کہ امیدوار نے سابقہ تکمیل میں کم از کم ۴۴ اوسط حاصل کیا ہو۔ اور وہ کسی کتاب میں ناکام نہ ہو۔

۶۔ ایک تکمیل کی درخواست دینے والے دوسری تکمیل کے امیدوار نہ ہو سکیں گے، اور یہ کہ اُن کے مطلوبہ درجۂ تکمیل میں تعداد پوری ہونے کے سبب ان کا داخلہ نہ ہو سکا ہو۔

۷۔ دارالافتاء کے فضلاء کا کسی شعبہ میں داخلہ نہیں لیا جائے گا۔

۸۔ کسی بھی تکمیل میں داخلہ کی تعداد ۲۰ سے زائد نہ ہو گی۔

دوسرے شعبوں کے بارے میں

دارالعلوم دیوبند کا بنیادی کام اگرچہ عربی دینیات کی تعلیم ہے لیکن حضرات اکابر رحمہم اللہ نے مختلف دینی اور دنیوی فوائد اور مصالح کے پیش نظر مختلف شعبے جاری فرمائے، شعبۂ تجوید اُردو و عربی، شعبۂ خوشنویسی وغیرہ، ان شعبوں میں داخلے کیلئے درج ذیل قواعد پر عمل ہو گا

شعبہ اردو دینیات، شعبہ حفظ، شعبۂ فارسی،

۱۔ شعبۂ اُردو دینیات، شعبہ حفظ، اور درجۂ فارسی میں صرف مقامی بچوں کو داخلہ دیا جائیگا

۲۔ سال اوّل دینیات اُردو، اور شعبۂ حفظ میں داخلہ ہمہ وقت ممکن ہو گا۔

۳۔ بقیہ درجات میں داخلہ کی آخری تاریخ تعطیل ذی الحجہ ہو گی۔

شعبۂ تجوید حفص اُردو عربی

۱۔ حفص اُردو میں وہ طلبہ داخل ہو سکیں گے جو حافظ ہوں اور قرآن کریم ان کو یاد بھی ہو اور وہ اُردو کی اچھی استعداد بھی رکھتے ہوں۔ نیز اُن کی عمر اٹھارہ ۱۸ سال سے کم نہ ہو۔

ان طلبہ میں تین۳ کی امداد بھی جاری ہو سکے گی

۲۔ حفص عربی میں ان طلبہ کا داخلہ ہو سکے گا جو حافظ ہوں اور قرآن کریم یاد بھی ہو اور عربی کی شرح جامی یا سال سوم تک تعلیم حاصل کر چکے ہوں۔ ان طلبہ میں سے دس کی امداد بھی جاری ہو سکے گی۔

۳۔ ان درجات میں داخل طلبہ کیلئے اوقاتِ مدرسہ میں مکمل حاضری ضروری ہوگی۔

قرآت سبعہ و عشرہ

۱۔ ان درجات میں داخلے کیلئے حافظ ہونا ضروری ہے اور یہ کہ وہ عربی کی شرح جامی یا سال سوم تک کی جید استعداد بھی رکھتے ہوں

۲۔ داخل شدہ طلبہ کے لئے اوقاتِ مدرسہ میں مکمل چھ گھنٹے درسگاہ میں حاضر رہنا ضروری ہوگا۔

۳۔ اس درجہ میں داخل دس طلبہ کی امداد جاری کی جا سکے گی۔

شعبۂ خوشنویسی

۱۔ اس شعبہ میں داخلے کے امیدواروں میں فضلائے دارالعلوم کو ترجیح دیجائے گی

۲۔ مستقل داخلے کے امیدوار کو امتحانِ داخلہ دینا ضروری ہوگا۔ اور صرف اس فن کی ضروری صلاحیت رکھنے والوں کو داخل کیا جائے گا۔

۳۔ اس شعبہ میں داخل امدادی طلبہ کی تعداد تیس۳۰ ہوگی اور یہ امداد صرف ایک سال کیلئے دی جائے گی۔

۴۔ قدیم امدادی طلبہ اگر فن کی تکمیل نہیں کر سکے ہیں تو ناظم شعبہ کی سفارش پر ان کا مزید ایک سال کیلئے غیر امدادی داخلہ کیا جا سکے گا۔

۵۔ جو طلبہ مستقل امدادی یا غیر امدادی داخلہ لیں گے ان کو مدرسہ کے تمام اوقات میں کامل چھ گھنٹے درس گاہ میں حاضر رہ کر مشق کرنا ضروری ہوگا۔

۶۔ جو طلبہ عربی تعلیم کے ساتھ کتابت کی بھی مشق کر چکے ہیں۔ پھر ناظم شعبہ ان کی صلاحیت کی صلاحیت کی تصدیق کریں۔ ایسے طلبہ اگر دورۂ حدیث کے بعد مستقل داخلہ کے خواہشمند ہوں گے تو داخلہ اور امداد میں اُن کو ترجیح دی جائے گی
۷۔ اس شعبہ میں داخل تمام طلبہ کے لئے طالبعلمانہ وضع وقطع اختیار کرنا ضروری ہوگا۔
۸۔ پہلی سہ ماہی میں مقرر کردہ تمرینات کی تکمیل نہ کی گئی تو داخلہ ختم کر دیا جائے گا۔

دارالصّنائع

۱۔ طالب علمانہ وضع قطع کے بغیر داخلہ نہیں لیا جائے گا۔
۲۔ معلّم دارالصنائع جن کی صلاحیت کی تصدیق کریں ان کو داخل کیا جائے گا۔
۳۔ پہلی سہ ماہی کے مقرر کردہ کام کی تکمیل نہ کی گئی تو داخلہ ختم کر دیا جائے گا۔
۴۔ دارالصنائع میں داخلہ دس طلبہ سے زائد کا نہیں ہوگا۔
۵۔ اوقاتِ مدرسہ میں پورے وقت حاضر رہ کر کام کرنا ضروری ہوگا۔

جامعہ طبیہ

نوٹ:۔ چونکہ ڈپلوما کی مدت ختم ہو چکی ہے اور ڈگری کورس ابھی منظوری کے مرحلہ میں ہے اسلئے داخلہ کے ہر امیدوار سے یہ تحریر لی جاتی ہے کہ آپ منظوری کی امید پر داخلہ لے سکتے ہیں۔ (ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا)
۱۔ جامعہ طبیہ میں پری طب بی، یو، ایم، ایس کے داخلے کیلئے ۲۰ شوال تک درخواستیں لی جائیں گی۔
۲۔ داخلے کے مجاز وہی طلبہ ہوں گے جنھوں نے دارالعلوم سے فاضل کی سند یا کسی ایسے مستند دینی درسگاہ سے فراغت حاصل کی ہو۔ جس کی سند بارہویں کلاس کے برابر سمجھی جاتی ہو
۳۔ درخواست کے ساتھ مندرجہ ذیل کاغذات کا داخل کرنا ضروری ہوگا۔
(الف) تعلیمی اسناد کی مصدقہ نقول۔
(ب) تاریخ پیدائش کا مصدقہ سارٹیفکٹ۔
(ج) کردار کا سارٹیفکٹ جو چھوڑے ہوئے آخری ادارہ کے سربراہ سے حاصل کیا ہو۔

(۵) سرحدی اضلاع کے طلبہ کیلئے تصدیقنامہ شہریت
(۶) سرپرست کا ضمانت نامہ جس میں صراحت کی گئی ہو کہ وہ جامعہ طبیہ کے قوانین کا پابند ہوگا۔
(۷) جامعہ طبیہ میں داخلہ کیلئے بالکل شرعی وضع قطع ضروری ہے۔

دارالافتاء

۱۔ دارالافتاء میں داخلہ کے امیدوار طلبہ کیلئے وضع قطع کی درستگی کی اہمیت سب سے زیادہ ہوگی
۲۔ دورۂ حدیث سے دارالافتاء کیلئے صرف ۵۵ طلبہ امیدوار ہوں گے جن کا اوسط کامیابی ۲/۴ ہو
۳۔ کسی بھی تکمیل سے دارالافتاء میں داخلہ کے امیدوار کے لئے سابقہ تکمیل میں ۴۵ اوسط حاصل کرنا ضروری ہوگا۔
۴۔ ان تمام امیدواروں کا الگ سے امتحان لیا جائے گا۔
۵۔ دارالافتاء میں داخلہ کی تعداد ۲۰ سے زائد نہ ہوگی، اور کوشش کی جائے گی کہ معیار مذکور کو پورا کرنے والے ہر صوبے کے طلبہ کو داخلہ دیا جائے گا۔ لیکن اگر کسی صوبہ سے کوئی امیدوار مندرجہ بالا شرائط کا حامل نہ پایا گیا تو دوسرے صوبوں سے یہ تعداد پوری کرلی جائے گی۔
۶۔ ان بنیل طلبہ کی امداد ہو سکے گی۔

نوٹ:۔ جن درجات میں داخلہ کیلئے کسی طرح کا اوسط نمبر شرط نہیں جیسے شعبۂ خوشنویسی، دارالصنائع اور جامعہ طبیہ، ان میں داخلہ کیلئے اس سال دارالاقامہ اور دفتر تعلیمات سے حاصل کردہ تصدیقنامۂ اخلاق داخل کرنا ضروری ہوگا۔

جاری کردہ:۔ دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند،

باب استفتاء

سوال: ۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور ایک دینی اور مذہبی مدرسہ ہے جو سو سال سے زائد عرصہ سے قائم ہے ۔دین اور علم دین کی خدمات بجا لا رہا ہے ۔حالات کے بگاڑ اور ماحول کے رُخ اختیار کرنے کے خطرات کے پیش نظر اس ادارے کی مجلس شوریٰ نے جو نیک اور صالح علماء اور دین دار لوگوں پر مشتمل ہے ۔اور جو عوام و خواص میں معتمد ہے اور جو کہ ہمیشہ سے ہی اس ادارے کو چلاتی چلی آرہی ہے ۔اس ادارے نے اپنی قرارداد میں متفقہ طور پر یہ طے کیا ہے کہ اس کے دستور کو مجلس شوریٰ کو سوسائٹی ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ کرالیں ۔تاکہ ہر ممکنہ خطرے سے حفاظت رہے اور اس کی دینی خدمات میں کوئی خلل نہ ڈال سکے ۔

یو۔پی میں حکومت کی جانب سے ایک وقف بورڈ موجود ہے ۔اس میں بھی اس کا اندراج نہیں ہے جبکہ اس ادارے کی موقوفہ جائیدادیں وقف بورڈ میں درج ہیں ۔

یہ ادارہ ابھی تک وقف بورڈ میں درج نہیں ہے اور نہ ہی اس کے دستور کی کوئی قانونی حیثیت ہے ۔(۲) یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اس رجسٹریشن سے ادارے کی نہ دینی حیثیت مجروح ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے اوقاف پر کوئی زد پڑتی ہے وقف ہر صورت میں وقف رہتا ہے ۔کسی بھی ادارے کے رجسٹرڈ کرانے کا مطلب صرف یہ ہے کہ مجوزہ دستور کے مطابق متعینہ کمیٹی اس ادارے کو چلائے گی ۔دوسرے کسی فرد کو قانوناً اس میں مداخلت کی اجازت نہ ہوگی حالات اور مصالح کے پیش نظر ہندوستان کے سیکڑوں مدارس دینیہ رجسٹریشن ایکٹ کے تحت اپنا ادارہ ۔اپنا دستور ۔اور اپنی مجلس شوریٰ رجسٹرڈ کرا چکے ہیں ۔چنانچہ دارالعلوم دیوبند ندوۃ العلماء لکھنؤ ۔مدرسہ شاہی مراد آباد ۔بھی اسی طرح رجسٹرڈ ہیں ۔نیز حیدرآباد ۔گجرات ۔کانپور جونپور ۔بھوپال وغیرہ کے بہت سے مدارس دینیہ بھی رجسٹرڈ ہیں ۔

خود شہر سہارنپور کے قرب و جوار کے بعض مدارس جیسے مدرسہ اشرف العلوم وغیرہ رجسٹرڈ ہیں ـــــ اب سوال طلب امر یہ ہے کہ ان موجودہ حالات میں مدرسہ کی حفاظت اور اس کی بقاء کیلئے کیا اس طرح کا رجسٹریشن کرالینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر ناجائز ہے تو ان سیکڑوں مدارس کے بارے میں شرعی فیصلہ کیا ہوگا۔ جو سوسائٹی ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ہیں اور ان مدارس کی مجالس شوریٰ میں نامور علماء، فقہاء، اور مشائخ کرام شامل ہیں۔

(حافظ) محمد ارشاد سہارنپور۔

الجواب:۔ ہو الموفق والمعین۔ کسی دینی وملّی ادارے کی حفاظت وبقا اور فتنہ وفساد سے بچاؤ کی خاطر جس ادارے کے دستور اساسی اور اس کی مجلسِ شوریٰ کو جو مختلف خاندانوں اور مختلف شہروں کے دیندار، متقی اور ایسے صاحب فضل وکمال علماء اور افراد پر مشتمل ہو، جو معاملہ فہم وبا اثر ہوں، رجسٹریشن کرانے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ بلکہ موجودہ دور وحالات میں رجسٹریشن کرالینا ہی مناسب وبہتر ہے۔ اس وقت اور بھی جبکہ مستفتی کے بقول "اس رجسٹریشن سے ادارے کی نہ دینی حیثیت مجروح ہوتی ہے، اور نہ اس کے اوقاف پر کوئی زد پڑتی ہے، بلکہ وقف ہر صورت میں وقف رہتا ہے"۔

آجکل مسلمانوں میں گروپ بندی اور پارٹی بازی کی صورت میں جو فتنہ عام ہوتا جارہا ہے۔ اور مسلم حکومت وریاست ختم ہونے کے بعد مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ مدارسِ دینیہ ومساجد کی صورت میں رہ گیا ہے، ان کو بنیاد بنا کر لڑتے ہیں اور جس سے مسلمانوں کی رہی سہی ساکھ گرتی جارہی ہے۔ ان حالات کے پیش نظر اکابر دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دیگر مدارس کے ارباب بست وکشاد علماء نے اپنے دستور اساسی اور مجلسِ شوریٰ کو رجسٹریشن کراکے نزاع باہمی کو ختم کیا ہے۔ یہ ان کا مستحسن اقدام ہے

البتہ صرف ایک خاندان کے متعدد افراد کے نام دینی ادارے کے دستور اساسی کو نظر انداز کرکے جس میں اس ادارے کے دستور ہوتے ہیں۔ رجسٹریشن کرانا درست نہ ہوگا۔ مختصر یہ کہ سوال میں جو تفصیل درج ہے اور ان اصول وقواعد کے ساتھ جو کسی دینی ادارے کیلئے دستور اساسی ہوتے ہیں، رجسٹریشن کرانا جائز ہے۔ شرعاً کوئی قباحت نہیں

واللہ اعلم۔ محمد ظفیر الدین عفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند — الجواب صحیح والمجیب نجیح۔ العبد نظام الدین — الجواب صحیح، حبیب الرحمٰن خیرآبادی — کفیل الرحمٰن، نائب مفتی دارالعلوم

حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کے آخری ایام سے متعلق اُن کے داماد پروفیسر محمد اسلم صاحب کا

ایک اہم مکتوب

قبلۂ محترم زید مجدکم!

سلام مسنون کے بعد معروض ہوں کہ علم و حکمت کا وہ آفتاب جو گذشتہ نصف صدی سے برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کو منور کر رہا تھا۔ بالآخر ۳ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ مطابق ۲۴ مئی ۱۹۸۵ء بروز جمعہ افطاری سے چند منٹ پہلے کراچی میں غروب ہو گیا یعنی حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

حضرت مرحوم کو جنوری کے وسط میں بغرض علاج علی گڈھ سے کراچی لایا گیا تھا ان کی بیماری کا سلسلہ طویل ہے۔ گذشتہ سال ماہ اگست میں انھیں کتے نے کاٹ لیا تھا حفظ ماتقدم کے طور پر ان کے شکم میں انجکشن لگائے گئے۔ چند روز بعد انجکشن والی جگہ پر ورم آگیا۔ اور انھیں بخار آنے لگا۔ اطباء نے ملیریا بخار کی تشخیص کی اور انھیں مقررہ مقدار سے زیادہ کونین کھلادی، کونین کی کثرت سے ان کے جگر پر اثر ہوا اور جگر کا فعل ماؤف ہونے سے یرقان لاحق ہو گیا۔ حکیم افہام اللہ خاں صاحب اور حکیم عبد الحمید صاحب کا علاج ہوتا رہا۔ اور چند روز علی گڈھ یونیورسٹی کے ہسپتال میں بھی رہے۔ ان کی بیماری کی تشویشناک خبریں ہمیں مل رہی تھیں۔ چنانچہ حضرت مولانا کی بڑی صاحبزادی کراچی سے علی گڈھ پہنچیں اور چند روز میں تمام انتظامات طے کر کے انھیں اپنے ساتھ کراچی لے گئیں وہاں اطباء کے ایک بورڈ نے ان کا معاینہ کیا اور مثانے پر سرطان کا اثر بتایا۔ جسمانی کمزوری کی بنا پر آپریشن کے مرحوم متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے مختلف اوقات میں مختلف اطباء کا علاج ہوتا رہا۔

میں گذشتہ ماہ وسط اپریل میں ان کی عیادت کے لئے لاہور سے کراچی گیا تھا پچھ روز ان کے ساتھ رہا۔ واپسی پر بار بار دل میں یہی خیال آتا تھا کہ کہیں یہ اُن کے ساتھ الوداعی ملاقات نہ ہو۔ انھوں نے بھی مجھے چلتے وقت گلے لگایا اور رخصت کیا۔

۲۴ مئی مطابق ۳ رمضان کو میں نماز عشاء اور تراویح پر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ کراچی سے برابر کے مکان میں فون آیا۔ میری اہلیہ گھبرا کر فون سننے گئیں، ان کے پیچھے پیچھے میں بھی گھر سے نکلا۔ معلوم ہوا کہ افطاری سے ذرا پہلے مولانا کا انتقال ہو گیا موصوف کی صحت معمول کے مطابق تھی۔ اس دن کوئی خاص تکلیف نہ تھی۔ مرحوم نماز مغرب کے لئے وضو کرنے تشریف لے گئے، وضو کر کے جب اپنے کمرے کی طرف لوٹ رہے تھے تو راستے ہی میں اچانک ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

میری اہلیہ راتوں رات کراچی پہنچ گئیں۔ میں خود نہ جا سکتا تھا۔ اس روز میری ہمشیرہ کو تیز بخار تھا۔ اور ٹمپریچر ۱۰۶ درجے سے بھی بڑھ گیا تھا۔ میرا بیٹا زفر بھی بخار میں مبتلا تھا۔ اس لئے میں نہ جا سکا۔ اس کا مجھے عمر بھر افسوس رہے گا۔

حضرت مولانا کو دارالعلوم کورنگی کراچی میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قبلہ کے ذاتی قبرستان میں اُن کے قریب ہی علماء وصلحاء کے جلو میں دفن کیا گیا ہے۔ یہ قبرستان بڑا بابرکت قبرستان ہے اور اس میں گنتی کی چند قبریں ہیں۔ اور وہ سب کی سب علما و صلحاء کی ہیں

مولانا کی وفات سے جہاں دارالعلوم دیوبند اپنے ایک عظیم فرزند سے محروم ہو گیا۔ وہاں ندوۃ المصنفین اور برہان کا بھی بے اندازہ نقصان ہوا ہے۔ شیخ الہندؒ اکاڈمی بھی ڈائرکٹر سے محروم ہو گئی اور دیوبند کی مجلس شوریٰ اپنے ایک رکن رکین..........
.... سے محروم ہو گئی۔ ہمارا ذاتی نقصان بھی ناقابل تلافی ہے۔

اگر یہی چند سطور ماہنامہ دارالعلوم میں چھپ جائیں تو اُن کے احباب کو پوری اطلاع مل جائے گی۔

والسلام

غمزدہ محمد اسلم

ادبیات

غزل

فخرِ مشرق شفیق جونپوری

تمہارا جی اسی کی شرکتِ محفل سے بدظن ہے
کہ جس کے دل کے داغوں سے تمہاری بزم روشن ہے

کلی کھلتی تھی دل کی جن گلوں کی مسکراہٹ سے!
چمن میں آج اُن کا ہر تبسم برقِ خرمن ہے

بہار آئی مگر گلشن کی صورت مسخ کر ڈالی!!
جہاں شاخِ نشیمن تھی وہاں خاکِ نشیمن ہے

بقدرِ تشنگی تقسیم ہو مینا و ساغر کی!
نہیں تو پھر ہمارا ہاتھ ہے ساقی کا دامن ہے

پکارا جب کبھی میں نے خوشی منھ پھیر کر بولی
کہ تیرے شہر میں انسان کا انسان دشمن ہے

نہیں معلوم تم کیسا اجالا لے کے آئے ہو!!
کہ دنیا اور بھی تاریک ہے جتنی ہی روشن ہے

تمہیں کالی گھٹا کا بھی نہیں پہچاننا آتا!!
نشیمن سے دھواں اٹھتا ہے تم کہتے ہو ساون ہے

تمہیں اب تو پسند آنے لگیں باتیں خوشامد کی
کوئی منہ پر ذرا انصاف کی کہہ دے تو دشمن ہے

دار العلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دار العلوم

جلد نمبر ۶۸ | جولائی سنہ ۱۹۸۵ء مطابق شوال المکرم ۱۴۰۵ھ | شمارہ نمبر ۴

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند

مدیر مسئول

مولانا ریاست علی صاحب بجنوری

مدیر تحریر

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی

قیمت فی پرچہ ۲/۵۰ سالانہ ۳۵/۰۰

سالانہ بدل اشتراک بیرون ممالک سے | سعودی عرب، کویت، ابوظہبی، ایرمیل ۱۱۵/۰۰ - جنوبی و مشرقی افریقہ و برطانیہ ۱۲۵/ امریکہ، کناڈا وغیرہ بذریعہ ایرمیل ۱۲۵/۰۰ - پاکستان بذریعہ ایرمیل ۵۰ بنگلہ دیش ۴۵

محبوب پریس دیوبند | سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زر تعاون ختم ہو چکا ہے

فہرست مضامین

ہندوستانی اور پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

(۱) ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اوّل فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ فرمائیں

(۲) پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ -/۵۰ روپے مولانا عبدالستار صاحب مقام کرم علی والہ تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان (پاکستان) کو بھیج دیں اور انھیں لکھیں کہ اس چندہ کو رسالہ دارالعلوم کے حساب میں جمع کرلیں۔

(۳) خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمائیں۔ خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

مُدیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف آغاز

حبیب الرحمٰن القاسمی

ہمارا ملک ہندوستان! اپنے دستور کے اعتبار سے ایک سیکولر ملک ہے، آئین کی روسے یہاں ہر مذہب کو پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ یہاں کے بسنے والے اپنے مذہبی معاملات میں بالکل آزاد ہیں اس لئے کسی کے مذہبی رسوم اور طور طریقے پر کوئی قدغن نہیں لگائی جاسکتی۔

دستور ہند کی اس غیر مبہم اور مضبوط ضمانت کے باوجود داڑھی رکھنے کے خلاف کیرلا ہائی کورٹ کا حالیہ فیصلہ مسلمانوں کے لئے نہ صرف باعثِ حیرت ہے بلکہ باعثِ تشویش بھی ہے۔ اور مسلمان یہ سوچنے پر حق بجانب ہیں کہ اب ملک کی عدلیہ بھی ان فرقہ پرست عناصر کی ہاں میں ہاں ملانے لگی ہے۔ جن کی نگاہوں میں یہاں کا مسلمان اور ان کا مذہب کانٹے کی طرح چبھ رہا ہے اور وہ اس کانٹے کو بہر صورت نکال پھینکنے کے درپے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کیرلا کے "ٹی، اے، محمد" نامی ایک ہیڈ کانسٹبل کو اُن کے افسر اعلیٰ نے داڑھی رکھنے سے روک دیا تھا۔ اس غیر آئینی آڈر کے خلاف انھوں نے مسٹر پی، سی، بال کرشنا مین جسٹس کیرلا ہائی کورٹ کی عدالت میں درخواست گذاری کہ مذہب اسلام میں داڑھی رکھنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ لہٰذا اُن سے یہ پابندی ختم کی جائے۔ مسٹر پی سی نے درخواست نامنظور کردی اور صحیح بخاری کی ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے فیصلہ میں کہا ہے کہ "داڑھی رکھنا... مسلمان کیلئے ایک اختیاری عمل ہے کوئی ضروری حکم نہیں ہے" جج نے اپنے فیصلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ "پولیس مینول (دستور العمل) یا وزارت داخلہ کے مینول، "دستور العمل" میں داڑھی کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ پولیس کے لئے داڑھی نہ رکھنا ضروری ہے۔ اس لئے پولیس حکام کا یہ آرڈر کہ "پولیس کے لئے کلین شو ہونا ضروری ہے"، بالکل حق بجانب ہے اس آرڈر سے

دستور کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔

فاضل جج نے اپنے اس فیصلے میں دو دعوے کئے ہیں (۱) داڑھی رکھنا ایک مسلمان کیلئے محض اباحت کا درجہ رکھتا ہے یعنی یہ ایک اختیاری عمل ہے جس کا جی چاہے اُسے انجام دے جس کا جی چاہے ترک کردے۔ (۲) چونکہ پولیس کے مینول (دستور العمل) میں اس کا ذکر نہیں ہے بلکہ ایک پولیس کے لئے داڑھی نہ رکھنا ضروری ہے اس لئے پولیس حکام کا یہ آرڈر کہ "پولیس کے لئے داڑھی کا صاف کرنا ضروری ہے" بالکل درست ہے اس سے دستور کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔

موصوف نے اس فیصلہ میں مذہب اسلام کے حوالہ سے داڑھی کی جو حیثیت بیان کی ہے اگر اُن کی یہ تحقیق انیق صحیح اور اسلام کے نقطۂ نظر کے مطابق ہے تو بلاشبہ ان کا یہ فیصلہ درست ہے کہ پولیس حکام نے داڑھی نہ رکھنے کا حکم دیکر دستور ہند کی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔ لیکن اگر انھوں نے داڑھی کا شرعی درجہ متعین کرنے میں دانستہ یا نادانستہ غلطی کی ہے تو یقیناً ان کا یہ فیصلہ بھی عدل وانصاف سے ہٹا ہوگا۔ اور بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ پولیس حکام نے یہ آرڈر دیکر اور فاضل جج نے اس کی حمایت و موافقت کرکے نہ صرف دستور ہند کی خلاف ورزی کی ہے بلکہ اسلام کے چہرے کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔

آیئے اب اسلامی اصول وقوانین کی روشنی میں دیکھیں کہ مذہب اسلام میں داڑھی کی کیا حیثیت ہے۔ بلاشبہ اسلام میں داڑھی کا ثبوت سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے۔ لیکن کیا یہ بات بھی صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت سے جو عمل ثابت ہو وہ اباحت اور جواز کا درجہ رکھتا ہے؟ یہ دعویٰ وہی شخص کرسکتا ہے جسے اسلامی اصول واحکام سے ادنیٰ واقفیت بھی نہ ہو۔ قرآن حکیم جو اسلام کا اصل ماٰخذ ہے اس کی ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں آیتوں میں اس بات کی وضاحت موجود ہے کہ ایک بندۂ مومن پر جسطرح اللہ تعالیٰ کے فرمان کی پابندی ضروری ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان کیلئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام وہدایات پر بھی عمل کرنا لازم ہے ان سے اعراض وانحراف قطعاً جائز نہیں۔ مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ ہوں۔

(۱) وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ○

اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جبکہ کھل چکی اس پر سیدھی راہ اور چلے مسلمانوں کے راستہ کے خلاف تو ہم حوالہ کردیں گے اس کو اسی طرف جو اس نے اختیار کی اور ڈالیں گے ہم اسکو دوزخ میں اور وہ بہت بری جگہ پہنچا

(۲) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ٥

تیرے رب کی قسم وہ مومن نہ ہوں گے یہانتک کہ تجھ کو ہی منصف جانیں اس جھگڑے میں جوان میں اٹھے پھر نہ پائیں اپنے دل میں تنگی تیرے فیصلے سے اور قبول کریں خوشی سے ۔

(۳) وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا ۔

اور رسول جس کا حکم دیں اس پر عمل کرو اور جس سے روک دیں اُس سے رُک جاؤ ۔

ان مذکورہ آیتوں سے یہ بات اظہر من الشمس ہوگئی کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی پابندی لازم ہے اور آپ کے حکم سے روگردانی کرنے میں ہمیشہ کی ہلاکت ہے

ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات و فرمودات کے علاوہ آپ کے اعمال وافعال میں علمائے اصول اور اسلامی قانون کے ماہرین نے یہ تقسیم ضرور کی ہے کہ آپ کے افعال کی ایک قسم وہ ہے جن کا تعلق عادت وجبلت سے ہے جیسے کھانا، پینا، بیٹھنا، اٹھنا وغیرہ اس قسم کے افعال سے اباحت کا ثبوت ہوتا ہے۔ اور دوسری قسم ان افعال کی ہے جن کا تعلق عادت سے نہیں بلکہ عبادت سے ہے اس قسم کے افعال میں دیکھا جائیگا کہ اگر وہ افعال قرآن حکیم یا احادیث پاک میں مذکور کسی احکام کی تشریح وتوضیح کر رہے ہیں تو ان احکام کا جو حکم ہوگا وہی حکم نبی کریم کے اس عمل کا ہوگا جن سے ان احکامات کی وضاحت ہو رہی ہے ۔ اگر قرآن یا حدیث کا وہ حکم واجب ہوگا تو آپ کے عمل سے بھی واجب ہی کا ثبوت ہوگا اور اگر وہ حکم مستحب یا مباح ہوگا تو آپ کے عمل سے بھی استحباب اور اباحت ہی کا ثبوت ہوگا

اس متفقہ اصول کے مطابق آپ کے عمل سے بھی داڑھی کا سنت مؤکدہ اور شعار اسلام ہونا ہی ثابت ہوتا ہے کیونکہ یہ بات ہر شبہ سے بالاتر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حکم "اعفوا اللحی" داڑھی کو خوب بڑھاؤ۔ کی وضاحت اور تشریح اپنے عمل سے فرمائی ہے تمام علمائے حق اور ماہرین کتاب و سنت اس بات پر متفق ہیں کہ داڑھی بڑھانا سنت مؤکدہ اور شعار اسلام میں داخل ہے ۔

ان تفصیلات سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ داڑھی کا معاملہ محض رواج اور عادت سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ اسلامی معاشرہ کا ایک شعار اور اسلامی تہذیب کا ایک نشان ہے اسلئے فاضل جج کا یہ کہنا کہ "داڑھی رکھنا ایک مسلمان کیلئے اباحت کا درجہ رکھتا ہے۔ قطعاً غلط اور اسلام میں کھلی مداخلت ہے ۔ جو دستور ہند کے سراسر خلاف ہے ۔ مسلمان اس فیصلے کو کسی قیمت پر بھی تسلیم نہیں کر سکتے ۔

قسط نمبر ۲

مولانا کفیل احمد علوی کیرانوی استاذ
دارالعلوم دیوبند

تعلیماتِ نبویؐ
اور جمہوری نظام کی فاصل حدیں

جب تک مسلمان تعلیماتِ نبوی کو اپناتے رہے ہر ہر قدم پر اس سے روشنی حاصل کرتے رہے۔ اس وقت تک وہ کامیابی سے ہمکنار رہے۔ دنیا کی کوئی طاقت انھیں زیر نہ کرسکی۔ زیر تو کیا کرتی ان جسور وغیور انسانوں سے آنکھ ملانے کی جرأت بھی نہیں کرسکی لیکن جیسے جیسے مسلمان اپنی تعلیمات سے دور ہوتے گئے اور اُن میں تن آسانی، سہولت پسندی اور عیش وعشرت میں مبتلار ہنے کی بری عادتیں پیدا ہوتی گئیں۔ اور جب ان کی مجالس میں قال اللہ وقال رسول کی صداؤں کے بجائے رقص ونشاط کے مدہوش کن ہنگامے رہنے لگے تو قدرت نے بھی مدد کا ہاتھ کھینچ لیا ــــــ صدیوں قبل سے تمام دنیا میں مختلف قسم کی جو پریشانیاں پھیلی ہوئی ہیں، وہ سب کے سامنے ہیں۔ خود غرض اور فریب کار عناصر من مانی کرتے میں ہر جگہ آزاد ہیں شریف اور ایماندار لوگوں کے لئے زندگی گذارنا مشکل ہوگیا ہے۔ ان حالات میں کتاب وسنت پر یقین رکھنے والوں کی جن میں علماء وحکمراں دونوں شامل ہیں، اہم ذمہ داری تھی کہ وہ آگے آتے اور اپنے وسائل کی حد تک تعلیمات نبوی کی روشنی میں ضروری مسائل کا حل پیش کرتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو یقیناً کامیابی حاصل ہوتی اور اللہ کے کروڑوں بندوں کو امن وسکون کی زندگی نصیب ہوجاتی۔ مگر ہمارا حال یہ ہے کہ ہم آج تک بھی خوابِ غفلت سے بیدار نہیں ہوئے۔ دوسرے لوگوں نے وقت کے تقاضوں کو سمجھا اور انسانوں کی فلاح وبہبود کیلئے نصب العین بنائے جن میں کمیونزم اور موجودہ جمہوری نظام حکومت دونوں شامل ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کمیونزم حالات کے نتیجہ میں سامنے آیا اور انسانی مساوات کے

نعروں کے ساتھ ایک تحریک بن گیا۔ سامراجیوں کے ستائے ہوئے لوگوں نے اس کا استقبال کیا۔اس سے فائدہ بھی پہنچا۔ بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ سامراجی طاقتیں پہلے کی طرح اب شتر بے مہار دکھائی نہیں دیتیں۔ اگرچہ ان کی خوئے بد تو نہیں بدلی اور نہ بدلے گی۔ تاہم ان کے حوصلوں میں پہلی سی توانائی نہیں رہی —— لیکن کمیونزم سے لوگوں کی وہ تمام توقعات پوری نہیں ہوسکیں۔ جو اس سے وابستہ کرلی گئی تھیں۔ کیمونسٹ ممالک میں آج بھی لوگ انصاف کو ترستے ہیں۔ نیکی وشرافت کے متلاشی ہیں، غربت وافلاس سے تنگ ہیں۔ پھر اس سے زبردست نقصان یہ پہنچا کہ اس نے زندگی کے تمام دائروں سے مذہب کو صاف کردیا۔ اور کاروانِ حیات کی پوری رہنمائی اپنی عقل وفہم کے ہاتھ میں دیدی۔ جس کے بعد لوگوں کے لئے تقاضۂ عبدیت کو پورا کرنے کا کوئی طریقہ ہی نہیں رہا۔ روحانی ارتقاء اور اس سے پیدا ہونے والے محاسن اور بعد الموت سب سے بڑی طاقت کے آگے اپنے اعمال کی جواب دہی کا تو سوال ہی کیا۔ اور اصل میں یہی وہ حقیقتیں ہیں جو انسان کو اس کا صحیح مقام دیتی ہیں۔ انہی کا ان کے یہاں فقدان ہے۔ اسی لئے جو لوگ برسرِ اقتدار ہیں اور جو قانون کے نگراں نہیں خود قانون ساز ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم دوسروں کے مقابلہ میں اپنی خواہشات کی تکمیل میں آزاد ہیں بضرورت پڑنے پر ہم قانون میں ترمیم وتنسیخ کا پورا حق رکھتے ہیں —— اس صورت میں وہ ہزار انسانیت دوستی کے بلند بانگ دعووں کے باوجود انسانیت کے حقیقی تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتے۔

بلاشبہ دنیا میں رائج جمہوری نظامِ حکومت بھی وقت کے شدید تقاضوں کے احساس سے پیدا ہوا ہے اور اس لحاظ سے نسبتاً بہتر ہے کہ اس میں عام طور سے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں ہوتی۔ مختلف مذاہب کے ماننے والے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو اپنے مذہب پر رہتے ہوئے اور اپنی امتیازی حیثیت کو باقی رکھتے ہوئے اس نظام میں زندہ رہنے اور اقتصادی ومعاشی اور تعلیمی اعتبار سے ترقی کرنے کے یکساں مواقع ملتے ہیں۔ یہاں ذات پات کی جڑیں بھی کمزور رہتی ہیں۔ ایک بڑی بات یہ ہے کہ جمہوری حکومت عوام کے ووٹوں کے ذریعہ عمل میں آتی ہے۔ اگر حکومت کا رویہ عوام کے ساتھ منصفانہ اور ہمدردانہ نہیں ہوتا۔

توعوام کو پورا حق حاصل رہتا ہے کہ وہ آئندہ الیکشن میں بشرطیکہ وہ ایماندارانہ ہو ووٹ نہ دیکر اقتدار سے ہٹا دیں اور ان کی جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئیں۔ اس طرح حکومت پر عوام کا دباؤ رہتا ہے۔ زبان وقلم کی آزادی بھی صاحب اقتدار لوگوں کو برابر جھنجھوڑتی رہتی ہے۔ عام حالات میں اس کا اچھا اثر پڑتا ہے ــــــ اس کے برخلاف شخصی حکومت میں عوام کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی کسی بھی شخص کو شہنشاہ کے خلاف آواز اٹھانے یا اس کے طریقۂ کار پر تنقید کا حق نہیں دیا جاتا اس کو بغاوت کہا جاتا ہے۔ شاہی حکومت کا مزاج دراصل یہ ہوتا ہے کہ بادشاہ اور اس کے گرد وپیش کے افراد ہی مقتدر شخصیتیں ہیں باقی تمام ان کی رعایا اور خدمت گذار، جمہوری نظام میں حکومت عوام کی خادم ہوتی ہے۔ عوام کی ضرورتوں کو پورا کرنا ان کے لئے راحت رسانی کے ذرائع مہیا کرنا، اس کے اہم اور بنیادی فرائض سمجھے جاتے ہیں۔

لیکن یہ سب اس صورت میں ہے جب کہ جمہوری نظام حکومت صحیح معنی میں نافذ ہو، اور اس کے چلانے والے جمہوری مزاج رکھتے ہوں، اپنے فکر وعمل میں مخلص ہوں، ملک اور عوام سے انھیں سچی محبت ہو، گہرا تعلق ہو، اور وہ اپنے ذاتی مفادات پر ملکی وعوامی مفادات کو ترجیح دینے کا زبردست جذبہ رکھتے ہوں۔ اور اگر ـــــ ایسا نہیں ہے۔ یہاں بھی صرف اقتدار ہی اقتدار ہے اور اس سے حاصل ہونے والے مفادات۔ تو پھر، ـــــ شہنشاہیت اور جمہوریت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ بلکہ یہ اس سے بھی زیادہ بدتر حکومت بن جاتی ہے۔

جمہوری نظام حکومت میں اگرچہ برسر اقتدار جماعت پر عوام کا دباؤ تو رہتا ہے لیکن نفسانی خواہشات کے پورا کرنے کی راہیں بھی کھلی رہتی ہیں۔ ان پڑھ اور سادہ لوح عوام کو دھوکہ دیکر بہت سے خودغرض اور نااہل لوگ اقتدار کی کرسیوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ جن سے بھلائی کی توقع نہیں کی جاسکتی ـــــ پھر یہاں بھی قانون سازی چند لوگوں کے ہاتھوں عمل میں آتی ہے۔ اور یہ قانون ساز اپنی ہزار لیاقتوں کے باوجود اللہ کے بندوں کی ضروریات کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے اور نہ انھیں صالح نظام دے سکتے ہیں۔ جہاں جہاں بھی جمہوری نظام رائج ہے، وہاں اس کا مشاہدہ اور تجربہ کیا جاسکتا ہے علاوہ

دباؤ سے زیادہ سخت اور اصل دباؤ جو آدمی کو آدمیت کی راہ چلنے پر مجبور کرتا ہے ۔ وہ دراصل مالکِ حقیقی کے آگے اپنے اعمال کی جواب دہی کا دباؤ ہوتا ہے۔ جو یہاں نہیں ملتا۔ یہیں سے اسلام اور جمہوری نظام حکومت کے درمیان فاصل حدیں قائم ہوجاتی ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ اسلام اور موجودہ جمہوری حکومت کے راستے الگ الگ ہوجاتے ہیں۔ اسلام کسی آدمی کو یا کسی جماعت کو خواہ وہ اپنے علم و فضل اور اعلیٰ صلاحیتوں کے اعتبار سے کتنی بھی جامع اور عظیم کیوں نہ ہو، اللہ کے بندوں کیلئے قانون بنانے کا حق نہیں دیتا۔ تمام انسانوں کیلئے وہ خود قانون الٰہی پیش کرتا ہے۔ کیونکہ خالق کائنات ہی اپنے بندوں کی ضروریات کو بہتر طور جانتا ہے۔ وہ علیم ہے، خبیر ہے، بصیر ہے، کسی کا بھی کوئی عمل اس کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے اور ایک دن سب کو اس کے سامنے پیش ہونا ہے۔ ہم اپنے بڑے سے بڑے افسر سے اپنی زیادتیوں یا کوتاہیوں کو چھپا سکتے ہیں۔ یا اس کے عتاب سے بچنے کی تدابیر نکال سکتے ہیں۔ لیکن رب العالمین سے اپنے گناہوں کو کسی طرح نہیں چھپا سکتے۔ اور نہ اپنی مجرمانہ روش پر رہتے ہوئے اس کو خوش رکھنے کی کوئی تدبیر ڈھونڈ سکتے ہیں اس پختہ یقین کے بعد ہی یہ احساس زندہ رہ سکتا ہے کہ ہمیں ایک دن اپنی کارگزاریوں کا اُسے جواب دینا ہے۔ اور اس شدید احساس کے بعد ہی لوگوں سے وہ عوام ہوں یا اراکین سلطنت اخلاص و وفا کی اور زندگی کے ہر معاملہ میں اعتدال و حقیقت پسندی کی توقع کی جاسکتی ہے۔

تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں امیر کا کام صرف قانون الٰہی کو خوبصورتی اور مضبوطی کے ساتھ نافذ کرنا ہوتا ہے۔ اور اس کا اپنا مقام خادم ملک و ملت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس کا ہاتھ کسی بھی حالت میں قانون سازی یا اصل حکمرانی تک نہیں پہنچ سکتا۔ اصل حکمرانی صرف خالقِ کائنات کیلئے ہے۔ امیر سے اگر کسی بھی وقت قانون کے صحیح نفاذ میں غلطی یا کوتاہی ہورہی ہے تو کسی بھی شخص کو اس کا ہاتھ پکڑ لینے یا اُسے متنبہ کرنے کا پورا حق حاصل رہتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ تمام انسان صرف اسی ایک خدا کی عبادت کریں جو پوری کائنات کا خالق ہے اور

مالک ہے۔ اسی کے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں جو سیدھا بھی ہے اور منزل رسا بھی جس پر چل کر ہم دونوں جہاں کی راحتوں سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔

أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ ءَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ

تم اللہ کی بندگی کرو اور ہر معاملہ میں اسی کے حکم پر چلتے رہو کیا بہت سے الگ الگ خداؤں کو ماننا بہتر ہے یا ایک خدا کا اقرار جو واحد ہے اور قہار ہے

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے مذاہب کی طرح اسلام بھی ایک مذہب ہے جو مخصوص دائروں میں یعنی عقائد و عبادات کی حد تک رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن سماجی واقتصادی اور سیاسی سطح پر اس میں رہنمائی کی صلاحیت نہیں۔ اور اگر اس نے کسی وقت ان دائروں میں رہنمائی کی بھی ہے تو وہ اُس وقت کے حالات پر منحصر تھی۔ آج کے حالات بدلے ہوئے ہیں، ضرورتیں بدلی ہوئی ہیں۔ وقت کے تقاضے بدلے ہوئے ہیں۔ ایسے حالات میں اسلام سمیت کوئی بھی مذہب مکمل رہنمائی نہیں کر سکتا۔ اور آج کے ترقی پسند ذہنوں کو ماضی کے دھندھلکوں میں نہیں لیجایا جا سکتا، ایسا سوچنا بھی ایک بڑی حماقت ہوگی" انھیں معلوم نہیں کہ اسلام دوسرے مذاہب کی طرح ایک جامد اور نامکمل مذہب نہیں ہے۔ وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ زندگی کے ہر ہر شعبہ میں پوری رہنمائی کرتا ہے۔ وقت کے تقاضوں کے مطابق اس میں لچک کا ایک زبردست اعجاز بھی موجود ہے ——— اصل میں یہ غلطی بھی ہمیں لوگوں کی ہے۔ ہم نے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ہم دُنیا کو اچھے معقول انداز میں اسلام سے روشناس نہیں کرا سکے۔ ہم آپس میں ایک دوسرے سے دست وگریبان رہے۔ اور اپنی ساری ذہنی اور علمی توانائیاں اسی راہ میں خرچ کرتے رہے صحیح غور و فکر کے ساتھ اگر ان طاقتوں سے ٹھیک کام لیا جاتا تو آج اُس کے بہت بہتر نتائج ہمارے سامنے ہوتے۔

کس قدر دکھ کی بات ہے کہ مغرب کی وحشی اور غیر متمدن قومیں منظم ہو کر علمی، اقتصادی، صنعتی اور سیاسی میدانوں میں آگے بڑھتی رہیں اور ہم ——— بھرپور وسائل کے ہوتے ہوئے

غفلت کے نشہ میں پڑے حسین سپنے دیکھتے رہے۔ فرمایا گیا تھا۔
وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَااسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ۔ تم امکان کی حد تک طاقت حاصل کرتے رہو۔
مگر افسوس ہم نے اس طرح کی آیات و روایات پر غور نہیں کیا۔ حضراتِ صحابہؓ کی زندگی اور اللہ کے لئے ان کی جد وجہد کے طریقوں پر سوچنے اور ان کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی ——
اسلام جہاں ہمیں جارحانہ اقدامات سے روکتا ہے، وہاں یہ بھی چاہتا ہے کہ ہم ہر لحاظ سے زیادہ سے زیادہ مضبوط اور طاقت ور رہیں تاکہ کوئی طاقت ہماری طرف جارحانہ قدم نہ بڑھا سکے۔
آج ہمارے تمام عرب ممالک اپنی غفلت شعاری کے تلخ نتائج بھگت رہے ہیں۔ کیا اس کی کھلی ہوئی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ امریکہ اور برطانیہ کے پروردہ اسرائیل کے مقابلہ میں کمزور ہیں۔ ان کے پاس وہ طاقت نہیں آج کے میدانوں میں جس کی ضرورت ہے اور جس کے ذریعہ وہ اپنے حقوق حاصل کر سکتے ہیں۔ خدا کرے ان شدید ضربوں کے بعد جو ہم جگہ جگہ سہہ رہے ہیں۔ گر بس نہیں، سنبھل جائیں۔ اور اپنے صحیح موقف پر آجائیں۔ حالات بلاشبہ نامساعد ہیں۔ مگر ہیں مایوس نہیں۔ مسلمان کے لئے اللہ کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔
البتہ ہمیں اور آپ کو وقت کے مطابق اپنے اندر زبردست تبدیلیاں پیدا کرنی ہوں گی۔
میں اس حقیقت پر یقین رکھتا ہوں ؎

گر ہوش میں آجائیں، پھر دیکھ یہ دیوانے
صدیوں کا ادھار اپنا، لمحوں میں چکا لیں گے

شاہ طیّب بنارسی

از۔ مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

بنارس ایک صنعتی اور ایک خاص طبقہ کا مذہبی مرکز ہونے کے علاوہ گذشتہ ددر میں اسلامی علوم وفنون اور ارباب فضل وکمال کا بھی مرکز رہ چکا ہے، یہ علاقہ چھٹی صدی میں باقاعدہ اسلامی قلمرو میں شامل ہوا۔ سلطان شہاب الدین غوری کے غلام قطب الدین ایبک نے اس دیار کو فتح کرکے دہلی سے وابستہ کیا۔ اسی وقت سے علمی و روحانی خانوادے یہاں آ آکر آباد ہونے لگے۔ خاص طور سے نویں صدی ہجری کے آغاز سے جب پورب کی آزاد خود مختار سلطنت کی بنیاد پڑی اور چند سالوں بعد سلطان ابراہیم شاہ شرقی متوفی ۸۴۴ھ تخت نشین ہوئے تو ان کی علم پروری، علماء نوازی اور عدل گستری کی بدولت پورب کی ساری سرزمین اسلامی علوم اور علمائے اسلام کے حسنات وبرکات سے لہلہا اٹھی، سلاطین شرقیہ کے بعد افق سلطنت پر لودھی خاندان کا ستارہ چمکا اور غروب ہوا، مگر یہاں کے علم ودانش اور فضل وکمال کی محفلیں جمی رہیں۔ زمانہ نے ایک کروٹ پھر لی اور ۹۳۳ھ میں شاہانِ مغلیہ کی سلطنت قائم ہوئی تو تیموری خاندان کا پانچواں حکمراں اس خطہ کی علمی ودینی شان وشوکت اور علماء وفضلاء کی کثرت دیکھکر بے ساختہ پکار اٹھا "مملکت پورب شیراز ماست"

اسی شیراز ماست کا ایک قابل قدر حصہ بنارس بھی تھا جہاں بہت سے علمی و روحانی خانوادے آکر اس طرح اقامت پذیر ہو گئے کہ صدیوں تک ان کے فیوض وبرکات کا سلسلہ جاری رہا، ان باہر سے آنیوالوں میں قدوۃ اہل تجرید، غریق بحر توحید فرید ثانی شیخ الاسلام شیخ فرید بن قطب الدین اور ان کے برادر خورد امام العارفین ہمام العاشقین شیخ داؤد بن قطب الدین کے خاندان کو علمی ودینی لحاظ سے بڑا فروغ حاصل ہوا۔ شاہ طیّب بن معین بنارسی اسی خانوادے

کے گل سر سبد تھے۔ آئندہ صفحات میں انھیں کے علمی و روحانی کارناموں کا تذکرہ کیا جارہا ہے

مآخذ و مصادر

ہماری تحقیق میں شاہ صاحب کے سب سے قدیم تذکرہ نگار شیخ لیسین بن احمد بناری متوفی ۱۰۷۸ھ ہیں جنھوں نے ان کی وفات کے بارہ[۱۲] سال بعد مناقب العارفین میں تفصیل کے ساتھ آپ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد شیخ ارشد جون پوری متوفی ۱۱۱۲ھ کے ملفوظات گنج ارشدی میں شیخ طیب کا مفصل تذکرہ ہے جس میں ...... کچھ باتیں مناقب سے زائد ملتی ہیں۔ گنج ارشدی کا ایک قلمی نسخہ خانقاہ رشیدیہ جونپور میں ہے۔ اور میری نظر سے کئی بار گذر چکا ہے

بحر زخار میں بھی شاہ طیب اوران کے بہت سے بزرگوں کا تذکرہ ہے جس کا ایک قلمی نسخہ پیرزادہ شاہ محمود احمد رمز ایڈوکیٹ خانقاہ ملا سید محمدی الہ آبادی کے کتب خانہ میں موجود ہے جسے پیرزادہ صاحب کی نوازشوں کے طفیل متعدد بار مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ بعد کے جن تذکرہ نویسوں نے بھی شاہ صاحب کا تذکرہ کیا ہے ان کا مرجع یہی کتابیں ہیں چنانچہ نزہتہ الخواطر عربی، سمات الاخیار، مرقع بنارس، تذکرہ مشائخ بنارس وغیرہ میں انھیں کتابوں کے حوالہ سے آپ کا ذکر ملتا ہے۔

حضرت شاہ طیب بناری گیارہویں صدی کے علماء میں جامع شریعت وطریقت تھے۔ انھوں نے اپنی علمی و روحانی سرگرمیوں سے مدرسہ وخانقاہ دونوں کو آباد رکھا۔ ان کے اصلاحی وتبلیغی کارنامے، آج بھی تاریخ کے صفحات میں نمایاں ہیں اور اپنے ہر تذکرہ نگار سے خراج تحسین وصول کرتے ہیں۔ چنانچہ شیخ لیسین بناری نے ان الفاظ سے انھیں یاد کیا ہے۔

"آں فرد یگانہ آں غوث زمانہ آں جامع معانی ودقائق آں منبع اسرار وحقائق آں نہنگ دریائے شریعت آں شیر بیشۂ طریقت آں شاہباز عالم ملکوت آں بلند پرواز بیضائے لاہوت آں متمکن درمقام تمکین حضرت بندگی شیخ طیب بن معین"

(مناقب العارفین قلمی نسخہ مظہر العلوم بنارس)

شیخ وجیہ الدین اشرف لکھنوی صاحب بحر زخار نے ان تأثرات کا اظہار کیا ہے:۔

"وے راکمالات عالی وحالات لازوال بودہ اند آخر آخر بدوام مشاہدہ رسیدہ بود"

(بحر زخار قلمی نسخہ دائرۂ محمدی شاہ الہ آباد ص۳۱)

مولانا عبدالحئی حسنی نے یوں مدح سرائی کی ہے :۔

"الشیخ الصالح طیب بن معین کان زاہدًا متقللاً متورعًا قنوعًا بشوشا طیب النفس۔"

(نزہۃ الخواطر ص ۱۹۱ ج ۵)

تعلیم وتحصیل اور ابتدائی حالات

شاہ صاحب کی تاریخ ولادت کی تصریح کہیں نہیں ملتی۔ شیخ یٰسین نے صرف اتنا لکھا ہے کہ "والد شریف وے شیخ معین دے رادہ سالہ گذاشتہ خود بجوار رحمت حق بیوست۔"

یعنی ان کے والد انھیں دس سال کی عمر کا چھوڑ کر انتقال کر گئے۔ والد بزرگوار کی رحلت کے بعد اپنی پھوپھی کی جوار شفقت میں پرورش پائی۔ قرآن حکیم اور فارسی کی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ عربی کی ابتدا استاذ الفضلاء شیخ نظام الدین بنارسی سے کی۔ عہد طالب علمی ہی سے شاہ صاحب کے اخلاق واطوار نہایت پسندیدہ تھے، صلاح وتقویٰ، عفت وپاکدامنی اسی وقت سے ان کے ہر قول وعمل سے ظاہر ہوتی تھی۔ ان اوصاف حمیدہ کے پیش نظر شیخ نظام نے ابتداء ہی میں یہ پیشین گوئی کر دی تھی۔

ازیں پسر بوئے مشیخت ومقتدائی می آید جہانے از برکات انفاس وے نصیب خواہند یافت واین خاندان از و روشن خواہد شد (مناقب ص ۴)

اس بچے سے مشیخت وبزرگی کی بو آرہی ہے ایک جہاں اس کی برکت سے نفع حاصل کرے گا۔ اور خاندان کا نام اس سے روشن ہوگا۔

شیخ نظام الدین بنارسی کی درسگاہ میں صرف ونحو کی بعض کتابیں پڑھ کر جون پور کا علمی سفر کیا اور وہاں کے بعض اساتذہ سے نحو ومعانی کے فن کو مکمل کیا۔ پھر شیخ نور اللہ بن طلحہ[۱] جون پوری متوفی ۱۰۱۲ھ سے شرح وقایہ مکمل اور حسامی کے کچھ اجزاء کی تحصیل وتکمیل کی۔

---

[۱] شیخ نور اللہ بن طلحہ جون پوری ہر دی علماء جونپور میں شریعت وطریقت کے جامع تھے علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل اپنے برادر کلاں شیخ عبدالجلیل جونپوری سے کی درس وتدریس اور مطالعہ کتب میں بڑا انہماک تھا علمی تبحر میں خاص شہرت کے مالک تھے عہد عالمگیری میں متعدد عہدوں پر بھی فائز ہوئے ۱۰۱۲ھ میں وفات ہوئی۔ مزار شہر جون پور میں ہے۔ تجلی نور۔

دوران تعلیم میں ایک بار مکان تشریف لائے تو اہل خاندان کے اصرار پر رشتۂ ازدواجی سے منسلک ہوگئے جس کی بناء پر تعلیم وتحصیل کے سلسلے میں تقریباً تین سال کا وقفہ ہوگیا۔

شیخ یٰسین لکھتے ہیں:۔

پس بملازمت افضل العصر اعلم الدہر میاں شیخ نور اللہ انصاری ہروی شرح وقایہ تمام خواند وجزوے حسامی بعدازاں بتقریب کارخیر بخانہ آمد ومتاہل شد بعد کہ خدائی از خواندن باز ماند وسلسلے دو سہ درخواندن تفرقہ گذارند (ص ۴)

پھر افضل العصر اعلم الدہر شیخ نور اللہ انصاری ہروی کی خدمت میں شرح وقایہ مکمل اور حسامی کے چند اجزاء کی تحصیل کی اس کے بعد گھر آئے اور شادی کرلی۔ نکاح کے بعد سلسلۂ تعلیمی جاری نہ رکھ سکے اور دو تین سال کا وقفہ ہوگیا

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

تین سال کے تعلیمی انقطاع کے بعد پھر جون پور تشریف لے گئے اور اس وقت کے مروجہ نصاب کے مطابق فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم مکمل کرکے دینیات سے فراغت حاصل کی (ص ۴)

تعلیم سے فراغت کے بعد مزید ایک سال جون پور میں مقیم رہے، شاہ صاحب کا یہ یک سالہ قیام کس مقصد کے تحت تھا اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی۔ شیخ یٰسین مبہم طور پر لکھتے ہیں کہ:۔

"بعدازاں قریب یکسال درجون پور بتقریب بعضے امور توقف فرمودہ بود" یعنی تعلیم کی تکمیل کے بعد ایک سال مزید بعض امور کے تحت جون پور میں ٹھہرے رہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قیام بسلسلۂ ملازمت رہا ہوگا۔ کیونکہ اس سے پہلے عقد ہوگیا تھا۔ بیوی کے ساتھ بیوہ والدہ کی کفالت بھی انھیں کے ذمہ تھی۔ اس لئے تحصیل علم سے فراغت کے بعد تحصیل معاش کی غرض سے ملازمت کرلی ہوگی۔ واللہ اعلم۔

عرفان وطریقت

جون پور ہی کے دوران قیام میں ایک دن کسی خانقاہ میں شیخ تاج الدین جھوسوی سے ملاقات ہوگئی۔ دونوں حضرات ایک ہی درسگاہ واستاذ کے تربیت یافتہ تھے۔ اس لئے بڑی یگانگت ومحبت تھی۔ دوران گفتگو ..... شاہ صاحب نے برسبیل تذکرہ شیخ تاج سے عرض کیا کہ ایک عرصہ سے میری خواہش ہے۔ جدامجد حضرت شیخ حسن بنارسی قدس سرہٗ کے سلسلہ کے کوئی بزرگ مل جائیں تو ان سے وابستہ

ہوکر جد بزرگوار کے سلسلے میں داخل ہوجاتا۔ یہ سنتے ہی شیخ تاج نے فرمایا یہ آپ کی سعادت اور نیک بختی ہے کہ اس وقت شہر میں مولانا خواجہ کلاں خلیفہ کامل وخلف قابل شیخ نصیر الدین خلیفہ مطلق حضرت شیخ حسن بناری تشریف فرما ہیں۔ یہ مژدۂ روح افزا سنتے ہی شاہ طیب کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھا، خود ان کا بیان ہے کہ:۔

چوں ایں حرف بگوش بندہ رسید	اس جملہ کو سنتے ہی مجھے اس قدر
چناں خوش شدم کہ گویا جان از سر نو	خوشی ہوئی گویا نئی جان مل گئی اور
یافتم و بآب حیات رسیدم (ص ۵)	چشمۂ آب حیات پر پہنچ گیا۔

اسی وقت شیخ تاج سے عرض کیا کہ مجھے خواجہ کی مجلس میں پہونچا دیں چنانچہ شیخ تاج انھیں لے کر خواجہ کلاں کی مجلس میں پہونچے۔ خواجہ انھیں دیکھتے ہی کھڑے ہوگئے اور مصافحہ ومعانقہ کے بعد فرمایا۔

"مگر شما از اولاد حضرت شاہ ہستید کہ بمجرد دیدن شما صورت حضرت شاہ درنظر من آمدہ" شاید آپ حضرت شاہ حسن کی اولاد سے ہیں۔ کیونکہ آپ کی صورت دیکھتے ہی شاہ صاحب کا حلیہ یاد آگیا۔ شاہ طیب نے عرض کیا حضرت شاہ صاحب بندہ کے جد امجد تھے۔ یہ سن کر خواجہ نے بڑی شفقت ونوازش فرمائی اور نہایت تواضع وانکساری کے ساتھ کہا "شما مخدوم زادہ ایں عاجز اید مارا نعمت از خاندان شما است" آپ تو ہمارے مخدوم زادہ ہیں، اس عاجز کو جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ آپ ہی کے خاندان کا عطیہ ہے:۔

اس تعارفی گفتگو کے بعد شاہ صاحب نے بیعت کی درخواست کی جو منظور ہوئی اور اسی مجلس میں خواجہ نے انھیں بیعت فرماکر اوراد و وظائف کی تلقین کی اور از راہ شفقت ونوازش کلاہِ مبارک اپنے سر سے اُتار کر اُن کے سر پر رکھ دی۔ بیعت ہوتے ہی دنیا بدل گئی اور قلب میں سوز دروں کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ناچار جون پور کے مشاغل کو خیرباد کہہ کر مکان چلے آئے مگر یہاں بھی سکون نصیب نہ ہوسکا عشق الٰہی کی سوزش بڑھتی ہی گئی۔ اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ بیتابی میں کبھی دشت د

بیابان کی خاک چھانتے اور کبھی گوشۂ محراب میں عافیت کی جستجو کرتے۔ اسی عالم حیرانی و پریشانی میں تنگیٔ معاش نے بھی اپنی گرفت سخت کر دی اور اہل خانہ پر فاقے گذرنے لگے اس لئے مجبوراً اطراف بنارس کے کسی حاکم کی ملازمت کر لی۔ مگر شوریدگی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ اس سلسلہ کو تا دیر قائم نہ رکھ سکے اور سال کے اندر ہی اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ شاہ صاحب کے گھر والے ان کے ان حالات سے نہایت پریشان و متفکر تھے۔ چنانچہ شیخ شہاب الدین ترکمان کی خدمت میں جاکر دعا کی درخواست کی کہ ان کی یہ اضطرابی کیفیت کسی طرح زائل ہو جائے۔ شیخ شہاب ایک روشن ضمیر و صاحب دل بزرگ تھے وہ اپنی چشم بصیرت سے دیکھ رہے تھے کہ اس سوز دروں و اضطراب باطنی کی حقیقت کیا ہے۔ اس لئے شاہ صاحب کے گھر والوں کو مطمئن کرتے ہوئے فرمایا:

ایں فرزند بطلب حق سرشدہ است خدائے تعالیٰ ہمہ را ایں سعادت نصیب گرداند مارا ہمت از وے باید خواست امیدوار باشید کہ حق تعالیٰ خاندان حضرت شاہ را از برکت انفاس ایں فرزند معمور خواہید کرد واز انوار او خانوادہ روشن خواہد شد۔ (مناقب ص ۶)	یہ فرزند طلب حق میں دیوانہ ہوا ہے اللہ تعالیٰ سب کو یہ سعادت نصیب فرمائیں ہمیں اس سے دعا لینی چاہیئے تم لوگ امید وار رہو کہ اللہ تعالیٰ حضرت شاہ حسن کے خاندان کو اس فرزند کے برکات و انوار سے معمور فرمائیں گے اور خاندان کا نام اس کے ذریعہ روشن ہوگا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

بالآخر شاہ صاحب کے دل میں یہ بات آئی کہ یہ آگ جس نے لگائی ہے وہی اسے بجھائیگا بھی، اس خیال کے آتے ہی والدہ ماجدہ سے اجازت لیکر شیخ پورہ کی راہ لی اور حضرت خواجہ کلاں کی خدمت میں جاکر اپنی باطنی کیفیات اور سوز دروں کا حال بیان کیا۔ خواجہ نے انھیں تسلی دی اور اس خوش آیند کیفیت پر مسرت کا اظہار فرمایا۔ چند دن خواجہ کی صحبت میں رہ کر گھر واپس ہوئے۔ لیکن خواجہ کی روحانی مجلس کے کیف نے رہا سہا سکون بھی زائل کر دیا۔ اس لئے گھر پر صبر و قرار میسر نہ آسکا۔ اور چند ہفتہ کے بعد دوبارہ خواجہ کلاں کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اس بار طویل عرصہ تک وہاں قیام رہا اور عبادت و ریاضت کے ساتھ خواجہ کے

فیوض و برکات سے بھرپور استفادہ کیا۔ اسی سفر میں یا اس کے بعد تیسرے سفر میں حضرت خواجہ نے انھیں رمضان المبارک کے عشرۂ اخیر کے اعتکاف کا حکم دیا اور اعتکاف کے اختتام پر عید کے دن خرقۂ خلافت سے نوازا اور بعض اذکار و اوراد کی تلقین فرمائی۔ ساتھ ہی حضرت شاہ حسن بنارسی کے مخصوص وظائف بھی بتائے۔

مناقب میں ہے:۔

باعتکاف عشرۂ اخیرہ رمضان مبارک امر نمودند و در روز عید پیراہن حضرت خواجگانِ چشت باشاں اجازت عطا فرمودند و بعضے اذکار تلقین کردند و اوراد حضرت شاہ حوالہ نمودند۔ (ص ۷)

رمضان مبارک کے اخیر عشرہ کے اعتکاف کا حکم دیا اور عید کے دن مشائخ چشت کے پیراہن کے ساتھ خلافت کی اجازت دی اور بعضے اذکار کی تلقین فرمائی نیز حضرت شاہ حسن کے اوراد بھی حوالہ کئے۔

عطائے خلافت کے بعد مزید تربیت و تکمیل کی غرض سے شاہ صاحب کو اپنے خلیفہ خاص شیخ تاج الدین جھوسوی کے حوالے کر دیا۔ شیخ تاج سے شاہ صاحب کے دوران طالب علمی ہی سے معاصرانہ و رفیقانہ تعلقات تھے۔ لیکن اس سپردگی کے بعد انھوں نے شیخ تاج کے ادب و احترام اور انقیاد و اطاعت کا جو نمونہ پیش کیا، معاصرین کی باہمی تاریخ میں اس کی مثال کمتر ہی ملے گی۔ شاہ صاحب نے خود اپنے انقیاد و اطاعت کی کیفیت کو بایں الفاظ بیان کیا ہے۔

دل خود بدست ایشاں سپرد و اختیار خود از ایشاں برداشت تا دہ سال ابتدائً گاہے بخدمت ایشاں ظاہر نکرد کہ مرا فلاں وظیفہ یا نماز بفرمائید یا ذکر تلقین کنید ہرچند سلوک ایشاں بابندہ یارانہ و بے تکلف بود اما من خود را از غلامانِ ایشاں کمتر دانستہ در خدمت مقید بودم۔ (ص ۷)

اپنے اختیار و خواہشات کو ان کے حوالہ کر دیا ابتداءً دس سال تک کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ مجھے فلاں وظیفہ نماز یا ذکر تلقین فرمادیں ہرچند وہ میرے ساتھ دوستانہ اور بے تکلفانہ معاملہ فرماتے تھے۔ لیکن میں اپنے آپ کو ان کے نوکروں سے بھی کمتر تصور کرتے ہوئے خدمت میں لگا رہا۔

شاہ طیب نے اپنے مربی کے ساتھ گرویدگی وخودسپردگی میں حضرات صوفیاء کے اس اصول پر پورا پورا عمل کیا "ینبغی للمرید ان یکون بین یدی الشیخ کالمیت بین یدی الغسال یقلبہ کیف یشاء" یعنی مرید کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ شیخ کے حضور میں اس طرح رہے جیسے میت غسال کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کہ وہ جس طرح چاہتا ہے اسے الٹتا پلٹتا ہے۔

شاہ صاحب کو اس اطاعت شعاری کا پورا پورا نفع بھی حاصل ہوا کہ شیخ تاج نے اپنے عطاء وانعام کو ان پر نچھاور کردیا اور خلافت واجازت کے علاوہ متعدد بار اپنے خلعتِ خاص سے نوازا اور مرض الموت میں ایک دن انھیں اپنے سینے سے چمٹا کر اپنی محبت وشفقت اور اتحاد دیگانگت کے اظہار کے لئے یہ شعر پڑھا:

ع　من تو شدم تو من شدی تو جاں شدی من تن شدم
تاکس نگوید بعد ازیں تو دیگرے من دیگرم !!!

الحاصل تقریباً تیس سال کی طویل مدت تک شیخ خواجہ کلاں و شیخ تاج الدین کی صحبت میں رہ کر اصلاح باطن اور تزکیہ وتصفیہ میں مشغول رہے۔ تا آنکہ مرتبۂ ارشاد وتکمیل پر فائز ہوئے اور پیرو مرشد کے حکم سے بنارس آکر عرفان وسلوک کی مسند کو زینت بخشی۔

شاہ صاحب کو ان دونوں بزرگوں کے علاوہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ سے بھی سلسلہ قادریہ میں اجازت حاصل تھی۔

مناقب میں ہے۔

دراں زماں کہ بعد وفات ایشاں	شیخ تاج کی وفات کے بعد جس وقت
برائے زیارتِ پیراں خویش بجانب	شاہ صاحب پیران چشت کی زیارت
دہلی رفتہ بود با شیخ الاسلام استاذ	کیلئے دہلی تشریف لے گئے تھے حضرت شیخ
المفسرین حاجی الحرمین بندگی میاں شیخ	عبدالحق محدث دھلوی بخاری
عبدالحق الدہلوی البخاری کہ دراں وقت	سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

معتقد رائے سلسلۂ قادریہ بود ملاقات واقع شد و وے شیخ کامل ومکمل یافت ایں سلسلہ از وے گرفت وخرقۂ قادریہ از دست وے پوشید۔ (ص ۹)

اس وقت یہ سلسلۂ قادریہ کے معتقد تھے۔ محدث دھلوی کو شیخ کامل پایا، چنانچہ ان سے سلسلۂ قادریہ کی اور ان کے دستِ خاص سے خرقۂ خلافت زیب تن کیا۔

بنارس شریعت آباد شیخ تاج الدین نے شاہ صاحب کو بنارس رخصت کرتے وقت فرمایا تھا کہ اب آپ کو یہاں آنے کی حاجت نہیں۔ بنارس میں جم کر خلق خدا کی اصلاح وتربیت کی خدمت انجام دیجئے۔ میں خود کبھی کبھی وہاں آکر ملاقات کر آؤں گا۔ چنانچہ ان کے حکم کے مطابق اپنے آبائی قیام گاہ منڈواڈیہہ میں ارشاد وتلقین کی محفل آراستہ کی، لیکن یہاں خانگی جھمیلوں کی بناء پر دلجمعی ویکسوئی حاصل نہ ہوسکی۔ اس لئے جدامجد حضرت شاہ حسن کے طریق پر آبادی سے باہر قلعہ راجہ بنارس کے خرابہ کے قریب ایک حجرہ بنا کر چند رفقاء کے ساتھ وہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ خلق کا رجوع شروع ہوا۔ طلباء وفقراء کی ایک جماعت آپ کے گرد جمع ہوگئی جن کی رہائش کے لئے آپ کے قریبی عزیز ومرید باختصاص شیخ طاہر بن شیخ جان نے ایک پختہ مکان حجرہ سے متصل تعمیر کرادیا۔ کچھ عرصہ کے بعد بہت سے تجار وغیرہ نے بھی حسن عقیدت میں آپ کے جوار میں اپنے لئے الگ الگ حجرے اور مکانات بنوا کر اقامت اختیار کرلی۔ پھر طلبہ وارادت مندوں کی کثرت کی بناء پر حجرہ اور مکان ناکافی ہوا تو مستقل ایک خانقاہ اور اس سے متعلق ایک مسجد کی تعمیر عمل میں آئی۔ اس طرح آہستہ آہستہ یہ ویرانہ اچھی خاصی آبادی میں تبدیل ہوگیا، جسے شاہ صاحب نے شریعت آباد کے نام سے موسوم کیا۔

درس وتدریس وارشاد وتلقین شاہ صاحب کا قیام مستقل طور پر شریعت آباد ہی میں تھا۔ جہاں وہ سالکین کی تعلیم وتربیت کے ساتھ درس وتدریس کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ طلبہ کی کثیر جماعت

خدمت میں موجود رہتی تھی جن سے شاہ صاحب نہایت شفقت و محبت کا معاملہ فرماتے تھے مناقب میں ہے

اکثر طلبہ درخدمت دے می بودند وایں طائفہ را بسیار دوست داشتے وسبق شان گفتے (مناقب ص ۱۰)

اکثر طلبہ ان کی خدمت میں موجود رہتے تھے۔ جنہیں وہ بہت عزیز رکھتے تھے اور انھیں درس دیتے تھے۔

سبق کا سلسلہ عام طور سے ظہر کے بعد شروع ہوتا تھا، جو عصر تک جاری رہتا، اسی وقت کبھی کبھی کچھ تصنیف وتالیف کا کام بھی کرتے تھے۔

مناقب میں ہے۔

وبعد نماز ظہر تا عصر جزوے قرآن می خواند بعد آزاں بعضے یاراں سبق گفتے وگاہے چیزے می نوشت۔ (ص ۱۴)

ظہر کے بعد عصر تک کچھ قرآن پاک کی تلاوت فرماتے پھر بعض لوگوں کو سبق پڑھاتے اور کبھی کبھی کچھ تحریر کرتے تھے۔

تذکرہ نویس شاہ صاحب کے روحانی کمالات وتصرفات کے بیان وتفصیل میں اس درجہ محو ہو گئے ہیں کہ ان کے علمی کارناموں کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ اس معاملہ میں تنہا شاہ صاحب ہی کے ساتھ یہ برتاؤ نہیں ہوا ہے۔ بلکہ بالعموم مشائخ کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا ہے کہ ان کی کرامات وتصرفات کے انبار میں ان کے علمی کمالات اجاگر نہ ہو سکے۔ اس لئے شاہ صاحب کے تلامذہ اور تصنیفات کے متعلق اب کوئی تحقیقی اور یقینی بات کہنی مشکل ہے۔ انتہائی تلاش وجستجو کے بعد "اکثر طلبہ درخدمت دے بودند" میں سے صرف دو کے ناموں کی تصریح مل سکی کہ انھوں نے شاہ صاحب کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور علوم ظاہری کی تحصیل کی۔ ان میں ایک شاہ یٰسین بنارسی ہیں اور دوسرے شیخ ناصر الدین اور ایک تصنیف "صلوٰۃ طیبی" کا پتہ چل سکا جس کا ایک نسخہ مولانا رضا علی بنارسی متوفی ۱۳۱۲ھ کے کتب خانہ میں تھا۔ مولانا علی رضا صاحب نے اپنے فتاویٰ میں صلوٰۃ طیبی کا حوالہ اکثر مقامات پر دیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "قال العالم

العارف الفقیہ المحقق المدقق الشیخ طیب بنارسی ،، (تذکرہ مشائخ بنارس ص ۲۲)

طریق اصلاح وبیعت

شاہ صاحب بیعت کے سلسلے میں نہایت حزم و احتیاط فرماتے تھے، سلسلہ کو وسیع کرنے کی غرض سے ہر کس و ناکس کو ہاتھ نہیں دیتے تھے۔ جب تک طالب بیعت کے حسن اعتقاد اور تقویٰ و تدین کو اچھی طرح جانچ نہیں لیتے۔ بیعت نہیں کرتے تھے۔ بیعت کے بعد ابتداء میں صرف ایام بیض کے روزے اور چھ رکعت صلوٰۃ اوابین پر مداومت کا حکم دیتے۔ اس کے بعد بقدر استعداد نوافل و وظائف اور دیگر مجاہدات و ریاضت کی اجازت دیتے تھے۔ ابتداء میں اوراد کی پابندی پر بہت تاکید فرماتے تھے۔ ان امور پر مکمل مداومت کے بعد ذکر جہری کی تلقین فرماتے اور اس پر استقامت حاصل ہو جانے پر مراقبہ کا حکم دیتے تھے۔ سالکین و مریدین کی اصلاح و تربیت کا ہمہ وقت خیال رکھتے تھے۔ جس کے اندر صلاحیت و استعداد پاتے اس کی بطور خاص توجہ فرماتے۔ (مناقب ص ۱۷)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے بارے میں شاہ صاحب بلاخوف لومۃ لائم سعی بلیغ فرماتے تھے اور ابتداء میں تو مزاج میں اس قدر شدت تھی کہ خلاف شرع امر کو دیکھتے ہی بے قابو ہو جاتے تھے۔ اگر کہیں سے ڈھول یا نقارہ کی آواز کان میں پڑ جاتی تو اُسے توڑے بغیر قرار نہ ہوتا تھا۔ نماز فجر کے وقت مسجد میں جاتے ہوئے اگر کسی کو سویا ہوا دیکھ لیتے تو اس کے اوپر پانی ڈال دیتے تھے۔ یا عصا سے کرید کر جگا دیتے۔ اور نہ اٹھنے پر کبھی کبھی عصا سے مار بھی دیتے تھے۔ شادی بیاہ کے سلسلے میں غیر قوموں کے اختلاط سے مسلمانوں میں اس وقت جو غلط رسمیں جاری ہوگئی تھیں۔ مثلاً جلوہ، نقارہ وغیرہ اسے اپنی اصلاحی کوششوں سے بالکل ختم کر دیا تھا۔ مناقب میں ہے۔

اکثر بدعتہا کہ دریں دیار شائع بود مثل نقارہ و جلوہ و رسوم نکاح ہمہ را دور ساختہ و رسم جاہلاں کہ در خلق پراگندہ بود	اکثر بدعتیں جو اس دیار میں جاری تھیں جیسے جلوہ و نقارہ اور نکاح کی دیگر رسمیں سب کو ختم کر دیا اور جاہلانہ رسوم جو عوام میں پھیلی

جملہ را ازمیاں برانداخت۔ ہوئی تھیں ان سب کو بالکل دور کردیا۔

اس سلسلہ میں صاحب گنج ارشدی نے ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے جس سے شاہ صاحب کی ایمانی جرأت وصلابت کا اندازہ ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب شہر کی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ خطیب نے خطبہ میں شہنشاہ اکبر کا نام لیا۔ اس کا نام سنتے ہی شاہ صاحب کو جلال آگیا۔ آگے بڑھ کر خطیب کو منبر سے کھینچ لیا۔ اور فرمایا خطبہ میں کافر کا نام لیتا ہے۔ اتفاق سے شاہ صاحب کے ہمراہ اسوقت ان کے دونوں شیوخ حضرت مولانا خواجہ کلاں اور شیخ تاج الدین جھوسوی بھی تھے۔ شہر کے قاضی اور حاکم تو شاہ صاحب سے اُن کے ہیبت وجلال کی بنا پر کچھ نہ کہہ سکے۔ البتہ ان دونوں بزرگوں سے عرض کیا کہ ہم بادشاہ کے نوکر ہیں۔ اگر بادشاہ کو معلوم ہوجائیگا کہ خطبہ سے اُس کے نام کو خارج کردیا گیا ہے تو ملازمت تو جائے گی ہی۔ ہمارے مکانات بھی مسمار کرادے گا۔ اس لئے ہم خطبہ میں اس کے نام کو شامل کرنے میں مجبور ہیں۔ خواجہ کلاں نے اس دن سے شاہ صاحب کو ہدایت کردی کہ نماز جمعہ بجائے جامع مسجد کے منڈواڈیہہ میں ادا کرلیا کریں۔ (گنج ارشدی ص ۱۷۳)

امراء واغنیاء کے ساتھ اس بارے میں انتہائی متشدد تھے، ان کے ساتھ رفق ونرمی کا معاملہ کرنا تو گویا جانتے ہی نہ تھے۔

صاحب مناقب لکھتے ہیں:۔

وے قدس سرہٗ باجماعت اغنیاء درکلام بسیار شدید بود وسخن ہرگز برفق نگفتے وگر خلاف شرع ازیں جماعت دیدے منع کردے وزجر فرمودے واگر کسے از ابنائے روزگار باسبلت دراز خدمت وے رسیدے۔ سبلت وے بریدے (ص ۱۲)

حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ جماعت اغنیاء کے ساتھ گفتگو بڑی سخت فرماتے تھے۔ نرمی ہرگز نہ فرماتے۔ اس جماعت سے اگر کوئی خلاف شرع امر دیکھتے تو فوراً ٹوک دیتے اور تنبیہ فرماتے، اگر کوئی دراز مونچھ والا خدمت میں آجاتا تو اس کی مونچھ کٹوا دیتے تھے۔

امراء و حکام کا شاہ صاحب کے ساتھ برتاؤ

شاہ صاحب امراء و حکام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے اور نہ کبھی اپنی ضرورت سے اُن کے دربار میں جاتے تھے۔ البتہ اگر کوئی ضرورت مند، صاحب احتیاج کسی حاکم کے پاس سفارش کی درخواست کرتا تو "من یشفع شفاعۃ حسنۃ یکن لہ نصیب منہا" الآیۃ کے پیش نظر ان کے پاس جانے میں دریغ نہ فرماتے تھے۔ امراء شاہ صاحب کا اس درجہ احترام کرتے تھے کہ ان کے مجلس میں پہونچتے ہی اگر خلاف شرع کوئی چیز ہوتی تھی۔ مثلاً شطرنج وغیرہ تو فوراً وہاں سے ہٹا کر کہیں چھپا دیتے تھے۔ بسا اوقات توان کے مجلس میں پہونچنے سے پہلے ہی ان چیزوں سے مجلس کو پاک وصاف کر دیتے تھے۔ اور ہمہ تن گوش ہو کر شاہ صاحب کی باتوں کو سنتے اور فوراً اس پر عملدرآمد کرتے تھے۔

مدد معاش کے بارے میں شاہ صاحب کا نظریہ

شاہ صاحب امراء و سلاطین کے عطیات اور جاگیروں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے اور نہ کبھی اُسے قبول کیا۔ اکثر فرماتے تھے کہ "ایں مدد معاش مدد ممات است"، اپنے متعلقین کو بھی اس سے احتراز کرنے اور بچنے کی سخت تاکید کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے خادم خاص وخلیفہ با اختصاص شاہ یٰسین بنارسی کو مخاطب کرکے بارہا فرمایا کہ دیکھنا اس مدد معاش کو قبول نہ کرنا ایک غریب فقر وفاقہ کے باوجود اپنے گھر میں اطمینان وعافیت سے رہتا ہے۔ لیکن جب اُسے قبول کر لیتا ہے تو اُسے حاکم، فوجدار، صوبہ دار اور دیوان کے دربار میں حاضر ہونا پڑتا ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کی نگرانی کے لئے چوکیدار بٹھائے جاتے ہیں اور مقررہ حقوق کی عدم ادائیگی کی صورت میں اسے نظر بند کر دیا جاتا ہے۔ جس سے اس کا اطمینان وسکون اور راحت وعافیت غارت ہو جاتا ہے۔ اور انجام کار یہ مدد معاش اس کے حق میں مدد ممات ہو جاتی ہے۔ (مناقب ص ۱۲)

(بقیہ آئندہ)

ساتویں قسط

منطق و فلسفہ ایک علمی و تحقیقی جائزہ

از مولانا محمد اطہر حسین قاسمی بستوی

اب ارسطو کا فلسفہ رائج ہے

عالم اسلام میں جو فلسفہ رائج اور عام ہے۔ وہ ارسطو ہی کا فلسفہ ہے۔ اور وہی آخری دور میں یونان کا فلسفہ سمجھا جاتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں!

لٰکِنَّ هٰذِهِ الْفَلْسَفَةَ الَّتِیْ يَسْلُكُهَا الْفَارَابِیُّ وَابْنُ سِينَا وَابْنُ رُشْدٍ وَالسُّهْرَوَرْدِیُّ الْمَقْتُوْلُ وَنَحْوُهٗ فَلْسَفَةُ الْمَشَّائِيْنَ وَهِیَ الْمَنْقُوْلَةُ عَنْ اَرَسْطُوْ الَّذِیْ يُسَمُّوْنَهٗ الْمُعَلِّمُ الْاَوَّلُ (الرد علی البکری ملنہ)

لیکن یہ فلسفہ جس کی فارابی، ابن سینا، ابن رشد، اور سہروردی مقتول وغیرہ پیروی کرتے ہیں یہ مشائین کا فلسفہ ہے۔ اور یہ تمام تر ارسطو سے منقول ہے جس کو فلاسفہ معلم اول کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

ارسطو حقائق دینیہ سے دور تھا

ارسطو ہر چند معقولات اور فلسفیانہ علوم میں امام گردانا جاتا ہے مگر دینی اور مذہبی حقائق و معلومات کی اُسے ہوا بھی نہیں لگی تھی نہ وہ کبھی انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سرزمینوں میں گیا نہ ان کی تعلیمات سے استفادہ کیا، ستارہ پرستی کے مذہب کا کچھ علم رکھتا تھا اسی پر اس نے قیاسی تعلیمات کی بنیاد ڈالی اور ایک فلسفہ گھڑ لیا اس لئے وہ جو کچھ اپنے فلسفہ میں بیان کرتا ہے - وہ دین و مذہب سے میل نہیں کھاتا، حافظ ابن تیمیہؒ تحریر فرماتے ہیں۔

• جن لوگوں نے فلسفہ کی تاریخ و تذکرہ مرتب کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ فلسفہ

کے ابتدائی ارکان فیثاغورس، سقراط، افلاطون شام وغیرہ ارض انبیاء کی طرف آمد و رفت رکھتے تھے اور لقمان حکیم وغیرہ سے اور حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے اصحاب سے استفادہ کرتے تھے۔ لیکن ارسطو کو کبھی اس سرزمین کی طرف سفر کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ جو انبیاء کی بعثت سے مشرف ہوئی نہ اس کے پاس انبیائے کرام علیہم السلام کی تعلیم کا کوئی حصّہ تھا جیسا کہ اس کے پیش روؤں کے پاس تھا، اس کے دامن میں ستارہ پرستی کے مذہب کا کچھ حصّہ تھا اسی پر اس نے قیاسی تعلیمات کی بنیاد ڈالی اور وہ ایک ایسا قانون بن گیا جس پر اس کے پیرو آنکھ بند کر کے چلتے رہے۔ (نقض المنطق ص ۱۱۳)

معقولات دُنیاوی علم ہے معقولات انسان کو خدا کی یاد سے غافل کرتا ہے۔ اُن کا اشتغال ضرر دینی سے خالی نہیں۔ کم از کم علوم شرعیہ سے تو ضرور محروم کر دیتے ہیں، نہ وہ آخرت میں کام آنے والے ہیں نہ دین کا دار و مدار ان پر ہے بلکہ وہ ان لغو اور لایعنی چیزوں میں سے ہے جن سے اجتناب مفید اور بہتر ہے اور جن کا اشتغال مہلک اور مضر ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں تحریر فرماتے ہیں!۔

"اے فرزند! جانتے ہو کہ دنیا کس کو کہتے ہیں؟ جو چیز بھی تم کو اللہ تعالیٰ سے باز رکھے وہ دنیا ہے، پس زن و فرزند، مال و جاہ و ریاست نیز لہو و لعب اور لایعنی اشیاء میں مشغولیت یہ سب چیزیں داخلِ دُنیا ہیں، جو علوم آخرت میں کام آنے والے نہیں وہ بھی دنیاوی ہی ہیں۔ اگر علوم نجوم و منطق و ہندسہ و حساب اور ان جیسے دیگر علوم عقلیہ کی تحصیل آخرت میں کارآمد ہوتی تو فلاسفہ اہل نجات ہوتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بندے سے اللہ تعالیٰ کی روگردانی کی علامت یہ ہے کہ بندہ لایعنی مشاغل میں مشغول ہو۔

ہر چہ جز عشق خدائے احسن است!
گر شکر خوردن بود جان کندن است

یعنی عشق الٰہی کے بغیر کوئی چیز اچھی نہیں یہاں تک کہ اگر اس کے بغیر شکر کھائی جائے تو وہ بھی مہلک ہے، اور یہ جو کہا گیا ہے کہ علم نجوم اوقات صلوٰۃ کی پہچان کیلئے درکار ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ علم نجوم کی تحصیل کے بغیر معرفت اوقات حاصل ہی نہیں ہو سکتی بلکہ اسکا مطلب یہ ہے کہ علم نجوم بھی معرفت کا ایک طریقہ ہے چنانچہ بہت سے لوگ ہیں جو علم نجوم سے واقف نہیں۔ لیکن اوقات صلوٰۃ کو عالمان نجوم سے بہتر جانتے ہیں۔ قریب قریب یہی بات علم منطق اور علم حساب وغیرہ علوم عقلیہ کی تحصیل کے بارے میں بھی ہے کہ وہ بعض علوم شرعیہ میں درکار ہیں اور بہت سے حیلوں کے بعد ان علوم عقلیہ میں مشغول رہنے کا جواز نکلتا ہے۔ بشرطیکہ ان کے پڑھنے سے سوائے معرفت احکام شرعیہ و تقویت ادلۂ کلامیہ کے اور کوئی مقصد نہ ہو۔ اور اگر کوئی دوسرا مقصد ہوگا تو ہرگز جائز نہیں، ذرا غور کرو کہ اگر کسی امر مباح کے اختیار کرنے سے امور واجبہ کا فوت ہونا لازم آتا ہو تو وہ امر مباح دائرۂ اباحت سے نکل جاتا ہے یا نہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان علوم عقلیہ میں مشغول رہنا علوم شرعیہ میں رہنے کو فوت کر دیتا ہے۔ (تجلیات ربانی ترجمہ مکتوبات مجدد الف ثانی جلد اول صلا۹)

فلسفہ اور علوم نبویہ کا تقابل درست نہیں

عجیب بات تو یہ ہے کہ یونانی الٰہیات کو انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علوم و حقائق کے سامنے لاتے ہیں اور ان سے مقابلہ کرنے لگتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ علوم نبویہ کے سامنے معقولات کی کیا حقیقت ہے اور کون سے کھیت کی مولی ہے جسے علوم نبویہ جیسے عظیم و رفیع و اعلیٰ علوم کے مقابلہ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ ان لوگوں کے بارے میں بڑے جوش و خروش سے لکھتے ہیں !۔

ایک پڑھا لکھا آدمی دریائے حیرت میں غرق ہو جاتا ہے جب دیکھتا ہے کہ کچھ لوگ یونان کی الٰہیات کا پیغمبروں کے علوم و تعلیمات سے مقابلہ کرنے لگتے ہیں۔ اس کی یہ بات ایسی ہی نظر آتی ہے جیسے لوہاروں کا فرشتوں سے یا گاؤں

کے زمینداروں کا دنیا کے بادشاہوں سے مقابلہ کرنے لگے بلکہ اس میں بھی کسی قدر علم و عدل کا شائبہ ہے لیکن جو لوگ فلاسفہ کا انبیاء سے مقابلہ کرتے ہیں وہ تو سخت ظلم کرتے ہیں کیونکہ گاؤں کا زمیندار بہرحال گاؤں کا منتظم ہے اس میں اسکو بادشاہ کے ساتھ کسی نوع کی مشابہت اور کسی جزء کی شرکت ہے لیکن فلاسفہ اور انبیاء کا حال تو یہ ہے کہ انبیاء جو کچھ لیکر آتے ہیں فلاسفہ کو اس کے مطلق خبر نہیں بلکہ وہ اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتے، واقعہ یہ ہے کہ کفار یہود و نصاریٰ بھی ان فلاسفہ کے مقابلہ میں امور الٰہیہ سے زیادہ باخبر ہیں۔

میری مراد اس سے وحی کا وہ علم خاص نہیں ہے جو صرف انبیاء کی خصوصیت ہے اور دوسروں کو نصیب نہیں ہے اس لئے کہ یہ علم تو خارج از بحث ہے بلکہ میری مراد ان علوم عقلیہ سے ہے جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی معرفت، توحید، اس کے اسماء وصفات کی معرفت، نبوت ورسالت، معاد اور ان کے اعمال سے ہے جو آخرت میں سعادت کا موجب ہیں اور جن میں اکثر کو انبیاء کرام علیہم السلام نے براہین عقلیہ سے بیان کیا ہے، ان الٰہی و دینی و شرعی تعلیمات کی فلاسفہ کو ہوا بھی نہیں لگی اور ان کے علوم میں ان کا کوئی پتہ ونشان ہی نہیں، باقی وہ علوم ومعارف اور حقائق غیبیہ جو انبیاء علیہم السلام کے خصائص میں سے ہیں ان کے ذکر کا تو اس میں کوئی موقع ہی نہیں اور فلسفہ اور علوم نبویہ کے مقابلہ میں وہ بحث ہی میں نہیں آتے۔ (الرّد علی المنطقیین ص۳۹۵)

سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ انبیائے کرام علیہم السلام اور حکماء کی تعلیم کے درمیان فرق بیان فرماتے ہیں!

"میں نے بار بار اس امر پر توجہ دلائی ہے کہ حکماء اور فلاسفہ صرف ظن اور تخمین کی اتباع کرتے ہیں، ان کے پاس اٹکل ہے تجربہ ہے۔ اندازہ ہے خرص ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ ظنون فاسدہ اور اوہام کاسدہ کا ڈھیر ہے اور دلائل باردہ کا ذخیرہ ہے۔ جس سے یہ دنیا کو گمراہ کرتے پھرتے ہیں۔ (دوسری تقریر سیرت ص۳۵)

لیکن انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے پاس مشاہدہ اور عین الیقین ہے ان کا قول حق ہے اور فلاسفہ کا قول ظن اور وہ ظن بھی وہم آلود، یوں سمجھئے کہ اندھوں، اور بہروں کا گروہ ہے جو آنکھ والوں اور کان والوں کا مقابلہ کرنے کی سعی ناکام کر رہا ہے اور تم جیسے احمق ان اندھوں اور بہروں کی تقلید کر رہے ہو۔

(پہلی تقریر سیرت صـ۵۹)

اس کے بعد انبیاء علیہم السلام اور حکماء کی تعلیمات کے مقابلہ کرنے والوں کی بُری طرح خبر لیتے ہیں، انھیں ڈانٹتے اور مخاطب کرکے نہایت سختی کے ساتھ فرماتے ہیں!

"ان احمق اور گدھوں کی آراء و اقوال پر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اقوال کو جانچا کرتے ہو۔ تم کو شرم نہیں آتی، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام جو اپنی رائے میں کوہ استقلال ہوتے ہیں ان کی رائے کو ان تھالی کے بیگنوں اور بندر کے بچوں کی رائے سے ٹکراتے ہو اور پھر اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔

(پہلی تقریر سیرت صـ۳۴)

علوم عقلیہ اور علوم نبویہ کے درمیان موازنہ کرنے والوں کو سحبان الہندؒ کے اس ارشاد سے عبرت لینی چاہئے۔

فلسفہ فسق سکھاتا ہے فلسفہ کے رواج سے لوگوں میں بے دینی پھیلتی جاتی ہے زندگی کے قیود اٹھتے جاتے ہیں اور عام طور پر فلاسفہ بھی علوم طبعیہ کی وجہ سے مادیت پرستی میں غرق ہو جاتے ہیں۔ ماضی کی تاریخ اس پر شاہد ہے، زنادقہ، باطنیہ اور اباحیہ فرقہ کے لوگ عموماً فلسفی ہوا کرتے تھے۔ ابن سینا جس کے خاندان کے لوگ باطنی تھے اس کا یہ حال تھا کہ راتوں کو گانے بجانے اور شراب پینے میں مشغول رہتا تھا۔ جب لوگوں نے اس سے کہا کہ شراب تو حرام ہے تو اس کا جواب اس نے دیا کہ شراب کی حرمت کا سبب یہ ہے کہ اس سے لوگوں کے درمیان عداوت پیدا ہوتی ہے اور میں سنبھل سنبھل کر اس کا استعمال کرتا ہوں، میرے لئے اس کی حرمت کی کوئی وجہ نہیں۔ یہی سبب تھا کہ فلاسفہ مسلمانوں میں نہایت بدنام تھے۔ چنانچہ مولانا محمد یونس فرنگی محلی مرحوم

لکھتے ہیں:

"جتنے فلاسفہ گذرے ہیں ان میں بہت کم ایسے ہیں جن پر فسق اعتقادی یا فسق عملی کا الزام نہ لگایا گیا ہو، ابن الہیثم اور خلفاء فاطمین کے عہد میں مصر کے تمام مسلمان فلاسفہ اسمٰعیلی باطنی تھے، شام کے فلاسفہ عموماً حران کے صابیوں کے مذہب کے قائل تھے۔ ایک بڑی تعداد حران کے صابیوں کی تھی، اصحاب اخوان الصفا سب کو معلوم ہے کہ باطنی تھے، غرض بہت کم فلسفی ایسے ہیں جو فسق اعتقادی یا فسق عملی میں گرفتار نہ پائے گئے ہوں بلکہ علامہ ابن تیمیہؒ نے تو یہاں تک لکھدیا ہے کہ مشرق کے فلاسفہ کی اصل درحقیقت حرّان کے صابی اور یونان کے بُت پرست تھے اس لئے عموماً مسلمان باطنی فلسفی بھی اپنی کتابوں میں عقل اوّل، نفس کل، نور وغیرہ مسائل کا تذکرہ کرتے ہیں جو صابیین کے مذہب کی پیداوار ہیں۔

(ابن رشد صـ ۲۵۶)

اپنے وقت کا مشہور فلسفی نصیر الدین طوسی متوفی ۶۷۲ھ جس نے فلسفہ اور کلام میں تجرید اور شرح اشارات لکھی ہے اور فلسفیوں میں محقق گردانا جاتا ہے اس کے فسق کا حال مندرجہ ذیل عبارت میں ملاحظہ فرمائیں۔ شذرات الذہب کا مصنفؒ اس کے بارے میں لکھتا ہے!

اُس نے اپنی کتابوں میں قدم عالم، انکارِ معاد اور انکار صفات باری کی تائید کی اور ملاحدہ کے لئے مدارس قائم کئے جس میں ملحدوں کے امام ابن سینا کی اشارات کو قرآن بنانا چاہا لیکن یہ اُس کے مقدور سے باہر تھا اس لئے اس نے کہا کہ اشارات خواص کا قرآن اور قرآن مجید عوام کا قرآن ہے۔ اس نے نماز میں بھی تبدیلی کرنی چاہی اور اس کو دو نماز بنانا چاہا۔ لیکن اس میں اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اخیر میں اس نے جادو کا علم سیکھا اس لئے وہ جادوگر تھا اور بتوں کی پرستش کرتا تھا۔ (شذرات الذہب جلد پنجم صـ ۳۳۹)

اندلس کا نامور فلسفی ابن رشد متوفی ۵۹۵ھ اپنے خاندان اور معاشرہ کا فسق اعتقادی بیان کرتا ہے جسے وحی والہام سے کم رتبہ نہیں قرار دیتا اور کہتا ہے!۔

"ہمارے آباء واجداد میں قدیم زمانہ سے بطور عقیدۂ مسلمہ کے یہ روایت مشہور چلی آرہی ہے کہ افلاک اوران کے نفوس دیوتا اورانسان کے معبود ہیں اور سارا کارخانۂ عالم ان دیوتاؤں کے قبضہ میں ہے۔ ان دیوتاؤں کی شکل وصورت انسان یا دیگر حیوانات کی شکل وصورت سے مشابہ ہے، اس روایت کا مفہوم دیگر اضافوں سے قطع نظر کرکے اگر اس قدر سمجھا جائے کہ اس میں مبادئ عالم اور افلاک کے معبود یا دیوتا ہونے کا اعتراف کیا گیا ہے تو اس میں شک نہیں کہ یہ خیال میرے نزدیک وحی والہام سے کم رتبہ نہیں اور جو طرز ادائے مطلب کیلئے اختیار کیا گیا ہے وہ بھی عدیم المثال ہے۔"

(مابعد الطبیعہ ص۲۵۴)

مسلم فلاسفہ نے علم نبوت کی قدر نہ کی

فلاسفۂ متاخرین جو اسلامی عہد میں پیدا ہوئے فلسفۂ یونان کے لکیر کے فقیر ہیں اور ارسطو کے مقلد محض ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے یہاں فاش غلطیاں اور سخت تناقض پایا جاتا ہے۔ افسوس کہ مسلمان فلاسفہ نے اس نعمت کی بالکل قدر نہ کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان تک پہونچی تھی اور اس ہدایت وروشنی سے کچھ فائدہ نہ اٹھایا جو ان کی دسترس میں تھی بلکہ اس پر مزید پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ چنانچہ حافظ ابن تیمیہؒ تحریر فرماتے ہیں۔

اِنَّ هٰؤلاء المُتَفَلسِفَةَ المتاخّرين فِي الْاِسْلَامِ مِنْ اَجْهَلِ الْخَلْقِ عِنْدَ اَهْلِ الْعِلْمِ وَالْاِيْمَانِ وفيهم مِنَ الضَّلَالِ وَالتناقُضِ مَالَا يَخْفىٰ عَلىٰ اذكياءِ الصِّبْيَانِ لِاَنَّهُمْ لَمَّا الْتَزَمُوْا اَنْ لَا يسلكوا اِلَّا سَبِيْلَ سَلَفِهِمُ الضَّالِّيْنَ وَاَنْ لَا يُقِرُّوْا اِلَّا بِمَا يُبَيِّنُوْنَهٗ عَلىٰ تِلْكَ الْقَوَانِيْنَ وَقَدْ جَاءَ هُمْ مِنَ النُّوْرِ وَالْهُدىٰ وَالْبَيَانِ مَامَلَأَ الْقُلُوْبَ وَالْاَلْسِنَةَ وَالْآذَانَ صَارُوْا بِمَنْزِلَةِ مَنْ يُرِيْدُ

یہ پچھلے دور کے مسلمان فلسفی اہل علم وایمان کے نزدیک جاہل ترین مخلوق ہیں، ان کی گمراہی اور تضاد بیانی ایسی کھلی ہوئی ہے کہ ذرا ہوشیار بچے بھی اس کو سمجھ سکتے ہیں، انھوں نے جب اس بات کو طے کرلیا کہ ان کو اپنے پیشروں اور پیشواؤں کے راستے پر چلنا ہے جو خود بھٹکے ہوئے تھے اور استدلال کی جو عمارت ان کے قوانین پر کھڑی ہوئی ہے اسی کو تسلیم کرنا ہے اور اس روشنی وہدایت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا ہے جس نے دلوں اور

اَنْ یُّطْفِیَٔ نُوْرَ الشَّمْسِ بِالنَّفْخِ فِی الْھَبَاءِ اَوْ یُغَطِّیَ ضَوْءَھَا بِالْعَبَاءِ
(الردُّ علی البکری ص۱۱۱)

کانوں کے پردے پھاڑ دیئے تو اب اُن کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص آفتاب کی روشنی کو پھونک مار کر بجھانا چاہے یا اپنے دامن کے نیچے چھپانا چاہے۔

مسلم فلاسفہ اسلام کے دشمن ہیں

مسلم فلاسفہ قرآنی آیتوں اور حدیثوں کو جھٹلاتے اور افلاک وکواکب کو قدیم مانتے ہیں۔ اس کے باوجود اپنے آپ کو مدّعی اسلام بتلاتے ہیں، حیرت ہے کہ خدا ورسول پر ایمان کا دم بھرتے ہیں لیکن جو کچھ انھوں نے فرمایا ہے اس کو ٹھکرانے سے دریغ نہیں کرتے، الغرض فلاسفہ اسلام سے اسلام کو بہت نقصان پہونچا، اس حقیقت کو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے سنئے حضرت مجددؒ تحریر فرماتے ہیں!

"اسی طرح متاخرین فلاسفہ جو اپنے کو اہل اسلام کے گروہ میں شامل کرتے ہیں وہ بھی اپنے فلسفیانہ اصول پر جمے ہوئے ہیں اور افلاک وکواکب اسی طرح اور دوسری چیزوں کے قدیم ہونے کے قائل ہیں اور ان کے فناد ہلاک نہ ہونے کے مدّعی ہیں، ان کی خوراک قرآنی تصریحات کی تکذیب اور ان کا رزق دین کے اصولی مسائل کا انکار ہے، وہ عجب طرح کے مومن ہیں کہ خدا ورسول پر ایمان لاتے ہیں لیکن خدا ورسول نے جو کچھ فرمایا ہے اس کو قبول نہیں کرتے اس سے بڑھکر حماقت نہیں ہو سکتی، کسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

فلسفہ چوں اکثرش باشد سفہ پس کلّ آں
ہم سفہ باشد کہ حکم کل حکم اکثر است

یعنی فلسفہ چونکہ اس کے لفظ کا بڑا حصّہ سفہ یعنی حماقت ہے اسلئے وہ کل کا کل حماقت ہے کیونکہ اصول یہ ہے کہ اکثر کا حکم کل کا حکم رکھتا ہے۔

(مکتوب ج ۲۳/۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی)

(باقی آئندہ)

قسط ۱

ایک مطالعہ ایک نظر

مولوی عبدالحمید نعمانی —— دارالعلوم دیوبند

آج کل تنقید کی ایک ہوا چل پڑی ہے جسے دیکھئے اُردو کی چند کتب و رسائل دیکھکر محقق دوراں اور نقاد اعظم بننے کا سنہرا خواب دیکھ رہا ہے ۔ دوسروں کی صحیح بات میں بھی کیڑے نکالنا اور تنقید کے نام پر تنقیص کا مظاہرہ کرنا گویا اس دور کا فیشن بن گیا ہے جہاتک اختلاف رائے کا اور بے لاگ اظہار خیال کا معاملہ ہے تو اس سے کوئی دور خالی نہیں رہا ہے اور اصلاح عام کیلئے یہ بے بھی ضروری۔ لیکن اس کی آڑ میں دوسروں کو طنز وطعن کا ہدف بنانا اور ان کی پگڑیاں اچھالنا کسی بھی اعتبار سے لائق تحسین قرار نہیں دیا جاسکتا ہے ۔ تنقید ہونی چاہئے لیکن دین و دیانت کی بنیاد پر۔ اختلاف رائے بھی ضروری ہے لیکن انصاف اور حق کے پیش نظر۔ جو تنقید اور اظہار خیال انسانی ذاتیات اور گروہی عصبیت کے پیش نظر ہوگا اس سے کسی خیر اور اصلاح کی توقع نہیں کی جاسکتی ۔

آج کل جو تنقیدی مضامین سامنے آرہے ہیں ان میں عام طور پر نہ دیانت نظر آتی ہے نہ شائستگی، نہ سلیقہ نظر آتا ہے نہ وقار، بلکہ ان کی ابتداء اور انتہا کچھ اس ڈھنگ ہوتی ہے کہ خلوص و دیانت اپنا منہ نوچکر رہ جاتے ہیں اور علم و تحقیق کو اپنی رسوائی پر نوحہ کرنا پڑتا ہے تنقید اگر تعریض اور نکتہ چینی ہی کو کہتے ہیں تو یہ بہت ہی آسان کام ہے ۔ اتنا آسان کہ اُسے پرائمری اسکول کے بچے بھی بحسن وخوبی انجام دے سکتے ہیں ۔ لیکن تنقید اگر فکر کی گہرائی کے ساتھ نقد و نظر کا نام ہے تو یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں. بلکہ اس کے لئے وسیع مطالعہ، وسعت نظر، ذہنی تنور اور عقل سلیم کی ضرورت پڑتی ہے

افسوس کہ عصر حاضر میں بہت سے ایسے افراد جن کا مبلغ علم چند کتابوں کے سرسری مطالعہ

سے زیادہ نہیں اس وادئ پُرخار میں چھلانگ لگانے سے نہیں چوک رہے ہیں۔ نتیجتاً امت کے اندر افتراق وانتشار دن بدن بڑھتا ہی جارہا ہے۔ انھیں لوگوں میں سے جناب تابش مہدی صاحب بھی ہیں۔ جنھوں نے "تبلیغی نصاب ایک مطالعہ" نامی ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں عالم کی مشہور ومعروف شخصیت حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی مقبول ترین کتاب "تبلیغی نصاب" کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے

راقم نے جب مذکورہ کتاب کے سرورق پر یہ جملہ مرقوم دیکھا "یہ حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی شہرہ آفاق کتاب تبلیغی نصاب پر ایک غیر جانب دارانہ تبصرہ" ہے تو مجھے یہ خیال ہوا کہ اس کتاب میں دیانت دارانہ تجزیہ عالمانہ محاسبہ کرکے تبلیغی نصاب کی خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہوگی۔ چنانچہ میں نے انتہائی شوق وذوق کے ساتھ کتاب کا مطالعہ شروع کیا۔ لیکن میں نے ابھی چند صفحات بھی نہیں پلٹے تھے کہ میرے حسن ظن کو شدید ٹھیس لگی۔

ع: اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مطالعہ کے دوران مجھے بخوبی اندازہ ہوگیا کہ مؤلف کتاب کے اندر تصنیفی شعور کا فقدان اور دینی معلومات کی زبردست کمی ہے۔ موصوف نے موضوع بحث کو اچھی طرح سمجھے بغیر محض تنقید نگار بننے کے شوق میں یہ کتاب لکھ ڈالی ہے۔ اگر وہ علمی ودینی کتابوں کے وسیع مطالعہ کے بعد اس وادی میں قدم رکھتے تو ان کے قلم سے اس طرح کی باتیں نہ نکلتیں اور وہ بہت سی ایسی غلطیوں سے بچ جاتے جنھیں پڑھکر منہ کا مزہ خراب ہونے لگتا ہے

کوئی بھی ذی فہم اور سلیم الطبع قاری "تبلیغی نصاب ایک مطالعہ" کے دیکھنے کے بعد سوائے تحیّر اور پراگندہ خیالی کے سوا کچھ بھی حاصل نہ کرسکے گا۔

موصوف نے تنقید کے جوش میں صحیح باتوں کو غلط رُخ پر موڑنے کی ناکام سعی کی ہے۔ اور اسے حق کی مظلومی کہئے۔ یا عصر حاضر کا تماشہ کہ فن حدیث اور علم حدیث سے اپنی عدم واقفیت کے برملا اعتراف کے باوجود جناب تابش مہدی نے صحیح روایات کو من گھڑت باتوں کے خراد پر چڑھاکر اپنی ڈھٹائی کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ کچھ تو سوچنا چاہئے کہ خدا بیزاری کے اس دور میں جبکہ سنّتِ رسول سے بے اعتنائی برتی جارہی ہے۔ اس کی حفاظت وصیانت کو عجمی سازش

کہا جارہا ہے۔ حفظ حدیث کو دماغی تفریح کے نام سے یاد کیا جارہا ہے[1]۔ محض نقاد بننے کے شوق میں صحیح حدیثوں پر ہاتھ صاف کرتے چلے جانا کونسا دانشمندانہ فعل اور دین وملت کی کونسی خیر خواہی ہے۔ الغرض کتاب میں بہت سی خامیاں اور خلاف تحقیق مواد ہونے کے باوجود راقم الحروف نے کتاب کو بوجہ کثرت مشاغل اور یہ سوچ کر نظر انداز کردیا کہ خود ہی سوجھ بوجھ رکھنے والے قارئین کتاب کی استدلالی کمزوریوں کو محسوس کریں گے۔ لیکن چونکہ سوجھ بوجھ عام نہیں، جبھی تو صدہا قارئین نے جناب تابش مہدی صاحب کی اس تنقیدی کوشش کو سراہا اور مفید مشوروں سے نوازا[2] راقم الحروف حب وطن عزیز پہونچا تو دیکھا کہ "ایک مطالعہ" بھولے بھالے صورتحال سے ناآشنا افراد کے دلوں میں غلط فہمی اور بدظنی کا بیج بوکر اس کی آبیاری کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ نیز ہمارے ایک مشفق کرم فرمانے کتاب کے چند اوراق کی طرف توجہ دلائی۔ اور موصوف کے انداز گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ غیر معمولی طور پر زیر بحث کتاب سے متأثر ہوگئے ہیں۔ اِدھر جناب تابش مہدی کا بھی اصرار ہے کہ میں کتاب میں موجود خامیوں کی نشاندہی کروں۔ اس لئے اپنی علمی کم مائیگی اور بے بضاعتی کے باوجود محض حمایت حق کے جذبے کے تحت "ایک مطالعہ" کی کمزوریوں پر قلم اٹھا رہا ہوں۔ ورنہ مجھے کسی سے داتی پرخاش نہیں ہے۔ پہلے میں ان چند امور پر روشنی ڈالوں گا۔ جن کی جانب ہمارے کرم فرمانے توجہ مبذول کرائی ہے۔ پھر اگر باری تعالیٰ کی نصرت شامل حال رہی۔ اور وقت نے یاوری اور زندگی نے وفا کی تو دیگر فروگذاشتوں کا جائزہ بھی لوں گا انشاء اللہ۔

قارئین باتمکین اگر ہماری معروضات میں کوئی خامی یا سقم نظر آئے تو برائے مہربانی اس کی نشاندہی فرما کر ہمیں شکریہ کا موقعہ دیں۔ اس سے ہمیں بے حد خوشی ہوگی۔ اور ہم آپ کی بات کو سینے سے لگا کر بلاتأمل اپنی غلطی سے رجوع کرلیں گے۔

شرائط تنقید

اصل مباحث کو ہاتھ لگانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ۔ مولانا مودودی مرحوم اور مولانا یوسف جنت صاحب سابق امیر جماعت بیان کردہ شرائط تنقید کو سپرد قرطاس کردیا جائے۔ تاکہ آپ کو اچھی طرح اندازہ ہوجائے کہ تابش صاحب

---

[1] مقام حدیث اور رسالہ طلوع اسلام، کراچی۔ [2] ایک مطالعہ ص۲ تیسرا ایڈیشن

نے کہاں تک ان اصول وشرائط کا پاس و لحاظ رکھا ہے۔ مولانا مودودی مرحوم رقمطراز ہیں۔ کہ تنقید کیلئے چار شرطیں ہیں۔ (۱) یہ کہ آدمی اس شخص کے نظریات کو اچھی طرح جانتا ہو جس کے کلام پر وہ تنقید کر رہا ہے۔ اس لئے صرف وہی کتاب یا مضمون اس کے مدِ نظر نہ ہو جس پر وہ بحث کر رہا ہے بلکہ مجموعی طور پر بھی اس کے کلام پر اس کی نگاہ ہو۔ ۲ یہ کہ تنقید میں ذاتی محبت ومخاصمت کو دخل نہ ہو ۳ یہ کہ تنقید مہذب اور معقول طریقہ پر کی جائے۔ ۴ یہ کہ تنقید کرنے والا بھی اور اُسے پڑھنے والا بھی کسی شخص کی رائے کی تغلیط کو اس شخص کی کلی تغلیط نہ بنا دے [۱]

جناب مولانا محمد یوسف صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

کہ ہر شخص کو خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم جماعت کے کسی فرد پر یا پوری جماعت پر تنقید کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن تنقید کے حق میں یہ چیز داخل نہیں ہے کہ جھوٹ، بہتان، افتراء، سوء ظنی، لعن طعن، تحقیر وتذلیل وغیرہ سے کام لیا جائے لوگوں کی عیب جوئی کی جائے۔ اور برے نام رکھے جائیں اور اس بات کی تحقیق نہ کیجائے کہ واقعتاً اس شخص کا عقیدہ کیا ہے۔ جس کے متعلق تنابز بالالقاب سے کام لیا جارہا ہو۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تنابز بالالقاب کی صریح ممانعت فرمائی ہے [۲]

اس تمہید کے بعد آپ اپنے ذہن کا رشتہ اصل موضوع سے جوڑیں۔

ایک اور مغالطہ انگیز روایت

یہ جناب تابش مہدی صاحب کی نظر انتخاب کا دوسرا مرکزی عنوان ہے۔ اس عنوان کے تحت موصوف نے "ایک مطالعہ" کے صفحہ ۴۱، ۴۲، ۴۳ پر تبلیغی نصاب ج اوّل سے دو واقعے نقل کرکے حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ پر تصنیفی بے شعوری، تضاد بیانی، مسخ تاریخ، اور صحابہ کرام کی عظمت کو غبار آلود کرنے کے بھیانک اور بے بنیاد الزامات عائد کئے ہیں۔ موصوف کے طلسم فریب اور مغالطہ آفرینیوں کا پردہ چاک کرنے سے پہلے۔ آپ دونوں واقعے ملاحظہ فرمائیں۔ دونوں واقعے یہ ہیں، حضرت حنظلہؓ کہتے ہیں۔ کہ ایک مرتبہ ہم لوگ حضورؐ کی مجلس میں تھے حضورؐ نے وعظ فرمایا۔ جس سے قلوب نرم ہوگئے۔ اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور اپنی

---

[۱] مکاتیب مودودی ص۱۲۲، ج اوّل، ماہنامہ تجلی سالنامہ ۱۹۷۵ء [۲] یا لیت قومی یعلمون ص۹۰

حقیقت ہمیں ظاہر ہو گئی، اور حضورؐ کی مجلس سے اٹھ کر میں گھر آیا۔ بیوی بچے پاس آگئے اور دنیا کا ذکر و تذکرہ شروع ہو گیا۔ اور بچوں کے ساتھ ہنسنا، بولنا، اور بیوی کے ساتھ مذاق شروع ہو گیا[1]

واقعہ دوم غزوہ احد میں حضرت حنظلہؓ اوّل سے شریک نہیں تھے۔ ان کی نئی شادی ہوئی تھی۔ بیوی سے ہمبستر ہوئے اس کے بعد غسل کی تیاری کر رہے تھے کہ ایک دم مسلمانوں کی شکست کی آواز کانوں میں پڑی جس کی تاب نہ لا سکے۔ اسی حالت میں تلوار ہاتھ میں لی، اور لڑائی کی طرف بڑھے چلے گئے۔ اور کفار پر حملہ کیا، اور برابر بڑھتے چلے گئے۔ اسی حالت میں شہید ہو گئے۔"

ان دونوں نقل کردہ واقعے کو نظر میں رکھ کر آپ جناب تابش مہدی کے خامہ عنبر شمامہ کی گہر افشانی ملاحظہ فرمائیں۔ فرماتے ہیں: "پہلی روایت میں تو اسی شخص کو بچوں سے ہنستے، بولتے اور مذاق کرتے دکھایا گیا ہے۔ اور دوسری روایت میں بتایا گیا ہے کہ مباشرۃ کا غسل کئے بغیر شہید ہو گئے۔ راقم الحروف کی رائے میں۔ حضرت لکھنے کے عادی تھے ان کی کونسی بات کیا رخ اختیار کر رہی ہے۔ یا اس کے نتائج برآمد ہوں گے۔ اس کا بالکل پاس و لحاظ نہیں رکھ پاتے تھے۔"

پھر قارئین کو انصاف کی دہائی دیتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

قارئین ہی انصاف فرمائیں کہ کیا اس تضاد بیانی سے تاریخ کا چہرہ مسخ نہیں ہوتا؟

اور کیا اس قسم کی مغالطہ انگیز اور مبہم روایتوں سے صحابہ کرام کی عظمت غبار آلود نہیں ہوتی[2]

قارئین اگر آپ تعمق نظری سے خط کشیدہ الفاظ کو پڑھیں گے تو احساس ہو گا کہ جناب تابش کے اس زہریلے ریمارک کی زد صرف تبلیغی نصاب ہی پر نہیں پڑ رہی ہے بلکہ حضرت شیخ کی دیگر تصانیف بھی اس لپیٹ میں آجاتی ہیں۔ گویا کہ تنقید نگار صاحب اپنے قارئین کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی کوئی کتاب قابل اعتبار نہیں ہے

---

[1] تبلیغی نصاب ص۵۷ ج اوّل۔ ایک مطالعہ ص۱۴۱-۱۴۲ تیسرا ایڈیشن، [2] ایک مطالعہ ص۱۴۲

کیونکہ ان کو اتنا بھی شعور نہیں تھا کہ ہماری بات کیا رخ اختیار کر رہی ہے۔ لیکن میں نے جہاں تک غور کیا۔ حضرت شیخ تو بڑے متقیظ اور باخبر نظر آرہے ہیں۔ برخلاف جناب تابش کے خود ہی عدم تدبر قلت مطالعہ اور بے خبری کے شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حضرت شیخ کی تضاد بیانی، بے خبری، اور مسخ تاریخ پر کوئی دلیل بھی پیش کرنے سے مجبور ہیں۔ اُن کی بیدار مغزی کو ہم اس وقت تسلیم کر لیتے، جبکہ وہ نقل کردہ واقعہ اور صاحب واقعہ کو ایک ثابت کر دیتے۔ گرچہ موصوف نے "اسی شخص کے" جملہ سے اپنے قارئین کو دونوں واقعہ کو ایک باور کرانے کی کوشش کی ہے۔) اور بتا دیتے کہ یہ دونوں واقعے کتب حدیث و سیرت میں سے کسی معتبر کتاب میں نہیں ہیں۔ ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ دونوں واقعات الگ الگ اور بالکل صحیح ہونے کی وجہ سے حضرت شیخ الحدیث رح کی تحریر میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اس کو ہم انشاء اللہ عنقریب دلائل و براہین سے ثابت کریں گے۔ اور اگر بالفرض ہم اس بات کو مان بھی لیں کہ دونوں نقل کردہ واقعے دو نہیں۔ بلکہ ایک ہیں تو مؤلف "ایک مطالعہ" کی اس بھونڈی تنقید کی زد حضرت شیخ رح سے پہلے ان ارباب فضل و کمال پر پڑتی ہے۔ جو آسمان علم حدیث کے نیر تاباں۔ اور فلک سیرت و تاریخ کے نجوم درخشاں ہیں کہ انھوں نے پہلے عظمت صحابہ کو غبار آلود کرنے والی باتوں کو جگہ دی اور حضرت شیخ الحدیث جیسے بعد کے مصنفین کیلیے غلط مواد..... فراہم کیا۔ چنانچہ حضرت نے پہلا واقعہ بحوالہ مسلم شریف اور احیاء العلوم نقل فرمایا ہے۔ حدیث پاک کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

عن حنظلة بن الربیع الاسیدی قال لقینی ابوبکر فقال کیف انت یا حنظلة قلت نافق حنظلة قال سبحان اللّٰہ ما تقول قلت نکون عند رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یذکرنا بالنار والجنة کأنا رأی عین فاذا خرجنا من عند رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عافسنا الازواج والاولاد والضیعات نسینا کثیرا قال ابوبکر فواللّٰہ إنا لنلقیٰ مثل ھذا فانطلقت انا وابوبکر حتیٰ دخلنا علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقلت نافق حنظلة یارسول اللّٰہ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وما ذاک قلت یا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نکون عندک..........

تذکرنا بالنار والجنة کانا رای عین فاذا خرجنا من عندك عافسنا الاولاد والازواج والضیعات نسینا کثیراً فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ لو تدومون علی ماتکونون عندی وفی الذکر لصافحتکم الملائکة علی فرشکم وفی طرقکم ولکن یاحنظلة ساعة ساعة ثلاث مرات۔

(ترجمہ تبلیغی نصاب سے نقل کیا جاچکا ہے) مسلم شریف، اس حوالے پر راقم الحروف، مزید اضافہ کرتا .. یہ روایت ترمذی شریف کتاب الزہد ص ۷۴ ج دوم جمع الفوائد ص ۲۲۷ ج ۲ درر فرائد ص ۵۹ حصہ چہارم۔ معارف الحدیث ص ۵۵ ج ۲ ترجمان السنۃ ص ۳۱۸ ج ۲ اسوۂ صحابہ ص ۱۷۷-۱۷۸ ج ۱ اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ص ۵۶ ج ۲ نیز مشکوٰۃ شریف اور احیاء العلوم میں بھی ہے۔

اس روایت کے خط کشیدہ الفاظ ذہن نشین رکھیں۔ جس پر تابش صاحب نے اپنے الزام کے شیش محل کی تعمیر کی ہے۔

حضرت حنظلہؓ کا دوسرا واقعہ شیخ الحدیثؒ نے قرۃ العیون سے نقل کیا ہے۔ جو شیخ ابو اللیث سمرقندی متوفی ۳۷۳ھ کی تصنیف ہے۔ پھر ندوی عرض کرتا ہے کہ یہ واقعہ اور بھی بہت سی کتابوں میں مذکور ہے۔ مثلاً تہذیب الاسماء واللغات از امام نوویؒ ص ۱۷۰-۱۷۱ ج ۱۔ الکمال فی اسماء الرجال ص ۲۹ از علامہ خطیب تبریزیؒ۔ مقدمہ ہدایہ اولین ص ۶ از مولانا عبد الحئی لکھنویؒ۔ تجرید اسماء الصحابہ از شمس الدین ذہبیؒ ص ۱۵۲ ج ۱۔ اصابہ فی تمیز الصحابہ از حافظ ابن حجر عسقلانیؒ ص ۳۶۰ ج ۱ مرقاۃ ص ۳۲۰ ج ۱ از ملا علی قاریؒ۔ التعلیق الصبیح ص ۲۱۶ ج ۱ از مولانا ادریس صاحب کاندھلویؒ حاشیہ مشکوٰۃ ص ۱۷۴ ج ۱ ان تمام کتابوں میں یہ مندرجہ ذیل واقعہ نقل کیا گیا ہے۔ جس سے صاحب "ایک مطالعہ" کو غلط فہمی ہوئی ہے ملاحظہ ہو،

عن عروۃ ان رسول اللہؐ قال لامرأة حنظلةؓ ما کان شانہ قالت جنباً و

غسلت احدی شقیه فلما سمع لهيعة خرج فقتل .... فقال رسول اللہ رأیت الملئکة یغسلہ۔ اب دیکھیں ان ماہرین فن اور بحر تاریخ وسیرت کے شناوروں کے بارے میں محترم تابش کی عدالت عالیہ سے کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ ہم منتظر ہیں کہ کب موصوف ان بلند پایہ محدثین ومؤرخین کو تضاد بیانی اور مسخ تاریخ کا مرتکب قرار دیکر مجرموں

کے کٹہرے میں کھڑا کر کے جرأت مندی کا ثبوت دیتے ہیں۔

اس جگہ پہونچ کر جناب تابش سے ایک سوال کرنے کو جی چاہتا ہے۔ امید ہے کہ وہ اس پر سنجیدگی سے غور فرمائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ کیا آپ اس جگہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے کلام میں حسن تاویل سے کام نہیں لے سکتے تھے۔ کہ ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ میں حنظلہؓ نام کے اشخاص متعدد ہوں۔ اس احتمال کے ہوتے ہوتے بے تاج مجتہد بن کر اپنی اجتہادانہ رائے کو ان الفاظ میں بیان کرنا کہ "راقم الحروف کی رائے میں حضرت شیخ صاحب لکھنے کے عادی تھے۔ ان کی کون سی بات کیا رُخ اختیار کر رہی ہے یا اس سے کیا نتائج برآمد ہوں گے اس کا بالکل پاس و لحاظ نہیں رکھ پاتے تھے" دیانت وانصاف کی کون سی قسم ہے؟

حنظلہ نام کے متعدد صحابہ کرامؓ کے ہونے کا صرف امکان ہی نہیں بلکہ میری ناقص معلومات کے مطابق ۱۵-۱۶ حضرات صحابہ کرامؓ کے اسماء مبارکہ کتب اسماء رجال وسیر کے درخشندہ اوراق میں بکھرے ہوئے ہیں۔ دو حنظلہ نامی اصحابؓ کے شہید ہونے کا ذکر تو جنگ احد کے موقع پر بھی ملتا ہے[1]

(۱) حنظلہ ابن ابی حنظلہ انصاری امام مسجد قبا۔ (۲) حنظلہ ثقفی (۳) حنظلہ بن خدیم بن حنیفہ مالکی یہ بنو حنیفہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی کنیت ابو عبید ہے۔

(۴) حنظلہ بن الربیع الاسیدی (بالتشدید) (۵) حنظلہ بن ابی عامر الراہب بن صیفی بن نعمان (۶) حنظلہ عبشمی (۷) حنظلہ بن علی (۸) حنظلہ بن عمرو الاسلمی (۹) حنظلہ بن قسامہ بن قیس ابن عبد بن طریف الطائیؓ (۱۰) حنظلہ بن قیس الانصاری زرقی (یہ عہد رسالت میں پیدا ہوئے تھے۔ (۱۱) حنظلہ بن قیس الانصاری العقری (۱۲) حنظلہ بن نعمان (۱۳) حنظلہ بن نعمان بن عامر بن عجلان بن عمرو بن عامر بن زریق (۱۴) حنظلہ ابن ہوذہ بن خالد بن ربیعہ (۱۵) حنظلہ، ان کے بارے میں کوئی تصریح نہیں ملی کہ یہ کس قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے) ان مذکورہ ناموں کے علاوہ ابن اثیرؒ نے ایک

---

[1] ملاحظہ ہو تجرید اسماء الصحابہ ص ۱۵۲، ۱۵۳ ج ۱۔

اور ایک حنظلہ بن قیس کا تذکرہ کیا ہے۔ ان مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں آپ نے جناب تابش صاحب کی غلطی کا اندازہ لگا لیا ہوگا۔ ان امور کا ذکر میں نے اس وجہ سے کیا تاکہ محترم تابش یا اُن کے ہم نوا جب کسی دینی مسئلہ پر خصوصاً جس کا تعلق علم حدیث سے ہو جب خامہ فرسائی کی زحمت کریں تو ان امور کا لحاظ کریں۔ کیونکہ حدیث کے رواۃ میں بہت سے اشخاص ایک ہی نام کے ہوتے ہیں۔ جن کی معرفت کنیت یا اضافت سے ہوسکتی ہے۔ مثلاً عبداللہ نام کے متعدد صحابہؓ ہیں۔ ان کے درمیان فرق کرنے کیلئے کہا جائے گا۔ عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن مسعود وغیرہ وغیرہ

اس کی تحقیق کئے بغیر کسی نام پر بحث کرنا کھلی کوتاہی کا باعث ہوگا۔ صاحب ایک مطالعہ کی قلمی جابکدستی اور حقیقت سے پردہ اٹھانے کے لئے ہماری پیش کردہ مذکورہ بالا تفاصیل ہی ایک ذی فہم قاری کیلئے کافی ہوں گی۔ لیکن چونکہ میں نے مسئلے کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ تاکہ بحث کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہ جائے۔ اور قارئین اور جناب تابش صاحب یہ نہ کہنے لگیں کہ تم حنظلہ نامی اصحاب کی ایک طویل فہرست پیش کردی۔ جس سے ہمیں معلوم ہو گیا کہ حنظلہ نام کے متعدد صحابہ کرام ہیں۔

بقیہ آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

مسائل حاضرہ

مطلقہ عورت کیلئے تادم حیات یا تا نکاحِ ثانی شوہر پر نفقہ لازم کرنا کیسا ہے؟

حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری مدظلہ العالی

سوال:۔ مطلقہ عورت کا نفقہ شوہر پر کب تک لازم ہے؟ سرکاری قانون یہ ہے کہ عورت جب تک دوسرا نکاح نہ کرے یا اس کا انتقال نہ ہو جائے شوہر کو اس کا نفقہ دینا پڑے گا۔ اگر شوہر نفقہ نہ ادا کرے تو مستحق سزا ہوتا ہے۔ کیا اس قانون کو شرعاً صحیح کہا جا سکتا ہے؟ اور اس قانون پر عمل کرتے ہوئے عورتوں کو یہ نفقہ لینا جائز ہے؟

بینوا توجروا۔

الجواب:۔ نکاح میاں بیوی کے درمیان ایک عظیم معاہدہ ہے جس کے پورا کرنے کی ذمہ داری دونوں نے اپنے اوپر لازم کی ہے۔

شوہر کی طرف سے بیوی کو مہر دینے، نان ونفقہ ادا کرنے، حسن معاشرت اور میل ومحبت کے ساتھ زندگی گذارنے کا اقرار ہے۔ اور بیوی کی طرف سے عفت وپاکدامنی، اطاعت وفرماں برداری کا عہد وپیمان ہے۔ اگر مرد بدعہدی کرے اور اپنی ذمہ داری پوری نہ کرے تو عورت کو طلاق لینے اور نکاح فسخ کرا کر علیحدہ ہوجانے کا حق ہے۔ اسی طرح اگر بیوی ناشزہ، نافرمان، بے وفا اور بدچلن بنجائے اور نکاح کا مقصد فوت ہوجائے اور ایک دوسرے کے حقوق کی پائمالی ہونے لگے تو ایسے حالات میں اس پریشانی سے نجات حاصل کرنے کیلئے بہتر یہی ہے کہ طلاق

دے کہ ایسی عورت سے علیحدگی اختیار کرے

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دھلوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:۔

ثم لا بدّ من الارشاد الی المرأة التی یکون نکاحها موافقاً للحکمة وفرا علیه مقاصد تدبیر المنزل لانّ الصحبة بین الزوجین لازمة والحاجات من الجانبین متاکدة فلو کان لها جبلة سوء وفی خلقها وعادتها فظاظة وفی لسانها بذاء ضاقت علیه الارض بما رحبت وانقلبت علیه المصلحة مفسدة۔

یعنی:۔ نکاح کیلئے ایسی عورت کا ہونا ضروری ہے جس سے نکاح کرنا حکمت کے موافق ہو اور خانہ داری کی تمام مصلحتیں وہ پورے طور پر انجام دے سکے کیونکہ میاں بیوی میں صحبت لازمی شے ہے اور دونوں جانب سے حاجتیں ضروری ہیں پس اگر عورت بدطینت ہے اور اس کی عادت میں سختی ہے اور وہ زبان دراز ہے تو اس شخص پر زمین باوجود اپنی فراخی کے تنگ ہوجائے گی اور وہ مصلحت فساد کی طرف منقلب ہوجائے گی (حجۃ اللہ البالغہ مع ترجمہ ص ۳۵۹ ج ۲ ص ۳۶۰)

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں۔ ومع ذٰلک لا یمکن سدّ هذا الباب والتضییق فیه فانه قد یصیر الزوجان متناشزین امّا السوء خلقهما او لطموح عین احدهما الی حسن انسانٍ آخر فیکون ادامة هذا النظم مع ذٰلک بلاءً عظیماً وحرجاً .... الخ

یعنی:۔ لیکن اس کے باوجود طلاق کا باب بالکل بند کرنا اور اس میں تنگی کرنا بھی ممکن نہیں کیونکہ کبھی خاوند اور بیوی میں مخالفت (اور نفرت) پیدا ہوجاتی ہے جو یا تو ان دونوں کی بدخلقی سے یا ان دونوں میں سے کسی ایک کا اجنبی سے تعلق پیدا ہونے یا اسی قسم کے دیگر اسباب کی وجہ سے پیدا ہوجاتی ہے ان حالات میں اس جوڑے کا باقی رکھنا بلائے عظیم اور حرج ہے (اور علیحدگی ہی اختیار کرنے میں بہتری ہوتی ہے۔) (حجۃ اللہ البالغہ مع ترجمہ ص ۲۹۸ ج ۲)

ایک دوسرے بزرگ شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :-

زنِ بد در سرائے مرد نکو ! ✽ ہم دریں عالم است دوزخِ او

زینہار از قرین بد زینہار ✽ وقنا ربنا عذاب النار

یعنی :- بدخلق اور بداطوار عورت نیک مرد کے گھر میں ہو تو (اس مرد کیلئے) اسی دنیا میں دوزخ ہے۔ خدا پاک قرینِ بد سے محفوظ رکھے اور عذابِ دوزخ سے بچائے (گلستان، باب دوم)

جو عضو پیدائش سے بدن کا جزو ہو کبھی بدن سے الگ نہ ہوتا ہو جیسے آنکھ، دانت، کان، ناک، ہاتھ پیر وغیرہ اگر وہ سڑ جائے اور انسان اس کی وجہ سے بے چین اور بے قرار ہو جائے اور اس کے اصلاح کی امید نہ رہے تو آپریشن کر کے اس عضو کو بدن سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح نافرمان اور بے وفا عورت کہ جس نے اپنے معاہدے کے خلاف کر کے شوہر اور پورے گھر والوں کو رسوا اور ان کی نیند حرام کر رکھی ہو اور ہر ایک کیلئے دردِ سر بنی ہوئی ہو اس کو طلاق دیکر کیوں علیحدگی اختیار نہ کی جائے؟ اور سکون حاصل نہ کیا جائے؟

معاہدہ کی خلاف ورزی معمولی بات نہیں ہے حکومت کے تعلقات منقطع ہو کر جنگ کے خطرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ملازم اگر آقا سے بے وفائی اور خلاف معاہدہ کرے تو اسے ملازمت سے برطرف کر دیا جاتا ہے اور جب تک اسے دوسری جگہ ملازمت نہ ملے اس کو تنخواہ ملنے کا قانون نہیں ہے تو مطلقہ عورت کیلئے نکاحِ ثانی کرنے تک نفقہ ملنے کا قانون کس بنا پر ہے؟ حکومت کا معزز عہدیدار اگر بغاوت اور بدعہدی کرے تو اس کو عہدے سے برخواست کر کے سزا دیجاتی ہے دوسری ملازمت ملنے تک حکومت اسے تنخواہ نہیں دیتی تو وہ عورت جو شوہر کی نافرمانی اور بدعہدی کر کے اس کے سکون کو ختم کر دے اس کے لئے نکاحِ ثانی تک شوہر کے ذمہ نفقہ لازم کرنا کہاں کا انصاف ہے؟

شرعی اصطلاح میں "نفقہ" سے مراد خوراک، پوشاک اور رہنے کا

گھر ہے، شوہر پر عورت کے نفقہ کے وجوب کا سبب ازدواجی تعلق کا قیام ہے۔ لہذا نکاح کے بعد شوہر پر بیوی کا نفقہ لازم ہوجاتا ہے اور جب تک یہ ازدواجی تعلق قائم رہے گا شوہر پر اس کا نفقہ لازم رہے گا اور جب یہ تعلق ختم ہوجائے گا توسبب کے فوت ہونے کی وجہ سے نفقہ کا لزوم بھی نہ رہے گا۔ جس طرح نوکری اور سرکاری ملازمت کے قائم ہونے کی وجہ سے تنخواہ کی ادائیگی لازم ہوجاتی ہے اور ملازم کی بدعہدی ونافرنی کے سبب ملازمت کا تعلق ختم ہوجانے پر تنخواہ کی ادائیگی موقوف ہوجاتی ہے، اس کے بعد وہ ملازم تاحیات یا دوسری ملازمت ملنے تک تنخواہ کا مستحق نہیں ہوتا۔ ملازم کیا کرے گا؟ کہاں سے کھائے گا؟ جوے باز اور چوربن کر معاشرہ کو تباہ وبرباد کرے گا ان باتوں کی طرف کسی کا خیال نہیں جاتا، توجس عورت کو اس بدزبانی، بدخلقی، بے وفائی اور نشوز (نافرمانی) کی وجہ سے نکاح سے الگ کردیا گیا ہو یہ خیال کرکے کہ وہ کہاں سے کھائے گی، کہاں جائے گی؟ بدچلن بن جائے گی، شوہر پر اس کی زندگی تک یا نکاحِ ثانی کرنے تک اس کا نفقہ لازم کردینا کہاں کی عقلمندی ہے؟

بلکہ اگر اس پر بنظرِ انصاف غور کیا جائے تو اس قانون کی وجہ سے عورتوں میں آزادی، شوہروں کی نافرمانی، امورِ خانہ داری میں تغافل وتساہل اور گھریلو زندگی میں فتنہ وفساد پیدا ہوگا۔

مطلقہ عورت کیلئے شرعی حکم یہ ہے:۔ اگر اس کی مہر ادا نہ کی گئی ہو تو مہر ادا کی جائے۔ حیض آتا ہو تو تین حیض تک، حیض نہ آتا ہو تو تین ماہ تک، حاملہ ہو تو وضعِ حمل تک نان ونفقہ دیا جائے۔ اور اگر خلوت سے پہلے طلاق دیدی گئی اور مہر مقرر ہوتی ہو تو نصف مہر اور اگر مقرر نہ ہوتی ہو تو کپڑے کا ایک جوڑا دیا جائے اس کے علاوہ نکاحِ ثانی کرنے یا اس کے انتقال ہونے تک شوہر پر اس کا نفقہ لازم کرنا قرآنی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے اور حدود اللہ سے تجاوز کرنا ہے اور شوہر پر ظلم وزیادتی ہے۔

عدت کے بعد اس کے گزران کی کیا صورت ہوگی؟ اس کا حل یہ ہے کہ وہ عورت

دوسرا نکاح کرلے۔ نکاح ثانی اسلام میں معیوب نہیں بلکہ فضیلت کی چیز ہے، قرآن کریم میں ہے وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ اور نکاح کردو رانڈوں کا اپنے اندر، مفسر قرآن علامہ شبیر احمد عثمانی رح فرماتے ہیں:۔

"اس آیت میں یہ حکم دیا کہ جن کا نکاح نہیں ہوا یا ہو کر بیوہ اور رنڈوے (مطلقہ) ہو گئے تو مناسب موقع ملنے پر ان کا نکاح کر دیا کرو۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے علی! تین کاموں میں دیر نہ کر، نماز فرض کا جب وقت آجائے، جنازہ جب موجود ہو، اور رانڈ عورت جب اس کا کفو مل جائے" جو تو میں رانڈوں کے نکاح پر ناک بھوں چڑھاتی ہیں۔ سمجھ لیں ان کا ایمان سلامت نہیں۔
(فوائد عثمانی سورۂ نور پارہ ۱۸)

حضرت غوث اعظم شاہ عبد القادر جیلانی رح نے اپنی مشہور کتاب غنیۃ الطالبین میں عورتوں کے متعلق حدیثیں نقل فرمائی ہیں۔ مسکینۃ مسکینۃ امرأۃ لیس لہا زوج قیل یا رسول اللہ وان کانت غنیۃ من المال۔ یعنی مسکینہ ہے مسکینہ ہے وہ عورت جس کا شوہر نہ ہو پوچھا گیا کہ اگر وہ مالدار ہو تب بھی مسکینہ ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں تب بھی وہ مسکینہ ہے (غنیۃ الطالبین ص ۹۶)

دوسری حدیث: لیس شیئ خیراً للمرأۃ من زوج او قبر۔ یعنی نہیں ہے کوئی چیز بہتر عورت کے لئے آغوش شوہر یا قبر کے گوشہ سے (غنیۃ الطالبین ص ۹۶)

اگر کسی مجبوری کی وجہ سے اس کا نکاح نہ ہو سکے تو پھر اگر عورت صاحب حیثیت ہو تو اپنے مال سے اپنا گذران چلائے ورنہ اس کے اعزا و اقرباء پر اس کا نفقہ لازم ہوگا۔ (اگر شوہر اس کے اعزا میں سے ہے تو رشتے دار ہونے کی نسبت سے اس پر بھی اس کا خیال رکھنا ضروری ہوگا) اگر اس کے اعزا و اقرباء نہیں ہیں یا وہ خود محتاج ہیں تو اس کی برادری والے (جماعت والے) اس کے نفقہ کا بندوبست کریں۔ ورنہ عام مسلمانوں پر اس کی مدد کرنا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دلوں میں خصوصاً عورتوں کے قلوب میں شریعت

اورشرعی قانون کی کما حقہ عظمت عطا فرما وے اوراس کی خلاف ورزی کرنے سے محفوظ رکھے۔ آمین

فانی دنیا کے تھوڑے سے مفاد کی خاطر شرعی قانون کے مقابلہ میں دنیوی قانون پر عمل کرنا اور ایسے ناجائز نفقہ کا مطالبہ کرنا اپنے ایمان کو خطرہ میں ڈالنا ہے، تفسیر بیضاوی میں ہے۔ وانما عُدّ منہ لبس الغیار وشدّ الزنّار ونحوھما کفرا لانّھا تدلّ علی التکذیب لا لانّھا کفر فی انفسھا۔ یعنی غیار پہننا اور زنّار (جنوئی) باندھنا اور ان کے مانند چیزوں کا اختیار کرنا کفر ہے اس لئے کہ یہ چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب پر دلالت کرتی ہیں۔ کیونکہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا نبی جانے گا۔ وہ ان چیزوں پر جرأت نہیں کر سکتا ورنہ یہ چیزیں اپنی ذات کے اعتبار سے موجب کفر نہیں ہیں۔

(تفسیر بیضاوی ص۲۳ سورۂ بقرہ) فقط

واللہ اعلم بالصواب

فہرست کتب مکتبہ دار العلوم دیوبند شعبہ نشر واشاعت

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
فتاویٰ دار العلوم جلد ۱	۲۴/-	مقامات حریری	۲۵/-	اسرائیل	۴/-
" " " ۲	۱۷/-	دیوان المتنبی	۱۱/-	قرآنی پیشین گوئی	۳/۷۵
" " " ۳	۲۵/-	تاریخ دار العلوم جلد ۱	۴۰/-	انتصار الاسلام	۹/-
" " " ۴	۳۱/-	" " " ۲	۴۰/-	مصابیح التراویح	۶/۵۰
" " " ۵	۳۰/-	" " انگریزی ۱	۱۲۵/-	تفسیر معوذتین	۳/-
" " " ۶	۳۶/-	" " " ۲	۱۷۵/-	اسلامی عقائد اور سائنس	۲/-
" " " ۷	۳۳/-	سوانح قاسمی جلد اول	۴۰/-	مودودی مذہب	۲/۵۰
" " " ۸	۲۸/-	" " " دوم	۳۸/-	نظریہ ردقرآنی پر ایک نظر	۴/-
" " " ۹	۳۱/-	" " سوم	۱۲/-	مکتوبات ثلثہ	۳/۵۰
" " " ۱۰	۲۲/-	ملفوظات جلد اول	۱۹/-	دو ضروری مسئلے	۱/-
" " " ۱۱	۱۱/-	" " دوم	۳۱/-	جماعت اسلامی کا دینی رخ ۱	۳/۵۰
مقدمہ ابن الصلاح	۱۱/-	قبلہ نما	۳۸/-	" " ۲	۲/۵۰
الغیۃ الحدیث	۱۲/-	دینی دعوت کے قرآنی اصول	۶/۵۰	" " ۳	۲/۵۰
مشکوٰۃ الآثار	۱۱/-	ناقابل فراموش واقعات	۲۶/-	" " ۴	۴/-
الفتحیہ	۱۰/-	المنار الانوار	۷/-	اجتماع گنگوہ	۱/-
نفحۃ الادب	۶/-	مثنوی فروغ	۴/۵۰	درمنثور اول	۱/-
تفسیر مدارک التنزیل	۸/-	براہین قاسمیہ	۱۰/-	" دوم	۱/-
الاشباہ والنظائر	۳۷/-	حکمت قاسمیہ	۵/-	اعفاء اللحیہ	۱/-
عقیدۃ الطحاوی	۱۱/-	مدارج سلوک	۱۶/-	ایمان وعمل	۳/-
حسامی	۲۴/-	جائزہ تراجم قرآنی	۱۱/-	دار العلوم دیوبند کا ایک فتویٰ اور اسکی حقیقت	۱۰/۵۰
ملا حسن	۱۲/-	قرآن محکم	۵/-	ماثورہ دعائیں	۱/۵۰
		حجۃ الاسلام	۱۰/-	دستور عقائد	۲/۵۰
				مکتوبات	۲/۵۰

جلد نمبر ۶۸	بابتہ ماہ اگست ۱۹۸۵ء مطابق ذیقعدہ ۱۴۰۵ھ	شمارہ نمبر ۵

نگران

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند

مدیر

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

قیمت فی پرچہ ۲/۵۰ ‡ سالانہ ۲۵/۰۰

سالانہ بدل اشتراک بیرونی ممالک سے	سعودی عرب، کویت، ابوظہبی ایرمیل -/۱۱۵ جنوبی مشرقی افریقہ، برطانیہ -/۱۲۵ امریکہ، کناڈا وغیرہ بذریعہ ایرمیل -/۱۴۵ - پاکستان بذریعہ ایرمیل ۵ بنگلہ دیش -/۲۹

محبوب پریس دیوبند، سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زرِ تعاون ادا ختم ہوگیا ہے۔

فہرست

رسالہ دارالعلوم ماہ اگست ۱۹۸۵ء

بنگلہ دیشی خریداروں سے ضروری گذارش

بنگلہ دیشی خریدار اپنا چندہ مبلغ 25/= روپے ہندوستانی شیخ مولانا سراج الحق صاحب پرنسپل دارالعلوم مولوی بازار ضلع بنگلہ دیش کو بھیج دیں اور انہیں لکھیں کہ اس چندہ کو رسالہ دارالعلوم کے حساب میں جمع کرلیں۔

خریداران حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں۔ خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔ اور رسید منی آرڈر رسالہ دارالعلوم کو روانہ کر دیں۔

والسلام

مدیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف آغاز

از:- مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

ایک سیکولر اسٹیٹ اور لادینی مملکت میں دین، مذہب، تہذیب اور ثقافت کی حفاظت اور ترویج و اشاعت کی تمام تر ذمہ داری مذہب کے پیروکاروں اور ماننے والوں پر ہوتی ہے۔ حکومت کا فریضہ بس اتنا ہوتا ہے کہ وہاں کی بسنے والی اقوام میں سے کسی کے مذہب و شریعت میں حکومت نہ خود مداخلت کرے اور نہ ہی کسی دوسرے فرد یا جماعت کو مذہبی معاملات اور شرعی امور میں دخل اندازی کی اجازت دے۔

ہمارا ملک ہندوستان بھی دستوری اعتبار سے ایک لادینی اور جمہوری ملک ہے۔ اس لئے یہاں اسلامی معاشرہ اور دینی عبادات و رسوم کے تحفظ و بقاء کا دار و مدار خود یہاں کے بسنے والے مسلمانوں کے اپنے طرز عمل اور رویّے پر ہے اگر مسلمانوں کو اپنے مذہبی اعمال اور ملّی شعائر سے دلچسپی اور لگاؤ ہوگا تو کسی طاقت کی مجال نہیں کہ وہ ان کے شرعی اور دینی امور میں ذرہ برابر بھی تغیر و تبدل کرے لیکن خدانخواستہ اگر مسلمان ہی دین سے بیگانہ ہو جائیں، اسلامی احکام و فرائض چھوڑ بیٹھیں اور اپنے مذہبی تشخص و امتیاز کو خود اپنے ہاتھوں مٹا ڈالیں تو بجز خدا کے یہاں ان کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہوگا۔

آج اسلامی تہذیب و ثقافت خود مسلمانوں کے ہاتھوں جس شکست و ریخت سے دوچار ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ کسی مسلم آبادی میں گھوم پھر کر دیکھ لیں آپ کو اس آبادی میں ایک گھر بھی ایسا نہ ملے گا جس میں رہنے والے تمام کے تمام افراد دیندار اور اسلامی طرز زندگی کے پابند ہوں۔ اسکے

برعکس ایسے گھر کثرت سے مل جائیں گے جن کے صد فی صد افراد غیر اسلامی زندگی کے عادی اور خوگر ہوں گے۔

آج عمومی طور پر مسلمان فرائض دین، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ داڑھی جو اسلامی شعار اور آقائے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب سنت ہے اسے عیب کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ خرید و فروخت اور لین دین کے معاملات سے شرعی احکام کو بالکل خارج کر دیا گیا ہے۔ نکاح و شادی میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کو پس پشت ڈال کر غیروں کی تباہ کن رسموں کو حرزِ جان بنا لیا گیا ہے۔ طلاق جسے شریعت نے ابغض المباحات قرار دیا تھا اور انتہائی مجبوری اور ضرورت کے وقت اس کے استعمال کی اجازت دی تھی لیکن اسے ایک کھیل اور تماشا بنا لیا گیا ہے۔ آخر کہاں تک اور کن کن امور کو شمار کرایا جائے یہ غم ناک فہرست بڑی طویل ہے۔

درحقیقت اسلامی ہدایات اور دینی اعمال و اخلاق سے ہماری اسی غفلت اور بے پرواہی نے مخالفین اسلام کو یہ حوصلہ دیا ہے کہ وہ ہمارے خالص شرعی معاملات میں مداخلت کریں۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری سنت اور اسلام کی علامت پر پابندی لگانے کا غیر منصفانہ فیصلہ دیں۔ اور پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر کتاب مقدس "قرآن مجید" کی تعلیم اور اس کے نشر و اشاعت پر قانونی بندش لگانے کیلئے عدالتوں کو اکسائیں۔ کیا ملت اسلامیہ کیلئے یہ باتیں ایک کھلا چیلنج نہیں ہیں؟ آخر ہماری ایمانی حرارت کس سرد خانے میں سو گئی ہے کہ دن کی روشنی میں کھلے عام ہمارے قانون، ہمارے شعار اور ہماری مقدس کتاب پر حملے کئے جا رہے ہیں مگر ہماری بے حسی اور سرد مہری بدستور قائم ہے اور ہم اپنی زندگیوں میں تبدیلی لانے کیلئے بالکل آمادہ نہیں ہیں۔ مسلم عمائدین بالخصوص علمائے دین کیلئے مسلم معاشرہ کی یہ زبوں حالی ایک لمحۂ فکریہ ہے اگر آگے بڑھ کر آزاد روی اور مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کے اس سیلاب کو روکا نہیں گیا تو پانی سر سے اونچا ہو جائے گا اور پھر ساری کوششیں بیکار ثابت ہوں گی۔

انگریزوں کے ملک پر تسلط کے وقت بھی مسلم معاشرہ کو انھیں جیسے حالات سے گذرنا پڑا تھا اس وقت ہمارے اسلاف اور بزرگوں نے سینہ سپر ہو کر ان حالات کا مقابلہ کیا اور اس دور کے لادینی سیلاب کے آگے اسلامی درسگاہوں کا مضبوط بندھ قائم کر کے اس بڑھتے ہوئے طوفان کے

رخ کو موڑ کر ملت اسلامیہ کے سفینہ کو بحفاظت ساحل پر لگا دیا تھا۔ بحمد اللہ آج بھی اسلامی درسگاہوں کی کمی نہیں بلکہ پہلے کے مقابلہ میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہم آج بھی ان اسلامی قلعوں سے اپنی مدافعت و حفاظت کا کام لے سکتے ہیں۔ بس ذراسی بیداری کی ضرورت ہے اگر ان اسلامی قلعوں کے سپاہی معاشرے کی اصلاح کیلئے اٹھ کھڑے ہوں تو انشاء اللہ کایا پھر سے پلٹ سکتی ہے۔ کیونکہ اس عام بے راہ روی اور غفلت شعاری کے باوجود قوم مسلم میں دینی حمیت و غیرت کی دبی چنگاری ابھی سرد نہیں ہوئی ہے، خواب غفلت میں مدہوش ان شیروں کے اندر ابھی روح حیات باقی ہے۔ بس ضرورت ہے اک صدائے رحیل کی۔ ضرورت ہے انھیں اپنے اسلاف کے آئینۂ حیات دکھانے کی، اور یہ کام جس خوش اسلوبی سے ہمارے مدارس انجام دے سکتے ہیں کوئی دوسرا نہیں دے سکتا۔ اگر ارباب مدارس اپنے قرب وجوار کی صرف دس دس بستیوں کو دینی اصلاحی جدوجہد کا محور بنالیں اور ایک مہم بنا کر گھر گھر پہنچ کر مسلمانوں کو حکمت و موعظت کے ساتھ ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلائیں، اسلامی احکامات و ہدایات کے فوائد ان کے ذہن نشیں کریں تو یقین ہے کہ مسلمان غیر اسلامی تہذیب کی حیات سوز دھوپ سے نکل کر دینی اعمال و اخلاق کے زندگی بخش سائے میں آجائیں گے پھر نہ کسی خاتون پر ظلم ہوگا اور نہ وہ اسلام کے گہوارے کو چھوڑ کر لادینی عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹائے گی کہ اسلام مخالف عناصر کو دین میں مداخلت کا موقع ہاتھ لگے۔

ملت کے ساتھ رابطہ استوار کرلے
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار کرلے

(علامہ اقبالؒ)

مسلمانانِ ہند سے صاف صاف باتیں

از — مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

اس وقت ساری دنیا کے مسلمانوں کے عمومی حالات نے اس بات کی شدید ضرورت پیدا کردی ہے کہ ان سے بغیر کسی رو رعایت اور بغیر کسی اشارہ کنایہ کے کچھ صاف صاف باتیں کی جائیں، یہی ان کے ساتھ سب سے بڑا خلوص اور سب سے بڑی ہمدردی ہے اور اسی میں اپنی اور تمام مسلمانوں کی حفاظت اور سلامتی کا راز مضمر ہے، یہ فریضہ ہر جگہ اور ہر زبان میں ادا ہونا چاہیئے

ہندوستانی مسلمانوں سے

لیکن خصوصی ذمہ داری اور تعلق کی بنا پر اس وقت روئے سخن ہندوستانی مسلمانوں کی طرف ہے جن کے تازہ حالات نے ان کو ایک طرف اپنے حالات کا دیانت دارانہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ لینے پر مجبور کردیا ہے، دوسری طرف ان میں حقائق و واقعات پر غور کرنے کی نئی صلاحیت اور استعداد پیدا ہوگئی ہے، مزید برآں خاص سیاسی خارجی حالات نے ان کی صورت حال کچھ ایسی بنادی ہے کہ ان کے لئے دین کی کھلی راہ اختیار کرنے اور نصرت الٰہی کے سایہ کے نیچے آنے کے سوا کوئی راہ نہیں ہے۔

سچی حب الوطنی

ایک ذی ہوش، صاحب ضمیر، غیور اور جری قوم کی طرح ہمیں اپنے گردوپیش کے حالات کا پورا جائزہ لینا چاہیئے، اس سلسلہ میں جو غلطی ملک کی جمہوری اور نامذہبی حکومت کی طرف سے اور جو کوتاہی قومی اور ملکی اداروں سے ہو رہی ہے، ایک ہندوستانی کی حیثیت سے پوری طاقت اور صفائی کے ساتھ اس پر تنبیہ کرنے کی ضرورت ہے، اور اس سلسلہ میں کسی بدگمانی یا ریشہ دوانی سے نہیں ڈرنا چاہئے

کہ یہی سچی حب الوطنی ہے، جمہوریتیں اسی طرح پنپتی اور پھلتی پھولتی ہیں، اور ملکوں کی سلامتی اور خوش حالی کا راز اسی میں مضمر ہے

دیانتدارانہ وجرأتمندانہ جائزہ

ہمارا اللہ سے عہد ہے کہ اس سلسلہ میں ہم کسی موقعہ پرستی یا مصلحت شناسی سے کام نہیں لیں گے اور خواہ ہماری آواز کیسی ہی صدا بصحرا ثابت ہو ہم یہ آواز بلند کرتے رہیں گے۔

اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی کے لئے اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبر کے ارشادات کافی ہیں، یہاں کسی تفصیل کا موقعہ نہیں، چند باتیں جو قرآن مجید کے محدود مطالعہ کے نتیجہ میں نظر میں آئیں لکھی جاتی ہیں

حالات کی تبدیلی اور حقیقی حفاظت اور نصرت کے لئے ان کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے

شرک و توحید کا فرق اور ان کے نتائج وعواقب

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی ایسی قوم جو خدا کے پیغمبر پر ایمان لاچکی ہو اور اس کو آسمانی کتاب دی جاچکی ہو، مشرکانہ اعمال میں مبتلا ہو جائے تو وہ خدا کی رحمت وقدرت سے دور اور ذلت و بے عزتی کا شکار ہو جاتی ہے۔ سورۂ اعراف میں بنی اسرائیل کا ذکر کرتے ہوئے صاف فرمایا گیا ہے :-

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ٥

(الاعراف ۱۵۲)

جن لوگوں نے گوسالہ پرستی کی ہے ان پر بہت جلد ان کے رب کی طرف سے غضب اور ذلت اسی دنیوی زندگی ہی میں پڑے گی، ہم افترا پردازیوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔

دوسری طرف توحید کامل پر صاف صاف عزت و سربلندی، دین کے غلبہ و استحکام اور امن و حفاظت کا وعدہ فرمایا گیا ہے:

چنانچہ نزول قرآن مجید کے بعد جن لوگوں (صحابہ کرامؓ) نے سب سے پہلے اور سب سے مکمل طریقہ پر اس شرط کو پورا کیا ان کے متعلق غیر مبہم الفاظ میں اس کی شہادت دی گئی اور تاریخ نے ادب سے سر جھکا کر اس کی تصدیق کی۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ٥

(الانفال - ۲۶)

اور اس حالت کو یاد کرو جب کہ تم قلیل تھے زمین میں کمزور شمار کئے جاتے تھے۔ اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ لوگ تم کو نوچ کھسوٹ نہ لیں سو اللہ نے تم کو رہنے کی جگہ دی اور تم کو اپنی نصرت سے قوت دی اور تم کو نفیس نفیس چیزیں عطا کیں تاکہ تم شکر کرو۔

۱۔ بعض مشرکانہ عقائد و اعمال

یہ حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ، ناخوشگوار اور بہت سے لوگوں کے لئے نامانوس ہو مگر حقیقت ہے کہ ہم مسلمانوں میں کچھ مشرکانہ عقائد و اعمال پائے جاتے ہیں اور شرک جلی کے وجود کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، اس کے اعتراف کے لئے تھوڑی سی قرآن فہمی اور کسی قدر اخلاقی جرأت کی ضرورت ہے، اگر شرک کی کوئی حقیقت ہے اور وہ "عنقا" کی طرح کوئی خیالی و فرضی پرندہ نہیں، اور اگر قوموں اور ملّتوں کے لئے ایک ہی میزانِ عدل اور ایک ہی پیمانۂ انصاف ہے تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سے مسلمان (خواہ ماحول سے متاثر ہو کر خواہ علم اور صحیح تبلیغ کی کمی کی وجہ سے) اس ذہنی گمراہی اور عملی بے راہ روی میں مبتلا ہو گئے ہیں، جس کو قرآن میں صاف صاف شرک کہا گیا ہے، اگر کسی کو اس میں شبہ ہو یا وہ کسی خیالی دنیا میں رہتا ہو تو کسی "مرجع خلائق" مزار پر جا کر اور کسی عُرس میں شریک ہو کر دیکھ لے یا ان عقائد و خیالات کے سننے کی کوشش کرے جو بہ کثرت عوام اور کہیں کہیں خواص نے اولیاء کرام، بزرگانِ دین اور اپنے سلسلہ کے مشائخ کے متعلق قائم کر رکھے ہیں کہ "صفت خلق" (پیدا کرنے کی طاقت) "ایجاد عالم" (عالم کو عدم سے وجود میں لانے کی قدرت) اور مشکل سے ایک دو صفتوں کے علاوہ صفات و افعالِ الٰہی میں سے کون سی صفت اور کون سا فعل و تصرف ہے جو انھوں نے ان بزرگوں سے منسوب نہیں کر رکھا ہے، اور سجدہ سے لیکر دعا و استعانت تک کون سا معاملہ ہے جو خدا کے ساتھ ہونا چاہئے انھوں نے ان ہستیوں کے ساتھ روا نہیں رکھا ہے؟ قرآن مجید ہاتھ میں لیکر کسی بڑی بستی یا خوش اعتقادی کے کسی غالی مرکز میں چلے جایئے اور اس کا امتحان کر لیجئے۔

ایسی حالت میں خالص قرآن کی روشنی میں حفاظت اور نصرت و تائید الٰہی کی کیا امید کی جاسکتی ہے اور رہنمایانِ قوم کی خارجی تدبیریں کیا کارگر ہوسکتی ہیں جب کہ امن و حفاظت تک کے لئے اس کی شرط کی گئی ہے کہ

یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا ط (النور - ۵۵)

بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں۔

اس سلسلہ میں علماء، واعظین و واقفین حال کا جو فرض ہے وہ محتاج بیان نہیں، اور اس فرض کے "فرض کفایہ" کے درجہ میں باقی نہ رہنے سے جس عمومی بازپرس اور مواخذہ کا خطرہ ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔

۲- اخلاق و اعمال کا فساد اور اسکے بُرے نتائج

دنیا میں جس طرح اللہ کا قانون طبعی جاری و ساری ہے ہزاروں برس سے آگ جلاتی ہے، پانی بجھاتا ہے، سنکھیا کام تمام کرتی ہے، تریاق زہر کے اثر کو دور کرتا ہے، دوائیں، غذائیں، قوت، تعداد اسلحہ، محنت، تنظیم اور زندگی گذارنے اور کامیابی حاصل کرنے کے آزمودہ اور معروف طریقے بحکم الٰہی اپنا اثر رکھتے ہیں، اسی طرح اس کائنات میں ایک اخلاقی قانونِ مکافات بھی ہے، اچھے بُرے اخلاق و اعمال، افراد اور قوموں کی زندگی میں اپنا اثر اور خاصیتیں رکھتے ہیں۔ قرآن مجید میں اقوام سابقہ کے تذکرہ میں ان کی تاثیر اور ان کے نتائج کا واضح طریقہ پر ذکر کیا گیا ہے۔ اور ان افراد اور اقوام کا انجام بتایا گیا ہے جنھوں نے ان اخلاق و اعمال کا مظاہرہ کیا، قوم ہودؑ، قوم صالحؑ، قوم لوطؑ اور قوم شعیبؑ کا حال دیکھ لینا کافی ہے، جن کے خاص امراض و احوال و اخلاق (کیرکٹر) کی نشاندہی کی گئی ہے اور ان کے ان اعمال و اخلاق کا انجام بتایا گیا ہے، حدیث شریف میں خاص خاص اخلاق و اعمال کا انجام اور دنیا وی زندگی میں ان کے اثرات اور خاصیتوں کا صاف الفاظ میں تذکرہ ہے، کسی پر بے برکتی، کسی پر امراض و پریشانیوں کی کثرت، کسی پر کثرتِ اموات، کسی پر ذلت و خواری، اور کسی پر بزدلی و مرعوبیت کا اعلان کیا گیا ہے، اس "طبِ نبوی" کا مطالعہ اس دور میں خاص طور پر بہت ضروری اور مفید ہے، اسی طرح امر بالمعروف و

نہی عن المنکر کے فریضہ کے ترک پر اطلاع دی گئی ہے کہ دُعائیں تک مقبول نہ ہوں گی۔ صحیح روایت میں آتا ہے۔

عن حذیفۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قال: والذی نفسی بیدہ لتأمرنّ بالمعروف ولتنھونّ عن المنکر، أو لیوشکنّ اللہ أن یبعث علیکم عقابا منہ ثم تدعونہ فلا یستجاب لکم۔ (رواہ الترمذی)

حضرت حذیفہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تم نیکی کا حکم دیتے رہو اور بُرائی سے روکتے رہو ورنہ اس کا خطرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف سے عذاب بھیج دے، پھر تم اُسے پکارو تو تمہاری دُعا قبول نہ کی جائے۔

فساد عقیدہ، فساد اعمال و اخلاق کے علاوہ مسلمانوں میں ایک بڑی تعداد نفاقِ عملی و اخلاقی میں اور خواص و قائدین کی ایک تعداد نفاق اعتقادی تک میں مبتلا ہے، ایک بڑی تعداد فرائض کی تارک حتیٰ کہ اسلام کے رکن اعظم نماز سے غافل اور مستقل و علانیہ تارک صلوٰۃ ہے، ضرورت ہے کہ تمام سیاسی و اجتماعی تدبیروں کے ساتھ (اور حقیقتاً ان سے پیشتر اور ان سے زیادہ) اصلاحِ اعمال و اخلاق اور فرائض و ارکانِ دین کی پابندی کی دعوت دی جائے اور جزاء الاعمال کے الٰہی قانون کی روشنی میں خصوصیت کے ساتھ ان اخلاقی امراض و عملی فسادات سے ملّت کو ڈرایا جائے جو بڑے مہیب اجتماعی و عمومی نتائج رکھتے ہیں، اور جن کے لئے قرآن و حدیث میں نص صریح موجود ہے اور بد قسمتی سے بہت سے مسلمان اس میں مبتلا ہیں۔

۳۔ شہرت و عزّت کا حد سے بڑھا ہوا شوق اور رسم و رواج کی شریعت کی طرح اور اکثر اس سے زیادہ پابندی!

ایک اہم چیز جو عالم غیب میں بھی بڑا اثر رکھتی ہے اور ملی و اجتماعی زندگی میں بھی اس کے اثرات بڑے وسیع اور دُور رس ہیں، وہ مسلمانوں کا اپنے ذاتی معاملات پر اور اپنی دلچسپی کے دائرہ میں اسراف و فضول خرچی، شہرت و عزّت کے حصول یا

رسم و رواج کی پابندی میں بے دریغ روپیہ صرف کرنا اور اپنے پڑوسیوں، عزیزوں اور ملت کے دوسرے افراد کے فقر و فاقہ، اضطرار و اضطراب اور ان افسوسناک حالات سے چشم پوشی اور بے حسی ہے، جن میں کم سے کم انقلاب کے بعد مسلمان اس ملک میں مبتلا ہو گئے ہیں، فقہ و فتاویٰ کی محتاط و محدود زبان اور حلال و حرام کے معین حدود و احکام میں خواہ اس کے لئے حرمت کا کوئی صریح فتویٰ اور لرزہ خیز لفظ نہ ملے، اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ صورتِ حال اللہ تعالیٰ کی حکیم و عادل ذات اور ربوبیت و رحمتِ عامّہ کی صفات کے لئے غضب اور سخت ناپسندیدگی کا باعث ہے کہ ایک ایسے ماحول و زمانہ میں جہاں ایک کثیر تعداد نانِ شبینہ کی محتاج ہو، جاں بلب مریض دوا، اور برہنہ تن شریف مرد اور عورتیں ستر پوشی سے محروم ہوں، کہیں کسی بیوہ کے چولھے پر توا اور کہیں کسی غریب کے جھونپڑے میں دیا نہ ہو، ایک ایک دعوت، اور ایک ایک تقریب میں سیکڑوں اور ہزاروں روپئے بے دریغ خرچ کئے جائیں

اس سلسلہ کی سب سے قابلِ ملامت و نفرت اور غضب الٰہی بلکہ عذابِ الٰہی کو دعوت دینے والی چیز لڑکی والوں سے زیادہ سے زیادہ جہیز کا مطالبہ اور فرمائشوں کی وہ فہرست ہے جو لڑکے یا لڑکے والوں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے، اور اس کو رشتہ کی شرط قرار دیا جاتا ہے، کہیں اس کو "تلک" کی رسم، کہیں "سلامی" اور کہیں "گھوڑے جوڑے" سے تعبیر کیا جاتا ہے، لڑکی کو اپنی حیثیت کے مطابق جہیز دینا خلاف شرع و سنت نہیں، بلکہ وہ درحقیقت اپنی اولاد کے ساتھ حسن سلوک و صلہ رحمی ہے، جو فی نفسہٖ امر مباح بلکہ مستحسن ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنی جگر گوشہ حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کو جہیز میں روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں دیں جس میں ایک خمیل (جھالردار چادر) ایک مشک، ایک تکیہ دیا تھا، جس میں گھانس بھری تھی[1] بعض روایات میں آتا ہے کہ ان کے دینے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس جن سے شادی ہو رہی تھی روزمرہ کے استعمال کا سامان بھی نہ تھا، اس سے ان کے اسباب خانہ داری کی فراہمی کی بھی نیت تھی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ہر طبقہ اور حیثیت کے مسلمانوں نے اپنی بیٹیوں کو ضرورت کا سامان

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۳/ ۳۴۶- بروایت بیہقی بعض روایات میں ہے کہ ایک پلنگ اور بستر دیا اور بعض میں ہے کہ آپ نے ایک چادر دو چکیاں اور ایک مشک بھی دی (سیرت النبی حصہ دوم، علامہ شبلی نعمانی رح)

دیا اور یہ اب بھی جائز و مستحسن ہے، لیکن اب اس کی شکل بالکل بدل گئی ہے، اب نہ ہدیہ مقصود رہا ہے، نہ صلہ رحمی بلکہ ناموری، شہرت کی طلب اور پابندئ رسم رہ گئی ہے، اور اس میں بہت سی ایسی پابندیاں شامل ہو گئی ہیں، جن کی کوئی شرعی اساس نہیں، اس رسم کو پورا کرنے کے لئے لڑکی والے کو اکثر اوقات قرض بھی لینا پڑتا ہے۔ خواہ سود ہی دینا پڑے، یا حویلی، باغ، اور ضروری املاک فروخت کرنی پڑیں، ہندوستان سے باہر ممالک اسلامیہ میں اس کی یہ اہمیت اور اس کا یہ اہتمام نہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہندوستانی معاشرہ کی دین ہے۔ یہ چیز جو اکثریتی فرقے اور ہندو سماج سے مسلمانوں میں پچھلے دنوں میں آئی ہے، اس حد کو پہونچ گئی ہے کہ اس نے شادی کو ایک مصیبت اور دشوار ترین کام بنا دیا ہے، اور اس کی وجہ سے ایسے افسوسناک واقعات پیش آئے اور آرہے ہیں، جن سے اس غیرتِ خداوندی کے حرکت میں آجانے کا خطرہ ہے جس کی بناء پر سلطنتوں، معاشروں، اور تہذیبوں کے چراغ گل اور ملک زیر و زبر کر دیئے گئے ہیں۔

مسلمانوں کا جو حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت ہیں فرض تھا کہ ان کی موجودگی میں غیر مسلم معاشرہ میں بھی یہ ظلم عظیم نہ ہوتا، جس کی پاداش میں ملک پر قہر الٰہی کے نزول کا اندیشہ ہے، اور وہ اپنے کو اس نبیؐ کا وارث و نائب ثابت کرتے جس کے لئے ارشاد خداوندی ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ط (سورۃ الانفال ۳۳)

اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر اس وقت تک عذاب نازل کرنے والا نہیں ہے، جب تک آپؐ ان میں موجود ہیں۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ملکی معاشرہ میں یہ بیماری کس حد تک پہونچ گئی ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے مشہور اخبار "قومی آواز" مورخہ ۱۰ ر جون ۱۹۸۲ء کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:۔

"نئی دہلی ۹ ر جون مہیلا سرکشا سمیتی کے صدر ممبر پارلیمنٹ مسز پرمیلا ڈنڈوتے نے کل ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ملک کی راجدھانی نئی دہلی میں اب جہیز کے لئے ہر بارہ گھنٹے پر ایک دلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے، جبکہ اس سے قبل ایک دن میں اس طرح کی

ایک موت واقع ہوتی تھی، اس سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ جہیز کے خاتمہ کے لئے اعلان تو بہت ہوتے ہیں، اور اقدام بھی کئے جاتے ہیں لیکن یہ سب کاغذی معلوم ہوتے ہیں کہ ان سے صورتِ حال میں بظاہر کوئی سدھار نہیں آیا ہے، بلکہ وہ دن بدن ابتر ہوتی جارہی ہے، جہیز کا سودا جیسے پہلے ہوتا تھا اب بھی دھڑلے سے ہورہا ہے اور لڑکی والے جہیز کا بندوبست کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس کے باوجود ان کی لاڈلی اولاد کو جلاکر بھسم کردیا جاتا ہے۔"

لیکن افسوس ہے کہ خود مسلم معاشرہ میں یہ مرض داخل ہوگیا ہے، اور مسلمان اس کو دینداری، بلکہ انسانیت وشرافت کے بھی خلاف نہیں سمجھتے اور فہرست میں سے کسی ایک چیز کی تکمیل نہ ہونے پر مہینوں اور بعض اوقات برسوں منکوحہ بیوی یا بہو کو اپنے گھر آنے کی اجازت نہیں دیتے۔

ضرورت ہے کہ اس کے خلاف ایک طوفانی مہم چلائی جائے اور مسلمانوں کے دینی شعور اور جذبے کو بیدار کیا جائے اور اس رسم کا بالکلیہ استیصال اور قلع قمع ہوجائے، ورنہ اس کے نتیجہ میں کسی بلائے آسمانی، یا آفتِ ناگہانی کے ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ باقی اس کے جو معاشرتی خاندانی، اخلاقی نتائج بد ظاہر ہورہے ہیں، وہ کسی کی نظر سے مخفی نہیں

(باقی آئندہ شمارہ میں)

مرقومات حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ
بنام حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ

حضرت مولانا مفتی نسیم احمد صاحب فریدی

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے آٹھ مکتوبات رسالہ دارالعلوم دیوبند کے صفحات پر محفوظ کرنے کے لئے مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی کے سپرد کر رہا ہوں یہ گراں قدر مکتوبات مجھے حافظ ارشد میاں سلمہٗ، نبیرہ حضرت شیخ الادبؒ سے حاصل ہوئے ہیں، یہ سب مکاتیب حضرت شیخ الادبؒ کے نام ہیں، ان کو حضرت شیخ الادبؒ نے اپنی بیاض پر نقل کر لیا تھا، اس نقل کی نقل مولانا محمد یوسف امروہی سلمہٗ ربہٗ نے کی ہے، ان جواہر پاروں کے متعلق چند ضروری باتیں لکھنا ضروری ہیں۔

(۱) ان خطوط پر بیاض میں کوئی تاریخ پڑی ہوئی نہیں ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ ان میں کا ہر مکتوب کس سال اور کس ماہ میں آیا؟ مگر قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مکتوبات ۱۳۲۲ھ سے ۱۳۲۷-۲۸ھ تک کے ہیں۔

۲- یہ مکاتیب اس وقت کے ہیں جب حضرت شیخ الادبؒ پورینی ضلع بھاگلپور کے مدرسہ نعمانیہ میں مدرس ہو کر گئے تھے،

۳- حضرت شیخ الادبؒ مدرسہ نعمانیہ پورینی ضلع بھاگلپور میں فراغت کے بعد تشریف لے گئے تھے۔ فراغت کا سال ۱۳۲۲ھ ہے جیسا کہ سند فراغ سے معلوم ہوتا ہے۔ مجھے سند فراغ اور اس سند کا عکس جو ۱۳۲۵ھ کے جلسۂ دستار بندی کے بعد حضرت شیخ الہندؒ

نے اپنے تلمیذ رشید کو عنایت فرمائی ہے، استاذ دارالعلوم دیوبند مولانا حامد میاں سلمۂ ابن حضرت شیخ الادب رح سے مل گیا ہے۔ سند فراغ کے عکس سے یہ بات واضح ہوئی کہ تاریخ دیوبند میں جو حضرت شیخ الادب کا سن فراغت ۱۳۲۱ھ درج ہے وہ صحیح نہیں۔ صحیح ۱۳۲۲ھ ہے

۴:۔ یہ آٹھوں قلمی تبرکات سلوک اور تزکیۂ نفس سے متعلق ہیں، حضرت شیخ الہند رح حضرت گنگوہی رح کے ارشد خلفاء میں سے ہیں، اُن کے مسترشدین کی تعداد سلوک و تصوف کی لائن سے بھی بہت کثیر ہیں۔۔۔ حضرت شیخ الہند رح کے اس قسم کے یقیناً سیکڑوں مکاتیب ہوں گے جو شائع نہیں ہوسکے، ان آٹھ مکاتیب میں بڑا قیمتی سرمایہ موجود ہے۔

۵۔ حضرت شیخ الادب رح پہلے حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ متوفی ۱۳۲۳ھ سے بیعت ہوئے، اس کے بعد حضرت شیخ الہند رح سے سلوک و تزکیۂ نفس کے لئے تعلق پیدا کیا، اور حضرت شیخ الہند رح سے اجازت و خلافت پائی۔۔۔ جیسا کہ مولانا حامد میاں سلمہٗ نے مجھ سے بیان کیا اور کہا کہ میرے والد ماجد نے مجھ سے براہ راست یہ بات فرمائی ہے کہ مجھے حضرت شیخ الہند رح سے اجازت حاصل ہے، حضرت شیخ الہند رح کے بعد حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رح سے اس سلسلہ میں بغرض تکمیل تعلق رکھا۔

۶۔ ان مکتوبات میں حضرت مفتی محمد سہول بھاگلپوری رح کا ذکر بھی ہے۔ یہ بزرگ پورینی ضلع بھاگلپور کے باشندے تھے اور حضرت شیخ الادب رح کے استاذ بھی تھے اُنہی کے ذریعہ سے حضرت شیخ الادب مدرسہ نعمانیہ پورینی پہنچے تھے، اس مدرسہ میں پانچ، چھ سال درس دیا اور بڑی محنت سے طلبہ کی تعلیم و تربیت میں مشغول رہے اور ضلع بھاگلپور کے طلبہ کی ایک بہترین جماعت تیار کی، جس نے آپ کی فیض تعلیم سے فیضیاب ہونے کے بعد دارالعلوم کے دیگر اساتذہ سے بھی اکتساب فیض کیا۔ آپ کی کوشش سے اس علاقہ میں علمی فضا پیدا ہوگئی۔ اور طلبہ جوق درجوق مدرسہ نعمانیہ میں آنے لگے۔ جب مدرسہ کے لئے جدید عمارت بن گئی تو آپ نے یہاں پر ایک عظیم اور شاندار تعلیمی اجلاس کا قصد کیا، جسمیں دیگر علماء کے علاوہ اپنے استاذ مکرم حضرت شیخ الہند رح کو بھی مدعو کیا، حضرت رح نے شرکت فرمائی جس کی وجہ سے جلسہ نہایت ہی کامیاب اور بامقصد رہا،

۷۔ مدرسہ نعمانیہ پورینی کے بعد آپ نے افضل المدارس شاہ جہانپور میں درس دیا۔ اس مدرسہ کو

آپ نے خود ہی قائم فرمایا تھا۔ اوائل ۱۳۳۱ھ میں دارالعلوم دیوبند میں آپ کا تقرر ہوگیا۔ اور چوالیس سال تک آپ نے اپنے فیوض سے تشنگان علوم کو سیراب فرمایا، اور دیوبند ہی میں ۱۳۷۵ھ میں انتقال فرمایا۔ اور یہیں مدفن بنا۔

۸ ـــ مکتوب ہفتم میں حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی بڑی ہمشیرہ کے انتقال کی خبر دی ہے اور ان کو والدہ محمد حنیف لکھا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ جناب محمد حنیف صاحب دیوبندی مرحوم حضرت شیخ الہندؒ کے حقیقی بھانجے تھے مولانا محمد عثمان صاحب دیوبندی مرحوم ومغفور سابق نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند جناب محمد حنیف صاحبؒ کے صاحبزادے تھے اور حضرت شیخ الہندؒ کے حقیقی نواسے تھے، یعنی جناب محمد حنیف صاحب حضرت شیخ الہندؒ کے بھانجے بھی تھے اور داماد بھی،

مکتوبِ اوّل

اخی فی اللہ بارک اللہ فیکم وعلیکم، بندہ محمود سلام مسنون کے بعد ملتمس ہے عرصہ ہوا جو آپ کا عنایت نامہ پہنچا تھا، چند بار عزم کیا اور مولوی محمد سہول صاحب نے بھی چند مرتبہ یاد دلایا مگر اس عرصہ میں کچھ اپنے مرض میں مبتلا رہا، کچھ بیماروں کی مداوات اور اموات کی پریشانی میں مشغول رہا۔ ان وجوہ سے اس قدر تاخیر کی نوبت آئی اس وقت خارش میں مبتلا ہوں اور شہر میں بھی طاعون کا اثر چلا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرماوے۔

اس وقت آپ کا دوسرا خط پہنچا جس سے آپ کی پریشانی از حد معلوم ہوئی، یہ پریشانی بھی عمدہ علامت ہے، عزیزم! اپنے ذکر معمولی کو بالالتزام اور بہ اطمینان کئے جایئے۔ آپ کا یہی کام ہے آئندہ اس کے فضل پر نظر رکھئے، جانب قبلہ سے رو بشمال ہو جانا اس کا خیال کچھ نہ کیجئے، اوّل ہی نشست میں کسی مغالطہ کا ہو جانا یا اثناء ذکر میں رخ کا بدل

جانا اور مشغولی کی وجہ سے اس وقت محسوس نہ ہونا کچھ مستبعد نہیں، حالتِ ذکر میں رونا یا رونے کو دل چاہنا دونوں امر بہتر ہیں۔ باقی خیالاتِ مختلفہ کا پیش آنا اس کی بھی فکر نہ کیجئے اپنے اختیار سے خیال کو اِدھر اُدھر لیجانا نہ چاہئے بلا اختیار ہو جائے تو پھر اپنے ارادہ سے رجوع الی الذکر کرنا چاہئے اور جس طرح ہو سکے مقدار ذکر کو پورا کر لینا ضروری ہے کسی وقت خیالات متفرقہ کا ہجوم ہو تو توجہ کے ساتھ اس دُعا کو پڑھ لیا کیجئے۔ اللّٰھم نقنی من الذنوب کما ینقی الثوب الابیض من الدنس اللّٰھم اغسل خطایای بالماء والثلج و البرد اللّٰھم باعد بینی وبین خطایای کما باعدت بین المشرق والمغرب ۔ اور لاحول، تعوّذ پڑھ کر قلب پر تھتکار دینا بھی مفید ہے قابلِ لحاظ صرف یہ امر ہے کہ ذکر سے قلب میں کچھ موانست محسوس ہوتی ہے یا نہیں؟ اسکے بعد حسبِ رقعہ کوئی دوسرا امر عرض کروں گا، وظائف صبح وشام، درود واستغفار وغیرہ کا التزام بھی رہنا ضروری ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں اور اس ناکارہ کو اپنا دُعا گو خیر پسند یقین فرماویں۔ فقط والسّلام

مکتوب دوم

برادر مہربان بارک اللہ فیکم، سلام مسنون کے بعد التماس ہے آج آپ کا عنایت نامہ پہنچا جس سے آپ کی پریشانی معلوم ہوئی۔ برادرم! آپ ہرگز ہرگز پریشان نہ ہوں ہمت ہر وقت چست رکھنی چاہئے، یہ بھی وسوسہ شیطانی ہے کہ مایوسی دل میں ڈال کر طلب میں سستی واقع کر دے آپ ہمت وتوکل تام کے ساتھ نفع نقصان دونوں سے قطع نظر کر کے دل کو اس امر پر قائم کر لیجئے کہ اپنا وظیفہ برابر شوق کے ساتھ پورا فرمایئے اور کسی نفع نقصان پر مدار نہ رکھئے۔ ہاں امید اور اللہ کی رحمت کے ساتھ حسن ظن رکھئے، "اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ" بعد عشاء یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ "ایک سَو ایک بار اوّل وآخر درود کے ساتھ جہر وضرب کے ساتھ پڑھ

لیا کیجئے، بندہ ناکارہ بھی دعا کرتا ہے۔ والسلام۔

مکتوب سوم

عزیزم مکرم بارک اللہ فیکم، بندہ محمود سلام مسنون کے بعد ملتمس ہے آپ کے دو خط یکے بعد دیگرے موصول ہوئے بندہ گنگوہ چلا گیا تھا ایک ہفتہ صرف ہوگیا۔ واپس ہوکر کچھ بخار آنے لگا اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی، اب پہلے سے اچھا ہوں۔ بقیہ مرض بھی انشاء اللہ رفع ہو جائے گا۔ طالب کو شوق و پریشانی ہونی لازمی ہے۔ اس لئے اس میں کچھ حرج نہیں مگر وہ پریشانی کہ طلب مقصود میں کاہلی و سستی پیدا کرے مذموم ہے۔ آپ اپنے سب امور سے قطع نظر فرما کر چستی کے ساتھ مشغول رہیں وبس، بعد نصفِ لیل یا بعد مغرب یا دوسرے وقت میں جس میں التزام ہو سکے اس میں پورا کر لینا چاہیئے۔ کچھ ہرج نہیں ہاں جس وقت میں کیا جاوے ایک ہی وقت میں حتی الوسع کیا جاوے۔ کچھ صبح کچھ شام کر کے پورا کر لینا نہ چاہیئے۔ بعد عشاء ایک سو ایک بار "یا حیُّ یا قیوم برحمتك استغيث" ملحوظ معنیٰ وجہر متوسط پڑھ کیا کیجئے۔ اس کا خیال ضروری ہے کہ قلب کو ذکر کے ساتھ کچھ تعلق زائد محسوس ہوتا ہے یا نہیں؟ والسلام

مکتوب چہارم

برادر مکرم۔ اکرمہ اللہ، بندہ محمود سلام مسنون کے بعد ملتمس ہے جواب روانہ کر چکا ہوں۔ غالباً پہنچ گیا ہوگا، کام شوق و اطمینان کے ساتھ کئے جاؤ۔ کاہلی و بددلی مناسب نہیں۔ آپ اس امر کا بھی خیال فرمائیں کہ تعلیم کے علاوہ اور بھی جزئیات مدرسہ آپ کو انجام دینی پڑتی ہیں، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ضروریات مدرسہ کو ترک کرو نہیں، آپ کا یہ کام بھی حسن و محمود ہے اور بس نافع، مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ افکار متفرقہ میں اثر ذکر دیر میں ہوتا ہے۔ اسلئے مناسب ہے کہ ضروریاتِ مدرسہ کو انجام دینے

کے بعد اپنے کام میں بھی استقلال وہمت کے ساتھ برابر مشغول رہو اور جہاں تک ہو سکے ہر وقت اپنے دھیان سے غافل نہ رہو اور اللہ کی رحمت سے متوقع رہو، بندہ بھی دست بدعا ہے اور جو کام تعلیم کا للّٰہیت واخلاص سے کر رہے ہو میرے نزدیک شکر کا مقام ہے۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ، ولا تنقص،

والسلام

مکتوب پنجم

اخی فی الدین بارک اللہ فیکم پس از سلام مسنون مدعا ایں کہ عنایت نامہ موصول ہوا، شادی کی نسبت بندہ کی رائے یہ ہے کہ آپ انکار نہ کریں موقع مناسب ہو تو شادی کا ہو جانا ہی بہتر ہے گو بظاہر یہ قصہ آزادی کو زائل کرنے والا ہے مگر حق تعالیٰ نے اس میں بڑے منافع اور مصالح رکھے ہیں اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ کو ملحوظ رکھ کر اتباعاً للحکم آپ اس کو منظور فرمالیں اور انکار نہ کریں حق تعالیٰ مبارک کرے۔ بارک اللہ فیکم وعلیکم پاس انفاس کی اب کیا کیفیت ہے؟ آپ باطمینان اپنا کام وسعت کے موافق کئے جائیں گھبرانا مناسب نہیں۔ اللہ کی رحمت پر نظر رکھیں اپنے اظہار حال میں تامل نہ فرمائیں، جب چاہیں اور جو لکھنا منظور ہو بے تردد مطلع فرمایا کریں، خواب اچھا ہے خلاصہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ آپ کو اپنے مقصدِ عظیم میں براحت واطمینان کامیاب فرمادے۔ گو اس میں مخاوفِ نفسانی اور عوارض وخطرات بھی پیش آئیں جن کا پیش آنا ضروری سا امر ہے، باقی خیریت ہے

والسلام فقط

بندہ محمود عفی عنہ

مکتوب ششم

برادر مکرم بارک اللہ فیکم! بندہ محمود سلام مسنون کے بعد ملتمس ہے کل آپ کا جوابی کارڈ پہنچا آپ کے عقد وغیرہ کی کیفیت پہلے مولوی سہول صاحب سے معلوم ہو چکی تھی۔

حق تعالیٰ مبارک فرماوے، سررشتہ دار صاحب کا انتقال موجب افسوس ہے حق تعالیٰ ان کی مغفرت فرماوے، آپ اپنا کام توکلاً علی اللہ انجام دیئے جاویں پریشان نہ ہو دیں۔ اگر کوئی ضرورت وہاں سے علیحدگی کی پیش آوے گی اس وقت دیکھا جائے گا اپنے اذکار میں مشغول رہو، پاس انفاس جس قدر راسخ ہو جائیگا مفید ہے ذکر لسانی سے موانست قلبی کا کیا حال ہے آج بندہ کی ہمشیرہ کا انتقال ہوگیا دعائے مغفرت کیجئے باقی خیریت ہے ۔ اس وقت مدرسہ آپ کی توجہ کا زیادہ محتاج ہے ۔

والسّلام فقط

مکتوب ہفتم

عزیز مکرّم سلمہ بندہ محمود سلام مسنون کے بعد ملتمس ہے آپ کا محبت نامہ پہنچا، خیریت معلوم ہوئی۔ بندہ بھی کچھ عرصہ سے عدیم الفرصت رہا، اسی عرصہ میں آپ نے سنا ہوگا۔ میری بڑی ہمشیرہ والدہ محمد حنیف کا انتقال ہوگیا۔ باقی خیریت ہے، آپ اپنا کام کئے جاویں۔ پریشان و مایوس نہ ہوں۔ حق تعالیٰ آپ کی ہمشیرہ صاحبہ کی مغفرت فرماوے بندہ بھی دُعاء کرتا ہے۔ فصبرٌ جمیلٌ، مولوی خورشید صاحب کا دل وہاں لگایا نہیں؟ آپ کے مدرسہ کی اب کیا حالت ہے۔ والسّلام فقط

مکتوب ہشتم

برادر مکرّم سلمہ بندہ محمود سلام مسنون کے بعد ملتمس ہے بندہ کچھ عرصہ سے اس فکر میں ہے کہ ملازمت مدرسہ سے سبکدوشی یا تخفیف حاصل کرے، بہت سی تدابیر کے بعد اس وقت اس کے حصول کی صورت نظر آئی، حق تعالیٰ کو منظور ہے تو عنقریب یہ مطلب کسی نہج پر پورا ہو جائے گا۔ آپ بھی دُعاء فرمادیں کہ اس کا نتیجہ بندہ کے لئے خیر نکلے۔ خواب محتاجِ تعبیر نہیں صاف ہی مدّعا ہے کہ تعلق ہم مشربی پورا حاصل ہے اور ایک ہی موطن سے دونوں کو نفع پہنچتا ہے کام دلجمعی سے کئے جاؤ، مرض کا اب وہاں کیا حال ہے؟ جلسہ کی نسبت اب کیا ارادہ ہے؟ باقی خیریت ہے۔ والسّلام فقط

قانونِ نبوی کی رہنمائی امنِ عالم کی ضامن

خورشید انور اعظمی (فاضل دیوبند)
جامعہ مظہر العلوم، وارانسی

انسان کو ہمیشہ امن وسلامتی کی ضرورت رہی ہے اور اس کی فطری خواہش رہی ہے کہ وہ سکھ چین کی زندگی بسر کرے اور اطمینان وسکون کی ایسی فضا میں سانس لے جس میں عزت وآبرو محفوظ اور جان ومال دنیا کے مختلف خطرات سے دور رہیں، معاشرہ پاکیزہ اور صاف ستھرا ہو، جس میں باہمی تصادم کا تصور بھی نہ ہو سکے، سوسائٹی کے افراد ایسے اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار کے حامل ہوں کہ ان سے ایسی حرکات کی توقع ہی نہ کی جا سکے جن سے امن وسلامتی کا دامن تار تار ہو جائے، ماحول ایسا پُرامن اور خوشگوار ہو جس میں ہر فرد ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے کے بجائے اچھی نظروں سے دیکھے اور اپنے مزاج ومذاق کے مطابق اپنی زندگی کی صبح وشام گزار سکے۔ لیکن بعض دفعہ یہی انسان لڑنے جھگڑنے اور باہم دست وگریباں ہونے میں از حد لذت محسوس کرتا ہے اور اس قدر دلچسپی لیتا ہے کہ خود اپنے ہی جیسے انسانوں کے خون سے ہولی کھیلنا اس کا محبوب مشغلہ بن جاتا ہے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اس معرکہ آرائی اور باہمی جنگ وجدال کی داستان کوئی نئی نہیں ہے بلکہ ابتدائے آفرینش ہی سے اس کا سلسلہ شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔ جب کبھی انسان جذبۂ انتقام سے مغلوب ہوا اور اس کے ذہن ودماغ کسی کے خلاف عداوت ونفرت کی آماجگاہ بنے وہ بوکھلا اٹھا۔ اور موقع کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا،.... اپنے حریف کو زک پہونچانے اور

اسے زیر کرنے کی راہیں تلاش کرنے لگا، اگر یہ معاملہ انفرادی رہا تو مختصر سے دائرہ میں محدود ہوکر رہ جاتا اور اگر بدقسمتی سے اس کا سرا ملکوں اور سلطنتوں سے ملا ہوا ہوتا تو پھر اس کی لپٹیں دُور دُور جا پہونچتیں جس کی زد میں آکر پوری انسانیت کراہ اٹھتی۔

لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لانے کے بعد دنیائے انسانیت کو ایسا جامع اور ہمہ گیر قانون عطا فرمایا جس میں ظلم و تعدی کے خلاف آواز احتجاج اور عدل و انصاف کی خوشخبری تھی اور اس راستہ پر بند لگا دیا گیا تھا جس سے انسانی زندگی کا حسین قصر منہدم اور انسانیت کا تاج محل زمین بوس ہوجائے اور ان خصوصیات کو جگہ دی گئی تھی۔ جن سے جرائم بدکرداری کی بیخ کنی اور انتشار و لاقانونیت کا قلع قمع ہوسکے، ظلم و زیادتی، کبر و غرور، نسبی تفاخر، وطنی عصبیت، انتقام کا منحوس جذبہ، لوٹ مار اور غارت گری جیسے انسانیت کش خصلتوں سے احتراز کی بھرپور تاکید فرمائی گئی، اور عدل و انصاف امن و سلامتی، مساوات و برابری، باہمی الفت و محبت، ہمسائیگی کا لحاظ و پاس، انسانی خون کی رعایت اور چھوٹوں بڑوں کا احترام جیسے محاسن پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دی گئی جسکا لازمی نتیجہ تھا کہ دیکھتے دیکھتے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ مختصر سی زندگی میں عرب کا معاشرہ جو جنگ و جدال کے شعلوں میں جھلس رہا تھا۔ امن و امان کا گہوارہ بن گیا۔

فتنہ و فساد کا چشمہ اکثر نسبی تفاخر سے پھوٹتا ہے۔ جو رفتہ رفتہ خطرناک صورت اختیار کرجاتا ہے۔ اور انسان اس نشہ میں مدہوش ہوکر اپنے کو سب سے بلند اور دوسروں کو اپنے سے حقیر تصور کرنے لگتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں گوناں گوں مفاسد رونما ہوجاتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نسبی امتیاز ختم کردیا اور صاف فرمادیا کہ تمام افراد انسانی حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے

انسابکم ھذہ لیست بمسبۃ کلکم بنو آدم۔ مشکوٰۃ ص ۴۱۸ ج ۲ — تمہارے یہ نسب باعث عار نہیں ہیں تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو۔

اگر کوئی انسان معزز و مکرم ہوسکتا ہے تو وہ صاحب تقویٰ ہے

عن ابی ھریرۃ قال سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا سے

ای الناس اکرم قال اکرمهم عند الله اتقاهم۔ — دریافت کیا گیا لوگوں میں معزز ترین کون ہے حضورؐ نے فرمایا اللہ کے نزدیک معزز ترین وہ ہے جو سب سے بڑھ کر متقی ہو۔

متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۱۷

اسی طرح جب کسی قوم یا جماعت میں عصبیت کا گھن لگ جاتا ہے تو اس کے نتائج ازحد گندے سامنے آتے ہیں حتیٰ کہ جماعت کا ہر فرد اپنوں کی جائز ناجائز حمایت کرنا اپنا ایک اہم فریضہ سمجھتا ہے، اس کے استیصال کے لئے آپ نے فرمایا:۔

لیس منا من دعا الی عصبیة و لیس منا من قاتل عصبیة و لیس منا من مات علی عصبیة — وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی دعوت دے وہ بھی ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی بنیاد پر قتال کرے اور وہ بھی ہم میں سے نہیں ہے جس کی موت عصبیت پر ہوئی ہو۔

(رواہ ابوداؤد، مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۱۸)

واثلہ بن اسقعؓ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا۔ یا رسولؐ عصبیت کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا:۔

اَن تعین قومک علی الظلم — عصبیت یہ ہے کہ تم اپنی قوم کے ظلم پر ناجائز حمایت کرو۔

(رواہ ابوداؤد ومشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۱۸)

ظلم وزیادتی بھی انسانی زندگی کے لئے بہت مہلک مرض ہیں اگر اس کے انسداد کی کوشش نہ کی جائے تو پوری دنیا ظلم وتعدی کے ہاتھوں گھٹ گھٹ کر فنا کے گھاٹ اتر جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی قباحت بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

الظلم ظلمات یوم القیٰمة — ظلم قیامت کے دن سراپا ظلمت ہی ظلمت ہوگا۔

(متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۳۲)

اور فرمایا:۔

من اخذ شبرًا من ارض ظلمًا فانه یطوقه یوم القیٰمة من سبع ارضین — جو شخص کسی دوسرے کی بالشت بھر زمین بھی زبردستی سے لے گا اللہ تعالیٰ اس زمین کے ساتوں طبقات قیامت کے دن اس کی گردن میں ڈال دیں گے

(متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۵۴)

نیز آپ نے فرمایا کہ ظلم کا روکنا معاشرہ کے تمام افراد کی ذمہ داری ہے اگر ایسا نہیں کرتے تو تمام لوگ عذاب الٰہی کی زد میں آسکتے ہیں۔

ان الناس اذا راؤا الظالم فلم یاخذوا علی یدیہ اوشك ان یعمھم اللہ بعقاب منہ۔ (ریاض الصالحین ص ۱۱۳) — اگر لوگ ظالم کے ظلم کو دیکھیں اور پھر بھی اس سے اسکو باز نہ رکھیں تو خطرہ ہے کہ کہیں سبھی لوگ اس کے عذاب میں گرفتار نہ ہو جائیں۔

اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی خون کی بہت عظمت بتائی ، اگر کوئی کسی کا ناحق خون بہاتا ہے تو اُسے معاشرہ کا مبغوض ترین انسان بتایا ، آپؐ نے فرمایا :-

ابغض الناس ثلثة ملحد فی الحرم ومبتغ فی الاسلام سنة الجاھلیة ومطلب دم امرأ بغیر حق یھریق دمه (بخاری باب طلب الدم ، مشکوٰة ج ۱ ص ۲۷) — مبغوض ترین تین شخص ہیں۔ حرم[۱] میں الحاد کا مرتکب ، اسلام[۲] میں مراسم جاہلیت کو رواج دینے والا اور ناحق[۳] کسی کے خون کا خواہشمند تاکہ اس کا خون بہائے۔

دوسری جگہ خونریزی سے اجتناب پر زور دیتے ہوئے فرمایا :

اوّل مایقضی یوم القیٰمة فی الدماء (بخاری کتاب الدیات) — قیامت کے دن سب سے پہلے فیصلہ خون کے مسئلہ کا ہوگا۔

لوٹ مار اور غارت گری سے اسطرح منع کیا :

من انتھب نھبة فلیس منّا (رواہ الترمذی) — جو شخص لوٹ مار کرے وہ ہم میں داخل نہیں ہے۔

اور فرمایا :-

نھٰی عن النھبة والمثلة (رواہ البخاری) — حضورؐ نے لوٹ مار اور مثلہ سے منع فرمایا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اور اس طرح کی تمام برائیوں کا دنیا سے صفایا کر دیا اور کم از کم دامنِ اسلام سے وابستہ حضرات کیلئے ان افعال کے اختیار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی بلکہ اس کی جگہ اچھے اوصاف اور عمدہ خصائل کو رواج بخشا تاکہ دنیا امن و سلامتی کے خوشگوار ماحول میں زندگی گذار سکے ، حتیٰ کہ مسلم ہونے کا مطلب ہی یہ بتایا کہ مسلم وہ شخص ہے

جس سے کسی کو تکلیف نہ پہونچے۔ آپ نے فرمایا:۔

المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدیہ (مشکوٰۃ ج۱ ص۱۲)

مسلم وہ ہے جس کے زبان اور ہاتھ سے مسلمانوں کو تکلیف پہنچے۔

اور تمام لوگوں کو باہم مل جل کر زندگی گزارنے اور ایک دوسرے پر رحم و کرم کرنے پر ابھارا۔

عن جریر بن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یرحم اللہ من لا یرحم الناس

(متفق علیہ مشکوٰۃ ج۲ ص۴۲۱)

جریر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں حضورؐ نے فرمایا جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا اللہ تعالیٰ بھی اس پر رحم نہیں کرتا۔

آپؐ نے عفو و کرم کی جہاں تعلیم دی وہیں اس پر بھرپور عمل بھی کیا، چنانچہ فتح مکہ کے دن عفو کا اعلان فرمادیا مگر اس پر بھی صنادید قریش خوفزدہ ہو کر کعبۃ اللہ میں جا چھپے، آپؐ خانہ کعبہ کے پھاٹک پر آئے اور ان لوگوں سے سوال کیا کہ تم میرے بارے میں کیا خیال رکھتے ہو؟ جواب دیا، آپ اپنے چھوٹوں کے بُردبار بھائی اور اپنے بڑوں کے مہربان بھتیجا ہیں، یہ سُن کر آپ نے فرمایا:۔

اقول کما قال یوسف لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم وھو ارحم الراحمین

(شرح معانی الآثار ج۲ ص۱۹۲)

میں یوسف کی طرح اعلان کرتا ہوں کہ آج تم پر سرزنش نہیں ہے اللہ تعالیٰ تم کو معاف فرمائے وہ بڑا رحم و کرم والا ہے،

پھر وہ اس طرح باہر نکلے

فخرجوا کانما نشروا من القبور

(ایضاً)

وہ لوگ کعبہ سے اسطرح باہر نکلے جیسے وہ قبروں سے نکل کر (نئی زندگی پانے پر خوش و خرم ہوں)

نیز آپ نے فرمایا کہ انسان کو ایسی زندگی گزارنی چاہئے جس سے اس کے گردوپیش کے لوگ مطمئن ہوں۔

عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یدخل الجنۃ من لا یومن جارہ بوائقہ

حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ حضور نے فرمایا: وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے مظالم سے اس کا پڑوسی مامون نہیں ہے

(رواہ مسلم مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۲۳)

حدود وغیرہ میں رورعایت کا سوال ہی نہیں باقی رکھا حتی کہ قریش کی ایک مخزومی چور عورت کے سلسلہ میں حبیب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت محبوب صحابی حضرت اسامہؓ نے سفارش کی تو آپ نے فرمایا:۔

انما اھلك الذین قبلکم انھم کانوا اذا سرق فیھم الشریف ترکوہ واذا سرق فیھم الضعیف اقاموا علیہ الحد وایم اللہ لوان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا (متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۱۴)

تم سے پہلے کے لوگ محض اس وجہ سے ہلاک ہوگئے کہ جب انمیں کا بڑا آدمی چوری کرتا تو اُسے درگزر کردیتے اور جب چھوٹا کرتا تو اس پر حد جاری کرتے خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو اس کا بھی میں ہاتھ کاٹ دیتا

پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ عام طور پر غریب وخستہ حال آدمیوں کی کوئی عزت نہیں ہوتی، جو چاہتا ہے انھیں ڈانٹ پھٹکار دیتا ہے جس سے مساوات باقی رہنے کے بجائے ظلم زیادتی کی فضا قائم ہوتی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ضعیف وکمزور کو اونچا اٹھایا، اور خوشحال وارباب ثروت سے کہا:۔

ھل تنصرون وترزقون الا بالضعفائکم (رواہ البخاری، مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۴۶)

تم لوگوں کو رزق ونصرت ضعیفوں اور کمزوروں کے سبب حاصل ہوتی ہے۔

اس طرح نبی اکرم نے بے شمار ایسے الٰہی احکام وقوانین دنیا کے سامنے پیش کئے جن سے امن وسلامتی کا ماحول جنم لیتا ہے، اور باہمی ربط ومحبت کا نیک جذبہ ابھرتا ہے، پھر نہ جنگ وجدال کا تصور ہوتا ہے۔ اور نہ تنفر وکشمکش کا خیال آتا ہے۔ اور اگر خدانخواستہ کبھی معرکہ آرائی کی نوبت آہی گئی اس میں بھی دین اور اس کے سنہرے اصول مقدم رہتے ہیں اور ہر

موثر پر انسانیت کا احترام باقی رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگیں بھی لڑی ہیں۔ لیکن اس وقت بھی آپؐ نے جو دستور اور طریقۂ جنگ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے بلاشبہ امن وسلامتی کا ضامن ہے۔ آپؐ نے فرمایا، حتی الامکان لڑائی سے بچا جائے، لڑائی دنیوی اغراض ومقاصد کے تحت نہیں بلکہ حق کی آواز بلند کرنے اور امن وسلامتی کے قائم کرنے کیلئے ہو، انھیں لوگوں کو نقصان پہونچایا جائے جن سے براہِ راست مقابلہ ہو، بے ضرر بوڑھوں، بچوں، عورتوں، غلاموں، زاہدوں اور راہبوں سے تعرض نہ کیا جائے، جس بات پر معاہدہ ہو جائے اس کا ہمیشہ لحاظ کیا جائے، اگر کسی دشمن کو قتل کیا جائے تو اس کی صورت مسخ نہ کی جائے، اور اگر کسی کو گرفتار کیا جائے تو اس کے ساتھ انسانی برتاؤ کیا جائے۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے قوانین نافذ فرمائے جن سے میدان جنگ میں بھی انسانیت کا بھرپور لحاظ رہا۔

عصر حاضر جو خود اپنے ہاتھوں گوناگوں مصائب میں گرفتار ہے، اپنی تمام تر ترقیوں کے باوجود امن وسکون سے یکسر محروم ہے، بلکہ اس نے خود اپنے لئے ایسے سمّی اسلحہ جات تیار کر لئے ہیں کہ وہی اس کی ہلاکت کیلئے کافی ہیں، جن کی موجودگی میں تفاخر کا منحوس جذبہ ابھرتا ہے، کبر ونخوت کا مزاج پروان پاتا ہے، پوری دنیا کو ایک .... منٹ میں نیست و نابود کرنے کا خیال جنم لیتا ہے، انسانیت کا احترام باقی نہیں رہتا، اور ذہن ودماغ ان ساری چیزوں کے مرکز بن جاتے ہیں جن سے فساد پھیلتا ہے، اور انسان اخلاقی پستی، مذہبی کمزوری میں گرفتار ہو جاتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ساری دُنیا کراہ رہی ہے، اور بے چینی کی زندگی گزار رہی ہے۔ آج بھی اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قوانین کو نافذ کر دیا جائے اور زندگی کے تمام شعبوں میں انھیں رائج کر دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوبارہ یہی دُنیا امن وسلامتی کا گہوارہ نہ بن جائے۔

منطق و فلسفہ ایک علمی و تحقیقی جائزہ

باب پنجم، آثار و نتائج

مولانا محمد اطہر حسین قاسمی بستوی

مامون الرشید کے زمانہ میں جب یونانی کتابوں کے ترجمے ہوئے تو ان کا مسلمانوں پر نہایت برا اثر پڑا، ان کو اپنے عقائد و افکار میں شبہات ہونے لگے، توحید و نبوت، امور آخرت اور جنت و جہنم کی حقانیت میں انھیں تردد ہونے لگا۔ اور وہ اسلام کو ایک دوسرے انداز سے سوچنے لگے، نوبت بایں جا رسید کہ اعمال و عبادات اور فرائض و واجبات متروک ہو گئے اور تحقیر و توہین تک کی جانے لگی، علاوہ ازیں اس کے اثر سے ایک ایسا گروہ تیار ہوا جو اہل سنت والجماعت کا دشمن تھا اور جسے معتزلہ کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات و صفات میں موشگافیاں، ضروریاتِ دین کا انکار، فرائض و واجبات کی تحقیر اور مسلکِ اعتزال کا قیام وہ بدنما داغ ہیں جن سے علوم عقلیہ کی پیشانی داغدار ہے۔ تفصیل آئندہ سطروں میں آرہی ہے۔

ذاتِ باری تعالیٰ میں موشگافیاں

عہد بنی عباس میں جب یونانی فلسفہ کا زور ہوا تو مسلمانوں نے خدا کی نسبت ایک دوسرے انداز سے سوچنا اور غور کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً ایک طرف انھوں نے خدا کو علتِ تامہ یا علت اولیٰ و مطلقہ کہا اور دوسری جانب چونکہ فلسفہ یونان کا کلیہ الواحد

لَا یَصْدُرُ عَنْہُ اِلَّا الْوَاحِدُ یعنی ایک سے صرف ایک ہی صادر ہوسکتا ہے ان کے نزدیک ناقابلِ تردید تھا، اس وجہ سے انھیں عقول عشرہ ماننے پڑے، ان دونوں مسلّمات سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام نے خدا کی نسبت جو یقین دلایا ہے وہ اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں رہ سکتا، مثلاً قرآن کہتا ہے کہ خدا کے لئے مشیت ہے ارادہ ہے اور اس سے جو افعال صادر ہوتے ہیں وہ اضطراراً نہیں بلکہ اختیار سے صادر ہوتے ہیں وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ ہرگز نہیں ہوسکتا لیکن فلسفۂ یونان کی اصطلاح کے مطابق اگر خدا کو عالم کے لئے علتِ تامّہ کہا جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ خدا کے لئے نہ مشیت ہے نہ ارادہ اور اس سے جو کچھ بھی صادر ہوا ہے اس میں اس کے اختیار کو کچھ بھی دخل نہیں بلکہ بالاضطرار ہوا ہے۔ کیونکہ علتِ تامّہ سے معلول کا صدور اختیار سے نہیں ہوتا پھر چونکہ علتِ تامّہ اور معلول کے درمیان زمانہ کے اعتبار سے کوئی تقدّم اور تأخر نہیں ہوتا اس لئے فلاسفہ کو ماننا پڑا کہ خدا کی طرح عقل اوّل بھی قدیم بالذات ہے، اب خود فرمایئے کہ خدا کو عالم کی علتِ اولیٰ و مطلق قرار دے کر اگر اس کو مشیت، ارادہ اور اختیار سے محروم مان لیا جائے تو پھر اسلام تو درکنار کسی ایک مذہب کی عمارت بھی قائم نہیں رہ سکتی۔

(مسلمانوں کا عروج و زوال ص۹۵)

صفاتِ باری میں موشگافیاں

یونانی فلسفہ کے زیر اثر جس طرح خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی ذات کے بارے میں موشگافیاں کی گئیں اسی طرح خدا کی صفات کی نسبت بھی خام خیالیاں ظاہر کی گئیں اور اس سلسلہ میں عجیب عجیب طرح کی بحثیں پیدا ہوئیں۔ مثلاً پہلی بحث تو یہ تھی کہ صفات کا ذاتِ خداوندی کے ساتھ کیا تعلق ہے یعنی وہ عین ذات ہے یا غیر ذات یا نہ عین ہیں اور نہ غیر دوسری بحث یہ تھی کہ اُن... صفات کی حقیقت کیا ہے۔ یعنی اگر علم بغیر معلوم کے نہیں ہوسکتا تو جب خدا کے سوا کوئی شے بھی موجود نہ تھی اس وقت خدا کیونکر علیم ہوگا پھر خدا کی ذات و صفات سے قطع نظر دوسرے مسائل میں بھی اسی طرح کی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی کی گئی، مثلاً یہ کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے یا نہیں، انسان مجبور محض ہے یا مختار مطلق

یا نیم مجبور و نیم مختار، عقلی اعتبار سے تین احتمالات نکلتے تھے، یہی تین احتمالات مستقلاً تین فرقوں کی بنیاد قرار پا گئے اور اس کا اثر عقیدہ کے ثواب و عقاب پر ہوا۔

اسی سلسلہ میں قرآن کے متعلق بحثیں ہوئیں کہ وہ مخلوق ہے یا غیر مخلوق اور اگر وہ مخلوق ہے تو اللہ کا کلام کیونکر ہوا اور اگر غیر مخلوق ہے تو اس میں شان حدوث کیوں پائی جاتی ہے۔ وحی کیونکر نازل ہوتی ہے، خدا کے بولنے کی حقیقت کیا ہے، اس کا دیدار ممکن ہے یا ناممکن، دوزخ کا عذاب ابدی ہے یا غیر ابدی، حشر و نشر جسمانی ہوگا یا روحانی، افلاک میں خرق والتیام ممکن ہے یا ناممکن، جس سے متأثر ہو کر فلاسفہ نے معراج جسمانی کا انکار کر دیا۔ غرض یہ ہے کہ اس عہد (مامون رشید کے عہد) میں شریعت اسلام کا کوئی نظریہ یا عملی مسئلہ ایسا نہیں تھا جس کو فلسفہ اور عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش نہ کی گئی ہو، طبعی طور پر اس کا جو نتیجہ ہونا چاہئے تھا وہی ہوا، مسلمانوں میں ذہنی پراگندگی اور انتشار پیدا ہو گیا، افکار و آراء کے مختلف اسکول قائم ہو گئے اور عہد بنی امیہ میں چند در چند کمزوریوں کے باوجود مسلمان اب تک جس مصیبت عقلی سے محفوظ تھے یعنی عقیدہ و خیال کی کمزوری اور ابتری اب وہ اس کا بھی شکار ہو گئے۔

(مسلمانوں کا عروج و زوال ص ۹۵)

مسلمانوں کو کیا نقصان پہونچا

مسلمانوں کا تعارف جب معقولات سے ہوا تو انھیں اپنے افکار و خیالات میں شبہات ہونے لگے، اعمال و عبادات ان کی نظر میں مشتبہ ہو گئے اور اسلامی عقائد و خیالات میں انھیں تردّد ہونے لگا، حد یہ ہے کہ شعائر دین کو چھوڑ بیٹھے، نمازوں کو مہمل اور بیکار سمجھنے لگے، توحید و نبوت پر اعتراض کرنے لگے اور قضا و قدر سے ناراض ہو بیٹھے، علامہ ابن جوزی متوفی ۵۹۷ھ حنبلی اپنے زمانہ کے معقولی مسلمانوں کا حال بیان کرتے ہیں:۔

"ابلیس نے ہمارے مذہب والوں میں سے چند قوموں پر تلبیس کی تو ان کے پاس ان کی ذکاوت اور ذہن اور عقلوں کی راہ سے گیا، ان کو سمجھایا کہ فلاسفہ کی پیروی ہی صواب ہے۔ کیونکہ اُن سے ایسے ایسے افعال و اقوال صادر ہوئے ہیں۔ جو

نہایت ذکاوت اور کمال عقل پر دلالت کرتے ہیں، ایسے لوگ ہمیشہ سقراط وبقراط اور ارسطو وجالینوس کی حکمت میں پڑے رہتے ہیں حالانکہ ان پر فقط علوم ہندسہ ومنطق وطبیعات کا دارومدار ہے، باقی پوشیدہ امور انھوں نے اپنی عقل سے نکالے ہیں۔ پھر جب الٰہیات میں بحث کی تو گڈمڈ کر دیا، اسی وجہ سے ان میں اختلاف ہوا اور حساب وہندسہ میں اختلاف نہ ہوا (چند سطروں کے بعد) پس متأخرین نے ان کے خیالات کی تصدیق کی، شعائر دین کو چھوڑ دیا، نمازوں کو مہمل اور بیکار سمجھا، ممنوعات کے مرتکب ہوئے، حدود شریعت کو ناچیز جانا اور اسلام کی پابندی ترک کر دی۔

ہم نے اپنی امت کے تفلسف پیشوں میں اکثر کو دیکھا کہ انھیں بجز سرگردانی کے کچھ نہیں حاصل ہوا۔ اب نہ وہ مقتضائے فلسفہ ہی سمجھتے ہیں اور نہ مقتضائے اسلام بلکہ ان میں بہت سے ایسے ہیں جو روزہ رکھتے اور نماز پڑھتے ہیں مگر خالق اور نبوّتوں پر اعتراض کرتے ہیں اور حشر اجساد کے انکار میں بحث کرتے ہیں، جو فقر و فاقہ میں مبتلا رہتا ہے وہ عموماً قضا وقدر سے ناراض رہتا ہے۔ حتیٰ کہ مجھ سے بعض متفلسفہ نے کہا کہ ہم تو اسی سے مخاصمہ کرتے ہیں جو آسمان میں ہے پھر اس بارے میں بہت سے اشعار پڑھتا تھا۔

چونکہ فلاسفہ اور رہبان کا زمانہ ہمارے زمانہ سے قریب ہے اس لئے ہمارے اہل ملّت میں سے فلاسفہ کا اور بعض نے رہبان کا دامن پکڑ لیا۔ اسی لئے تم اکثر احمقوں کو دیکھو گے کہ جب وہ اعتقاد میں غور کرتے ہیں تو تفلسف میں پڑ جاتے ہیں اور جب زہد میں فکر کرتے ہیں تو راہب بن جاتے ہیں۔ پس ہم اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے ہیں کہ ہمیں ہمارے مذہب پر قائم رکھے اور ہمارے دشمن سے ہماری حفاظت فرمائے۔ (تلبیس ابلیس اُردو ص۶۳)

امام غزالیؒ کی زندگی میں جب انقلاب آیا اور وہ خلوت سے جلوت اور عزلت سے اجتماعی زندگی میں آئے تو اس کا سبب یہ بیان فرمایا:۔

"میں نے دیکھا کہ فلسفہ کا اثر بہت سے مدعیان تصوّف کی گمراہی اور بہت سے

علماء کی بے عملی کا شکار ہو چکا ہے اور متکلمین کی غلط اور کمزور نمائندگی کی وجہ سے اکثر طبقات کا ایمان متزلزل ہو چکا ہے۔ اور عقائد پر اچھا خاصہ اثر پڑ چکا ہے، بہت سے فلسفہ زدہ لوگ ظاہری احکام کے پابند ہیں۔ لیکن نبوت اور دین کی حقیقت پر ان کا ایمان نہیں ہے، بعض لوگ محض جسمانی ورزش کے خیال سے نماز پڑھتے ہیں اور بعض لوگ محض سوسائٹی اور اہل شہر کی عادت کی بنا پر پڑھتے ہیں۔ (تاریخ دعوت و عزیمت جلد اول ص۱۵۷

نقلاً عن بعض تصانیف الغزالی

معتزلہ کا ظہور

جب یونانی اور سریانی کتابوں کے تراجم ہوئے اور مسلمانوں کا یونانی فلسفہ سے تعارف ہوا تو قدیم مذاہب و ممالک کے علماء و متکلمین سے بھی اختلاط ہوا، اس کے نتیجہ میں امّت کا وہ گروہ جو جلد متأثر ہونے کی قابلیت رکھتا تھا اور جس کی ذہانت میں گہرائی اور پختگی سے زیادہ سطحیت اور جدّت تھی اس طرزِ فکر اور طریقۂ بحث سے متاثر ہوا، نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، ان کے باہمی تعلق، کلامِ الٰہی، رؤیت باری، مسئلہ عدل وتقدیر، جبر واختیار کے متعلق ایسے مسائل پیدا ہو گئے جو نہ دینی حیثیت سے مفید تھے اور نہ دنیاوی حیثیت سے ضروری بلکہ امت کی وحدت اور مسلمانوں کی قوت عمل کے لئے مضر تھے، دینی فلسفیوں کے اس گروہ کی امامت معتزلہ کر رہے تھے جو اپنے وقت کے روشن خیال عالم اور پُرجوش متکلم تھے، انھوں نے ان علمی بحثوں کو کفر وایمان کا معیار بنا دیا اور اپنی ساری ذہانتوں کو ان مباحث پر لگا دیا، ان کے مقابلہ میں فقہاء و محدثین کا گروہ تھا جو ان مسائل میں سلف کے مسلک کا قائل تھا اور ان موشگافیوں کو مضر اور ان تعبیرات کو غلط سمجھتا تھا، ہارون رشید کے دورِ خلافت تک معتزلہ کو عروج حاصل نہیں ہوا، مامون کے زمانہ میں جو یونانی فلسفہ اور عقلیات سے مرعوب تھا اور مخصوص تربیت اور حالات کی وجہ سے اس کی دماغی ساخت معتزلہ سے ملتی جلتی تھی۔ معتزلہ کو عروج حاصل ہوا۔ (تاریخ دعوت و عزیمت جلد اول ص۹۳)

اسلامی فرقوں میں باطنیہ اور معتزلہ کا فرقہ چونکہ بہت زیادہ آزاد خیال، کج فہم اور بے راہ تھا

اس لئے اس نے تمام قدیم حکماء کے اصول ونظریات کو اپنے اندر جذب کرلیا، اس نے اپنے عقائد کی بنیاد ہی حکماء کے فلسفیانہ اصول ونظریات پر رکھی۔ یا یوں کہئے کہ اس نے حکماء کے ان اصول ونظریات کو اس بنا پر اختیار کیا کہ وہ اس کے عقائد کے مطابق تھے۔ بہرحال جو بھی کہئے ان میں ایک فرقہ تو باطنیہ کا تھا جن میں بعض لوگوں نے ایبذقلس کا فلسفہ اختیار کیا تھا اور ان میں سب سے زیادہ نمایاں شخص محمد بن عبداللہ بن مسیرہ باطنی تھا، باطنیوں کے علاوہ سب سے زیادہ فلسفہ پرست فرقہ معتزلیوں کا تھا۔ ان میں بعض لوگوں نے فلسفۂ ایبذقلس کے بعض مسائل کو اختیار کیا، چنانچہ ایبذقلس پہلا شخص ہے جس کا نظریہ یہ ہے کہ خداتعالیٰ کی ذات میں علم وقدرت اور فیاضی وغیرہ جو اوصاف پائے جاتے ہیں وہ عام مخلوقات کی طرح الگ الگ نہیں ہیں بلکہ ان سب کا منشاء خود خدا ہی کی ذات ہے جس میں کسی چیز کی کثرت نہیں ہے بلکہ وہ ہر حیثیت سے ایک ہے اور معتزلہ میں ابوالہذیل، محمد بن الہذیل العلاّف کا بھی یہی مذہب ہے

ان ہی معتزلہ میں محمد بن علی بن طیب بصری متوفیٰ ۴۳۶ھ بھی تھا جو حکمائے قدیم کے خیالات ونظریات کا بڑا ماہر اور جامع تھا لیکن لوگوں کے خوف سے ان کا اظہار نہیں کرسکتا تھا۔ اس لئے مسلم متکلمین کے بھیس میں ان نظریات وخیالات کا اظہار کرتا تھا، ایک اور معتزلی مسعود بن ابی محمد متوفیٰ سنہ ۶۱۱ھ کے متعلق جمال الدین قفطی نے اخبار الحکماء میں لکھا ہے کہ وہ فلسفی متکلم ادیب شاعر حنبلی المذہب اور معتزلی تھا لیکن درحقیقت وہ حکماء کے عقائد وخیالات رکھتا تھا۔ معتزلہ کے فرقہ میں سب سے زیادہ آزاد خیال وسیع النظر اور وسیع المشرب ابراہیم بن سیّار تھا جو زیادہ تر اپنے لقب نظّام سے مشہور رہے۔ اسی وسیع النظری اور وسیع المشربی کی بنا پر وہ ارسطو کا مقلد تھا بلکہ اس نے ارسطو کے علاوہ اور حکماء کے اصول ونظریات بھی اختیار کئے، دوسرے نظریات کی طرح اس کا ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ خداوندتعالیٰ برائیوں کے کرنے کی طاقت نہیں رکھتا وہ صرف وہی کام کرسکتا ہے جو اس کے بندوں کے لئے مفید ہو لیکن جو کام ان کے لئے مفید نہ ہو وہ اس کے کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، یہ تو دنیادی کاموں کا حال ہے آخرت میں بھی وہ دوزخیوں

اور جنتیوں کے عذاب و ثواب میں کوئی کمی و بیشی نہیں کر سکتا، اس نظریہ کے متعلق علامہ شہرستانی ملل و نحل میں لکھتے ہیں کہ اس نے اس نظریہ کو قدمائے فلاسفہ سے لیا ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ ایک فیاض شخص کوئی ایسا ذخیرہ جمع نہیں کر سکتا جس کو وہ خرچ کر سکے اس لئے خدا جس چیز کو پیدا کر دیتا ہے وہی اس کی قدرت میں تھی لیکن اگر اس کے علم و قدرت میں کوئی چیز اس سے زیادہ بہتر اس سے زیادہ کامل و منظم اور اس سے زیادہ مفید ہوتی تو وہ اس کو ضرور پیدا کرتا، غرض نظام کے بہت سے نظریات حکمائے قدیم ہی کے نظریات پر مبنی ہیں بلکہ اگر اسلام کے تمام گمراہ فرقوں کے خیالات و نظریات کی جانچ پڑتال کی جائے تو ان میں بہت سے قدیم حکماء کے خیالات و نظریات کی جھلک نظر آئے گی۔ (تاریخ حکمائے اسلام جلد اول ص۳۰)

دین کو معتزلہ سے زیادہ فلاسفہ سے نقصان پہونچا

معتزلہ سے اگرچہ دانستہ یا نادانستہ شریعت کو نقصان پہونچا تھا اور انھوں نے عقل کی طاقت کو غیر محدود سمجھ کر ذات و صفات کے نازک و ماورائے عقل مسائل کو بازیچۂ اطفال بنا دیا تھا۔ لیکن اصلاً وہ مذہبی ذہن کے لوگ تھے، وحی و نبوت پر ایمان رکھتے تھے اور عموماً متقشف معاصی سے مجتنب و محتاط تھے، عبادت اور دینی جذبہ رکھتے تھے اور یہ سب ان کے اصول و قواعد کا اقتضاء تھا اس لئے اعتزال کے فروغ اور معتزلہ کے اقتدار سے عالم اسلام میں کفر و الحاد، انکارِ نبوت، انکارِ معاد، بے عملی اور تعطل کا رجحان پیدا نہ ہو سکا۔ اور مسلمانوں کا مذہبی شعور مجروح یا کمزور نہیں ہونے پایا لیکن فلاسفہ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ فلسفہ نبوت کے بالکل متوازی چلتا ہے اور کہیں جا کر نہیں ملتا، وہ دین کے اصول و کلیات اور اس کے بنیادی عقائد و مسائل سے متصادم ہے اس لئے جس قدر فلسفہ کی مقبولیت اور عظمت بڑھتی گئی قدرتی طور پر دین کی وقعت اور انبیاء علیہم السلام کی عظمت کم ہوتی گئی اور عقائد سے لیکر اخلاق و اعمال تک اس ذہنی تبدیلی سے متاثر ہوئے مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جو دین کی علانیہ تحقیر کرتا اور اسلام سے فخریہ اپنی بے تعلقی کا اظہار کرتا اور جو لوگ اتنی اخلاقی جرأت نہیں رکھتے تھے وہ ظاہری طور پر رسم و رواج کے پابند تھے۔ لیکن اندر سے وہ کسی معنیٰ میں مسلمان نہیں تھے۔

(تاریخ دعوت و عزیمت جلد اوّل ص۱۳۸)

فرمودات حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ

(۱) جب کوئی شخص تمہارے سامنے کسی کی جانب سے تمہیں تکلیف پہنچانے والی بات نقل کرے تو اُسے جھڑک دو اور کہو کہ تم تو اس سے بھی بُرے ہو۔ اس نے تو پیٹھ پیچھے میری بُرائی کی اور تو میرے سامنے کر رہا ہے۔

(۲) تیرے سب سے بڑے اور بُرے دشمن ترے بُرے دوست اور ہم نشین ہیں۔

(۳) جسے اللہ کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے وہ اس کی مخلوق کے حق میں نرم اور متواضع ہو جاتا ہے

(۴) گمنامی کو پسند کرو اس میں شہرت اور ناموری کی بہ نسبت زیادہ امن و اطمینان ہے۔

(۵) جب تک تیرے اندر تکبّر، غرور، غصّہ باقی ہے۔ اپنے آپ کو علم والوں میں شمار نہ کرو۔

(۶) رزق کی وہ وسعت اور فراخی جس پر خدا کا شکر نہ ہو اور معاش کی وہ تنگی جس پر صبر نہ ہو ایک فتنہ ہے۔

(۷) ہر ظالم مظلوم کی دُنیا بگاڑتا ہے اور اپنی آخرت تباہ کرتا ہے۔

(۸) عقلمند پہلے دل سے پوچھتا ہے، پھر زبان سے بولتا ہے۔ تیری گفتگو ظاہر کردیگی کہ تمہارے اندر کیا ہے۔

(۹) کوشش کرو کہ گفتگو کی ابتداء تمہاری جانب سے نہ ہوا کرے۔ تمہارا کام صرف جواب بنا کرے

(۱۰) جسے کوئی آزار، ایذاء اور تکلیف نہ پہنچے اس میں کوئی خوبی نہیں۔

تلک عشرۃ کاملہ

قسط نمبر ۲

ایک مطالعہ ایک نظر

از عبدالحمید نعمانی۔ دارالعلوم دیوبند

اس تفصیل سے یہ حقیقت بالکل کھل کر سامنے آگئی کہ صاحب تبلیغی نصاب حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب تصنیفی بے شعوری کا شکار نہیں ہیں۔ بلکہ جناب تابش صاحب ہی صحیح صورت حال سے مکمل طور پر ناواقف ہونے کی وجہ سے بے خبری کی ظلمت میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

ان مندرجات کی روشنی میں آپ صاحب ایک مطالعہ اور صدہا خطوط کے ذریعہ ان کی اس مجاہدانہ کوشش کو سراہنے والے کرم فرماؤں کے مبلغ علم اور پرواز فکر کا بخوبی اندازہ لگاسکتے ہیں کہ یہ حضرات کتنے خداترس اور علم و دیانت کے حامل ہیں۔ کیا اب ہم جناب تابش ہی کے الفاظ میں مختصر تغیر کے ساتھ یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ محترم تابش صرف مصنف بننے کے خواہاں اور لکھنے کے عادی ہیں۔ ان کی کون سی بات کیا رخ اختیار کر رہی ہے۔ اس سے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ یا اس گندی اور اندھادھند تنقید کی زد کس پر پڑے گی اور اس تیر انگنی سے کس کس ہستی کا سینہ چھلنی ہوگا؟ وہ اس کا بالکل پاس و لحاظ نہیں رکھ پاتے ہیں۔

رہا ان کا حضرت شیخ پر تضاد بیانی اور مسخ تاریخ کا الزام تو اس کی قلعی مذکورہ تفصیل سے اچھی طرح کھل گئی ہے۔ اس الزام کا بے جان اور کھوکھلا پن ہونا تو پہلے الزام سے بھی زیادہ ظاہر و باہر ہے۔ خداخوفی اور دیانت کا تقاضا تو یہ تھا کہ آپ ۔۔۔۔۔۔
۔۔۔حق گوئی اور صداقت شعاری کے دامن کو پکڑے رہتے اور تحزب و گروہ بندی سے بالاتر ہوکر

محنت و مشقت جھیل کر حقائق کا بے لاگ جائزہ لیتے۔ اور مسئلے کے تجزیہ و تنقیح میں ایسا علمی طرز اختیار فرماتے جو علم و دانش کی میزان پر پورا اُترتا۔ ایسا نہیں کہ علم و دیانت سر پیٹ کر رہ جائیں اور اسلامی شائستگی پر حرف آئے ہیں یہ نہیں کہتا کہ حضرت شیخ رح فرشتوں کی جنس سے تھے۔ ان سے فکری و قلمی لغزش کا صدور محال ہے۔ اس لئے ان کی تالیفات کو علم و تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت نہیں۔

نہیں نہیں! تنقید و تبصرہ ضرور کیجئے انشاء اللہ تعالیٰ آپ کے اعتراضات و تنقیدات پر غور کیا جائے گا۔ اگر آپ کا کوئی اعتراض درست اور اصول نقد و نظر کی کسوٹی پر پورا اُترے گا تو اُسے ایک حق پسند بلا تامل تسلیم کرے گا۔ ہاں پیش نظر آپ کی تنقیدی روش تو قطعاً مومنانہ کردار سے میل نہیں کھاتی.... یہ تو کھلی تنقیص ہے۔ جو خالصتہً فریب دہی اور مغالطہ انگیزی پر مبنی ہے۔

خیر بات دوسری طرف نکل گئی یہاں عرض کرنا یہ ہے کہ حضرت شیخ الحدیث پر تضاد بیانی اور مسخ تاریخ کا الزام قطعاً بے سر و پا ہے۔ اسے الٹی گنگا بہانا نہ کہیں تو آخر کیا کہیں کہ ایک صحیح بات پر تضاد بیانی اور مسخ تاریخ کا الزام عائد کر کے تنقیص کا نشانہ بنانا آخر انصاف و دیانت کی کون سی قسم ہے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ صحیح صورتِ حال سے ناآشنا افراد کی طرف سے اس خالص جارحانہ ریمارک پر آپ کو خوب خوب داد ملی ہوگی۔ اور جناب کے ہم خیال افراد جھوم جھوم اٹھے ہوں گے کہ موصوف نے ایک مخفی حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھا دیا۔ لیکن ایک غیر جانب دار صاحب علم آپ کے اس شہ پارے کو پڑھ کر اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا ہے کہ صاحب "ایک مطالعہ" نے محض لفاظی کے گورکھ دھندے کو بے لاگ جائزہ کا خوشنما نام دے کر اپنے قارئین کو تاریکی میں رکھنا چاہا ہے۔ ورنہ اس قلمی شعبدہ بازی کو جائزے کا نام دینا جائزے کی کھلی توہین ہے۔

اب آپ اپنے اس آخری الزام کی حقیقت بھی ملاحظہ کر لیجئے۔ جس نے بقول آپ کے مغالطہ انگیز اور مبہم روایتوں کی کوکھ سے جنم لیکر حضرات صحابہ کرام رض کی عظمت کو غبار آلود کر دیا ہے۔ تو اس کے بارے میں اطلاعاً عرض ہے کہ صحابہ کرام رض کی عظمت جو آپ کو دھواں

دھواں نظر آرہا ہے یہ محض زاویہ نظر میں تبدیلی کا ثمرہ ہے ورنہ آپ نے تبلیغی نصاب کے جن دو واقعات کو نقل کرکے داد تنقید دی ہے اُن میں تو کوئی ایسی بات یا جملہ نظر نہیں آتا جس نے بلا واسطہ فیوض و برکات نبوی سے مستفید و مستفیض ہونے والے انفاس قُدسیہ کی رفعت و عظمت کو (معاذ اللہ) غبار آلود کیا ہو۔ کاش کہ آپ اس ایمان سوز بات کی نشاندہی فرما دیتے۔ تاکہ ہم جیسے کم علموں کے علم میں کچھ اضافہ ہو جاتا۔ اور سوچنے سمجھنے کا موقع ملتا۔

حضرات قارئین! راقم الحروف نے جو حضرت حنظلہ بن ربیع الاسیدی رضؓ کا واقعہ ما قبل میں نقل کیا ہے۔ اس میں یہ مذکور ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے خیریت دریافت کرنے پر حضرت حنظلہ رضؓ نے جواباً فرمایا تھا کہ نافق حنظلہ۔ حنظلہ تو منافق ہو گیا۔ یہ سُن کر اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے بھی فرمایا۔ لنلقی مثل ذالك کہ ہم بھی اپنے آپ کو اسی حالت پر پاتے ہیں (حالتِ نفاق پر) ان خط کشیدہ الفاظ کو عبداللہ بن سبا اور ایران کی فیکٹری میں بنی ہوئی عینک سے دیکھنے کی بناء پر موصوف کو مغالطہ ہوا ہے۔ ورنہ مومنانہ نظر سے دیکھئے تو حضرات صحابہ کرام رضؓ صدق وصفا اور خدا خوفی کے پیکر مجسم نظر آئیں گے۔ اس سے اوران کی عظمت، قدر و منزلت، عبدیت اور تواضع و انکساری میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ کہ ان پاکباز بندوں کو فکر آخرت اور اپنے دین و ایمان کی حفاظت کا بے انتہا خیال رہتا تھا جبھی تو اپنے دل میں ایمانی کیفیت کے معمولی تغیّر و تبدّل کو وہ نفاق سے تعبیر کرتے ہیں۔

اللہ۔ اللہ! وہ تقویٰ و طہارت کے کتنے اونچے اور بلند مقام پر فائز تھے۔ ایک ہم لوگ ہیں کہ صدہا خلاف شرع امور کا ارتکاب کرنے کے باوجود ہماری پیشانی میں شکن تک نہیں پڑتی۔ یہ تو حضرات صحابہ رضؓ ہی تھے جو حضرات انبیاء عؑ کے بعد سب سے زیادہ مقدس گروہ ہونے کے باوجود سچے پکّے مومن اور غیر معصوم ہونے کی وجہ سے ذرا سی ایمانی حالت کی تبدیلی کو عملی نفاق سے تعبیر کرنے لگتے تھے۔ یہ راقم الحروف کا صرف دعویٰ نہیں ہے بلکہ ہمارے اس دعویٰ کی دلیل قرآن حکیم کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب بخاری میں موجود ہے۔ چنانچہ حضرت امام بخاریؒ نے باب خوف المومن من ان یحبط عملہ ولایشعر کے تحت حضرت ابن ملیکہ (متوفی ۱۱۷ھ

کا ارشادِ گرامی نقل فرمایا ہے۔ کہ میں نے تیس ۳۰ حضرات صحابہ کرامؓ سے ملاقات کی ان میں سے ہر ایک صحابیؓ اپنے بارے میں نفاق سے ڈرتا تھا۔

(ادرکت ثلٰثین من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کلھم یخاف النفاق علیٰ نفسہٖ[1]) ان تیس ۳۰ اصحاب میں علامہ قسطلانی کے بیان کے مطابق چند حضرات یہ ہیں حضرت عائشہؓ، حضرت اسماءؓ۔ حضرت ام سلمہؓ، عبادلہؓ اربعہ عقبہ بن حرثؓ مسور بن مخزمہؓ۔

یہ عملی نفاق سے ڈرنا غایت درجے کے تورع وتقویٰ کی بنیاد پر تھا۔ اور اس طرح ڈرنا مومنانہ زندگی کا آئینہ دار ہے، چنانچہ بخاری شریف ج۱ ص۱۲ پر کلّھم یخاف النفاق علی نفسہٖ کے نیچے بین السطور میں حضرت جلال الدین سیوطیؒ کا یہ قول درج ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ غایت درجے کے تورع کے حاصل ہونے کی وجہ سے اپنے اوپر نفاق کا اندیشہ کرتے تھے۔ (مبالغۃً فی الورع) یا چلتے پھرتے کتب خانہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ ... صلاح ونکو کاری کے باوجود نفاق عملی سے ڈرتے رہنا صالحین کا طریقہ ہے۔ کیونکہ یہ لوگ انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے زیادہ خوف وخشیت والے تھے۔ پس ان کا خوف غایت احتیاط وتقویٰ کے سبب[2] تھا۔ یہی بات حضرت شاہ صاحبؒ نے بخاری شریف کی شرح "فیض الباری" کے اندر بھی فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں۔ حضرات صحابہ کرامؓ اپنے بارے میں نفاق سے ڈرتے تھے۔ اور یہ ڈرنا صفت صلاح وتقویٰ سے متصف ہونے کے سبب تھا۔

(پھر ایک شبہے کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں) اس بات کے کہنے سے یہ اعتراض نہیں ہوسکتا ہے کہ ان (صحابہ) کے ایمان سے ہمارا ایمان زیادہ قوی ہے۔ کیوں کہ ہمارے دل میں نفاق کی کبھی کھٹک بھی پیدا نہیں ہوتی ہے۔ اپنے بارے میں نفاق کا اندیشہ کرنا اس وجہ سے تھا کہ وہ خدا کی مخلوق میں حضرات انبیاء کے بعد سب سے زیادہ ڈرنے والے تھے۔ اور ڈرنے والے کا یہی طریقہ ہے کہ اپنے بارے میں ہمہ وقت ڈرتا رہے۔ اِنَّھُمْ یُخَافُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِھِمْ

---

[1] بخاری شریف ص۱۲ ج۱ مطبوعہ مجتبائی دہلی۔ [2] انوار الباری شرح اردو بخاری شریف ص۱۵۱ ج۲)

وھذا الخوف کان لصلاحھم۔ فلا یرد ان ایماننا اقوی منھم لانہ لایخطر ببالنا النفاق، وذلک لانھم کانوا اخشی خلق اللہ بعد الانبیاءؑ وطریق الخائف ان یخاف علی نفسہ کل حین۔ (۲) دوسری جگہ بھی حضرت شاہ صاحبؒ ہر وقت ڈرتے رہنے کو مومنانہ رویہ بتاتے ہیں۔ اور اپنے ایمان پر مگن ہوکر بیٹھ رہنے کو مرجئیہ کا خیال قرار دیتے ہیں۔

چنانچہ امام بخاری کے باندھے ہوئے باب خوف المومن الخ پر بحث کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔ این جاز للمرجئۃ ان یقعد وامطمئین بایمانھم؛ فعلی المومن ان یخاف کل آن۔ یعنی جب حضرات صحابہ بھی اپنے ایمان پر تکیہ کرکے مگن نہیں تھے۔ تو فرقۂ مرجئیہ کے لئے اس بات کا جواز کیسے پیدا ہوگیا کہ اپنے ایمان پر مطمئن ہوکر بیٹھ رہیں۔[۳]

اور سچ پوچھئے تو حضرت امام بخاریؒ نے خوف المؤمن کا باب ہی مرجئیہ کے اس غلط نظریہ کی تردید کے لئے باندھا ہے کہ اپنے ایمان پر مست ومگن رہو۔ یہ صرف میرا ہی خیال نہیں ہے بلکہ بخاری شریف کے شارحین میں ایک مشہور شارح حافظ ابن حجر عسقلانی کا بھی خیال ہے۔ چنانچہ رقمطراز ہیں۔......

معقود للرد علی المرجئۃ خاصۃ[۳]

علامہ بدرالدین کی رائے

شارحین بخاری شریف میں ایک مشہور ومعروف شارح علامہ بدرالدین عینیؒ ہیں ان کا کہنا ہے کہ حضرات صحابہؓ کا اپنے اوپر نفاق کا اندیشہ کرنا۔ غیر معصوم ہونے کے سبب سوءِ خاتمہ کی بنیاد پر تھا[۴]

علامہ قسطلانی وعلامہ عسقلانی کی رائے

علامہ قسطلانی کا خیال اس بارے میں یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کا خوفِ نفاق ورع وتقویٰ کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کی وجہ سے تھا۔ لہٰذا محض اندیشۂ نفاق سے ان میں سے کسی ایک کا منافق ہونا لازم نہیں آتا ہے[۵]۔

---

[۱] فیض الباری ۱۲۵/۱ [۲] ایضاً ۱۲۶/۱ [۳] فتح الباری ج ۱/۱۵ [۴] عمدۃ القاری ۳۳۲/۱ [۵] ارشاد الساری ۱۸۱/۱

قریب قریب یہی عبارت فتح الباری میں بھی ہے [۱]

اس طویل بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے خاتمہ کے بارے میں ڈرتے رہنا مومن بندے کا کام ہے اور بے خوف و مطمئن رہنا ایمانی روح کے خلاف ہے۔ چنانچہ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ۔

"نفاق سے مومن ہی ڈرتا ہے اور رہا منافق کا معاملہ تو وہ اس سے بے فکر رہتا ہے۔ ماخافہ الا مومن ولا آمنہ الا منافق [۲] جو نفاق کا اندیشہ نہیں رکھتا ہے وہ منافق ہے۔ من لم یخف النفاق فھو منافق [۳] ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اب اس سوال کا جواب محترم جناب تابش صاحب اور ان کے ہم نوا ہی دیں گے کہ مذکورہ اشخاص نے جو ایک نہیں بیسیوں صحابہؓ کے بارے میں اندیشۂ نفاق کا تذکرہ کیا ہے ان کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ آیا امام بخاریؒ ابن ابی ملیکہ وغیرہ آپ کے نزدیک عظمت صحابہؓ کو غبار آلود کرنے والوں کے زمرہ میں شامل ہوں گے یا نہیں؟ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ جب دو صحابی کے اندیشۂ نفاق کا واقعہ کو نقل کر کے عظمت صحابہؓ کو غبار آلود کرنے والے ہوگئے تو امام بخاریؒ اور ابن ملیکہ وغیرہ کو بھی کیوں نہیں صحابہؓ کی عظمت و وقعت کو خاک میں ملانے والوں کی صف میں کھڑا کر دیا جائے۔

شبہہ کا ازالہ حضرت شیخؒ کی تشریح سے

آیئے اب ذرا حضرت مولانا زکریاؒ کی تشریح ہی سے جناب تابش کے خود ساختہ شبہے کا ازالہ کر دیا جائے۔ اگر محترم تابش ذرا دیانت داری اور غور و فکر سے کام لیتے تو ان کے شبہے کا مکمل جواب حضرت شیخ رح کے تشریحی نوٹ ہی میں مل جاتا اور زیادہ مغز ماری کی ضرورت نہ پڑتی۔ چنانچہ شیخ رح رقمطراز ہیں۔

"آدمی کے ساتھ انسانی ضرورتیں بھی لگی ہوئی ہیں۔ جن کو پورا کرنا بھی ضروری ہے کھانا پینا، بیوی۔ بچے اور ان کی خیر و خبر لینا یہ بھی ضروری ہیں۔ اس لئے اس قسم کے حالات کبھی کبھی حاصل ہوتے ہیں۔ نہ ہر وقت یہ حاصل ہوتے ہیں۔ اور نہ اس کی امید رکھنا چاہئے یہ فرشتوں کی شان ہے کہ ان کو کوئی دوسرا دھندا ہی نہیں۔ نہ بیوی بچے نہ فکر معاش

اور نہ دنیوی قصّے اور انسان کے ساتھ چونکہ بشری ضروریات لگی ہوئی ہیں اسلئے وہ ہر وقت ایک سی حالت پر نہیں رہ سکتا۔ لیکن غور کی بات یہ ہے کہ صحابہؓ کرام کو اپنے دین کی کتنی فکر تھی کہ ذرا سی بات سے کہ حضورؐ کے سامنے جو حالت ہماری ہوتی ہے وہ بعد میں نہیں رہتی۔ اس سے اپنے منافق ہونے کا ان کو فکر ہو گیا۔ عشق است و ہزار بدگمانی، عشق جس سے ہوتا ہے اس کے متعلق ہزار طرح کی بدگمانی اور شک ہوتا ہے[1]۔ خط کشیدہ الفاظ بغور بار بار پڑھئے۔ اور بتلائیے کہ جناب تابشؔ کے شبہے کا اس تشریحی نوٹ میں جواب ہے یا نہیں۔

محترم تابش کا عذر لنگ

راقم الحروف نے زبانی گفتگو کے دوران جب جناب تابشؔ سے عرض کیا کہ آپ نے زیر بحث موضوع کے سمجھنے میں بہت بڑی غلطی کی ہے تو موصوف نے فرمایا کہ "دونوں واقعات کے قریب قریب فاصلے پر واقع ہونے کی وجہ سے ہر شخص "تبلیغی نصاب" اور حضرت شیخ الحدیثؒ کے بارے میں وہی رائے قائم کرے گا جو میں نے قائم کی ہے"، حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو محترم تابشؔ کا یہ عذر لنگ علم و دیانت کی عدالت میں قطعاً ناقابلِ سماعت ہے کون آنکھ والا یہ کہنے کی جرأت کرے گا کہ دو واقعے بالکل قریب قریب فاصلے پر واقع ہیں۔ ہر صاحب نظر اپنے سر کی کھلی آنکھوں دیکھ سکتا ہے کہ ایک واقعہ "تبلیغی نصاب ص ۳۶، ۳۷ ج ۱" پر اور دوسرا ۳۸ صفحات کے بعد ص ۷۵ ج ۱ پر ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا قارئین پر ہے کہ موصوف کے اس عذر لنگ میں کتنی جان ہے

راقم الحروف نے اپنے علم و آگہی کی حد تک بحث کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے اور امید ہے کہ قارئین کے سامنے بھی بحث کا ہر گوشہ روز روشن کی طرح واضح ہو کر آ گیا ہوگا ان شاء اللہ ہماری یہ تفصیلی معروضات پڑھ لینے کے بعد قوی توقع ہے کہ جناب تابشؔ کی آنکھوں سے خصوصاً اور ان کے ہم نواؤں کی آنکھوں سے عموماً تضاد بیانی، مسخ تاریخ اور عظمت صحابہ کے غبار آلود ہونے کا زرنگار پردہ ہٹ جائے گا۔ اور بلا پس و پیش اس صحیح تنقید کو برداشت کریں گے۔ اور برداشت نہ کرنے کے کیا معنی! جب کہ جماعت اسلامی کے دستور میں یہ دفعہ مندرج ہے کہ "تنقید سے بالاتر کسی کو نہ سمجھے"[2]

---

[2] دستور جماعت اسلامی ص ۲۴ طبع سوم۔

نیز جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی مرحوم صحیح تنقید کی دعوت دینے کے ساتھ ساتھ زبان اور رائے کی آزادی کو خلافتِ راشدہ کی خصوصیت زندہ ضمیری، اور ہمت افزائی کے قابل کام قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ مولانا مودودی مرحوم اپنی مشہور ومعروف کتاب "خلافت وملوکیت" میں "آزادیٔ اظہار رائے کا خاتمہ" کے عنوان کے تحت رقمطراز ہیں" اسلام نے اسے مسلمانوں کا صرف حق ہی نہیں بلکہ فرض قرار دیا تھا۔ اور اسلامی معاشرہ وریاست کا صحیح راستے پر چلنا اس پر منحصر تھا کہ قوم کا ضمیر زندہ اور اس کے افراد کی زبانیں آزاد ہوں ۔ ہر غلط کام پر وہ بڑے سے بڑے آدمی کو ٹوک سکیں۔ اور حق بات برملا کہہ سکیں ۔ خلافتِ راشدہ میں لوگوں کی یہ آزادی پوری طرح محفوظ تھی ۔ خلفائے راشدین اس کی نہ صرف اجازت دیتے تھے بلکہ اس پر لوگوں کی ہمت افزائی کرتے تھے ۔ ان کے زمانہ میں حق بات کہنے والے ڈانٹ اور دھمکی سے نہیں ۔ تعریف و تحسین سے نوازے جاتے تھے ۔ اور تنقید کرنے والوں کو دبایا نہیں جاتا تھا بلکہ ان کو معقول جواب دیکر مطمئن کرنے کی کوشش کی جاتی تھی[۱]

جماعتِ اسلامی کے ایک سرگرم رکن، اہل قلم، صاحب علم اور سنجیدہ عالم مولانا عروج قادری صاحب نے اپنی کتاب ایک نظر میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہم کی کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح" کا علمی وتنقیدی جائزہ لیا ہے ۔ اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں، "مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے دوسرے اہل علم لوگوں کو علمی واصولی تنقید کی دعوت دیتے رہے ہیں تاکہ اہل علم علمی طور پر کسی چیز کو ثابت کر دیں تو اُسے ترک کر دیا جائے[۲] ۔

جناب تابش اور ان کے ہمنوا خط کشیدہ الفاظ کو بار بار پڑھیں اور اگر مجھ سے کوئی علمی لغزش ہوئی ہو تو علمی واصولی انداز میں اس کی نشاندہی فرمائیں ۔ اگر میری تنقید صحیح اور درست ہے تو اپنی غلطی کا برملا اعتراف کرتے ہوئے مومنانہ کردار ادا کریں۔

---

[۱] خلافت وملوکیت ص۱۵۱، طبع چہارم دہلی [۲] ایک نظر ص۸ طبع اوّل دہلی ۔ از مولانا سید عروج قادری مدیر زندگی رامپور

قسط نمبر ۲

شاہ طیب بنارسیؒ (۴)

از۔ مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

فتوحات کے سلسلہ میں طرزِ عمل

شریعت آباد کے ابتدائی زمانہ قیام میں معاش کی بڑی تنگی رہی، اکثر ایام فاقے میں گذرتے تھے ساتھ میں رہنے والے طلبہ و فقراء جنگل کی گھاس یا جنگلی درختوں کے پھل کھا کھا کر دن کاٹتے تھے، مگر بعد میں خدائی قانون " من یتق اللہ یجعلہ مخرجاً و یرزقہ من حیث لا یحتسب "، کے مطابق فتوحات کے دروازے کھل گئے اور ہدایا و تحائف کثرت سے خدمت میں آنے لگے۔ قبول ہدایا کے بارے میں شاہ صاحب کا اصول یہ تھا کہ غریب ارادتمندوں اور مریدوں کے ہدیے تو بلا چوں وچرا قبول کر لیا کرتے تھے اور اسے اپنی ضروریات میں صرف فرماتے تھے مگر امراء و رؤسا کی جانب سے پیش کئے گئے تحائف کو رد فرما دیتے تھے۔ البتہ اگر اس جماعت کا کوئی فرد حلقۂ ارادت میں داخل ہو جاتا تو اس کے ہدیہ کو شرف قبولیت عطا ہو جاتا تھا لیکن اسے اپنی ذات پر خرچ کرنے کے بجائے فقراء و غرباء پر تقسیم کر دیتے تھے۔

مناقب میں ہے۔

روش او ہم چنیں بود کہ از اغنیاء چیزے نگرفتے تا کہ او داخل محباں نمی شد و محبت و اعتقاد او محکم نمی گشت بعد ازاں کہ او

(قبول ہدایا کے بارے میں) شاہ صاحب کی روش یہ تھی کہ اغنیاء کی کوئی چیز قبول نہ کرتے تھے تا وقتیکہ وہ حلقۂ محباں میں

داخل معتقداں می شد ونیت او معلوم می گشت ہر چہ می فرستاد یا می آورد قبول می فرمود آں را صرف فقراء ومسافراں می نمود وخود ازاں گاہے نمی خورد ونمی پوشد (مناقب ص ۱۱)

داخل نہ ہو جاتے اور ان کی نیت معلوم نہ ہو جاتی، اس کے حلقۂ محباں میں شامل ہو جانے کے بعد جو کچھ وہ بھیجتا یا خود لاتا تو قبول فرمالیا کرتے تھے لیکن اسے کبھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کرتے تھے۔

اور عطیات وفتوحات کے سلسلے میں شاہ صاحب کا عمل یہ تھا انھیں دو حصوں پر تقسیم کر کے ایک حصّہ اہل خانہ، خدّام، اور خانقاہ کے طلبہ اور سالکین پر خرچ فرماتے تھے اور دوسرے حصّہ کو شہر کے فقراء، غرباء اور سالکین پر صدقہ کر دیا کرتے تھے۔

مناقب ہی میں شاہ یٰسین لکھتے ہیں :-

وطریق وے درباب قسمت فتوح عجیب بود کہ ہر چہ از غیب رسیدے نصف آں بار باب حقوق وفقراء شہر ومحتاجان و ہمسائیگان دادے ونصف بخادماں خاص از جہتہ فقراء خانقاہ ومہمانان ومسافراں خرچ نمودے، (ص ۱۱)

شاہ صاحبؒ کا طریقۂ فتوحات کی تقسیم میں عجیب تھا جو کچھ آتا اُسے دو حصوں پر تقسیم کر کے ایک حصّہ ارباب حقوق فقراء شہر محتاجوں اور ہمسایوں کو دیدیتے تھے اور نصف حصّہ کو خدام کے حوالہ کر دیتے تھے جسے خانقاہ کے فقراء اور مہمانوں پر خرچ کیا کیا جاتا تھا۔

معمولات

شاہ صاحب کا عام طور سے معمول یہ تھا کہ نماز تہجد کے بعد مراقب ہو جاتے جس کا سلسلہ نماز فجر تک جاری رہتا اور کبھی مراقبہ کے بجائے تلاوت قرآن پاک میں مشغول ہو جاتے اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی خاص کیفیت کے تحت مندرج رباعی بار بار پڑھتے اور مسجد کے صحن میں بیتابانہ چکّر لگاتے اور زار وقطار روتے۔ رباعی یہ ہے۔

گر صد ہزار قرن ہمہ خلق کائنات ÷ فکرت کنند در صفت وذات اے خدا
آخر بعجز معترف آئند کہ الٰہ ! دانستہ شد کہ ہیچ ندانستہ ایم ما

نماز فجر کے بعد چاشت تک تلاوت فرماتے اور نماز چاشت پڑھکر مسجد سے

باہر آتے۔ زوال کے وقت تھوڑی دیر قیلولہ کرنے کا بھی معمول تھا۔ بعد زوال نماز ظہر باجماعت ادا کر کے کچھ دیر تلاوت کرتے قرآن کی تلاوت میں بڑا اہتمام تھا بالعموم ہفتہ عشرہ میں قرآن ختم کر لیا کرتے تھے، تلاوت کے بعد عصر تک طلبہ کا درس جاری رہتا اور کبھی کبھی درس کے بجائے کچھ تصنیف و تالیف کا کام بھی اسی وقت کر لیا کرتے تھے نماز عصر کے بعد مغرب تک مسجد ہی میں مراقب رہتے، مغرب و عشاء کے درمیان نوافل اور ذکر و اذکار میں مشغول رہتے اور عشاء سے کچھ پہلے گھر آکر کھانا تناول فرماتے، کچھ توقف کے بعد نماز عشاء ادا کر کے وظائف پورا کرتے اس سے فارغ ہو کر سو جاتے، دو ڈھائی گھنٹہ استراحت کرنے کے بعد بیدار ہو جاتے کبھی بستر پر اور کبھی مسجد میں جاکر ذکر و اذکار میں منہمک رہتے۔

روزہ کے سلسلہ میں معمول یہ تھا کہ ایام بیض، پنجشنبہ، جمعہ، دوشنبہ کے روزوں کا خاص طور سے اہتمام کرتے تھے۔ ورنہ عام معمول صوم داؤدی کا تھا کہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے، رمضان کے عشرہ اخیرہ کے اعتکاف کا بھی معمول تھا۔ ان معمولات میں زندگی کے آخر لمحہ تک فرق نہیں آنے پایا تھا۔ حتیٰ کہ آخر عمر میں استغراق و حضور دوام کے باوجود ان میں سر مو فرق نہیں تھا۔ (مناقب ص ۱۴، ۱۵)

غناء و سماع کے بارہ میں طرز عمل

ابتدائی عہد میں دیگر مشائخ چشت کی طرح شاہ صاحب بھی وجد و سماع سے خاصا ذوق رکھتے تھے۔

مناقب میں ہے۔

وے قدس سرہٗ ابتداء وقت شغف بر سماع بسیار داشت و وجد و رقص بسیار نمود و بعضے اوقات، در جوش سماع در جنگل رفتے دو دو روز در جنگل ماندے و کسے ندانستے کہ کجا است (ص ۱۴)

شاہ صاحب قدس سرہٗ ابتداء وقت میں سماع سے بہت شوق رکھتے تھے۔ اور وجد و رقص خوب فرماتے تھے۔ بعض اوقات جوش وجد میں جنگل میں بھاگ جاتے اور دو دو روز تک غائب رہتے تھے۔

لیکن جب مقام مشیخت پر پہونچے تو اس سے شدت کے ساتھ پرہیز کرنے لگے تھے۔

اور فرماتے تھے۔

دریں زمانہ سرود نباید شنید کہ ہیچ شرط باقی نماندہ و زمانہ فاسد شدہ و یاراں نماندہ موافق و در قوالاں طمع جاگرفتہ دریں وقت سرود شنیدن مناسب طریقۂ فقراء نیست (مناقب ص ۱۳)

اس زمانہ میں غناء نہیں سننا چاہئے کیونکہ کوئی شرط اب باقی نہیں رہ گئی ہے۔ زمانہ فاسد ہو چکا ہے۔ یار موافق نہیں رہے اور قوالوں میں لالچ پیدا ہو گئی ہے اسوقت غناء سننا فقراء کے طریق کے مناسب نہیں ہے۔

اس بارے میں آپ کا حال بعینہٖ حضرت شیخ عبدالقادر بن محمد حسنی جیلانی ملقب بہ شیخ عبدالقادر ثانی متوفی ۹۴۰،۳۹ھ جیسا تھا کہ وہ جب مقام شیخت پر پہونچے تو سماع و غناء سے بالکلیہ پرہیز کرنے لگے تھے اور مریدوں کو بھی شدت سے منع کرتے تھے۔

اسرار طریقت کے بیان سے احتراز شاہ صاحب تصوف کے اسرار و حقائق کے بیان کرنے سے بالکلیہ پرہیز کرتے تھے اور اگر کبھی کوئی شخص اس بارے میں کوئی بات پوچھتا تو فرماتے۔

ایں سخناں حالی را در مرتبۂ قالی آوردن دور از ادب است،،

ان حالی باتوں کو قول کے درجے میں لانا بے ادبی ہے۔

شاہ یٰسین لکھتے ہیں کہ میں چونکہ بہت بے تکلف تھا، اس لئے کبھی کبھی جرأت و ہمت کرکے بعض اسرار کو دریافت کرتا تو مجھ سے بھی کچھ بیان نہ فرماتے اور ارشاد فرماتے کہ

ایں سخن از جملہ واردات است تو درکار خویش مشغول باش ناپرسیدہ بردل تو مثل آں وارد خواہد شد۔

یہ باتیں منجملہ واردات کے ہیں تم اپنے کام میں لگے رہو۔ بغیر پوچھے قلب پر اس کا القاء ہو جائے گا۔

لباس لباس میں بھی مشائخ و علماء کا اتباع کرتے تھے۔ موٹا اور کھردرا گزی کا پیراہن عام طور سے زیب تن ہوتا اور سر پر پانچ یا سات گز کا عمامہ جس کا رنگ کبھی نیلگوں ہوتا اور کبھی سبز یہ دونوں رنگ شاہ صاحب کے نہایت دلپسند تھے اس کے برخلاف پیلے رنگ سے بہت نفرت تھی۔ فرماتے تھے کہ یہ جوگیوں اور سناسیوں کا لباس ہے

جس سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

غرض جملہ امور میں ظاہر شریعت اور کتاب و سنّت نمونۂ عمل تھے جن سے سرِمو انحراف بھی گوارا نہیں تھا، درحقیقت معیارِ ولایت کتاب و سنّت کی پابندی ہی ہے جیسا کہ بعض اکابر سے منقول ہے جو جتنا پابند سنت ہے اتنا ہی بڑا ولی و بزرگ ہے۔ اس معیار کے اعتبار سے شاہ صاحب ولایت و بزرگی کے مرتبۂ کمال پر فائز تھے کیونکہ اتباع سنّت ان کی طبیعت بن چکی تھی۔

شاہ یٰسین رقمطراز ہیں:-

در اقوال و افعال تابع سیرت نبویؐ و در حرکات و سکنات متبع سنّت مصطفوی بود ہر کارے کہ خواستی کرد اوّل میزان آں بعمل مسنون کردے۔ اگر موافق آمد اختیار می فرمود و الا از اں حذری کرد و ایں متابعت ملکۂ طبیعت اُو شدہ طریق او طریق اصحاب بود۔

(مناقب ص ۱۵)

اقوال و افعال میں سیرت نبوی کے اور حرکات و سکنات میں سنّت مصطفوی کے تابع تھے جس عمل کو کرنا چاہتے پہلے اُسے میزان سنت پر تولتے اگر موافق سنّت ہوتا تو اس پر عمل کرتے ورنہ اس سے پرہیز کرتے تھے اور یہ متابعت ان کی طبیعت راسخہ بن چکی تھی، حاصل یہ کہ آپ کا طریقہ اصحاب کرام رضی اللہ عنہ کا طریقہ تھا۔

پوچھ ان خرقہ پوشوں کو ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

(علامہ اقبالؒ)

ماہنامہ

شمارہ نمبر ۶ | بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۸۵ء مطابق ذی الحجہ ۱۴۰۵ھ | جلد نمبر ۶۹

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

قیمت فی پرچہ ۲/۵۰ ؛ سالانہ -/۲۵

سالانہ بدل اشتراک بیرون ممالک سے: سعودی عرب، کویت، ابوظہبی ایرمیل -/۱۱۵ جنوبی و مشرقی افریقہ، برطانیہ -/۱۲۵
امریکہ، کناڈا وغیرہ بذریعہ ایرمیل -/۱۴۵ - پاکستان بذریعہ ایرمیل -/۵۰ بنگلہ دیش -/۲۹

محبوب پریس دیوبند۔ سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زرِ تعاون ختم ہو گیا ہے

فہرست مضامین

ہندوستانی اور پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

(۱) ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پا کر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ فرمائیں۔

(۲) پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ ۵۰/- روپے مولانا عبدالستار صاحب مقام کرم علی والا تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان (پاکستان) کو بھیج دیں اور انہیں لکھیں کہ اس چندہ کو رسالہ دارالعلوم کے حساب میں جمع کرلیں۔

(۳) خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں۔ خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

(مدیر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف آغاز

از حبیب الرحمٰن القاسمی

عصر حاضر کو تحقیق و ترقی اور تہذیب و تمدن کا دور کہا جاتا ہے۔ نت نئی ایجادات و انکشافات نے آج کے انسان کے حوصلے بہت بلند کر دئے ہیں اور وہ زمین کی پہنائیوں اور سمندر کی گہرائیوں کو ناپنے کے بعد آفتاب و ماہتاب پر کمندیں ڈالنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ علم و فن کے ذریعہ دھات کے بے جان پرزوں سے انسانی دماغ کا کام لیا جا رہا ہے۔ مہینوں کی مسافت کو گھنٹوں میں طے کر لینا ایک معمولی بات ہے۔ ابلاغ و ارسال کے ایسے کامیاب ذرائع مہیّا کر لئے گئے ہیں کہ چند لمحوں میں اپنی بات پوری دنیا میں پھیلائی جا سکتی ہے۔ آرام و آسائش اور تزئین و آرائش کے ایسے ایسے سامان تیار ہو گئے ہیں کہ ایک صدی پہلے کا انسان ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اور اب تو تمدّن کا معیار اسقدر بلند ہو گیا ہے کہ آسمان سے باتیں کرتی عمارتیں اور ہواؤں کا پر کترتی میسرسیز کاریں اپنا عروج اور وقار کھوتی جا رہی ہیں، ماکولات، ملبوسات کی اتنی قسمیں بنالی گئی ہیں کہ انھیں شمار میں لانا بھی مشکل ہے۔ غرضیکہ آرام و راحت، اطمینان و سکون، تہذیب تزئین اور زیبائش و آرائش کے اسباب کی اس درجہ فراوانی اور کثرت کہ آج کے کورده اور پسماندہ دیہات بھی پہلے کے قصبات اور شہروں سے کہیں زیادہ پُر تکلف اور بارونق نظر آتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس مادی عروج و ترقی، ظاہری چمک دمک اور سامانِ راحت کی اس کثرت سے انسان کو چین و سکون اور امن و اطمینان حاصل ہو گیا ہے؟ قلب کو تسکین

اور روح کو آسودگی مل گئی ہے؟ اور کیا واقعی تہذیب وتمدن کے اُن پرشور نعروں کی بدولت آج کا انسان پہلے سے زیادہ شائستہ اور مہذب ہوگیا ہے؟ اگر آج کی متمدن اور ترقی یافتہ دُنیا کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں تو ان سارے سوالوں کا جواب آپ کو مایوس کن نفی میں ملیگا اور حیرت تو یہ ہے کہ آرام وراحت کے یہ اسباب جسقدر بڑھتے جارہے ہیں قلب کے اضطراب اور روح کی بےچینی میں بھی اس قدر اضافہ ہوتا جارہا ہے اور فریب تمدّن کے دام صدرنگ میں گرفتار انسانیت تڑپ رہی ہے، چیخ رہی ہے اور تلاش سکون میں در در کی ٹھوکریں کھارہی ہے۔ مگر یہ متاع گم شدہ کہیں سے ہاتھ لگ نہیں رہی ہے۔ عدل وامانت، صبر و قناعت، عفت وحیا، صدق وصفا، اخلاص ومحبّت، شرافت ومروّت، لحاظ وپاسداری، سیرچشمی وخودداری وغیرہ اعلیٰ قدریں جن سے انسانیت عبارت تھی ایک ایک کرکے رخصت ہوگئی ہیں۔ اور انسان اندر سے بالکل بے مایہ اور کھوکھلا ہوکر رہ گیا ہے۔

علم وفن، تحقیق وجستجو اور عروج وترقی کے اس دور میں آخر انسانیت کیوں تباہ ہورہی ہے، اس کی خلش روز بروز کیوں بڑھتی جارہی ہے اور اس کے اضطراب وانتشار میں آئے دن کیوں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اگر حقیقتاً ہمیں سچے سکون کی طلب ہے اور ہم روح کی آسودگی اور قلب کے چین کے متلاشی ہیں تو ہمیں ان اسباب وعوامل کی کھوج لگانی چاہئے جن کے ذریعہ یہ جنسِ گرانمایہ حاصل کی جاسکتی ہے۔ ہم نے ایک طویل عرصہ تک دھات د بھاپ پر محنت کرکے دیکھ لیا۔ زمین کے پوشیدہ خزانوں کی تحقیق کرڈالی۔ آفتاب کی کرنوں اور بجلی کی لہروں کو بھی آزما چکے ہیں۔ ان سب کے دامن اس گوہر نایاب سے خالی ہیں۔ ہم نے استعماریت واشتراکیت کا بھی تجربہ کرلیا ہے مگر ان آستانوں سے بھی یہ متاع عزیز ہمیں دستیاب نہیں ہوسکی۔

مگر ان مسلسل محرومیوں اور تجربات کی پیہم ناکامیوں سے مایوس ہوکر ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں ابھی ایک تجربہ اور کرنا چاہئے۔ عنقریب حاضر کے ان پُرفریب نعروں کے

درمیان حق وصداقت کی ایک مدہم سی آواز بھی سُنائی دے رہی ہے ۔ آیئے کان لگا کر سنیں ممکن ہے روح کو تسکین اور قلب کے آرام کا سامان یہیں سے فراہم ہو جائے ۔ قرآن حکیم بھٹکی ہوئی انسانیت کو دعوت دے رہا ہے کہ اے گم کردہ راہ انسانوں دُنیا کے ان گورکھ دھندوں میں پھنس کر اپنے آپ کو ضائع مت کرو اگر تمہیں سکونِ قلب کی تلاش ہے تو آؤ میرے پاس آؤ تمہارے گوہر مقصود کا پتہ میں اور صرف میں ہی بتا سکتا ہوں کیونکہ اس بیش بہا امانت کا امین وحافظ میں ہی ہوں ۔ کان کھول کر غور سے سُن لو " اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ " اللہ تعالیٰ ہی کی یاد سے قلوب چین پائیں گے ۔ یعنی دولت وحکومت منصب و جاگیر، مادی ایجادات واکتشافات ، ظاہری عروج وترقی ، اسباب راحت کی فراوانی ان میں سے کوئی چیز بھی انسان کو حقیقی سکون واطمینان سے ہم آغوش نہیں کر سکتی ۔ صرف یادِ الٰہی اور ذکر اللہ کا نور ہی دلوں سے ہر طرح کی وحشت ، گھبراہٹ اور اضطراب وانتشار کو دور کر سکتا ہے ۔

یہ اس کتاب مقدس کا اعلان ہے جس کی صداقت اور سچائی کو چودہ سو سال کی طویل مدت گذر جانے کے باوجود آج تک چیلنج نہیں کیا جا سکا ہے ۔ ابتدائے نزول سے آجتک اسکا ہر اعلان اور ہر پیشین گوئی حرف بحرف درست ہوتی رہی ہے ۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ایک بار صدق دلی سے اس کا بھی تجربہ کر لیا جائے ۔

قسط نمبر (۲)

مسلمانانِ ہند سے صاف صاف باتیں

از- مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

۴- مسرفانہ تقریبات

شریعت کی روح، دین کے مزاج اور انسانی و اخلاقی نقطۂ نظر سے کسی طرح اس کا جواز نہیں نکل سکتا کہ جب ہزاروں لاکھوں افراد کی زندگی کی بنیادی ضرورتیں پوری نہ ہو رہی ہوں، لاکھوں آدمیوں کو قوت لایموت حاصل نہ ہو رہی ہو، اور وہ جسم و جان کا رشتہ بھی قائم نہ رکھ سکتے ہوں، ملت کے لاکھوں بچے فیس اور کتابوں اور ضروری مصارف کے نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم سے محروم ہوں، ہزاروں ادارے جو ملت کے لئے روح کا حکم رکھتے ہیں اور بیسیوں منصوبے جن کی تکمیل کے بغیر اس ملت کا وجود مشکوک اور اس کا مستقبل تاریک ہے، موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوں، ہمارے اہل ثروت تجار اور ذی حیثیت لوگ اپنی اولاد کی شادیوں، خوشی کی تقریبوں اور رسومات کی تکمیل میں پانی کی طرح روپیہ بہائیں، زمانہ کے بہت سے تغیرات و انقلابات اور علم و ترقی کے باوجود مسرفانہ اور "شاہانہ" شادیوں اور تقریبوں کا رواج بند نہیں ہوا، البتہ بعض جگہ انھوں نے جدید (ماڈرن) طرز اختیار کر لیا ہے۔ اور سیاسی مصالح و مقاصد بھی کہیں کہیں ان سے وابستہ ہو گئے ہیں، آج بھی ہماری بہت سی برادریوں، تجارت پیشہ حلقوں اور عمائد شہر میں تقریبات پر جو ایک انسانی ضرورت اور دینی فریضہ تھا، دل کھول کر اور جان پر کھیل کر روپیہ خرچ کرنے کا رواج ہے، ان میں سے

بہت سے حضرات اپنی دوسری عملی زندگی میں دیندار اور صاحبِ خیر بھی ہیں، مگر انہوں نے اس شعبہ کو دین سے بالکل غیر متعلق سمجھ رکھا ہے اور اس میں اچھے اچھے لوگ ان آیات کا مصداق ہیں

أَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوٰىهُ (سورۃ الفرقان ۴۳)

آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہشِ نفسانی کو بنا رکھا ہے۔

بَلْ قَالُوٓا إِنَّا وَجَدْنَآ ءَابَآءَنَا عَلٰٓى أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلٰٓى ءَاثٰرِهِم مُّهْتَدُونَ (سورۃ الزخرف ـ ۲۲)

بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقہ پر پایا ہے، اور ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے رستہ چل رہے ہیں۔

حقیقتاً اس سلسلہ میں سخت قدم اٹھانے کی ضرورت ہے، ان فرائض و تقریبات کا تخیل و مفہوم یکسر بدلنے کی ضرورت ہے۔ اس کے خلاف اعلانِ جنگ اور اعلانِ بغاوت کی ضرورت ہے، اس بات کو صاف طریقہ پر واضح کردینے کی ضرورت ہے کہ یہ مسرفانہ تقریبات افراد کے لئے غضب الٰہی کا موجب اور ملت کے لئے وبال و ادبار کا باعث ہیں، اللہ تعالیٰ کی رحیم و حکیم ذات اور اس کی حکیمانہ شریعت ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتی کہ اس جھوٹے نام و نمود اور اس عارضی رونق و زینت یا کام و دہن کی فانی لذت پر وہ دولت صرف کیجائے جو سیکڑوں ضرورت مندوں کے کام آسکتی تھی۔

ایک مثالی واقعہ

خوش حال و سربرآوردہ مسلمانوں کے سامنے یہ واقعہ آنا چاہئے کہ مدینہ منورہ کی محدود و مختصر آبادی میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نکاح کرتے ہیں اور اس ذات گرامی کو اطلاع بھی نہیں ہوتی جس کی شرکت و موجودگی ہر بزم کے لئے باعثِ فخر و زینت تھی۔ خصوصاً ایک جلیل القدر صحابی اور مہاجر کے کاشانہ کا چراغ بجا طور پر تھی، جس نے ابھی ابھی اس نئے شہر میں قدم رکھا تھا اور جس کے سارے تعلقات اسی مہاجر برادری سے قائم تھے، اور یہاں کی رونق و برکت سب آپ کی ذات

عالی کے طفیل تھی جس سے ازدواجی زندگی کا یہ طریقہ اور اس کے یہ احکام معلوم ہوئے تھے۔ آج دور دراز کے عزیزوں اور دوستوں کو یہاں تک کہ ان ملکوں سے جہاں پاسپورٹ اور ویزا ہے مدعو کیا جاتا ہے، اور حضرت عبدالرحمٰن رضؓ کی شادی کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت ہوتی ہے جب ان کے کپڑوں پر خوشبو کا نشان ملاحظہ فرمایا جاتا ہے، پوچھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے شادی کرلی ہے، اس وقت برکت کی دعا کی جاتی ہے اور ولیمہ کے لئے ہدایت ہوتی ہے، خواہ ایک بکری ہی ذبح کرکے ہو[1]

اب وقت آگیا ہے کہ ان "حوصلہ مندیوں" پر جن کا ان مواقع پر اظہار کیا جاتا ہے، ہمارا ذمہ دار طبقہ اپنی پوری ناپسندیدگی اور بیزاری کا اظہار کرے، ان حوصلہ مند حضرات کو بھی سوچنا چاہیئے کہ ہندوستان کے موجودہ حالات مسلمانوں کی معاشی پستی اور بدحالی بلکہ ہلاکت اور ہلاکت کے دور میں اس کی کیا گنجائش ہے کہ کوئی فرد اپنے یہاں کی کسی ایک تقریب پر اتنے مصارف کردے جس سے ایک برادری کی پرورش یا مکمل ادارہ کا انصرام ہوسکتا ہے؛ ان کو آخرت کے مؤاخذہ اور حساب سے بھی ڈرنا چاہیئے۔ جب ایک ایک پائی کا حساب دینا ہوگا۔ اور افراد و ملت کی شدید ضروریات کی موجودگی میں اس دریادلی کا جواز پیش کرنا ہوگا جو اپنی ذات تک محدود تھی۔

۵۔ ملی اور اجتماعی تقاضوں اور ضرورتوں سے چشم پوشی اور ملت کی حفاظت و تقویت سے غفلت

قرآن مجید سے یہ بات صاف طریقہ سے ثابت ہوتی ہے کہ امت کے ملی اور اجتماعی تقاضوں اور دین کی حفاظت و اشاعت کے مطالبہ اور اس کی ضرورتوں میں اپنا مال صرف کرنے سے آنکھیں بند کرکے افراد کا اپنے ذاتی کاروبار اور اپنی معاشی ترقی و استحکام کی فکر و کوشش میں انہماک صریح خودکشی کے مرادف ہے اور جو جماعت یہ غلط راستہ اختیار کرتی ہے، وہ اپنے ہاتھوں ہلاکت کے غار میں گرتی ہے؛

[1] ملاحظہ ہو صحیح مسلم، باب النکاح علی وزن نواۃ من ذہب۔

اوراس شاخ پر تیشہ چلاتی ہے جس پر اس کا آشیانہ ہے بلکہ کھلے لفظوں میں وہ اپنے ہاتھوں زہرناب کا پیالہ پیتی ہے قرآن مجید کے صاف لفظ ہیں۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَ لَاتُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ ج
اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

(سورۃ البقرۃ ۱۹۵)

اس آیت کے محرم راز میزبان نبوت حضرت ابوایوب انصاری رضؓ تھے، انھوں نے قسطنطنیہ کے محاصرہ میں ان لوگوں کو ٹوکا جو اس آیت سے دین کے راستہ میں قربانی اور خطرہ میں پڑنے کی مخالفت نکالتے تھے، اور ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اس آیت کی رُو سے جو کسی دینی مقصد کیلئے اپنی جان پر کھیل جائے یا سر ہتھیلی پر رکھ کر نکلے وہ خودکشی کا مرتکب ہے، انھوں نے فرمایا کہ یہ آیت ہم انصار کے بارے میں نازل ہوئی تھی جب ایک عرصہ کی مالی قربانیوں اور عملی سرفروشیوں کے بعد اسلام کے قدم مدینہ میں جم گئے، اور اسلام کے سپاہی اور مجاہد پیدا ہو گئے، تو ہم نے سوچا کہ اب کچھ روز کے لئے ہم اسلام کی نصرت اور خدمت (اور گویا اس سلسلہ کے بے پایاں مصارف سے) عارضی رخصت لے کر کچھ عرصہ کیلئے اپنے ذاتی کاروبار، باغات، زراعت اور ان تجارتوں کو سنبھال لیں اور ان کی دیکھ بھال میں ہمہ تن مشغول ہو جائیں جو ہماری تبلیغی اور مجاہدانہ سرگرمیوں اور روز وشب کی مشغولیت کی وجہ سے سخت متاثر ہوئی تھیں اور ان پر کاری ضرب پڑی تھی، حضرات انصار کے دل میں یہ وسوسہ بھی نہیں آسکتا تھا کہ وہ اسلام کی خدمت اور اس کی قربانیوں سے مستقل طور پر سبکدوشی اور آزادی حاصل کر لیں۔ انھوں نے محض وقتی طور پر عارضی رخصت اور اجازت لینے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ ان صریح اور ڈرا دینے والے لفظوں میں ان کی تنبیہ کی گئی اور بتلایا گیا کہ دین و ملت کی مدد سے (عارضی) دست کشی اور انفرادی سرسبزی اور بہبود کا خیالی منصوبہ بھی

کھلی خودکشی کا مرادف ہے، اس سے غیر مشتبہ طریقہ پر یہ ثابت ہوگیا کہ افراد کا وجود ملت سے ہے اور ملت ہی کی حفاظت اور استحکام میں ان کی حفاظت اور استحکام کا راز مضمر ہے جس طرح پتوں کی سرسبزی و شادابی درخت سے وابستہ ہے، درخت سے جدا ہونے کے بعد کسی خارجی کوشش اور کسی بڑی سے بڑی ذہانت اور صنعت سے بھی ان کو سرسبز و شاداب نہیں رکھا جاسکتا، اسی طرح ملت کے افراد کی زندگی اور اس کا نمو دارتقا بھی ملت ہی سے مربوط ہے، اور ہر دور میں ان کے لئے پیام ازلی اور قانون زندگی یہی ہے کہ ع۔

پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

ملّت اسلامیہ کے افراد کسی ملک میں ملّت سے کٹ کر اور اس کے ملّی اور اجتماعی تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے محض انفرادی خوش حالی، معاشی ترقی، ذاتی سرمایہ اور تموّل، ذاتی منصب و اعزاز و شخصی حفاظت وضمانت پر کبھی زندہ محفوظ و باعزت و باوقار نہیں رہ سکتے، ملّت کے کھلے ہوئے اجتماعی تقاضوں اور ضرورتوں کی تکمیل سے افراد کا پہلوتہی کرنا اور ان کے بارے میں تغافل سے کام لینا اور اپنے ذاتی کاروبار کی ترقی اور اپنے محدود خاندانوں کی بہبود و آسائش پر اپنی تمام توجہ مرکوز کرلینا اور خیالی جنّت میں مست رہنا اور اسی کو حقیقی مسرّت و کامیابی سمجھنا اپنے حق میں کانٹے بونا اور پاؤں پر کلہاڑی مارنا ہے، ممالکِ اسلامیہ کی پوری تاریخ اور مسلمانوں کا سابق طرزِ عمل اس اعلان کی صداقت کی تصدیق کرتا ہے، جس نسل یا ملک کے مسلمانوں سے یہ غلطی ہوئی اور انھوں نے اس کوتاہ نظری اور کوتاہ اندیشی سے کام لیا وہ حرفِ غلط کی طرح مٹا دیئے گئے۔ اور ان کی زندگی کا تار پود بکھر کر رہ گیا، اندلس، بخارا اور سمرقند کی تاریخ اس پر شاہد عدل ہے۔

دانشمندانہ جدوجہد کی ضرورت

ہندوستان کے مسلمان اس وقت ایک فیصلہ کن مرحلہ سے گذر رہے ہیں، یہاں

ملت اسلامیہ ہندیہ کی بقا کے لئے ایک بڑی پرعزم لیکن دانشمندانہ جدوجہد کی ضرورت ہے، یہاں مسلمانوں کے ملی وجود ان کی اجتماعی شخصیت وانفرادیت کی بقا کے لئے کچھ کاموں کی تکمیل ضروری ہے، وہ اس ملک میں مسلمانوں کی حیثیت سے رہیں، محفوظ ہوں باعزت ہوں، مؤثر اور فیصلہ کن ہوں، حالات و واقعات سے عہدہ برآ ہوسکیں، زمانہ اور ایک ترقی کرنے والے ملک کے قافلہ کے ساتھ قدم ملا کر چل سکیں بلکہ ضرورت ہو تو ان کی رہنمائی اور کارواں سالاری کا فرض بھی انجام دے سکیں، قیادت کی ذمہ داریاں بھی سنبھال سکیں اور اس ملک کو مہیب خطرہ اور مہلک زوال سے بچا سکیں، اس کے لئے چند تعلیمی وتعمیری کوششوں اور تحریکوں اور عظیم اداروں اور فکری مرکزوں کی ضرورت ہے، ان تحریکوں اور اداروں کا وجود اور ان کا استحکام وترقی اس ملت کے وجود کے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے، جو ہوا اور پانی ایک زندہ انسان کے لئے، اگر یہ تحریکیں اور ادارے سرسبز، توانا اور روبہ ترقی ہیں تو ملت کا وجود محفوظ، اس کا مستقبل روشن اور ملک میں اس کا مقام معین ہے، کسی اکثریت یا فرقہ کا تعصب وتنگ نظری یا حکومت کی کمزوری یا جانب داری اس کے وجود کو ختم یا اس کے مستقبل کو تاریک نہیں بنا سکتی، اور کوئی بڑے سے بڑا فرقہ وارانہ فساد اس کی قسمت پر مہر نہیں لگا سکتا۔

لیکن اگر اس ملت کے افراد اپنے ذاتی مستقبل کی تعمیر میں ہمہ تن مشغول ومنہمک ہیں، اس کے متمول اور باستطاعت افراد ملی تقاضوں اور ضرورتوں سے غافل ہیں، وہ اپنی "خواہشات" اور "حوصلہ مندیوں" پر تو بے دریغ اور شاہانہ اولوالعزمیوں کے ساتھ روپیہ صرف کرسکتے ہیں، لیکن احیاء وبقائے ملت کی تحریکیں اور ادارے سرمایہ کی کمی کی وجہ سے دم توڑ رہے ہیں۔

تو پھر یہ افراد (خواہ سرمایہ کے لحاظ سے قارون وقت ہوں) ہر وقت خطرہ سے دوچار ہیں، اللہ کی نگاہ میں ان کی پرکاہ کے برابر بھی قیمت نہیں، حالات کی کوئی

خفیف سی تبدیلی اور واقعات کی کوئی ہلکی سی لہر بھی ان کے ان چھوٹے چھوٹے مصنوعی حصاروں کو ریت کی دیواروں کی طرح بہا کرلے جائے گی، اور کسی دن جب آنکھ کھلے گی تو ان کو نظر آئے گا کہ وہ دفعتہً ہر چیز سے محروم ہو گئے ہیں، اور ایک تن آسان اور خدا فراموش اور فرض نا آشنا قوم کی طرح ان کا حال بھی یہی ہوگا۔

فَأَتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ۔ (الحشر۔ ۲)

تو ان پر آیا اللہ کا عذاب ایسی جگہ سے کہ ان کو گمان بھی نہ تھا، اور اللہ نے ڈال دیا ان کے دلوں میں رعب۔

۶۔ تعمیری و تعلیمی اداروں اور مرکزوں کی زبوں حالی اور حفاظت واشاعت اسلام کی کوششوں کی کس مپرسی

ہندوستان کی یہی صورت حال ان لوگوں کو (جن کی سنت اللہ اور آئین الٰہی پر ذرا بھی نظر ہے) لرزہ براندام کئے ہوئے ہے، ہندوستانی مسلمان ساری سیاسی تبدیلیوں اور معاشی انقلاب کے باوجود اب بھی اتنے سرمایہ کے مالک ہیں کہ یہاں احیاء و بقائے اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کی ہر تحریک اور یہاں کے مرکزی دینی و تعلیمی ادارے بخوبی چل سکتے ہیں، اور ایک لمحہ کے لئے ان کو مالی بحران سے دوچار ہونے، دوسرے ملکوں کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں، نہ اپنے اصلاحی و تعمیری پروگرام میں اختصار یا التواء کی ضرورت ہے، لیکن کتنی تحریکیں ہیں جن کی کامیابی کے بغیر مسلمانوں کا تعلیمی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا، کتنے ادارے ہیں جن کے بغیر مستقبل میں مسلمانوں کے متعلق یہ کہنا ممکن نہ ہوگا کہ ؎

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی۔

کتنے مرکز ہیں جو تعلیم یافتہ مسلمانوں اور نوجوانوں کو ذہنی تہذیبی ارتداد سے (جو سیلاب کی طرح آرہا ہے) بچانے میں مدد دے سکتے ہیں۔ نوجوانوں کے ذہن میں اسلام اور اس کے مستقبل پر اعتماد (جس کو مغربی تعلیم و افکار نے متزلزل کر دیا ہے)

بحال کر سکتے ہیں۔ مستشرقین کے پھیلائے زہر کیلئے (جوان سب دماغوں کو مسموم کر رہا ہے، جن کے ہاتھ میں مسلم ممالک کی قیادت ہے) تریاق مہیا کر سکتے ہیں، اور ان کا علمی محاسبہ کر کے ان کو بے اثر بنا سکتے ہیں، کتنے مرکز ہیں جو بدلے ہوئے حالات میں اسلام کے ابدی قانون اور زندگی کے رواں دواں قافلہ کے درمیان رفاقت اور مطابقت پیدا کر سکتے ہیں، اور اس طبقہ کو جو واقعات و حقائق سے دوچار ہے نئی رہنمائی نیا اعتماد اور نیا ایمان عطا کر سکتے ہیں، اور اس کام کو دوبارہ جاری کر سکتے ہیں جو متکلمین اسلام نے اپنے اپنے وقت میں انجام دیا، کتنے افراد و ادارے ہیں جو مغربی زبانوں اور ہندوستان کی مقامی بولیوں میں اسلام اور قرآن و سیرت نبوی کا تعارف کرا سکتے ہیں، اور ان سب سعید روحوں کو اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں جو حق کی جویا اور جمال جہاں آرا نبوی کی نادیدہ عاشق ہیں، زیر تعلیم مسلمان نوجوانوں کی حفاظت و تربیت کیلئے کتنے منصوبے ہیں جو اُن کو الحاد و فساد کا لقمۂ تر بننے سے بچا سکتے ہیں اور ان کے اندر ایمان کی چنگاری کی حفاظت کر سکتے ہیں، لیکن یہ سب تحریکیں اور ادارے یا تو وسائل کے فقدان کی وجہ سے ایک خواب شیریں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے یا اگر کہیں وجود میں آ گئے ہیں تو مفلس کے چراغ کی طرح ٹمٹما رہے ہیں۔

دنیا میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے کہ کسی ملک میں پندرہ کروڑ کی ایک اقلیت پائی جاتی ہو، جن میں لاکھوں کی تعداد میں بڑے سرمایہ دار اور لاکھوں کی تعداد میں بڑے تعلیم یافتہ حضرات موجود ہوں، سیاسی حالات اور پچھلی تاریخ نے اس کے گرد تعصبات اور غلط فہمیوں کا جال پھیلا دیا ہو، سیاسی جماعتوں کی مصلحتوں اور تنگ نظر فرقہ پرستی نے اس کو کوہ آتش فشاں کے دہانہ پر کھڑا کر دیا ہو، ہر وقت اس کے متعلق بڑی سے بڑی غلط فہمی پیدا کرنے کا امکان

وہ اگر مظلوم ومعصوم ہو تو اس کو ظالم وخونخوار ثابت کرنا، وہ اگر اپنی حفاظت خود اختیاری کا فرض بھی انجام نہ دے تب بھی اس کو دست درازی اور لشکر کشی کا مجرم ٹھہرانا، وہ اگر مقتول ہو تو اس کو قاتل گردانا آسان ہو، اس کا مخالف پریس ہر وقت رائی کو پربت اور افسانہ کو حقیقت بنا سکے، لیکن اس سب کے باوجود اس ملت کے پاس کوئی طاقتور پریس نہ ہو، اس برّعظیم کے طول وعرض میں اس کا ایک بھی انگریزی روزنامہ نہ ہو، ہندی میں اس کی آواز پہونچانی مشکل ہو، ملک کے ذمہ دار صاحب اختیار حلقہ اور ارباب حکومت تک (ان کی مانوس زبان میں) حرف شکایت پہونچانا اور صحیح صورت حال سے آگاہ کرنا بھی ممکن نہ ہو، لیکن ہر طریقہ سے اس ملت کی خوش حالی کا اظہار ہوتا اور معاشی منصوبوں سے لے کر دینی شعبوں اور خیراتی کاموں تک وہ اپنی زندگی اور اولوالعزمی کا ثبوت دیتی رہتی ہو، دینی جذبہ اور سیاسی شعور سے قطع نظر اس ملت کی عقل عام (COMMON SENSE) کے متعلق کیا کہا جائے گا۔

خامہ انگشت بدنداں ہے اُسے کیا لکھئے ناطقہ سربگریباں ہے اسے کیا کہئے

پھر اس ملت کو کسی دوسرے فرقہ، کسی جماعت یا حکومت کی شکایت کرنے کا کیا حق ہے اور کسی بڑے سے بڑے واقعہ پر چیں بہ جبیں ہونے کا کیا موقعہ ہے؛ ملک کے کسی گوشہ میں فرقہ وارانہ فساد کا ہو جانا ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے کہ اس پر جتنی توجہ کی جائے کم ہے۔ مظلوم ومتاثر مسلمانوں کی ہر قسم کی امداد نہ صرف دینی بلکہ اخلاقی وانسانی فرض ہے۔ مسلمان اپنا پیٹ کاٹ کر اور اپنے بچوں کو بھوکا رکھ کر بھی اگر اس فسادزدہ علاقہ کی مدد کریں تو بے جا نہیں، فسادزدہ علاقوں کے لئے ہندوستانی مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ ادائے فرض اور احساس فرض کی معمولی مثال ہے جس پر کوئی تعجب ہونا نہیں چاہئے، جو کچھ ہوا وہ کم ہے، اس سے بھی زیادہ حمیت دینی اور

ایثار و قربانی کی ضرورت ہے، لیکن یہ بات اس وقت خواہ کیسی بھی سمجھی جائے بہرحال حقیقت ہے کہ یہ مسئلہ کا حل نہیں، اندیشہ ہے کہ فساد زدہ علاقوں کی مدد کہیں خدا نخواستہ ایک "سالانہ عرس" نہ بن جائے جس میں مسلمانوں کی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں مصروف ہو کر رہ جائیں۔

مسلسل عمل جراحی اور مسلسل مرہم گری زندہ قوموں کے شایان شان نہیں

ہمیں اس صورت حال کو کسی حال میں گوارا نہ کرنا چاہیئے اور اس کو روایت نہیں بننے دینا چاہیئے، وہ ملت بڑی قابل رحم اور بڑی بدقسمت ہے جو ایک طرف مجروح و مظلوم ہو اور دوسری طرف ملت کے سارے وسائل اس کی چارہ سازی میں صرف ہوں، ایک طرف زخم لگے اور دوسری طرف مرہم لاکر رکھا جائے، یہ ملت ہرگز اس مسلسل عمل جراحی اور مسلسل مرہم گری کے لئے پیدا نہیں ہوئی، فسادات کے سلسلہ کو ہمیشہ کے لئے بند کرنے کے لئے ملت کے حالات میں مستقل تبدیلی کی ضرورت ہے، ان ناکوں کے بند کرنے کی ضرورت ہے جن سے یہ فسادات ملت کے حصار میں داخل ہوتے ہیں، یہ ناکے بیرونی سے زیادہ اندرونی ہیں، ایسی فضا اور صورت حال کے پیدا کرنے کے لئے کہ فسادات کا امکان ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ احیاء و بقائے اسلام اور حفاظت مسلمین کی ٹھوس تعمیری انقلاب انگیز اور مستقل اور مسلسل تحریکوں اور اداروں کی ضرورت ہے اور جب تک یہ تحریکیں فروغ نہیں پائیں گی۔ اور اتنی طاقتور و مؤثر نہ بن جائیں گی کہ سپر کا کام دے سکیں۔ اس وقت تک یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔

قریبی واقعات نے پھر ایک بار اس کا موقعہ پیدا کر دیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان پوری صورتِ حال کا دیانت دارانہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیں۔ اور قرآن و حدیث کی روشنی میں موجودہ واقعات کے حقیقی اسباب تلاش کریں اور ان کے مستقل

انسداد وازالہ کے طریقوں پر غور کریں اور سطحی ووقتی وجذباتی طریقوں کے بجائے اللہ کی کتاب سے رہنمائی حاصل کرکے صحیح طریق علاج اختیار کریں، مسلمانوں کا طریق فکر ونظر عام اقوام عالم کی طرح نہیں ہوسکتا، نہ اُن کی بیماریاں اور مصائب وپریشانیاں عام ملل واقوام کی طرح محض تکوینی وطبعی ہیں، نہ ان کا علاج محض طبعی وتکوینی ہے، اس ملت کے بگاڑ کا سبب اور اس کی پریشانیوں کا سرچشمہ بھی الگ ہے، اور اس کے انسداد کے طریقے بھی الگ!

۹۔ حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت اور جوشِ خطابت

ہندوستانی مسلمانوں کی ان کمزوریوں میں جو اس اخیر دور میں (اور کہا جاسکتا ہے کہ تحریک خلافت کے بعد سے جس کا بلاشبہ ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری میں بڑا حصہ ہے) ان کا قومی مزاج بن گئی ہیں، ان کی حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت اور جوش خطابت ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حوادث اور مخالفتوں کا مقابلہ کرنے اور نازک و اہم ذمہ داریوں اور آزمائشوں سے عزت کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کے لئے عزم راسخ، جذبۂ قوی، مہم جوئی، خطرپسندی کا بڑا دخل ہے، اور قوموں اور ملتوں کی تاریخ میں اس کی کھلی شہادتیں ملتی ہیں، لیکن دانشمند اور فرزانہ قیادتوں کو اس جذباتیت، قلبی جوش و تاثر اور اس کے لئے مؤثر اور شعلہ نوا خطابت سے بڑے احتیاط وتناسب کے ساتھ کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ کچھ دنوں کے بعد یہ جذباتی ہیجان اور یہ آتش نوائی اپنا اثر کھودیتی ہے اور "بھیڑیا آیا! بھیڑیا آیا!" کی قدیم کہانی دہرائی جاتی ہے۔

خاص طور پر جس ملک میں مختلف فرقے اور قومیں آباد ہیں، اور جہاں حالات کی تبدیلی کے لئے جمہوری طریقے بھی مؤثر ومفید ہوں وہاں اور زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، بعض وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان قوم پیدائشی خطیب اور مقرر ہے۔ اور اس کا ہر فرد پورے جوش وخروش کے ساتھ تقریر کرسکتا ہے، اس کے بالمقابل ہم دیکھتے

ہیں کہ جن قوموں نے بڑے بڑے سیاسی معرکے سر کئے اور مخالف طاقتوں کو اپنے سامنے جھکا لیا، انھوں نے اس سے کم جوشِ خطابت اور الفاظ کی بازیگری سے کام لیا اور وہ اب بھی متوازن اور بقدر ضرورت خطابت سے بڑے بڑے مسائل حل کر رہی ہیں، لیکن ہماری قومی مجالس اور ان کی "دھواں دھار" تقریروں کے نتیجہ میں خود مسلمانوں کا مذاق اس گرم مسالہ اور تیز مرچ کھانے والے کا سا ہوگیا ہے، جس کو اس سے کم پر تسکین نہیں ہوتی اور وہ ہر وقت ہَل مِن مَزید کا نعرہ لگاتا رہتا ہے۔

۱۰۔ طویل المیعاد اور صبر آزما جدوجہد سے عدم مناسبت

اس حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت اور جوشِ خطابت کا ایک قدرتی و نفسیاتی نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایسے کاموں سے مناسبت ختم یا کم ہوتی جارہی ہے جو صبر و استقلال، مسلسل جدوجہد، اور ایک طویل المیعاد سعی و عمل کے محتاج ہیں، اور جن کے فوری نتائج نکلنے کا بہت کم امکان ہے، اور جو بعض اوقات پہاڑ تراش کر جوئے شیر لانے کے مرادف ہوتے ہیں، اس کے مقابلہ میں ان کو سر کٹا دینا اور گھر لٹا دینا آسان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ دن کسی تکلیف کو برداشت کرنا اور کسی کام میں محنت کرنا ان کے ملی مزاج کے خلاف ہوگیا ہے۔

یہ افتادِ طبع اور ایک بڑے پیمانہ پر یہ صورت حال بڑی تشویشناک ہے، اس لئے قوموں اور ملتوں کو عزت کا مقام حاصل کرنے اور ملی مسائل کو حل کرنے اور اپنے ملی تشخصات کی حفاظت اور ایک باعظمت صاحب دعوت، اور حامل پیغام ملت کی طرح زندگی گذارنے کیلئے فوری قربانیوں اور جوش و جذبات کے مظاہرہ سے زیادہ خاموش، مسلسل جدوجہد اور صبر و استقلال کی ضرورت ہے۔

یہ مسلّمہ حقیقت اور عالمگیر صداقت ہے کہ اقلیت کو عزت کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے اکثریت کے مقابلہ میں دوگونہ بلکہ چہار گونہ محنت اور جانفشانی کی

ضرورت ہوتی ہے، اسی اصول پر (ناگواری اور مجبوری کے ساتھ کہنا پڑتا ہے) یہودیوں نے امریکہ میں، اور بیشتر مغربی ممالک میں اپنی زندگی، صلاحیت اور مشکل پسندی کا ثبوت دیا اور اس نے ملک وحکومت میں وہ اثر ونفوذ حاصل کرلیا جس کا اس کے عددی تناسب کے ساتھ کوئی میل نہ تھا، لیکن شاید ہندوستان واحد ملک ہے جہاں مسلمان اقلیت اکثریت کے مقابلہ میں دوگونہ اور سہ گونہ محنت کے بجائے برابر کی محنت بھی نہیں کرتی، اور اس کا نتیجہ ہے کہ وہ مقابلہ کے امتحانوں میں امتیاز حاصل کرنے اور بڑے اور ذمہ دارانہ عہدوں میں حصّہ پانے سے محروم ہوتی جارہی ہے، اور اگر یہی لیل ونہار رہے تو اندیشہ ہے کہ ہندوستان کی پسماندہ اور اچھوت اقوام کی صف میں آجائے یا اس سے بھی پیچھے جائے، جو بڑی تشویش اور فکر کی بات ہے۔

۱۱۔ تعاون اور اعتماد کی کمی، اجتماعی مفاد پر ذاتی مفاد کی ترجیح اور کردار کشی: قومی زوال کی علامتوں میں سے ایک تشویشناک علامت یہ ہے کہ مسلمانوں میں اجتماعی وملی کاموں کو باہم دگر تعاون اور جذبۂ اعتماد کے ساتھ انجام دینے کی صلاحیت روز بروز مفقود ہوتی جارہی ہے اور اس کے نتیجہ میں اس کے عظیم سے عظیم تر ادارے ---------- (خواہ وہ تعلیمی ادارے ہوں یا رفاہی تنظیمات) موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں، اور ان کی کشتی طوفان سے ہر وقت اس طرح دوچار رہتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے اب ڈوبی تب ڈوبی، اس کا بڑا سبب (اکثریتی فرقے کے برخلاف) ان اداروں کے سربراہوں کی دیانت وخلوص اور انتظامی صلاحیت پر اعتماد کی کمی ہے، اور ان کے ہر اقدام اور فیصلہ کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھنے کی عادت اور اس کی توقع اور مطالبہ ہے کہ وہ ہر ایک کو مطمئن اور راضی کریں، اور سرپرستوں، سیاسی رہنماؤں اور بااثر افراد کی خواہشات ومفادات پر ادارہ کے مصالح اور مفادات کو بے تکلف قربان کردیں۔

قومی زوال کی ابتدائی و واضح علامتوں میں سے ایک علامت ملّی اداروں کے چلانے کی صلاحیت کا فقدان ہے۔ جس میں سب سے زیادہ اعتماد باہمی، جذبۂ تعاون اور کسی حد تک ایثار و قربانی اور تحمل وضبطِ نفس کی ضرورت ہے۔ اگر کسی ادارہ کو خوش قسمتی سے کوئی مخلص کارگزار و کارکن مل گیا، لیکن وہ تمام قومی نمائندوں، طلبہ کے سرپرستوں اور کمیٹی کے ارکان کو بیک وقت مطمئن نہیں کر سکا اور اس کو ادارہ کے مفاد میں کچھ اصلاحی قدم اٹھانے پڑے تو اس کی تمام خوبیوں، خلوص و دیانت پر پانی پھیر دیا جاتا ہے، اور اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی جاتی۔

نہ صرف ادارہ کے ذمہ داروں بلکہ ملّت کے عام قائدین اور خدمت گزاروں کے بارے میں ملّت کا دُہرا معیار ہے۔ اپنے لئے ہر طرح کی گنجائش، ہر چیز کا جواز اور توسّع لیکن ذمّہ داروں، قائدین سے حضرت فاروق اعظمؓ کا نہیں تو سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے زہد و ورع اور طرزِ زندگی کا مطالبہ، ایک اُردو محاورہ کے مطابق اپنے لئے "بخشش سو سو" اور خادمین ملّت کے معاملہ میں "حساب جُو جُو" اس طرزِ فکر اور طرزِ عمل نے اداروں اور تعمیری کوششوں کو بھی ہر وقت خطرہ میں مبتلا کر دیا ہے اور ملّت کی خدمت کے آرزومندوں کو بھی کسی ذمہ داری کے قبول کرنے کے بارے میں سو مرتبہ غور کرنے اور تمام عواقب و نتائج اور پچھلے کارکنوں کے انجام کو دیکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔

بات صرف بے اعتمادی، خوردہ گیری اور احتساب کی شدّت تک محدود نہیں ہے افتراء، اتہام، کردار کشی۔ (ASSASINATION-CHARACTER) تک پہنچ گئی ہے، کسی ملّی رہنما، سیاسی قائد اور دینی شخصیت کے بارے میں راہ چلتے بھی کچھ سن لیا جائے تو بات کا بتنگڑ اور رائی کا پربت بنا لیا جاتا ہے اور کڑی سے کڑی ملا کر ایک داستان وضع کر لی جاتی ہے، جس کی ساری بنیاد قیاس آرائی، سیاسی مقصد برآری یا صحافتی گرمیِ محفل پر ہوتی ہے۔

لیکن اکثریتی فرقے کا اپنے رہنماؤں اور قومی کارکنوں کے بارے میں طرز عمل واضح طور پر اس سے مختلف ہے؛ اپنی دوسری کمزوریوں کے باوجود اس بارے میں وہ نمایاں طور پر محتاط، فراخ دل، وسیع النظر اور نتائج کا انتظار کرنے والے ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ ان کے قومی رہنماؤں اور سماجی کارکنوں کو اپنے منصوبوں کی تکمیل کا پورا موقعہ ملتا ہے، اور وہ ان کو بام عروج تک پہونچاتے ہیں، اور ان کی قوم ان کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کرتی اور ان کی شکر گزار ہوتی ہے، سیاسی تحریکات کے رہنماؤں سے لے کر قومی یونیورسیٹیوں کے بانیوں اور اصلاحی مرکزوں، آشرموں کے بانیوں سے لے کر فرقہ پرست جماعتوں احیائیت REVIVALISM کے داعیوں تک یہ کلیہ عام ہے، اس قومی تفاوت پر اقبال کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

دیکھ مسجد میں شکست رشتۂ تسبیح شیخ بت کدہ میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

۱۲- ماحول کو مانوس و متأثر اور ہم وطنوں کو اسلام اور مسلمانوں سے متعارف کرنے کی کوشش کا فقدان

مسلمانان ہند کی ایک بڑی کمزوری، کوتاہ اندیشی اور عواقب سے چشم پوشی یہ ہے کہ وہ اپنے ماحول کو (جس کا غالب عنصر نہ صرف ان سے مذہبی اختلاف رکھتا ہے، بلکہ بہت سے تاریخی اور سیاسی اسباب کی بنا پر بدگمانی اور خوف میں مبتلا ہے) اپنے سے مانوس اور اپنے دین کے اصولوں اور بنیادوں، اپنے دینی پیشوا کی سیرت، اور اپنی تاریخ کی عظیم شخصیتوں سے روشناس کرنے اور اس ملک میں آنے کے بعد انھوں نے جو تعمیری و انتظامی کردار ادا کیا، اس ملک و معاشرہ کو جو تحائف دیئے، اور اب بھی ان کا وجود ملکی اور غیر ملکی سطح پر جو کردار ادا کر سکتا ہے، اسکے واقف کرانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کر رہے ہیں، انھوں نے سنجیدہ طور پر یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ اپنی دینی تعلیمات کی بنا پر اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود اب بھی سیرت و اخلاق کے کون سے امتیازی پہلو رکھتے ہیں، اور ان سے

کام لے کر ملک کے تیزی کے ساتھ گرتے ہوئے سماج کو مہیب زوال سے بچایا جاسکتا ہے، ان کے اخلاق اور سیرت کی خوشبو عام معاشرہ میں نہیں پہونچی، غیر مسلم بھائیوں نے مسلمانوں کو سیاسی میدان میں دیکھا یا انتخابی معرکہ (الیکشن) کے موقعہ پر یا بازاروں، دفتروں میں اور وہاں ان کو کوئی بڑا امتیاز نظر نہیں آیا، عام طور پر غیر مسلم اسلام کی بنیادی تعلیمات تک سے ناواقف ہیں، اور اس کا ثبوت برابر ملتا رہتا ہے، وہ مسلمانوں سے متعلق اتنا جانتے ہیں کہ مسلمان ختنہ کراتا ہے، گائے کا گوشت کھانا ضروری سمجھتا ہے، اور کچھ بات ہو جائے تو اسے بڑی جلدی غصہ آجاتا ہے، مسجد کے سامنے دوسروں کا باجہ نہیں سن سکتا، چاہے خود بجائے، ہم ابھی تک انھیں اذان کا مطلب تک نہیں سمجھا سکے جو پانچوں وقت (اکثر جگہ لاؤڈ اسپیکر سے) ہوتی ہے۔

اس بے خبری اور منافرت میں (جو ملک کے لئے بھی سخت مضر ہے) ہمارے ہم وطنوں کی غفلت اور احساس برتری کا بھی دخل ہے، فرقہ پرست رہنماؤں کا بھی قصور ہے، سیاسی الیکشنی نظام کا بھی عیب ہے۔ تعلیمی نصاب اور کورس کی کتابوں کی بھی ذمہ داری ہے۔ لیکن اس وقت ہمارے مخاطب مسلمان ہیں، ہم نے اپنے ہم وطنوں کو اپنے سے مانوس اور اسلام سے متعارف نہیں کرایا، ایسا طرز زندگی ہم عمومی طور پر سامنے نہیں لائے جس میں کشش ہو اور جو اس دین اور اس انقلاب کے سرچشمہ سے واقفیت کا تجسس (CURIOSITY) پیدا کرے، مطالعہ کا شوق، یا کم سے کم پوچھنے اور غور کرنے پر آمادہ کرے۔

ماحول کو مانوس اور قریب کرنے کا عمل، اصول و کردار کی کسی قربانی اپنے کسی شعار اور امتیاز سے دست برداری، سیاسی سودے بازی اور ضمیر فروشی کے بغیر بھی ہو سکتا ہے، اس کے لئے صرف عملی نمونوں، اخلاقی پختگی و بلندی، تھوڑے سے ایثار و قربانی، گہری اور عاقلانہ حب الوطنی، دانشمندانہ اور خود دارانہ اختلاط، باہم آمیزی

سماجی ورفاہی کاموں میں نہ صرف شرکت بلکہ قائدانہ کردار ادا کرنے کی سعی اور اس ملک کو اس مہیب اخلاقی زوال سے بچانے کی مخلصانہ کوشش کی ضرورت ہے، جو بظاہر بالکل قریب آگیا ہے، اور جس سے صرف وہی ملّت بچا سکتی ہے، جو دولت کو مقصود حیات اس زندگی ہی کو حقیقی زندگی، ذاتی مفاد ہی کو مقصود اصلی نہیں سمجھتی اور جس کے پاس ہزار خرابیوں اور کمزوریوں کے باوجود آسمانی تعلیمات کا سرمایہ، نبوت کا فیض اور ایمان کی رمق موجود ہے۔

یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہے۔ جس کے سمجھنے کے لئے بڑی ذہانت، اور جس کے دیکھنے کے لئے کسی خاص بصیرت کی ضرورت نہیں کہ ملی استحکام کی ساری کوششوں، اعلیٰ تعلیمی اداروں، قومی سرمایوں، تصنیفی و تحقیقی سرگرمیوں اور ذہین ترین فاضل ترین، بلکہ ولی صفت انسانوں کی بکثرت موجودگی کے باوجود، اگر ماحول نا آشنا بلکہ متنفر و متوحش ہے تو فرقہ وارانہ تعصّب کے جنون کی ایک لہر، نفرت کی ایک آندھی اور ہیسٹیریا کا ایک حملہ، گھنٹوں میں اس ساری صورت حال کو تبدیل کر سکتا ہے، اور سیکڑوں برس کی تعمیری کوششوں کو آن کی آن میں معدوم کر سکتا ہے، اور مختلف مقامات پر محدود پیمانہ پر ہونے والے فسادات نے اس کو بدیہی حقیقت بنا کر دکھا دیا ہے۔

اس لئے اس وقت سارے دینی اداروں، تعلیمی و دعوتی سرگرمیوں، کتب خانوں بلکہ مساجد و مدارس کی حفاظت اور عزّت و ناموس کے تحفظ کی ضمانت وہ وسیع بیرونی آہنی حصار ہے، جس کے اندر یہ سب دینی مرکز، ملّی اثاثہ، اور عزّت و ناموس محفوظ ہو، ماحول کا ضروری حد تک مانوس و آشنا ہونا، اس سارے اثاثہ کو قیمتی سمجھنا جو ملک ہی کا ایک قیمتی سرمایہ ہے، اور ملّتِ اسلامیہ کی افادیت و ضرورت کا اعتراف ضروری ہے۔

پھر ان ساری کوششوں اور مشغولیتوں کے جاری رہنے اور پایۂ تکمیل کو پہونچنے، کسی ادارہ کو قائم کرنے اس کو ترقی دینے، اپنی بات دوسروں تک پہونچانے کے لئے پہلی شرط

یہ ہے کہ ملک میں معتدل و پرسکون (NORMAL) حالات ہوں، بات کرنے، اپنی بات سنانے اور سننے والے اس کو اطمینان کے ساتھ سننے اور اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے موڈ میں ہوں۔

۱۳۔ ملک کے حالات کے جائزہ اور حقائق پر گہری نظر کی ضرورت

پھر صرف ملوں کا مانوس اور متعارف ہونا کافی نہیں، ضرورت ہے کہ خود مسلمان بھی زندگی کے حقائق، ملک کے حالات اور ماحول کے تقاضوں سے باخبر و روشناس رہیں، مسلم معاشرہ کا رابطہ زندگی اور ماحول سے کٹنے نہ پائے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جہاں مسلمانوں نے سب کچھ کیا لیکن زندگی کے حقائق سے روشناس نہیں ہوتے، اور اس ماحول میں اپنے قائدانہ فرائض انجام دینے کی کوشش نہیں کی، انھوں نے ایک اچھا شہری، ایک مفید عنصر بننے اور اس ملک کی قیادت حاصل کرنے کی اہلیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، وہاں اس ملک نے اُن کو اس طرح اگل دیا جیسے لقمہ اگلا جاتا ہے، اور ان کو اگل کر باہر پھینک دیا، اسلئے کہ انھوں نے اپنی جگہ نہیں بنائی تھی، اگر مسلمانوں نے زندگی کے حقائق سے آنکھیں بند رکھیں، ملک میں ہونے والے انقلابات، نئے بننے والے قوانین، بدلتے ہوئے نظام تعلیم، زبان و رسم الخط، عوام کے دل و دماغ پر حکومت کرنے والے رجحانات، ذرائع ابلاغ اور ملکی پریس کی طرف سے روزانہ دی جانے والی خوراک سے انھوں نے آنکھیں بند رکھیں تو قیادت تو الگ رہی اور جو خیر امت کا فرض منصبی ہے، ملی وجود کی حفاظت بھی مشکل ہو جائے گی، اور ان کی آئندہ نسل ذہنی ارتداد و انتشار کا نہیں بلکہ (خاکم بدہن) اعتقادی و دینی ارتداد کا بھی لقمہ تر بننے سے محفوظ نہیں رہے گی۔

آخری بات یہ ہے کہ مسلمانوں کیلئے اس ملک میں باعزت طریقہ پر رہنے کا یہی راستہ ہے کہ وہ اپنی افادیت ثابت کریں، اور اخلاقی قیادت کے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کریں، جو عرصۂ دراز سے اس ملک میں چلا آرہا ہے۔ اور اب اس حد کو پہونچ گیا ہے کہ اس کی کشتیٔ حیات ڈانواڈول ہو رہی ہے، کسی ملک میں کوئی اقلیت یا فرقہ اپنی واضح افادیت و ضرورت اور بے لاگ و بے غرض دعوت و قیادت کے بغیر عزت و اطمینان کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اقبال نے صحیح کہا ہے۔ ؎

—— زندگی جہد است استحقاق نیست۔ ——

مولانا عبدالقیوم حقانی فاضل و مدرس دارالعلوم حقانیہ

علامہ سمعانیؒ سے ایک ملاقات

دارالعلوم حقانیہ کے کتب خانہ میں

موچیوں، کسانوں، چرواہوں، دست کاروں، صنعت کاروں، تاجروں، کاریگروں، پارچہ بافوں، پارچہ فروشوں، درزیوں، دھوبیوں، روغن سازوں، قصابوں، حلوائیوں، آٹا پیسنے والوں، صابون سازوں اور صابون فروشوں، صیقل گروں، شیشہ گروں، لوہاروں، بڑھیوں، لکڑہاروں، شکاریوں اور مزدوروں سے تعلق رکھنے والے علماء، فقہاء اور محدثین، مفسرین اور ائمہ اسلام۔

یومیہ معمولات تدریسی مشاغل اور متنوع مصروفیات کے باوجود دارالعلوم حقانیہ کے عظیم الشان اور وسیع کتب خانہ میں متعلقہ کام اور حوالہ جات کی تخریج وغیرہ کے علاوہ بھی علمی سیر و تفریح نادر و نایاب کتابوں کی زیارت اور تعارف و مطالعہ کتب کے لئے کم سے کم یومیہ دس منٹ کی گنجائش نکال لیتا ہوں اور اپنے حد تک یہ کوشش رہتی ہے کہ ہمیشہ کے اس معمول میں ناغہ اور فرق نہ آنے پائے۔

یوں تو ذاتی اور معلوماتی حد تک اس کے بے شمار فائدے بھی حاصل ہوتے تاہم دارالعلوم سے نسبت خدمت کے لحاظ سے احقر کو ایک سعادت یہ بھی حاصل ہوئی کہ بیرون ملک اور ملک کے اطراف و جوانب سے علمی و مطالعاتی کتابی ذوق رکھنے والے کثرت سے آنیوالے اضیاف، علماء اور فضلاء اور اسکالروں کے وفود جب دارالعلوم حقانیہ تشریف لاتے ہیں

تو استاذی و استاذ العلماء محدث کبیر حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے حکم سے مجھے دار العلوم کے وسیع اور عظیم کتب خانہ میں اہم علمی نادر و نایاب کتابوں اور قلمی مخطوطات اور ان کے مصنفین اور دیگر متعلقات سے واردین وصادرین اور ناظرین و سامعین کو محظوظ اور متعارف کرانے میں کوئی حجاب آڑے نہیں آتا۔ اور اب تعارف کی حد تک شاید ہی کتب خانہ کی کوئی کتاب ایسی ہو جو نظروں سے اوجھل ہونے کی وجہ سے رہ گئی ہو۔

کتب خانہ کے نچلے اور بالائی دونوں حصوں میں چاروں طرف مختلف علوم و فنون کی ہزاروں کتابیں ترتیب سے الماریوں میں رکھی ہوئی ہیں۔ کتب خانہ کے وسیع ہال کے مغربی جانب لائبریری کا دفتر ہے۔ جس میں کتب خانہ کے دو ناظم کتابوں کے اندراج و ترتیب اور کتب خانہ سے متعلقہ امور انجام دیتے ہیں۔ دفتر کے مشرقی جانب کھڑکی کھول کر جب کتب خانہ میں داخل ہونا پڑے تو کھڑکی کے شمال مشرقی دیوار کے ساتھ جانب مغرب سے علوم کے ترتیب کے لحاظ سے علم التفسیر کی الماریاں لگی ہوئی ہیں۔ پھر علم الحدیث کی، اسی ترتیب سے جانب مشرق اور دیگر اطراف میں جگہ جگہ کتابوں سے بھری ہوئی الماریوں کے اوپر مختلف علوم و فنون کے چھوٹے چھوٹے تعارفی کتبے لگے ہوتے ہیں۔

مشرقی جانب آخری حصے پر "الموساعات" کے ساتھ والی ایک دوسری الماری پر "علم الانساب" کا کتبہ آویزاں رہتا ہے، اس الماری کی کتابیں بھی حسب عادت جب موقع ملا الٹتا پلٹتا رہا، مگر ایک کتاب جو اس حصہ میں سب سے زیادہ نمایاں حجم میں فائق، اعلیٰ طباعت اور سرخ رنگ کی رنگین جلد بندی کی وجہ سے سب سے زیادہ جاذب نظر رہی کئی بار ہاتھوں میں لی، سر ورق دیکھا۔ مصنف کا نام پڑھا، دیباچہ میں مصنف کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ کتاب کئی بار ہاتھوں میں الٹتی پلٹتی رہی۔ مگر چونکہ کتاب قلمی تحریر (قدیم شکستہ طرز کی خط نویسی) کا فوٹو اور عکس ہے۔ اس لئے تاریخ کے ایک علمی ذخیرے ایک معتدبہ اور مستند حصے جیسے علامہ ابوسعید عبدالکریم بن محمد السمعانی نے کتاب الانساب کے نام سے ایک ہزار چھ سو

صفحات میں محفوظ کرلیا ہے اس کے مطالعہ واستفادہ اور فیض وبرکت سے محروم رہا۔

مگر اس مرتبہ (۲۹ جنوری ۸۵ء) جب کتب خانہ کی سیر کے دوران، حسب عادت کتاب اٹھائی حسین ورنگین طباعت اور اعلیٰ جلد بندی کی وجہ سے کتاب جاذبِ نظر تو پہلے سے تھی ہی۔ اٹھائے بغیر بنتی نہیں۔ کھولی تو پھر وہی شکستہ خط جسے دیکھ کر دل برداشتہ ہوجاتا، مگر اس دفعہ کتاب کھولی کہ اچانک ایک صفحے پر نظر جم گئی ورق کا نمبر ۱۴۴ ہے۔ بڑی سائز کے اس صفحے کے وسط میں جلی حروف کے ساتھ "باب الحاء والذال الحذاء" لکھا ہوا ہے۔ عربی میں الحذاء جوتا بنانے والے کو کہتے ہیں۔ الحذاء کی اس فہرست میں علامہ سمعانیؒ کے ارشادات پڑھتا اور دل کے کانوں سے سنتا جارہا تھا ادھر ع

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔

کے پیشِ نظر قلب پر اللہ کے فضل وکرم اور احسان وامتنان کے نقوش ثبت ہو رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ دینِ اسلام کی عظمتیں بھی پتھر کی لکیر بن کر دل پر ثبت ہوتی چلی گئیں، کہ اسلام علاقائی، نسلی اور خاندانی تعصبات سے بالاتر ہو کر سب کو نوازتا ہے جو جتنی زیادہ اللہ کی راہ پر چلتا ہے اتنا زیادہ سنبھالا اور نوازا جاتا ہے اسلام کے دامن نے کتنوں اور کیسوں کو سلامتی کی پناہ سے نوازا۔ کتنے بے کسوں بے یار ومددگار اور گرے ہوئے لوگوں کو ذلتوں سے اٹھا کر عزت کی عظمتوں تک پہنچایا۔

علامہ سمعانیؒ کی بیان کردہ اس فہرست سے معلوم ہوتا جارہا تھا کہ اسلام نے موچیوں کے طبقہ اور پیشہ سے تعلق رکھنے والے حضرات کو بھی اسلامی علوم وفنون سے پورا پورا حصہ دے کر بہرہ ور فرمایا اور انھیں علم وفضل کی عظیم مسندوں پر جلوہ گر فرمایا۔

علامہ سمعانی کی اس تحریر کے پس منظر میں ان کی روح بولتی نظر آرہی تھی۔ میں نے اس مجلس کو غنیمت سمجھا اور پوری توجہ سے ان کے ارشادات پر ہمہ تن گوش ہوگیا۔

علامہ سمعانیؒ نے الحذاء کے عنوان سے علماء کی ایک جماعت کا ذکر چھیڑ دیا جو نسل اور پیشہ کے لحاظ سے موچی تھے، مگر اپنی فطری استعداد اور فنی صلاحیت سے ان حضرات نے علوم دینیہ کی قبا میں آفتاب کی کرنیں لگائیں ان جفت ساز علماء کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے شاہراہ دین پر چلنے چلانے کے لئے اکابر امت اور اسلاف کی ایک بڑی جماعت کے پائے عزم کو ثبات، استقامت اور بڑی استواری بخشی، اسلام نے دنیا پر یہ واضح کر دیا کہ نسل، قوم، ذات برادری طبقہ اور پیشہ کوئی چیز نہیں ہے۔

اصل چیز اسلام اور تقویٰ کی راہ ہے۔ جو بھی اس راہ سے آیا کامیاب رہا جس نے یہ راستہ چھوڑ دیا وہ ناکام ہو گیا۔ علامہ سمعانی نے اسی ملاقات میں متعدد تاریخی شخصیتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ محمد بن سیرین جیسے جلیل القدر تابعی کے علمی کمالات اور علم حدیث، ابن عمر بصری کا مرہونِ منت ہے کہ ابن سیرین نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا۔ اور حضرت ابنِ عمر نے، جابر حذّاء (موچی) سے علم حدیث کی تکمیل کی گویا ابن سیرین کے دادا استاذ، ایک عظیم محدّث ہونے کے ساتھ ساتھ ----- پیشہ کے لحاظ سے موچی تھے۔

ان کے علاوہ علامہ سمعانیؒ نے حذاؤں (موچیوں) کی اس طویل فہرست میں علامہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن حذاء محمد بن سالم حذاء، کثیر بن عبید وسطی حذّاء، یحییٰ المتوکل حذاء، عاصم بن سلیمان حذاء جیسے محدّثین، فقہاء اور ائمہ فن کا تذکرہ بھی کیا۔ جو اپنے زمانے کے مشاہیر ائمہ دین اور علماء میں شمار کئے جاتے تھے۔

جوں جوں ورق الٹتے اور صفحات کھلتے گئے۔ علامہ سمعانی کی اس کتاب میں مختلف پیشوں اور طبقوں سے تعلق رکھنے والے علماء دین اور ائمہ اسلام کے حیرت انگیز حالات سامنے آتے گئے، چرواہوں سے تعلق رکھنے والے علماء کے حالات سے تو حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ہمارے اسلاف اور اکابر نے اپنے دور میں چراگاہوں اور

جنگلوں اور میدانوں کو علوم نبوت کی کھلی ہوئی یونیورسٹی بنا دیا تھا جس میں مزدور کار، کاشتکار اور چرواہے تعلیم پاتے تھے۔

علامہ سمعانی کے قائم کردہ اس تاریخی روزن سے جب مسلمانوں کا ماضی سامنے آتا گیا تو حیرت واستعجاب کی حد نہ رہی کہ مسلمانوں میں علم کا ذوق اس قدر زیادہ اور قابلِ رشک تھا کہ اونٹوں کے چرواہے میدانوں اور ریگستانوں میں اونٹوں کے چرانے کے ساتھ ساتھ دینی علوم کی تحصیل کر رہے ہیں۔

چند صفحے آگے چلا تو اسی کتاب میں علامہ سمعانی نے علماء کی ایک ایسی جماعت کا تذکرہ بھی کیا جو نسلاً اور عملاً کسان تھے مگر اشاعت وتحصیل علم کا ذوق غالب تھا۔ ان کے کھیت اور باغ بغیچے ان کے علمی ذوق کی وجہ سے اسلامی مدارس اور مکاتب بن گئے تھے یہ بجا ہے کہ انھوں نے اپنی مادی غذا اور معاش ودنیوی ضرورت کے لئے اپنی جائیداد، باغات اور زمینوں کی کاشت ونگہداشت کی، مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنی اور امت کی روحانی غذا اور اخروی فلاح کے لئے علم دین کی کاشت ونگہداشت کا ذمہ بھی لے لیا تھا وہ اپنی کھیتی کی آبیاری کے ساتھ ساتھ علم دین کی آبیاری بھی کرتے تھے۔ اور جہاں دونوں میں معارضہ اور تقابل پیش آجاتا تو وہاں ذاتی کام رکاوٹ نہ بننے پاتا۔ اور ہمیشہ علمی کام کو ترجیح دی جاتی، علامہ سمعانی نے جس انداز سے نقشہ کھینچا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ حقیقت سے سر مو بھی مبالغہ نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے کھیتوں کی سرسبزی وشادابی کیطرح ان کے علم کا کشتِ زار بھی سدا بہار رہتا تھا۔

کیف ما اتفق ورق پلٹے تو ورق ۴۵۵ کی پشت پر جلی حروف کے ساتھ "قصار" لکھا ہوا تھا۔ قصار عربی زبان میں کپڑے دھلائی کرنے والے دھوبیوں کو کہتے ہیں۔ اسلام کی فیاضی وسیع النظری اور علم پروری کا اس سے اندازہ لگائیے کہ دھوبیوں کے طبقہ اور پیشہ سے تعلق رکھنے والوں تک اسلام نے علمِ دین کی لازوال دولت پہنچائی۔ صرف یہ نہیں اگر آپ علامہ سمعانی کی

اس فہرست کو ملاحظہ کریں جس میں انھوں نے دھوبیوں میں علم و علماء کا تذکرہ فرمایا ہے تو آپ کو اس زمانہ کے دھوبیوں میں صرف رسمی مسلمانی یا اسلام کی محض رسمی نشانی نظر نہیں آئے گی بلکہ اس جماعت میں بھی بڑے بڑے علماء، فقہاء اور محدثین پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے ظاہری اور باطنی کثافتوں کو اپنے علم و معرفت کے آب مصفّا سے دھوکر ختم کیا اور انسانیت کو علم و دیانت کا صاف اور شفاف لباس عطا فرمایا۔ یہ بزرگ کون اور کیا تھے اور کن حضرات سے انھوں نے علم حاصل کیا تھا علاّمہ سمعانی کی بیان فرمودہ فہرست سے چند ایک کا اجمالاً ذکر کرتے ہیں۔

علاّمہ ابوحراص قصّار، بہت بڑے عالم، متّقی پرہیزگار اور بزرگ انسان تھے قصّار کے لقب سے مشہور تھے کہ دھوبیوں کا کام کرتے تھے، معاویہ بن ہشام قصّار علم و فضل کے ایک روشن ستارے تھے۔ امام سفیان ثوری اور امام مالک سے علم نبوت کی تحصیل کی تھی علاّمہ ابواسحاق ابراہیم بن عبداللہ قصّار الاصفہانی کا لقب قصّار (دھوبی) اس لئے پڑگیا تھا کہ آپ ورع، زہد، تقویٰ، خدمتِ خلق اور اتباعِ سنّت کے جذبے سے مُردوں کو غسل دیا کرتے تھے۔ ان کے درس اور تلامذہ کا حلقہ بھی وسیع تھا۔ تمام عمر درسِ حدیث پڑھاتے رہے بلکہ آخر عمر تک اشتغال بالحدیث اور اشاعت حدیث کے ساتھ ساتھ مُردوں کے غُسل اور کفن کا کام بھی کرتے رہے ۳۶۷ھ میں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی نظر سے معذور ہوگئے۔ ۱۳۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ آج علاّمہ سمعانی کی تحریر فرمودہ کتاب ــــ "کتاب الانساب"، کی شکستہ قلمی طرزِ خطی سے انس اور مضامین کے تجسس کا قوی داعیہ پیدا ہوگیا تھا۔

جگہ جگہ سے دیکھا ہر طبقہ اور ہر پیشہ سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کا علم دین کو اپنی میراث سمجھ کر اس کی تحصیل و اشاعت میں زندگیاں وقف کردینے کی عجیب حیرت انگیز مثالیں سامنے آتی رہیں۔

کتاب الانساب کی شکل میں علامہ سمعانیؒ کی اس ملاقات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے جب بھی کوئی پیشہ اختیار کیا، کوئی روزگار کیا یا کوئی کام کیا، وہ علم دین سے جدا نہیں ہوئے۔ بلکہ معاشی کاروبار کے ساتھ علمی کاروبار جاری رکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ کسب معیشت کے ساتھ علم دین سے واقفیت بھی ضروری اور ممکن ہے۔

موچیوں، کسانوں اور چرواہوں، دست کاروں، صنعت کاروں، تاجروں، کاریگروں، پارچہ بافوں، پارچہ فروشوں، درزیوں، دھوبیوں، روغن سازوں، قصابوں، حلوائیوں، آٹا پیسنے والوں، صابون سازوں، اور صابون فروشوں صیقل گروں، شیشہ گروں، لوہاروں، بڑھیوں، لکڑہاروں، شکاریوں اور مزدوروں غرض دارالعلوم حقانیہ کے کتب خانہ میں علامہ سمعانی سے اس کتابی ملاقات میں مختلف پیشوں طبقوں سے تعلق رکھنے والے علماء، فقہاء، محدثین، مفسرین اور ائمہ اسلام کے عجیب اثر انگیز، اور انقلاب آفریں حالات سے آگاہی حاصل ہوئی۔ جن کی ذات پر قیامت تک اسلامی علوم اور مسلمان قوم ناز کرتی رہے گی۔ اور انشاء اللہ آئندہ کسی مجلس میں مختلف طبقوں اور پیشوں سے تعلق رکھنے والے علامہ سمعانیؒ کے تحریر فرمودہ علماء دین اور ائمہ اسلام کے مختصر تعارفی حالات بھی نذر قارئین کئے جائیں گے۔ (باقی آئندہ)

(بقیہ ص ۳ کا) حضرت عمرو بن العاص اور حضرت معاویہ تو بچ گئے۔ لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ان کور بختوں نے شہید کر ڈالا۔

(انا للہ وانا الیہ راجعون)

خوارج کی تحریک اور اُس کا پس منظر

ڈاکٹر محمد یوسف خاں، شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ،

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد ہی ملّت اسلامیہ افتراق و تشتت کا شکار ہوگئی، حضرت ابوبکر صدیق کے عہد خلافت میں مانعین زکوٰۃ کی جماعت ابھر کر سامنے آگئی اور ارتداد کا بازار گرم ہوگیا۔ ان دونوں گروہوں سے خلیفۂ اوّل نے مقابلہ کر کے اُن کو پسپا کر دیا۔ عہد فاروقی میں یہ فتنہ خاموش رہا۔ مگر اندر اندر لاوا اسلگتا رہا۔ خلافتِ عثمانی میں بغاوت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اور یہ اس وقت تک خاموش نہ ہوا۔ جب تک خلیفۂ سوم حضرت عثمان غنیؓ ذی النورین کو انتہائی بے دردی کے ساتھ خود انھیں کی قیام گاہ پر شہید کر دیا گیا۔ حضرتِ علیؓ کے مسند خلافت پر متمکن ہوتے ہی۔ خانہ جنگی کا دور دورہ شروع ہوا۔ کچھ اس بات پر مصر تھے کہ مستحق خلافت حضرت معاویہؓ ہیں اس کے مقابل دوسری جماعت یہ کہتی تھی کہ استحقاق خلافت حضرت علیؓ کو حاصل ہے۔ اور علاوہ ازیں ایک تیسرا گروہ بھی تھا جو اس بات کا نعرہ لگا رہا تھا کہ حضرت علیؓ کو خلیفۂ اوّل ہونا چاہئے تھا۔ مگر صدیق اکبر اور فاروق اعظم نے اُن کو اس حقِ خلافت سے محروم رکھا۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کو ہم شیعانِ علی کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کے بعد ایک اور جماعت نکل کر آئی۔ جسے خوارج کہا جاتا ہے۔ یہ مختصر جانباروں اور اندھے مقلدوں کی جماعت ہے

جو مرتکب کبیرہ کو کافر مانتے ہیں۔ انھوں نے میدانِ جنگ میں نہایت بے دردی اور بے جگری کے ساتھ لڑنا سیکھا تھا۔ اور زہد و تقشف دنیا سے علٰحدگی ان کی فطرت تھی۔ مگر نقصانِ علم، ضد اور بدویت نے انھیں گمراہ کردیا۔ مناظرہ و مباحثہ میں طلاقتِ لسانی اور قوتِ بیان سے مجمع پر چھا جاتے تھے۔ مگر جب مقابل اُن کے خلاف دلائل و شواہد کا انبار لگاتا تو بغلیں جھانکتے۔ اور الٹی سیدھی تاویلیں کرتے۔ جبکہ یہ خود ظواہر نص پر انتہائی پختگی سے عمل کرنے کے دعویدار ہیں۔ تاہم مقابل کے دلائل اُن کے عقائد میں تزلزل پیدا کرنے کے بجائے اور پختگی پیدا کرتا تھا۔ کیونکہ یہ اپنی ہٹ کے ضدّی تھے۔ اس لئے ہمیشہ اعترافِ حقیقت سے آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ اس لئے کوئی بھی دلیل ان پر اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ ان کا ظہور اس وقت ہوا جب کہ جنگ صفین میں حضرت معاویہؓ کو اپنی شکست قریب تر نظر آنے لگی۔ تو نظریہ تحکیم نے انھیں اپنے مقصد میں کافی حد کامیابی سے سرفراز کیا۔ حضرت معاویہ کے اعوان و انصار جنگ میں قرآن نیزوں پر بلند کئے ہوئے تھے۔ جو اس بات کا اشارہ تھا کہ جنگ بندی کردی جائے۔ اور ہمارے نزاعات کا فیصلہ تلوار کے بجائے قرآنِ عزیز سے ہوگا۔ حضرت علیؓ جنگ بندی کے حق میں نہ تھے۔ لیکن جب انھیں کے حامیوں نے مسئلہ تحکیم کے قبول کرنے پر مجبور کردیا تو ناچار بادلِ ناخواستہ اس پر آمادہ ہو گئے۔ جب باہمی رضامندی سے یہ بات طے ہوئی کہ دو ثالث مقرر کئے جائیں۔ ایک حضرت معاویہ کی طرف سے اور ایک حضرت علیؓ کی طرف سے۔ حضرت معاویہ نے اپنا فیصل حضرت عمرو بن العاص کو مقرر کیا۔ اور حضرت علیؓ کے ثالث حضرت ابوموسیٰ اشعری قرار پائے۔ دونوں نے مل کر عہدنامہ تیار کیا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ دونوں حکم کتاب اللہ و سنّت عادلہ کے بموجب ماہِ رمضان تک فیصلہ کریں گے۔

یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے خوارج کا ظہور ہوا۔ وہ لوگ جو حضرت علیؓ سے مسئلہ تحکیم کے تسلیم کرنے پر بیحد اصرار کر رہے تھے۔ اور ایک دم ہی اپنے خیالات سے منحرف ہو گئے۔ اور تحکیم کو

جرم اور اس کے تسلیم کرنے والے کو کافر قرار دینے لگے۔ اور حضرت علی کے پاس آکر کہا کہ جس طرح ہم نے تحکیم کو تسلیم کرکے ارتکاب کبیرہ کیا ہے۔ اور پھر ہم نے توبہ کی۔ اس طرح آپ بھی اپنے کفر کا اقرار کرکے دوبارہ دخولِ اسلام کا اعلان کریں۔ اُن کے ساتھ عرب کے ناخواندہ بدو بھی مل گئے۔ جب حضرت علیؓ نے اُن کی اس تجویز کو تسلیم نہیں کیا تو انھوں نے لَاحُکْمَ اِلَّا اللّٰہ کے نعرہ کو اپنا شعار بنالیا۔ اور حضرت علیؓ کی مخالفت میں جنگ فرض تصور کرکے اُن سے برسرِ پیکار ہوگئے۔ یہ وہ سیاسی فرقہ ہے۔ جسے اپنے سیاسی مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تو اسی شخصیت کی جس کی نصرت وحمایت کو اپنا دین وایمان سمجھتے کل تک جس کی حمایت ونصرت کو اپنا سب کچھ سمجھتے تھے۔ اسی کی مخالفت کو اپنا نصب العین بنالیا حضرت علیؓ کو جب کسی سے گفت وشنید میں مشغول دیکھتے تو ان پر آوازیں کستے اور انھیں بُرا بھلا کہتے تھے۔

خوارج اپنے اعتقاد میں دیگر دوسرے فرقوں سے زیادہ سخت گیر واقع ہوئے تھے چند نصوص ظواہرہ کو اپنا مقدس دین سمجھ رکھا تھا۔ جو مرتکب کبیرہ کو کافر جانتے تھے۔ لاحکم الا اللہ کا نعرہ ان کا نصف دین تھا۔ حضرت عثمان وعلی رضی اللہ عنہما سے اظہار بیزاری کا جذبہ کامل درجہ میں ان پر غالب تھا۔ یہی وہ چند امور ہیں جس نے ان کے دلوں پر قبول حق کے تسلیم کرنے سے مہر لگادی۔ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً۔ اور اعتراف حق کے سب دروازے ان پر بند کر دیئے۔

جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رحؒ نے خوارج سے مناظرہ کیا تو نقطۂ اختلاف ظالم امویوں پر آکر سمٹ گیا۔ جب کہ خود اس بات کے معترف تھے کہ آپ ظلم سے اُن کو روکتے تھے۔ ان تمام چیزوں کے باوجود چونکہ ان کے ذہن ودماغ پر خیالِ برائت بُری طرح سوار تھا۔ اور مسلمانوں سے عناد ودشمنی ان کی سرشت میں داخل ہوچکی تھی۔ یہ کبھی بھی

جمہور مسلمانوں کی جماعت میں داخل نہ ہو سکے۔

اپنی کم عقلی اور جذباتیت میں یہ فرانس کے انقلابی فدائیوں کے بہت مشابہ تھے۔ انھیں کی طرح یہ بھی چند بھاری بھر کم الفاظ کی آڑ لے کر مسلمانوں کا بے دریغ خون بہایا۔ اور ہر جگہ غارت گری پھیلادی۔ یہ انتہائی جانباز اور غیر معمولی طور پر بہادر اور شجاع تھے۔ اور جذبۂ فدائیت ان میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ ہر وقت موت کے انتظار میں بے چین تھے۔ اور بے دریغ بڑے بڑے خطرات میں کود پڑتے تھے۔ اور یہ سب کچھ محض قلّتِ علم نقصانِ عقل کے باعث تھا۔ کم عقلی، فکر کاسد، شدید تعصب کے سبب بڑی خوشی سے موت کا استقبال کرتے تھے۔ ان کا نعرہ تھا۔ ایمان۔ اور حکومت صرف خدا کے لئے ہے۔ اسی کی تبلیغ میں مصروف رہتے تھے۔ اور جو بھی ان سے تعارض کرتا اس سے آمادۂ جنگ ہو جاتے تھے۔ اور ان کا حال یہاں تک بگڑ چکا تھا کہ حضرت عثمان و علیؓ کے ماننے والوں کو مشرک قرار دیتے تھے۔ اور اسی وجہ سے اُن کو چیلنج کرتے تھے۔ اور اسی صلہ میں حضرت عبداللہ بن خباب بن الارت اور ان کی لونڈی کو قتل کر دیا۔ جب حضرت علیؓ نے کہا کہ خباب کے قاتلوں کو ہمارے حوالہ کر دو تو انھوں نے بڑے فخریہ انداز میں کہا کہ ہم سب نے قتل کیا ہے۔ اور اس کارِ ثواب میں ہمارا ہر فرد شامل ہے — جو کرنا چاہو کر لو۔ ناچار حضرت علیؓ کو ان سے لڑنا پڑا۔ یہاں تک کہ ان کو تہس نہس کر دیا۔ مگر اس کے باوجود جو کچھ بچ نکلے وہ ایک لمحہ کیلئے بھی اپنے اعتقاد و عوامل سے منحرف نہ ہوئے۔ اور بڑی بے جگری اور بہادری کے ساتھ — اپنے مشن میں مصروف رہے۔ اور اس کی تبلیغ و تلقین کرتے رہے۔

خوارج کا گمراہانہ خلوص

اسلام سے ان کا تعلق مخلصانہ تھا۔ مگر یہ اس کے صرف ایک ہی پہلو سے دبستگی رکھتے تھے۔ اور دوسرے پہلو کو قطعاً نظر انداز کر دیتے تھے۔ حضرت علیؓ نے ان پر حملہ کرنے سے قبل حضرت ابن عباسؓ کو ان کے پاس بھیجا۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے دیکھا کہ ان کی پیشانیوں پر سجدے کے نشان اور

محنت کے باعث ہاتھ سخت ہو گئے تھے۔ ان کے کرتے پسینہ سے شرابور تھے۔ غرض یہ کہ ان کا اخلاص شک وشبہ سے بالاتر تھا۔ لیکن دین کے فہم کی کمی اور حد سے بڑھی جذباتیت نے اخلاص کے باوجود انھیں گمراہ کر دیا۔ جس کی وجہ سے اسلام کے جوہر اور اس کی روح کو پامال کرنے لگے۔

ابوالعباس المبرد نے اپنی کتاب الکامل میں لکھا ہے کہ خوارج کے دلچسپ واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ ان کی گرفت میں ایک مسلمان اور ایک نصرانی آگیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ اور عیسائی کو وصی سمجھ کر چھوڑ دیا۔ عبداللہ ابن خباب کی جب ان سے ملاقات ہوئی تو ان کی گردن میں قرآن لٹک رہا تھا۔ ان کے ساتھ ان کی حاملہ بیوی بھی تھیں خارجیوں نے ان سے پوچھا کہ جو چیز تمہاری گردن میں لٹک رہی ہے اس کا حکم یہ ہے کہ ہم تمہیں قتل کر ڈالیں۔ پھر ان خارجیوں نے عبداللہ ابن خباب سے پوچھا ابوبکر اور عمر کے بارے میں تم کیا کہتے ہو۔ عبداللہ نے جواب دیا کہ اُن کے بارے میں کلمۂ خیر کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں۔

خوارج نے پھر سوال کیا۔ تحکیم سے پہلے اور خلافت کے ابتدائی دور میں عثمان کیسے تھے۔ عبداللہ نے جواب دیا بہت اچھے۔

خوارج نے پوچھا۔ تحکیم کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے — میری رائے یہ ہے کہ علی تم سے زیادہ کتاب الٰہی کو جانتے ہیں۔ اور تم سے زیادہ نیکوکار۔ دین کے حامی، نگہبان، صاحبِ بصیرت و فراست تھے۔

خوارج نے کہا کہ تم سچائی کی پیروی نہیں کرتے۔ لوگوں کے بھاری بھرکم ناموں کی پیروی کرتے ہو۔ یہ کہہ کر عبداللہ بن خباب کو نہر کے کنارہ لے گئے۔ اور انھیں ذبح کر دیا۔

کھجور کے ایک درخت کی وجہ سے ایک نصرانی کو تکلیف دینے لگے اس نے کہا کہ میں کھجور کا درخت تمہیں ہدیہ کرتا ہوں۔ اُسے قبول کریجیے۔

خوارج نے کہا خدا کی قسم ہم اسے اسی صورت میں قبول کر سکتے ہیں کہ ہم سے

قیمت وصول کرلو۔ نصرانی نے کہا۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ تم نے عبداللہ بن خباب جیسے آدمی کو قتل کر دیا۔ اور ہم سے ایک کھجور کا درخت نہیں لے سکتے۔

خوارج کی سرکوبی حضرت علی کرم اللہ وجہہ ملک شام پر حملہ کی تیاری میں معروف تھے کہ آپ کو خارجیوں کی دست درازی کی خبر ملی کہ انھوں نے حضرت خباب کو اس الزام میں قتل کر دیا ہے کہ وہ مسئلہ تحکیم کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ اس واقعہ کی تحقیق کے لئے آپ نے حضرت ابن مرّہ کو روانہ کر دیا۔ ان کو بھی خارجیوں نے بے دردی سے قتل کر دیا۔ اب حضرت علی اور سرکار لشکر کو فکر ہوئی کہ ہم اگر شام پر حملہ کریں۔ اور ادھر یہ عراق و مصر پر قبضہ کر کے ہمارے اہل و عیال کو قتل کر ڈالیں۔ اور اس پر انھوں نے اگر قبضہ کر لیا۔ تو شام پر حملہ کرنا بجائے سودمند ہونے کے مضرت رساں ہو جائیگا اس لئے شام پر حملہ کو ملتوی کر دیا گیا۔ اور وہی لشکر جو شام کے لئے روانہ ہونے والا تھا۔ خوارج کی طرف چل پڑا۔ ان کے قریب پہونچکر یہ پیغام بھیجا "تم میں سے جن لوگوں نے ہمارے بھائیوں کو قتل کیا ہے ان کو ہمارے سپرد کر دو۔ تاکہ ہم ان کو قصاص میں قتل کر دیں اور تم کو تمہارے حال پر چھوڑ کر روانہ ہوں۔ اس عرصہ میں جب تک ہم شام کی جنگ سے فارغ ہوں۔ ممکن ہے کہ خدائے تعالیٰ تم کو راہِ راست پر لے آئے"۔

بعد ازاں حضرت علیؓ نے کئی اجل صحابہ کو ان کو نصیحت کے لئے بھیجا اور اُن کے سرکردہ افراد کو خود بلا کر سمجھایا کہ اگر غلطی حکموں کے تقرر کرنے کی وجہ سے ہوئی تو وہ صرف تم لوگوں کے اصرار اور تمہارے کہنے کی وجہ سے۔ خیر جو ہوا اس کے پیچھے کیوں پڑتے ہو۔ اگر تمہاری خواہش ہو تو ہمارے ساتھ شام چلو۔

خوارج نے ہر مرتبہ کی طرح اس بار بھی وہی جواب دیا کہ ہم لوگوں نے خدا اور رسول کے حکم کی خلاف ورزی کر کے کافر اور پھر توبہ کر کے مسلمان ہو گئے۔ اس طرح آپ بھی اپنے کفر کا اقرار کر کے تجدید ایمان کا اعلان کریں۔ ورنہ ہم آپ کی مخالفت میں کوئی

دقیقہ باقی نہیں رکھیں گے۔ حضرت علیؓ نے اپنی ہجرت اور اپنے جہاد کا واسطہ دیا۔ مگر پھر بھی وہ آپ کو مسلمان ماننے کو تیار نہیں ہوئے۔ آخر میں حضرت علیؓ لشکر خوارج کو مخاطب کرکے کچھ عرض کرنا چاہتے تھے۔ خارجیوں نے اس اندیشہ سے شور مچانا شروع کردیا کہ کہیں آپ کی تقریر کا اثر مجمع اور سامعین پر نہ پڑجائے۔

یہ بدبختی دیکھکر حضرت علی مایوسی کی حالت میں واپس آگئے۔ اور اپنے لشکر کو ترتیب دی۔ اور حضرت ابوایوب انصاری کو امان کا جھنڈا دیکر ایک اونچی جگہ پر بھیج دیا اور اعلان کروایا کہ جو اس جھنڈے کے نیچے چلا جائے گا۔ وہ مامون ہے۔ اور جو مدائن یا کوفہ کی طرف چلا جائے گا وہ بھی محفوظ رہے گا۔ اس اعلان کو سننے کے بعد تقریباً ⅔ حصہ خوارج سے الگ ہوگیا۔ کچھ لشکرِ علی میں شامل ہوگئے۔ کچھ جھنڈے کے نیچے چلے گئے۔ اور کچھ لوگوں نے کوفہ اور مدائن کی راہ پکڑی۔ باقی ماندہ خارجیوں پر حملہ کرکے تہ تیغ کردیا گیا۔ ان کے بڑے بڑے سردار عبداللہ ابن وہب، زید حصین، حرقوص ابن زہیر، عبداللہ ابن شجر، شریح ابن اوفی مارے گئے۔ صرف نو آدمی فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔ اور فارس جاکر حضرت علیؓ کے خلاف بغاوت اور سازش کا جال بننے میں مشغول رہے۔ لیکن وہاں کوئی خاص کامیابی نظر نہ آئی۔ تو عراق و حجاز میں ادھر ادھر آوارہ زندگی بسر کرنے لگے۔ اور آخر میں مکّہ معظمہ میں عبداللہ ابن ملجم مرادی۔ برک بن عبداللہ تمیمی۔ عمر بن بکر تمیمی۔ یہ تین شخص جمع ہوئے اور آپس میں مقتولین نہروان کا ذکر کرکے ماتم کیا۔ اور پھر تینوں نے یہ متفقہ فیصلہ کیا کہ ہم میں سے ایک ایک آدمی ان تینوں آدمیوں کو قتل کردے جنھوں نے عالمِ اسلام کو پریشان کر رکھا ہے۔ اور قرارداد میں یہ بھی منظور کیا گیا کہ ملجم مرادی حضرت علیؓ کو۔ برک حضرت معاویہ اور عمر بن بکر حضرت عمرو ابن العاص کو ایک ہی وقت میں قتل کردیں گے۔ چنانچہ ۱۷ رمضان المبارک یوم جمعہ کو فجر کا وقت متعین ہوا۔ بالآخر یہ افسوسناک گھڑی آہی گئی ——

(بقیہ صفحہ ۴۳ پر)

قسط ۴

منطق وفلسفہ ایک علمی وتحقیقی جائزہ

از۔ مولانا محمد اطہر حسین قاسمی بستوی

باب ششم
معقولیوں کے دلائل کا تجزیہ

مذکورہ بالا آثار ونتائج جو تاریخی حقائق کی روشنی میں پیش کئے گئے معقولات کے مفاسد وفتن کے بیان کے لئے کافی ہیں، حق کے طالب کو اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں کیونکہ ادنیٰ عقل والا آدمی بھی یہ باور نہیں کرسکتا کہ جو علوم مومن کے دین وایمان اور اس کے اعمال وعبادات پر اتنی قوت سے اثر ڈالیں کہ اس کو اس کے دین ومذہب سے بیگانہ اور اعمال وعبادات سے متنفر کردیں، ان کو علوم کی فہرست میں شمار کیا جائے مگر اس کے باوجود چند سر پھرے معقولی اُن کی تعلیم پر اصرار اور ان کی تحصیل پر تشدد برتتے ہیں اور دلیل میں چند بزرگوں کے اقوال کا سہارا لیتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ ان بزرگوں نے کب اور کن حالات میں ان کو سیکھنے اور سکھانے کی اجازت دی تھی اور کن واقعات سے متأثر ہو کر انھوں نے یہ رویہ اختیار کیا تھا' اس باب میں انھی بزرگوں کے ارشادات کا علمی وتحقیقی تجزیہ پیش کیا جارہا ہے۔

بزرگوں کے ارشادات معقولی حضرات اپنے مقصد کے لئے جن اکابر کے ارشادات کا سہارا لیتے ہیں ان میں سر فہرست امام غزالیؒ ہیں (۱) امام غزالیؒ فرماتے ہیں

مَنْ لَمْ يَعْرِفِ الْمَنْطِقَ فَلَا ثِقَةَ لَهٗ فِی الْعُلُوْمِ اَصْلاً یعنی جو شخص منطق نہ جانے وہ علوم میں قابلِ وثوق نہیں، اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ امام غزالیؒ نے اخیر میں منطق کی مدح وتوصیف سے رجوع کر لیا تھا اور اس کی حرمت کے قائل ہو گئے تھے۔ چنانچہ ملّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں!

وَذکر الحافظ سراج الدین القزوینی من الحنفیۃ فی کتاب الفہ فی تحریمہ ان الغزالی رجع الی تحریمہ بعد ثناءہ علیہ فی اوّل المنتقی۔ (شرح الفقہ الاکبر ص۳)

حافظ سراج الدین قزوینی حنفی نے اپنی ایک کتاب (جس کو منطق کی حرمت میں لکھا ہے) میں ذکر کیا ہے کہ امام غزالیؒ نے منطق کی مدح وتوصیف کے بعد اخیر میں اس سے رجوع کر لیا تھا۔ اور اس کی حرمت کے قائل ہو گئے تھے۔

(۳) رسالۂ النور ماہ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ کی اشاعت میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی رائے گرامی بایں الفاظ درج ہے۔

"ہم تو جیسا بخاری کے مطالعہ میں اجر سمجھتے ہیں میرزاہد امور عامہ کے مطالعہ میں ویسا ہی اجر سمجھتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ نیت صحیح ہو کیونکہ اس کا شغل بھی اللہ کے واسطے ہے اور اس کا بھی"

اس ارشاد کا ایک جواب تو یہ ہے کہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ سے اس کے خلاف بھی منقول ہے۔ چنانچہ ایک جگہ فلسفیوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

"تمہارا فلسفہ ایسا کہ پڑھتے پڑھتے دماغ خراب کر لیا اور اخیر میں نتیجہ کیا؟ کچھ بھی نہیں سوائے اس کے کہ اشراقیین کی یہ رائے ہے اور مشائیین کی یہ رائے ہے معلوم نہیں کہ کونسی غلط ہے اور کونسی صحیح ہے اور ہمارا علم یہ ہے کہ اوّل ہی دن ہم نے پڑھا کہ وضو میں اتنے فرض ہیں اور وضو کرنا شروع کر دیا، اسی وقت سے عمل نکلنے لگا اور عمل پر ثواب کی امید ہوئی اور تمہیں کیا؟ کونسا ثواب مشائیین اور اشراقیین

کی رائے پر ملنے کی امید ہے ۔ (اشرف الجواب لشفاء المرتاب جلد چہارم ص۱۷۶)
باقی جوابات آئندہ آئیں گے ۔

(۳) ابن رشد اور ابن سینا معقولات کی تعریف میں پیش پیش رہتے تھے، ان کو علم وفضل کا معیار اور کمال تصور کرتے تھے، علاوہ ازیں ایک دفعہ مولانا حکیم دائم علی خاں مرحوم اپنے بچے کو لیکر حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں آتے اور حضرت سے استدعا کی کہ اس کے لئے دُعا فرمادی جائے ۔ حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کی زبان سے بیساختہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ اس کو علم معقول میں کمال عطا فرمائے ۔ حکیم صاحب نے عرض کیا کہ حضرت نے کیا دعا فرمائی ہے میری تمنا تو یہ ہے کہ اس کو فقہ اور دین کا علم حاصل ہو ۔ پھر حضرتؒ نے جو جواب دیا اُس کا خلاصہ یہ تھا کہ دین پر قائم رہنا علم معقول حاصل کئے بغیر دشوار ہے ۔　　(سوانح قاسمی جلد دوم ص۲۹۸)

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند فرماتے ہیں کہ ہم کو تو امید ہے کہ جیسے بخاری اور مسلم کے پڑھانے میں ہم کو ثواب ملتا ہے ایسے ہی فلسفہ کے پڑھانے میں بھی ملے گا کیونکہ ہم اعانت فی الدین کی وجہ سے فلسفہ کو پڑھاتے اور پڑھتے ہیں ۔　　(حاشیہ سوانح قاسمی جلد دوم ص۲۹۹)

مذکورہ اقوال کی حقیقت مسلمان جب عرب کے سادہ ماحول سے نکلے اور رومی وایرانی تہذیب اور یونانی علوم وفنون سے سابقہ ہوا تو نئے افکار وخیالات اور نئے انداز واطوار سامنے آئے اور آہستہ آہستہ زندگی ان سے متاثر ہونے لگی لیکن جب عباسی عہد میں حکمائے یونان کی کتابوں کے ترجمے عربی میں شائع ہوئے تو فلسفہ وحکمت کے مسائل نے ذہن ودماغ میں ہلچل پیدا کردی اور مذہبی عقائد واعمال کے بارہ میں بحثیں پیدا ہونے لگیں اور عملی موشگافیوں نے طرح طرح کے شبہات کھڑے کردئے ۔ پرانے بزرگ اس صورتِ حال سے کڑھتے لیکن خاطر خواہ اس کا تدارک نہیں کرپاتے تھے ۔ فلسفہ کی راہ سے جو

اعتراضات ہو رہے تھے ان کا جواب وہ لوگ کس طرح دے سکتے تھے جنھوں نے کبھی اس کوچہ میں قدم نہیں رکھا تھا، بالآخر یہ بات سمجھ میں آئی کہ علوم دین سے تعلق رکھنے والے فلسفہ وحکمت کے مسائل سے بھی واقفیت حاصل کریں تاکہ ان کو سامنے رکھکر دینی مسائل کی ایسی تشریح جو نوجوانوں کی خلش مٹا سکے اور فلسفہ کے اعتراضات کا جواب اسی کی زبان میں دے سکے۔ (تعمیر حیات کی خصوصی اشاعت ص۴۴ مطبوعہ ۱۹۷۵ء)

اس لئے انھوں نے معقولات کو سیکھا، سکھایا، اس میں کتابیں لکھیں، اس کو پڑھنے پڑھانے کی ترغیب دی، نتیجہ یہ ہوا کہ انہی اکابر - اسلام نے معتزلہ وفلاسفہ کو انھیں کی راہ سے بھگایا اور ان کو انہی کے اصول وقواعد سے جواب دیا۔ یہی تھا وہ پاکیزہ مقصد جس کے لئے ان اکابر نے گذشتہ صدیوں میں معقولات کو پڑھنے اور پڑھانے کی ترغیب دی اور اس کو سیکھا سکھایا، اب نہ وہ وقت اور زمانہ رہا نہ وہ معتزلہ اور فلاسفہ رہے جن پر رد کرنے کے لئے معقولات کی ضرورت پڑتی اس لئے موجودہ زمانہ میں ان کو پڑھنا پڑھانا لایعنی شئے کو پڑھنا پڑھانا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں - مِنْ حُسْنِ اِسْلاَمِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَالاَ یَعْنِیْہِ، یعنی مسلم کے حسن اسلام کی علامت یہ ہے کہ وہ لایعنی اور غیر ضروری کاموں کو ترک کردے، اس جواب کی سند مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ملتی ہے، ایک مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی رح نے مولانا شبلی رح سے عرض کیا کہ قدیم فلسفہ ومنطق کی کتابوں کو نصاب سے خارج کرنے سے آپ کا کیا مقصد ہے؟ مولانا شبلی رح نے فرمایا!

"یہ یونانی علوم نہ ہمارے مذہبی علوم ہیں اور نہ ہمارے مذہب کی فہم ومعرفت ان پر موقوف ہے۔ امام غزالی رح نے اپنے زمانہ میں ان علوم کو علماء کے نصاب میں اس لئے داخل کیا تاکہ ان یونانی علوم کے اثر سے جن کو اس زمانہ میں زیادہ تر باطنیوں نے پھیلا رکھا تھا علماء اسلام واقف ہو کر اس زمانہ کے

الحاد کا مقابلہ کر سکیں لیکن اب نہ وہ ملحد رہے نہ وہ یونانی علوم رہے نہ اُن کے مسائل کی صحت کا یقین عقل کے مدعیوں کو رہا اس لئے ان کا اثر خود بخود زائل ہو گیا۔ اور اب ان سے اسلام کو کسی گزند کا خوف نہیں رہا، اب اس کی جگہ نئے علوم ہیں نئے مسائل ہیں نئی تحقیقات ہیں۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے علماء انہی چیزوں سے واقف ہو کر اسلام کی نئی مشکلات کا حل نکالیں اور نئے شبہات کے تحقیقی جواب دیں۔ (حیات شبلی صنہ)

دوسرا جواب

ہم مطلقاً علوم عقلیہ کے سیکھنے کو بُرا نہیں کہتے بلکہ علوم دینیہ کو چھوڑ کر اس کے سیکھنے کو بُرا کہتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص علوم دینیہ میں تبحر اور مہارت حاصل کرنے کے بعد علوم عقلیہ کو سیکھے تو کوئی حرج نہیں، چنانچہ شاہ اندلس منصور بن ابی عامر کے حفید ابو بکر بن زہر جو حافظ قرآن اور فقیہ و محدّث تھے اُن سے دو طالب علم طب پڑھتے تھے، ایک روز وہ اتفاق سے منطق کی ایک کتاب لیکر پڑھنے آئے، ابو بکر بن زہر نے ان سے وہ لیکر دیکھی تو وہ منطق کی تھی، اس پر ان کو بہت غصہ آیا، وہ دونوں طالب علم خوف سے بھاگے۔ ابن زہر اس وقت اس قدر غصہ میں تھے کہ برہنہ پا ان کے پیچھے مارنے کے لئے دوڑے، طالب علموں نے ڈر کے مارے ان کے پاس آنا ہی ترک کر دیا لیکن کچھ دنوں کے بعد ان کو خود معذرت کا خیال پیدا ہوا اور ابن زہر کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے قصور کی معافی مانگی اور عذر کیا کہ یہ ہماری کتاب اصل میں نہ تھی بلکہ اپنے ایک دوست سے جبراً حاصل کی تھی جو ہمارے پاس رہ گئی۔ ابن زہر نے یہ سُن کر ان کا قصور معاف کر دیا اور دوبارہ پڑھانا شروع کیا اور یہ نصیحت کی کہ قرآن حفظ کریں اور فقہ و حدیث کی تکمیل کریں۔ چنانچہ اس ہدایت پر انھوں نے عمل کیا اور فقہ و حدیث کی تکمیل کر لی۔ جب ابن زہر کو ان کا یہ حال معلوم ہوا تو وہ خود ہی اپنے کتبخانہ سے فرفوریوس منطق کی کتاب ایساغوجی نکال کر لائے اور کہنے لگے کہ فقہ و حدیث کی تکمیل کے بعد اب وقت ہے کہ منطق و فلسفہ پڑھو۔ ورنہ اس سے پہلے فلسفہ کی

تعلیم ہرگز تمہارے لئے مناسب نہیں۔ (ابن رشد ص۳۱)

امام غزالیؒ تہافت الفلاسفہ میں لکھتے ہیں۔

تیسرا جواب فلسفہ کے مسائل تین قسم کے ہیں (۱) وہ مسائل جو صرف الفاظ و اصطلاحات کے لحاظ سے اسلام سے مختلف ہیں مثلاً فلاسفہ خدا کو جوہر سے تعبیر کرتے ہیں لیکن جوہر سے ان کی مراد متحیز نہیں بلکہ وہ شئے مراد ہے جو بالذات قائم ہو اور محتاج الی الغیر نہ ہو (۲) وہ مسائل جو اصول اسلام کے مخالف نہیں مثلاً یہ مسئلہ کہ چاند میں اس وجہ سے گہن لگتا ہے کہ اس کے اور آفتاب کے بیچ میں زمین حائل ہو جاتی ہے اس قسم کے مسائل کا رد کرنا ہمارا فرض نہیں۔ جو لوگ ان مسائل کے انکار و ابطال کو جزء اسلام سمجھتے ہیں ہم ان سے متفق نہیں۔ کیونکہ ان مسائل کے اثبات پر ہندسی دلائل قائم ہیں جن کی واقفیت کے بعد ان کی صحت میں کسی قسم کا شک نہیں رہتا۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ مسائل اسلام کے برخلاف ہیں تو یہ اس کی جہالت و ناواقفیت کا ثبوت ہوگا۔ (۳) تیسری قسم کے وہ مسائل ہیں جو اسلام کے عقائد مقررہ کے خلاف ہیں مثلاً عالم کا قدم، حشر اجساد کا انکار وغیرہ تو یہی وہ مسائل ہیں جن سے ہم کو غرض ہے اور جن کو باطل کرنا ہمارا موضوع ہے۔

(الغزالی ص۱۰)

اس لئے اس قسم کے مسائل کا پڑھنا پڑھانا حرام اور انتہائی مذموم ہے نیز وہ مباحث جن کا تعلق ہیولیٰ و صورت اور فلک کے عدم قبول خرق و التیام سے ہے ان کا پڑھنا پڑھانا بھی حرام ہے کیونکہ ان سے عقائد اسلام مجروح ہوتے ہیں، اوّل مباحث حشر و نشر، حساب کتاب اور ثواب و عقاب کے انکار کا سبب بنتے ہیں اور ثانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج سماوی اور ملائکہ کے نزول کے انکار کا سبب بنتے ہیں اس لئے اس قسم کے مسائل کا پڑھنا پڑھانا حرام اور سخت ممنوع ہے۔

چوتھا جواب کسی شے میں حد سے زائد انہماک آدمی کو غلط راستے پر ڈال دیتا ہے اس لئے

معقولات میں انہماک بھی اُس کو بُرے نتائج تک پہونچائے گا۔ اس لئے آدمی کو اس میں بیجا غلو اور انہماک سے بچنا چاہئے۔ مطلق تعلیم سے نہیں، یہی ہمارا مقصود ہے، توغل کی ایک دو مثالیں مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔

"ماضی قریب میں درس نظامی کے مولویوں کا سلّمیات اور زواہد ثلاثہ کے ساتھ اس قدر شغف و انہماک تھا کہ جب تک کوئی مولوی ان کتابوں میں سے کسی ایک کتاب پر اپنا حاشیہ نہ لکھ دیتا مستند مولویوں میں اس کا شمار نہیں ہوتا تھا، علاوہ ازیں معقولی کتابوں کی افادیت کے متعلق ہمارے علماء کا غلو اس حد تک پہونچا ہوا تھا کہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اجلاس میں نظامی نصاب کی ترمیم کا مسئلہ پیش کرتے ہوئے یہ تجویز جب سامنے آئی کہ ایساغوجی منطق کے رسالہ کو نصاب سے خارج کر دیا جائے۔ تو اس چھوٹے سے مسئلہ پر مسلسل تین روز تک بحث ہوتی رہی اور علماء کی اکثریت کو یہی اصرار رہا کہ اگر ایساغوجی کو نصاب سے خارج کیا گیا تو علم کی بنیاد ہی اکھڑ جائے گی۔"

(سوانح قاسمی جلد دوم ص ۲۸۹)

باب ہفتم
اکابرِ امت کے ارشادات

امت کے اکابر علماء کا دستور رہا ہے کہ جب انھوں نے اپنے زمانوں میں مسلمانوں کے اندر یونانی علوم کے بڑھتے جراثیم کو دیکھا تو اس پر کاری ضرب لگائی اور اس کی تردید و استیصال میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ جب علوم عقلیہ عربی زبان میں منتقل ہوئے تو عالمِ اسلام کے علمائے فلسفہ نے ارسطو کے منطق و فلسفہ کو آنکھ بند کر کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس کو تنقید و تحقیق سے بالاتر اور مستغنی نہیں سمجھا بہت سے علماء نے

اس کی تردید میں کتابیں لکھیں اور اس کے فلسفیانہ و منطقی مباحث پر آزادانہ و ناقدانہ نظر ڈالی اور جو چیزان کو مخدوش اور کمزور نظر آئی برملا اس کا اظہار کیا، اس سلسلہ میں معتزلہ پیش پیش تھے۔ ان میں سے نظام معتزلی اور ابوعلی جبائی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں تیسری صدی میں حسن بن موسیٰ نوبختی نے کتاب الآراء والدیانات لکھی اور اس میں ارسطو کی منطق کے بعض اہم مسائل کا رد کیا، چوتھی صدی میں امام ابوبکر باقلانی نے دقائق کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں فلسفہ کا رد لکھا اور یونانیوں کی منطق پر اہل عرب کے منطق کی ترجیح ثابت کی، پانچویں صدی میں علامہ عبدالکریم شہرستانی (صاحب الملل والنحل) نے برقلس اور ارسطو کے رد میں ایک کتاب لکھی اور قواعد منطق کے موافق اُن پر دلائل کا نقض کیا۔ اس صدی کے آخر میں امام غزالیؒ فلسفہ کے مدمقابل ہوئے اور انھوں نے تہافت الفلاسفہ کے نام سے وہ کتاب لکھی جس سے سو برس تک فلسفہ کے ایوان میں تزلزل رہا چھٹی صدی میں ابوالبرکات بغدادی نے اس سلسلہ کو بڑی ترقی دی اور المعتبر کے نام سے ایک معرکۃ الآراء کتاب لکھی جس میں اکثر مسائل میں ارسطو کے خیالات کو غلط ثابت کیا، اس صدی میں امام رازیؒ نے متکلمین اسلام اور اشاعرہ کا وکیل بن کر فلسفہ کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنالیا، آٹھویں صدی میں حافظ ابن تیمیہؒ نے نقض المنطق اور الرد علی المنطقیین لکھکر منطق و فلسفہ کے لاش کی تشریح (پوسٹ مارٹم) کا فرض انجام دیا۔

(تاریخ دعوت و عزیمت جلد دوم صفحہ ۲۴۰)

چھٹی صدی میں جب فلسفہ نے اندلس میں سر اُبھارا تو اس کے حکمراں ابویوسف منصور الموحدی

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) سلہ سلمیات سے مراد ملا محب اللہ بہاری کا مشہور منطقی متن اور اس کی شروح حمداللہ، قاضی مبارک، بحرالعلوم، ملا مبین وغیرہ ہیں۔ منہ سلہ زواہد ثلاثہ عالمگیری عہد کے ایک مشہور عالم مرزا زاہد کی تین کتابیں ہیں جو میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال، میر زاہد شرح مواقف کے نام سے مشہور ہیں، منہ

نے اس کی جماعت کو منتشر کر دیا اور اس کی کتابوں کو آگ میں جلوا دیا[1] علامہ ابن الصلاح رح تو امام غزالی رح سے محض اس بات پر ناراض ہو گئے کہ انھوں نے منطق میں کیوں کتاب لکھی منطق کا سیکھنا تو بالکل حرام ہے[2]، گیارہویں صدی میں حضرت مجدد الف ثانی رح نے ملفوظات و مکتوبات کے ذریعہ فلسفہ کے تار پود بکھیر کر رکھدئے، اسی صدی میں محدث العصر ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے جب لوگوں کا معقولات کے ساتھ غیر معمولی شغف دیکھا تو پوری جرأت کے ساتھ فتویٰ دیا کہ اوراق منطق سے استنجاء کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس میں ذکر اللہ نہ ہو، بارہویں صدی میں جب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رح کی وفات ہونے لگی تو انھوں نے وفات سے قبل جو وصیتیں فرمائی۔ اس میں آخری وصیت یہ تھی کہ منطق و فلسفہ سے احتراز کیا جائے اس کو دیکھنا گمراہی در گمراہی ہے۔ تیرہویں صدی میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی رح نے فرمایا!

اَلْبَحْثُ عَنْ مِثْلِ هٰذِهِ الْاَبْحَاثِ الْفَلْسَفِيَّةِ يُفْضِيْ اِلَى الْمَهْلَكَةِ -

ان فلسفیانہ بحثوں میں گھسنا ہلاکت تک پہونچاتا ہے۔

(تفسیر مظہری جلد دہم ص۳۷۱)

اگر آپ منطق و فلسفہ سے متعلق سلف صالحین اور علمائے اکابر کا رجحان معلوم کرنا چاہتے ہیں تو شرح فقہ اکبر کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیں، وہ اس سلسلہ میں آپ کو پوری رہنمائی کرے گی، محدث العصر ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں!

قَدْ قَالَ شَيْخُ مَشَايِخِنَا الْجَلَالُ السُّيُوْطِيُّ اَنَّهٗ يَحْرُمُ عُلُوْمُ الْفَلْسَفَةِ كَالْمَنْطِقِ لِاِجْمَاعِ السَّلَفِ وَاَكْثَرِ الْمُفَسِّرِيْنَ الْمُعْتَبَرِيْنَ مِنَ الْخَلَفِ وَمِمَّنْ صَرَّحَ

شیخ المشائخ علامہ جلال الدین سیوطی رح فرماتے ہیں کہ علوم فلسفہ و منطق کا سیکھنا اور سکھانا حرام ہے۔ اس پر سلف صالحین اور اکثر معتبر مفسرین کا اجماع ہے۔

[1] تاریخ الادب العربی ص۷۸ [2] الغزالی ص۲۳۳

بذالك ابن الصلاح والنووي وخلق لا يحصون وقد جمعت في تحريمه كتابا نقلت فيه نصوص الائمة في الحط عليه وذكر الحافظ سراج الدين القزويني من الحنفية في كتاب الفه في تحريمه ان الغزالي رجع الى تحريمه بعد ثنائه عليه في اول المنتقى وجزم السلفي من اصحابنا وابن رشد من المالكية بان المشتغل لا تقبل روايته۔

(شرح الفقہ الاکبر ص۳)

محدث ابن الصلاح، امام نوویؒ اور بیشمار علمائے امت نے اس کی تصریح کی ہے، میں نے اس کی حرمت کے بیان میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں ائمہ کرام کے اقوال و ارشادات جو اس کے مفاسد کے بارے میں وارد ہوئے ہیں ذکر کئے ہیں۔ حافظ سراج الدین قزوینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی حرمت کے بیان میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں امام غزالیؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بھی اس کی حرمت کے قائل ہو گئے تھے علامہ سلفی شافعیؒ اور ابن رشد مالکیؒ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ان علوم سے اشتغال کرنے والے کی روایت قبول نہ کی جائے گی۔

سرکار دو عالمؐ کی رہنمائی

مشہور بزرگ خواجہ حسن رسول نما دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علوم فلسفہ جیسے علم کو نہیں سیکھنا چاہئے پھر اپنا خواب بیان فرمایا کہ طالب علمی کے زمانہ میں مجھے شرح ہدایت الحکمت (فلسفہ) پڑھنے کا شوق ہوا۔ رات کو حضرت الصادق الامین زینت کعبہ رونق منبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابدا ابدا الی یوم القیامۃ کی زیارت نصیب ہوئی، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ فلاسفہ کے ساتھ رہو؟ خواب سے بیدار ہو کر میں نے توبہ کی کہ فلسفہ نہیں پڑھوں گا۔ چونکہ علوم مروجہ کا کما حقہٗ سمجھنا بعض مسائل فلسفہ پر موقوف ہے۔ اس لئے بسا اوقات پڑھنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اس منع کی وجہ سے

اس سے احتراز کرتا تھا، ایک رات پھر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت
ہوئی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر چاہو تو فقہ کہاں کے علوم پر اس کو حاصل کر سکتے

سیرت النبی بعد وصال النبی صلعم

مولانا حکیم جمیل الدین نگینوی ثم الدہلوی مرحوم سابق رکن شوریٰ دار العلوم دیوبند
لکھا کہ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے خواب دیکھا کہ
دار العلوم دیوبند کی اس عمارت میں جس کو نودرہ کہتے ہیں ایک اجتماع ہو رہا ہے،
سرور کائنات، فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم رونق افروز ہیں، سرور کائنات کی
نگاہ ایک کتے پر پڑی جو نودرے کے صحن میں بیٹھا ہوا تھا، حکم دیا کہ اس کتے کو نکال
دو۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس خواب کی تعبیر لی کہ
اس سے مراد منطق و فلسفہ ہے۔

(علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے جلد اول ص۸۵)

(باقی آئندہ)

قطعہ

[illegible]